

هذا أبلغ لِلْبَاسٍ

كتاب الثان

ج1

www.KitaboSunnat.com

جلد: اول

مولانا محمد رفیق حافظہ تعالیٰ

مکتبہ قرآنیۃ الامور

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب و سنت ذات کام پر دستیاب تمام الیکٹر انک کتب ←

عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔ ←

مجلس التحقیق الاسلامی (Upload) کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد آپ لوڈ ←

کی جاتی ہیں۔

دعویٰ مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹر انک ذرائع سے محض مندرجات نشر و اشاعت کی مکمل اجازت ہے۔ ←

☆ تنبیہ ☆

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔ ←

ان کتب کو تجارتی یا مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔ ←

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

نشر و اشاعت، کتب کی خرید و فروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔ ←

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

هَذَا بَلْغٌ لِّلنَّاسِ (ابراهیم: 52:14)
”یہ (الله کی طرف سے) ایک پیغام ہے، تمام لوگوں کے لیے“

تفسیر البلاع

مولانا محمد رفیق مدظلہ العالی

جلد اول

سورہ الفاتحہ اور سورہ البقرہ

www.KitaboSunnat.com

مکتبہ قرآنیۃ الامور



جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

238,15

مسی - س

نام کتاب : تفسیر البلاغ (جلد اول)

مترجم و مفسر : پروفیسر مولانا محمد رفیق

ناشر : مکتبۃ قرآنیۃ، یوسف مارکیٹ، غزنی شریٹ،

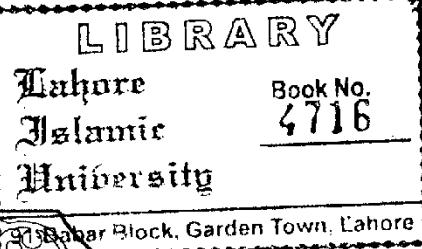
اُردو بازار لاہور۔ پاکستان

فون: 0321-7724032، موبائل: 0333-4399812

طبع : روشن پرنس، لاہور

اهتمام : حافظتی الدین

س اشاعت : اپریل 2013ء



مکتبۃ قرآنیۃ الامم

اُصول ترجمہ و تفسیر

قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر کی ضرورت ہر دور میں رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے اسلام نے اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے نہایت قیمتی اور قابل قدر کام کیا ہے۔
صحیح فہم قرآن کے لیے چند مسلمہ بنیادی اصول ہیں جن کا علم ضروری ہے اور ہم نے اس کتاب میں ان اصولوں کو پوری طرح مخوذ رکھا ہے۔

1۔ قرآن کو سمجھنے سے قبل آدمی اپنے دل و دماغ کو اُن تصورات اور تعصبات سے باکل خالی کر دے، جو اس نے پہلے سے قائم کر رکھے ہیں، ورنہ وہ قرآنی عبارات میں اپنے ہی خیالات پڑھتا رہ جائے گا، اور اسے اس کتاب ہدایت سے کوئی رہنمائی میسر نہ آسکے گی۔

2۔ فہم قرآن کے لیے عربیت یعنی عربی زبان کا پورا لحاظ رکھا جائے۔ قرآنی الفاظ و محاورات کے وہی معنی مراد لیے جائیں جو نہ قرآن کے وقت لیے جاتے تھے کیونکہ قرآن اپنے دور کے عربیوں کی فصیح و بیخش زبان میں اتراء ہے۔ مشہور ماہر لغت ابو زکریا الفراء کا قول ہے کہ:

((إِنَّ لُغَةَ الْقُرْآنِ أَفْصَحُ أَسَالِيْبِ الْعَرَبِيَّةِ عَلَى الْأَطْلَاقِ))
”بے شک قرآن کی زبان نہایت اعلیٰ فصیح عربی اسلوب میں ہے۔“

لیکن اس حوالے سے ایک مشکل یہ ہے کہ دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح عربی زبان بھی وقت کے ساتھ ساتھ بہت حد تک تبدیل ہو چکی ہے۔ یہاں تک کہ اب اس کے بیشتر الفاظ ان معنوں میں استعمال ہی نہیں ہوتے جن معنوں میں وہ قرآن مجید میں آئے ہیں، جیسے قوم، فرقہ، فقہ، فاسق، فطور، تاویل، تفصیل، دلیل، وسیله، لben اور سیارہ وغیرہ۔
قدیمی سے ہمارے ہاں کے بعض اردو تراجم میں دانستہ یا غیر دانستہ قرآنی الفاظ کے وہ معنی لیے گئے ہیں جو اردو زبان میں مستعمل ہیں، جبکہ عربیت کی رو سے وہ معنی مراد لینا ہرگز درست نہیں۔ مثال کے طور پر ”وسیله“ کا لفظ ہے جو قدیم عربی اور قرآن و حدیث کی زبان میں ”قرب“ کے معنوں میں آتا ہے مگر اسے ”ذریعے“ اور ”واسطے“ کے معنوں میں لے کر شرک و گمراہی کا دروازہ کھول دیا گیا۔ حد یہ ہے کہ ایک مشہور مترجم و مفسر نے قرآن کے الفاظ ﴿وَلَنْدِيْقَنَّهُمْ مِنْ عَذَابٍ غَلِيظٍ﴾ (حُمَّ السجدة 50:41) کا ترجمہ ”انہیں ہم بڑے گندے عذاب کا مزاچھائیں گے۔“ کر دیا ہے جو کہ عربیت کے سارے خلاف ہے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ صحیح فہم قرآن کے لیے عربیت کا لحاظ رکھنا نیادی شرط ہے۔ اس عربی زبان کا ذوق اور اس میں ملکہ و مہارت ضروری ہے، جس میں قرآن عظیم نازل ہوا ہے۔ اس کے لیے ”ادب جاہلی“ کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اس کے علاوہ ابتدائی اسلامی دور کے علمی و ادبی سرمائے سے مدد لینی چاہیے اور قدیم مستند عربی اخوات سے بھی استفادہ کرنا چاہیے۔

لیکن اس ضمن میں یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے کہ قرآن مجید کے وہ الفاظ جو دینی اصطلاحات (TERMS) کے طور پر آئے ہیں ان کے لغو یا کوئی اور خود ساختہ اصطلاحی معنی مراد نہیں لیے جاسکتے۔ ان کا صرف وہی مفہوم لیا جائے گا جو صاحبِ وحی، معلمِ قرآن، شارع علیہ السلام نے متعین فرمادیا ہے، جیسے حج، عمرہ، اقامت صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، ابھرت اور جہاد فی سبیل اللہ وغیرہ۔

3۔ قرآن کی تفسیر خود قرآن سے کی جائے گی۔ اس مسلمہ قاعدے کو اپنایا جائے گا کہ ((الْقُرْآنُ يَقُسِّرُ بَعْضَهُ بَعْضًا)) ”کہ قرآن کا ایک حصہ اس کے دوسرے حصے کی تفسیر کر دیتا ہے۔“

مثال کے طور پر سورہ البقرہ میں ہے کہ:

﴿وَإِذْ قُلْنَا لِلملائِكَةِ اسْجُدُوا لِأَدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ طَ أَبَى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكُفَّارِينَ﴾ (البقرہ 2:34)

”اور یاد کرو جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے جھک جاؤ تو وہ جھک گئے، مگر ابلیس نہ جھکا۔ اس نے انکار کیا اور تکبیر کیا اور وہ کافروں میں سے ہو گیا۔“

اس مقام پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید ابلیس فرشتوں میں سے کوئی فرشتہ تھا لیکن سورہ الکھف (18) میں وضاحت ہے کہ وہ جنوں میں سے ایک جن تھا، کوئی فرشتہ نہ تھا:

﴿وَإِذْ قُلْنَا لِلملائِكَةِ اسْجُدُوا لِأَدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ طَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ طَ﴾ (الکھف 18:50)

”اور یاد کرو جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے جھک جاؤ، تو وہ سب جھک گئے، مگر ابلیس نہ جھکا۔ وہ جنوں میں سے تھا۔ اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔“

اس طرح قرآن نے اپنی ایک محفل بات کو دوسری جگہ وضاحت سے بیان کر دیا ہے اور یہ قرآن حکیم کا خاص اسلوب ہے۔

4۔ قرآن کی تفسیر حدیث و سنت کے مطابق کی جائے گی۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا یہ فرض منصی تھا کہ تلاوت آیات کے علاوہ آپ ﷺ قرآن کی تعلیم بھی دیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنفُسِهِمْ يَتَلَوُ عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ﴾

وَيُزَكِّيهِمْ وَيَعْلَمُهُمُ الْكِتَبَ وَالْحِكْمَةَ طَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝
(آل عمران: 3) 164:

”بے شک اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ انہی میں سے اُن کے پاس ایک رسول بھیجا، جوان کو اللہ کی آسمیں سناتا، اُن کو پاک کرتا اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے، جب کہ اس کیبعثت سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے۔“

دوسرے مقام پر فرمایا گیا کہ نبی ﷺ کی بعثت کا ایک مقصد وحی الہی کی تبیین ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ قرآن مجید کا مدعا بیان کریں، اس کی مراد واضح کریں اور اس کی تشریح فرمائیں:
 ﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْذِي نُّكِرَ لِتَبْيَّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾ (النحل: 16: 44)
 ”اور ہم نے آپ ﷺ کی طرف ذکر یعنی قرآن نازل کیا تاکہ آپ ﷺ اس چیزوں کو لوگوں پر واضح کر دیں جو ان کی طرف اتاری گئی، اور تاکہ وہ غور و فکر کریں۔“

تھی وجہ ہے کہ جب قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی کہ:
 ﴿الَّذِينَ أَمْنَوْا وَلَمْ يُلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولَئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُمْ مُهْتَدُونَ ۝﴾ (الانعام: 6:82)
 ”جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے آلو دہ نہیں کیا، صرف ان کے لیے امن و
 سلامتی سے اور وہی بدایت پر ہیں۔“

تو صحابہ کرام گھبرا گئے کہ ہم میں سے کون ہے جس سے کبھی ظلم سرزد نہ ہوا ہو، تو کیا ہم کو امن و ہدایت اور جنت نصیب نہ ہوگی؟ تو اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: کیا تم نے قرآن کی یہ آیت نہیں پڑھی کہ:
﴿إِنَّ الشَّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾ (لقمان 13:31)
 ”بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔“

اس آیت میں بھی ظلم سے مراد شرک ہے۔ اس کے بعد صحابہ کرام کو اطمینان حاصل ہو گیا۔ (صحیح بخاری، رقم: 32)

5۔ صحابہ کرام کے مستند اقوال کی روشنی میں قرآن کی تفسیر کی جائے گی۔ صحابہ کرام کے تفسیری اقوال کو اس لیے ترجیح حاصل ہے کہ وہ خود صاحب وحی رسول اللہ ﷺ سے قرآن سنتے تھے، اپنی نمازوں میں اسے ذہرا تھے۔ کچھ پوچھنا ہوتا تو حضور ﷺ سے براہ راست پوچھ لیتے تھے۔ انہوں نے خود نبی ﷺ سے قرآن سیکھا اور سمجھا تھا۔ ان میں بعض صحابہ کرام ایسے تھے جو فہم قرآن کے ماہرین شمار ہوتے تھے۔ ان کی اس خوبی کی تصدیق و تصویب (CONFIRMATION) خود حضور ﷺ نے فرمائی تھی۔ جیسے حضرت عبد اللہ بن مسعود اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما۔ بعض عقیدت کی بات نہیں ہے بلکہ بالکل فطری حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے کتاب کا مطلب خود

صاحب کتاب سے سمجھا ہو، ان کے فہم کو بعد والوں کے فہم پر ترجیح ہونی چاہیے۔

انسوں بعد کے لوگوں نے صحابہ کرام کے بارے میں یہاں تک کہہ دیا کہ:

”سلف ایمان میں قوی ہیں مگر علم میں خلف کا طریقہ قوی ہے۔“

حالاں کہ صحابہ کرام کے بارے میں خود عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہے کہ:

((من کان منکم متأسیا فلیتأسی باصحاب محمد ﷺ، فإنهم كانوا أبراً هذه الأمة
قلویاً، وأعمقها علماً، وأقلّها تکلفاً، وأقوم هدیاً، وأحسنها حالاً، فوماً اختارهم
الله لصحبة نبیه ﷺ واقامة دینه، فاعرفوا لهم فضلهم، واتبعوهم فی آثارهم،
إنهم كانوا على الهدی المستقيم))

(جامع بیان العلم وفضله، ابن عبد البر: 198/2)

”جس شخص نے کسی کی پیروی کرنی ہو تو وہ محمد رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کی پیروی کرے، کیونکہ پوری امت میں ان کے دل سب سے زیادہ نیک تھے۔ ان کا علم سب سے زیادہ گہرا تھا۔ وہ بہت کم تکلف کرتے تھے اور یہی کرنے میں سب سے بڑھ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے نبی ﷺ کی محبت کے لیے اور اپنے دین کو قائم کرنے کے لیے جن لیا تھا۔ لہذا ان کے مقام و مرتبے کو پہچانو اور ان کے نقش قدم پر چلو، کیونکہ وہ سیدھی راہ پر تھے۔“

صحابہ کرام کے اکثر تفسیری اقوال تفسیر طبری، تفسیر الحجر الوجیز لابن عطیہ، تفسیر قرطبی اور تفسیر ابن کثیر جیسی کتب تفسیر میں مل جاتے ہیں۔

لیکن ان اقوال میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی آیت کی تفسیر میں بظاہر اختلاف پایا جاتا ہے لیکن اصل میں وہ ایک ہی قول ہوتا ہے، جسے مختلف انداز میں بیان کیا ہوتا ہے۔

یہی بات حافظ ابن کثیر نے اپنی مشہور تفسیر کے دیباچے میں لکھی ہے کہ:

((فتذکر اقوالهم فی الآیة فیقع فی عبارتهم تباین فی الالفاظ ، يحسبها من لا علم
عنه اختلافاً فیحکیها اقوالاً ، وليس كذلك ، فان منهم من يعبر عن الشئی بلازمه أو
بنظریه ، ومنهم من ينص علی الشئی بعينه ، والكل بمعنى واحد فی أكثر اماكن ،
فليتفطن للبیب لذلك))

”اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی آیت کی تفسیر میں جب ان (صحابہ کرام) کے اقوال بیان کیے جاتے ہیں، اور ان کے الفاظ میں بظاہر اختلاف نظر آتا ہے تو ناواقف شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس بارے میں کئی مختلف اقوال ہیں، حالاں کہ حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ بلکہ کسی نے ایک چیز کی تعبیر میں اس کے لازمی یا

مرادی معنی لیے ہوتے ہیں، کسی نے اس کی نظر یا مثال پیش کی ہوتی ہے اور کسی نے اصل چیز ہی کو بیان کیا ہوتا ہے۔ مگر سب کے ایک ہی معنی ہوتے ہیں۔ لہذا عقل مند آدمی کو اس بارے میں دھیان کرنا چاہیے۔“

6۔ قرآن کی تفسیر اجماع امت کے مطابق کی جائے گی۔ کسی قرآنی لفظ یا آیت کی ایسی کوئی تفسیر نہیں کی جاسکتی جو اجماع قطعی کے خلاف ہو۔ اس کا سبب ظاہر ہے کہ جن امور پر امت متفق ہے ان کی پیروی میں ہدایت ہے اور ان کی خلاف ورزی میں گمراہی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ وَمَنْ بَعَدَ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعُ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّٰ وَنُصِّلِهِ جَهَنَّمَ طَوَّسَأَتْ مَصِيرًا﴾ (النساء: 4: 115)

”جو شخص رسول کی مخالفت کرے اور مسلمانوں کا راستہ چھوڑ کر کسی اور راستے پر چلے، جب کہ اس پر صحیح راستہ واضح ہو چکا تھا تو اسے ہم اسی طرف پھیر دیں گے جدھروہ خود پھر گیا اور اسے جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بہت برا ملکھانا ہے۔“

اس آیت میں مسلمانوں کے راستے یا طریقے کو صحیح قرار دیا گیا ہے اور اس کے خلاف چلنے پر دوزخ کی وعید ہے۔ اب جس چیز پر مسلمان متفق ہو جائیں گے، وہی ان کا راستہ اور طریقہ ہے اور یہی اجماع امت ہے، جس کی خلاف ورزی گمراہی بھی ہے اور دوزخ میں جانے کا سبب بھی۔

ابن ماجہ کی ایک حدیث ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ أَمْتَنِي لَا تَجَتَّمِعُ عَلَى صَلَاتِهِ))
(ابن ماجہ، رقم: 3950)

”بے شک میری امت گمراہی پر کبھی متفق نہ ہوگی۔“

اس حوالے سے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہے کہ:
((مَا رَأَاهُ الْمُسْلِمُونَ حَسَنًا فَهُوَ عِنْدَ اللَّهِ حَسَنًا))

”جس بات کو سب مسلمان اچھا سمجھیں، وہ اللہ کے ہاں بھی اچھی ہے۔“

اس تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ اجماع امت کا راستہ ہدایت کا راستہ ہے اور اس کی خلاف ورزی کرنا گمراہی ہے۔ لہذا کسی اجماع قطعی کے خلاف جو تفسیر کی جائے گی، وہ ہدایت کی بات نہ ہوگی بلکہ گمراہی کی چیز ہوگی جس سے پچا ضروری ہے۔

7۔ قرآن مجید کی سورتوں اور آیتوں کی تفسیر اُن کے شانِ نزول کے لحاظ سے کی جائے گی۔

فہم قرآن کے لیے شانِ نزول کی بڑی اہمیت ہے۔ شانِ نزول (یا سببِ نزول) سے مراد وہ خاص پس منظر

(BACK GROUND) اور مخصوص حالات و ایعات ہیں، جن میں قرآن کی بعض سورتوں اور آیتوں کا نزول ہوا ہے۔ اس طرح کے قرآنی مقامات کو ان کا شان نزول جانے بغیر نہ تو صحیح طور پر سمجھا جاسکتا ہے اور نہ ان کی درست تفسیر ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور سورۃ البقرہ میں ہے کہ:

فَإِنَّ الصَّفَا وَالْمُرْوَةَ مِنْ شَعَائِيرِ اللَّهِ هُنَّ حَجَّ الْبَيْتَ أَوْ أَعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطْوَقَ بِهِمَا طَوْعَةً خَيْرًا لَا فَإِنَّ اللَّهَ شَاءَ كُرْ عَلِيهِمْ ۝ (البقرہ: 158)

”بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ اس لیے جو شخص بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی حرج نہیں کہ وہ ان دونوں (پہاڑیوں) کے درمیان سعی (کے چکر) لگائے اور جو کوئی شوق سے کوئی نیکی کرے تو اللہ قادر و ان اور سب کچھ جانے والا ہے۔“

اس آیت کے ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ حج اور عمرے میں صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا ضروری نہیں ہے۔ کوئی شخص سعی کرے یا نہ کرے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے، بلکہ ہر عمرے یا حج میں سعی کرنا واجب اور ضروری ہے۔

اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ جامیت کے دور میں شرکیں نے ان دونوں مقامات پر دو بت..... اساف اور نائلہ رکھے ہوئے تھے۔ ان بتوں کی موجودگی میں مسلمانوں کو سعی کرنے میں تامل (HESITATION) ہوا تو فرمایا گیا کہ ان بتوں کی موجودگی میں بھی سعی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ پھر جب نبی ﷺ نے صفا اور مروہ کے درمیان سعی فرمائی تو اب یہ سعی واجب اور ضروری تھی۔ (صحیح بخاری، رقم: 4495)

یاد رہے کہ شان نزول کے بارے میں مفسرین اور علمائے اصول کا ایک متفقہ قاعده یہ ہے کہ:

((الْعِبَرَةُ بِعُمُومِ الْلَّفْظِ لَا بِخُصُوصِ السَّبِّ))

مطلوب یہ ہے کہ قرآنی الفاظ کے عام ہونے کا اعتبار کیا جائے گا، اور اسے کسی موقع کی وجہ سے خاص نہیں سمجھا جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں اسے یوں کہا جاسکتا ہے کہ جن آیات کا کوئی خاص شان نزول ہوتا ہے، ان کے حکم کو صرف اسی موقع کے لیے مخصوص یا محدود نہیں سمجھا جائے گا، بلکہ اس حکم کو عام قرار دیا جائے گا۔ نہیں کہا جائے گا کہ چونکہ فلاں آیت فلاں شخص کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اس لیے اس کے بارے میں جو حکم آیا ہے وہ بھی اسی شخص کے ساتھ خاص ہے، بلکہ وہ حکم عام ہو سکتا ہے اور سب کے لیے ہو سکتا ہے۔

مثال کے طور پر سورۃ الجادلہ میں ظہار کے بارے میں جو آیتیں نازل ہوئی ہیں، وہ اگرچہ مخصوص میاں یوں کے حق میں نازل ہوئی ہیں، لیکن ظہار کا حکم عام ہے۔ صرف انہی میاں یوں کے لیے مخصوص یا محدود نہیں ہے، بلکہ اس کا اطلاق (APPLICATION) دوسرے لوگوں پر بھی ہو گا۔

البتہ شان نزول کے حوالے سے ایک مشکل پیش آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ تفسیر کی کتابوں میں بعض اوقات ایک ہی

سورت یا آیت کے کئی مختلف شان نزول لکھے ہوتے ہیں، جب کہ حقیقت میں اس کا ایک ہی شان نزول ہوتا ہے۔ لیکن صحابہ کرام اور تابعین جب یہ دیکھتے تھے کہ فلاں آیت یا سورت کے حکم کا اطلاق (APPLICATION) اس جیسے کسی اور واقعے پر بھی ہوتا ہے تو وہ اس دوسرے واقعے کو بھی اسی آیت کا شان نزول قرار دیتے تھے۔ اس طرح ایک ہی آیت یا سورت کے بعض اوقات کئی کئی شان نزول ہو جاتے تھے۔

اس بارے میں امام بدال الدین زرکشی رضی اللہ عنہ اپنی کتاب ”البرهان فی علوم القرآن“ میں لکھتے ہیں کہ:

((وَقَدْ عُرِفَ مِنْ عَادَةِ الصَّحَابَةِ وَالْتَّابِعِينَ أَنَّ أَحَدَهُمْ إِذَا قَالَ: نَزَّلَتْ هَذِهِ الْآيَةُ فِي كَذَا، فَإِنَّهُ يَرِيدُ بِذَلِكَ أَنْ هَذِهِ الْآيَةُ تَضَمَّنُ هَذَا الْحُكْمَ، لَا أَنَّهُ هَذَا كَانَ السَّبَبُ فِي نَزْوِلِهَا))

(البرهان فی علوم القرآن، ج 1، ص: 31,32)

”صحابہ وتابعین کی یہ عام عادت ہے کہ جب وہ کہتے ہیں کہ فلاں آیت فلاں کے بارے میں نازل ہوئی ہے تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ آیت اس حکم پر مشتمل ہے۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ بات واقعی اس آیت کے نزول کا سبب ہے۔“

بہر حال تفسیری کتب میں موجود کئی مختلف شان نزول والی آیتوں یا سورتوں کا اصل شان نزول معلوم کرنا خاصاً دشوار کام ہوتا ہے اور اس میں ایک مفسر کے لیے بڑا امتحان ہوتا ہے کہ وہ غور و فکر اور تحقیق کر کے اصل شان نزول معلوم کرے۔ اس سلسلے میں ان کتابوں کا مطالعہ بہت مفید ہے جو خاص اسی موضوع پر لکھی گئی ہیں، جیسے امام واحدی کی ”اسباب النزول“ وغیرہ۔

8۔ فہم قرآن کے لیے اس کی ناخ و منسوخ آیات کی پہچان ضروری ہے۔
نخ کے اصل معنی تو کسی چیز کو ہٹانے، دور کرنا یا زائل کرنے کے ہیں لیکن اصطلاح میں اس کی تعریف یہ کی گئی ہے۔
((رَفْعُ الْحُكْمِ الشَّرْعِيِّ بِدَلِيلِ شَرْعِيِّ مَتَّخِرٍ))
(مناهل العرفان، 2:127)

”کسی بعد کی شرعی دلیل کے ذریعے پہلے کے شرعی حکم کا اٹھ جانا یا باقی نہ رہنا۔“
گویا پہلے سے موجود کسی شرعی حکم کی جگہ کوئی نیا شرعی حکم آجائے کوئی نخ کہتے ہیں۔ پھر پہلا شرعی حکم ”منسوخ“، اور اس کی جگہ لینے والا نیا حکم اس کا ”ناخ“ کہلاتا ہے۔ اس کے بعد منسوخ حکم پر عمل نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کے ناخ حکم پر عمل کیا جائے گا اور اسی کے مطابق فتویٰ بھی دیا جائے گا۔

یاد رہے کہ نخ میں قرآن کی کسی آیت کا صرف حکم منسوخ ہوتا ہے مگر آیت بدستور قرآن کا حصہ رہتی ہے اور اس کی تلاوت بھی کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرُبُوا الصَّلَاةَ وَإِنْتُمْ سُكُّرٌ﴾
(النساء، 4:43)
”اے ایمان والو! نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ.....“

یہ پہلا حکم تھا کہ شراب پی کر نماز کی طرف آنا منوع اور حرام ہے۔ اس کے سواد و سرے اوقات میں شراب نوشی منع نہ تھی۔ مگر پھر سورہ المائدہ میں یہ حکم آگیا کہ:

هُنَّا كَيْلَهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْحَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْأَنْصَابُ وَ الْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطِينِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِعُونَ ۝ (المائدہ: ۵)

”اے ایمان والو! شراب، جوا، بتوں کے آستانے اور تیروں سے فال لینا، یہ سب گندے کام ہیں
شیطان کے، لہذا ان سے بچو! تاکہ تم فلاح پاؤ۔“

اس آیت کے حکم کے نتیجے میں شراب نوشی مستقل طور پر بہیش کے لیے منوع اور حرام قرار دی گئی۔ گویا پہلے شراب پی کر نماز کے قریب جانا منع اور حرام تھا۔ اب شراب نوشی بہیش کے لیے منوع اور حرام تھری۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیں گے کہ پہلے حکم میں نمازوں کے سواد و سرے اوقات میں شراب پی لینے کی جواہازت تھی وہ اس دوسرے حکم سے منسوخ ہو گئی۔

تفسیر بالرائے سے کیا مراد ہے؟

ایک حدیث میں تفسیر بالرائے کی مذمت کی گئی ہے۔ لیکن تفسیر بالرائے میں لفظ ’رائے‘ کا مطلب سمجھنے میں بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس لیے ہم اس پر تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

جامع ترمذی میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((..... وَمَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَلْيَتَبُوأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ)) (ترمذی، رقم: 2951)

”..... اور جس نے قرآن کے بارے میں اپنی رائے سے کچھ کہا تو وہ اپنا مٹھکا نا دوزخ میں بنالے۔“

امام ترمذی رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

لیکن اس حدیث سے پہلے امام ترمذی نے یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبُوأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ)) (ترمذی، رقم: 2950)

”جس نے علم کے بغیر قرآن کے بارے میں کوئی بات کہی، وہ اپنا مٹھکا نا دوزخ میں بنالے۔“

امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے۔

اس دوسری زیادہ مضبوط حدیث نے پہلی حدیث کے لفظ ((بِرَأْيِهِ)) ”اپنی رائے سے“ کا مطلب واضح کر دیا ہے کہ اس سے مراد ((بِغَيْرِ عِلْمٍ)) ”علم کے بغیر“ ہے۔ گویا تفسیر بالرائے ایسی تفسیر کو کہا جائے گا جو علم کے بغیر کی جائے۔ خود امام ترمذی رضی اللہ عنہ نے ((بِرَأْيِهِ)) والی حدیث کیوضاحت میں لکھا ہے کہ: ”اس سے مراد علم کے بغیر اپنے جی سے قرآن کی تفسیر کرنا ہے جو کہ قابل مذمت ہے۔ رہا علم کی رو سے تفسیر کرنا، تو یہ بالکل درست اور جائز ہے، کیونکہ اس

طرح کی تفسیر مشہور تابعین بجا ہے جو اللہ، قادہ جو اللہ اور دوسرے اہل علم نے کی ہے اور ان لوگوں کے بارے میں یہ بدگمانی نہیں ہو سکتی کہ خدا خواستہ وہ لوگ علم کے بغیر مخفی اپنے بھی سے قرآن مجید کی تفسیر کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حدیث میں 'رائے' کا لفظ اپنے لغوی معنوں میں نہیں ہے بلکہ ایک اصطلاح کے طور پر آیا ہے، جس کا مطلب ہے: "علم کے بغیر قرآن کی من مانی تفسیر کرنا۔" گویا ایسی تفسیر کرنا جس میں کوئی شخض یہ نہ دیکھے کہ قرآن کیا کہتا ہے، بلکہ یہ دیکھے کہ اس کی اپنی خواہش یا پہلے سے قائم کی ہوئی کوئی رائے کیا چاہتی ہے اور کس طرح قرآن کو کچھ تباہ کر اس کے مطابق کر لیا جائے۔ گویا یہ حالت ہو کہ:

خود بدلتے نہیں، قرآن کو بدلتے ہیں

اس سے واضح ہوا کہ تفسیر بالائے کا یہ مطلب لینا صحیح نہیں ہے کہ قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے عقل و بصیرت سے کام نہ لیا جائے۔ اگر یہی مطلب ہوتا تو پھر قرآن کا سمجھنا سمجھانا ہی فضول اور بے کار ہوتا۔ حالانکہ خود قرآن ہمیں بار بار غور و فکر کرنے اور عقل و بصیرت سے کام لینے کی دعوت و ترغیب دیتا ہے۔

﴿أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا﴾

(محمد 24:47)

"کیا پھر یہ لوگ قرآن پر تدبیر نہیں کرتے، یا ان کے دلوں پر تالے گلے ہوئے ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ صحابہ و تابعین اپنے علم اور اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر قرآن کی تفسیر بھی کرتے تھے اور اس سے مختلف احکام و مسائل نکالنے کے لیے اجتہاد بھی کرتے تھے۔

بعد کے مفسرین کرام نے تفسیر بالائے کی دو قسمیں قرار دیں:

ایک تفسیر بالائے محدود اور دوسرا تفسیر بالائے مذموم۔

تفسیر بالائے مذموم یہ ہے کہ قرآن کو سمجھنے میں عقل و بصیرت اور اجتہاد و استنباط سے بھی کام لیا جائے اور یہی پسندیدہ طریقہ ہے۔ اگرچہ ایسی صورت میں تفسیری اختلاف بھی پیدا ہو سکتا ہے جو ایک فطری امر ہے اور بالکل جائز ہے کیونکہ اس سے شریعت میں تنوع (Variety) اور وسعت پیدا ہوتی ہے۔

تفسیر بالائے مذموم یہ ہے کہ یہ نہ دیکھا جائے کہ قرآن کا مٹا کیا ہے اور وہ کیا کہنا چاہتا ہے، بلکہ صرف یہ دیکھا جائے کہ ہماری اپنی خواہش یا پہلے سے کوئی تھہرائی ہوئی بات کیا چاہتی ہے اور قرآن کی عبارت اور اس کے مضبوط کو کسی طرح سمجھنے تباہ کر اپنی خواہش یا اپنے پہلے سے قائم نظریے کے مطابق کر لیا جائے۔ یہ طریقہ مذموم، ناپسندیدہ اور حرام ہے۔ ایسی تفسیر کرنے والے کے لیے دوزخ کی وعید آئی ہے۔

تفسیر بالائے مذموم کی بعض صورتیں:

تفسیر بالائے مذموم کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں، مثلاً:

1۔ اپنی خواہش یا اپنے کسی خاص نظریے یا خصوصی فکر کو لے کر اس کے مطابق قرآن کی تفسیر کرنا۔ اس میں یہ نہ دیکھا

- جائے کہ خود قرآن کیا کہتا ہے بلکہ قرآن کی معنوی تحریف کر کے اسے اپنی خواہش، اپنے نظریے اور مخصوص فکر کے مطابق ڈھال لیا جائے۔ یہ ایک من مانی تفسیر ہے جو کبھی عربیت کے خلاف کی جاتی ہے اور کبھی قرآن کی بات کو اس کے اصل سیاق و سبق (CONTEXT) سے ہٹا کر کی جاتی ہے۔
- 2۔ فرقہ پرتی کے تعصب سے تفسیر کرنا تاکہ قرآن کو اپنے مخصوص فرقے کے عقائد و نظریات کے مطابق ڈھال لیا جائے۔ اس طرح کی تفسیر کے نمونے فرقہ پرستوں کی تفسیروں میں عامل جاتے ہیں۔
- 3۔ قادیانیوں نے جو کہ غیر مسلم ہیں، اپنے غیر اسلامی عقائد و اعمال کو قرآن کے مطابق ثابت کرنے کے لیے تفسیر بالائے نہ موم کا ارتکاب کیا ہے۔
- 4۔ بعض صوفیانے اپنے گمراہانہ تصورات و نظریات (جیسے وحدت الوجود وغیرہ) اور بعض باطنی احوال و واردات پر مبنی قرآن کی اشاری تفسیر کی ہے جو کہ تفسیر بالائے نہ موم کے ضمیں میں آتی ہے۔
- 5۔ دور جدید کے بعض مفسرین جب سائنسی حقائق کی بجائے سائنسی نظریات (THEORIES) کے مطابق تفسیر کرتے ہیں تو وہ بھی تفسیر بالائے نہ موم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ جیسے ڈارون (DARWIN) کے نظریہ ارتقا (EVOLUTION THEORY) کو قرآنی تعلیمات کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کرنا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنسی نظریات وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں اور کبھی غلط ثابت ہوتے ہیں، اس لیے ان کے مطابق تفسیر کرنے سے قرآن مجید کی حقانیت اور صداقت پر حرف آ سکتا ہے۔ البتہ وہ سائنسی اور طبعی حقائق جو تجربے (EXPERIMENT) اور مشاہدے (OBSERVATION) سے ثابت ہیں، ان کے مطابق تفسیر کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ جیسے زمین کا گول ہونا وغیرہ۔
- 6۔ کسی خاص مسلک و مذهب کے تعصب میں مبتلا ہو کر اس کی بے جا حمایت و طرف داری کے لیے کی گئی تفسیر بھی تفسیر بالائے نہ موم ہے۔
- 7۔ بیرونیوں کے وہ بے سرو پا قصے اور ان کی نہ ہبی داستانوں کی خرافات جسے اصطلاح میں 'اسرائیلیات' کہا جاتا ہے، کے مطابق تفسیر کرنا بھی تفسیر بالائے نہ موم ہے۔
- 8۔ مغربی تہذیب سے مرعوب ہو کر اس کے سانچے میں قرآنی تعلیمات کو ڈھالنا بھی تفسیر بالائے نہ موم ہے۔ اس طرح کی تفسیر کے نمونے سرید مرحوم اور جناب غلام احمد پرویز جیسے لوگوں کی کتب تفسیر میں موجود ہیں۔
- 9۔ زمانہ حال میں 'فرابی' مکتب لکڑ کے نام سے ایک نیا گمراہ فرقہ وجود میں آیا ہے، جو درصل مغربی تہذیب سے مرعوب و محور ہے۔ ان لوگوں کا دعویٰ ہے کہ وہ بھی اہل سنت میں سے ہیں مگر ان کے عقائد و نظریات اہل سنت کے بالکل خلاف ہیں کیونکہ وہ:
- قرآن مجید کی صرف ایک ہی قراعت کو صحیح مانتے ہیں اور اس کی دوسری قراعتوں کے مکمل ہیں۔

مرتد کے لیے سزاۓ قتل کو نہیں مانتے۔
 شادی شدہ زانی کے لیے رجم یعنی سگ ساری کی حد کا انکار کرتے ہیں۔
 صرف اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان لانے کو تجات کے لیے کافی سمجھتے ہیں۔
 ان کے نزدیک سنت وہ نہیں جو محمد رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل اور تقریر و تقویب پر مشتمل ہے بلکہ وہ اس کا تعلق سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے جوڑتے ہیں۔ پھر اس کے ثبوت کے لیے اجماع اور تو اتر کی شرط لگاتے ہیں۔
 ان کی رائے میں کوئی رسول کبھی قتل نہیں ہوا۔ (حالاں کہ ایسا سمجھنا قرآن کے نصوص کو جھٹلانا ہے)
 اجماع قطعی کے جھٹ ہونے کے قائل نہیں ہیں۔
 اس کے علاوہ اور کوئی قسم کے گمراہہ تصورات رکھتے ہیں۔

ہم اس گروہ کے جملہ گراہ کن عقاائد و نظریات پر مفصل تقدیم اپنی مطبوعہ کتاب ”فتنه غامدیت کا علمی حسابہ“ میں کر چکے ہیں۔

پھر جہاں تک قرآن فہمی کا تعلق ہے، یہ لوگ قرآن مجید کو بھی انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کی طرح ایک کتاب سمجھتے ہوئے پہلے اس کی تہمید اور مقدمہ تجویز کرتے ہیں، پھر قرآن کو اپنے کچھ خاص عنوانات دے کر اسے سات ابواب یا گروپس (GROUPS) میں تقسیم کرتے ہیں اور آخر میں کچھ سورتوں سے اس کا اختتامیہ ظاہر کرتے ہیں۔ تمام سورتوں کو جوڑا جوڑا (IN PAIRS) مانتے ہیں۔ سورہ النصر کو کمی سورت قرار دیتے ہیں اور اپنی اس اختراع کو نقلفہ نظم قرآن کا نام دیتے ہوئے دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے ایجاد کردہ ”نظم“ کے اس فلسفے کو سمجھ بغير کوئی شخص قرآن کو سمجھ نہیں سکتا۔

حالاں کہ بات سیدھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں عیسیٰ وضنی و منطقی ترتیب اور مضامین کا ربط ڈھونڈنا ایسا ہی فضول کام ہے جیسے کوئی شخص کسی قدر ترقی چس کو دیکھ کر اس میں مصنوعی باغ کی سی روشنیں اور قطاریں تلاش کرے۔ یا کہہ زمین کے مختلف پہاڑی سلسلوں اور ان کی چوٹیوں میں ربط و نظم کی جستجو کرے۔

یہ انسانی نفیات ہے کہ کوئی شخص ایک ہی موضوع پر مسلسل سوچ بچار نہیں کر سکتا۔ اُس کا ذہن ایک دائرے سے دوسرے دائرے اور ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔ اسی فطری مناسبت سے قرآن مجید کے مضامین میں بھی تنویر پایا جاتا ہے۔

قدیم الہل عرب کے شعراء کے قصیدوں میں اور ان کے خطباء کے خطبوں میں بھی کتابی اور منطقی ترتیب نہیں ہوتی تھی، بلکہ ان کے مضامین میں بھی تنویر اور زنگاری ہوتی تھی اور قرآن مجید انہی کے اسلوب میں نازل ہوا ہے۔ جس میں بعض مقامات پر مضامین میں کچھ مناسبت تو ہوتی ہے مگر فلسفہ نظم نہیں ہوتا۔

اس امت کے محققین علماء کبھی ”نظم قرآن“ کے نظریے کے قائل نہیں رہے۔ اس لیے فراہی کتب فکر کے حاملین کی تفسیری کتب بھی تفسیر بالمراء مذموم کے ذیل میں آتی ہیں۔

تیرہویں صدی ہجری کے مجدد اور مجتہد، امام شوکانی رضی اللہ عنہ اپنی شہرہ آفاق تفسیر فتح القرآن میں ”نظم قرآن“ کے نظریے کی تروید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

((اعلم أن كثيراً من المفسرين جاءوا بعلم متكلف، و خاضوا في بحر لم يكلفوها سباته، واستغرقوا أوقاتهم في فن لا يعود عليهم بفائدة، بل أوقعوا أنفسهم في التكلم بمحض الرأي المنهي عنه في الأمور المتعلقة بكتاب الله سبحانه، وذلك أنهم ارادوا أن يذكروا المناسبة بين الآيات القرآنية المسرودة على هذا الترتيب الموجود في المصاحف، فجاءوا بتتكلفات، وتعسفات يتبرء منها الانصاف، ويتنزه عنها كلام البلغاء فضلاً عن كلام الرب سبحانه، حتى افردوا ذالك بالتصنيف، وجعلوه المقصد الأهم من التأليف، كما فعله البقاعي في تفسيره.....))

(فتح القدير للشوکانی، ص: 60,61۔ طبع 2001ء ریاض)

”جاننا چاہیے کہ بعض مفسرین ایک ایسے علم کے پیچھے پڑ گئے جس میں تکلف ہی تکلف تھا۔ وہ ایک ایسے سمندر میں غوطے لگاتے رہے جس میں تیرنے کے وہ مکلف ہی نہ تھے۔ انہوں نے ایک بے فائدہ فن میں اپنا وقت صرف کیا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے معاملے میں تفسیر بالاراء مذموم کے مرتكب ہوئے۔ وہ ساری عمر موجودہ قرآنی ترتیب کی آیات میں باہمی ربط اور نظم ڈھونڈتے رہے۔ بالکل غیر منصفانہ انداز میں انہوں نے اللہ سبحانہ کے کلام کو اس قسم کے لصعن اور بے جا تتكلفات کا حائل قرار دے دیا جن سے انسانی فتح و بیان کلام بھی مبرا اور پاک ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اس حوالے سے انہوں نے کتابیں تصنیف کر لیں اور اس کام کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا۔ یقائی نے اپنی تفسیر میں یہی کچھ کیا ہے.....“

اس کے بعد امام شوکانی رضی اللہ عنہ مذکورہ بحث کو سیئتہ ہوئے آخر میں لکھتے ہیں:

((..... ولنكتف بهذا التنبيه على هذه المفسدة التي تعذر في ساحتها كثير من المحققين، وإنما ذكرنا هذا البحث في هذا الموطن، لأن الكلام هنا قد انتقل مع بني إسرائيل بعد أن كان قبله مع أبي البشر آدم عليهما السلام، فإذا قال متelligent: كيف ناسب هذا ما قبله؟ قلنا: لا كيف:))

”اور ہم اس نقطے سے، جسے بعض محققین (RESEARCHERS) پھیلارہے ہیں، لوگوں کو خبردار کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے ہم نے اس مقام پر جہاں ابو البشر آدم عليهما السلام کے واقعہ کے بعد بني اسرائیل کا واقعہ شروع ہوتا ہے، یہ بحث چھیڑی ہے تاکہ جب کوئی ”ربطی“ (یا ”نظیقی“) یہ سوال اٹھائے کہ ان دونوں واقعات میں باہمی ربط و نظم کیا ہے؟ تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ: کوئی ربط و نظم نہیں ہے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ امام شوکانی رضی اللہ عنہ "نظم قرآن" اور ربط آیات کے فلسفے کے خلاف تھے اور وہ اسے ایک فتنہ اور مفسدہ سمجھتے تھے۔

امام شاہ ولی اللہ دہلوی رضی اللہ عنہ بھی نظم قرآن کے قائل نہ تھے اور قرآن مجید کو ایک "مرتب" کتاب نہیں مانتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب الفوز الکبیر میں لکھتے ہیں کہ:

((حکمت درین باب موافقت مبعوث اليهم است در لسان و اسلوب بیان۔ تا نزول قرآن درمیان عرب هیچ کتابی نہ بود۔ نہ کتاب الهی نہ مؤلف بشر۔ وترتیبی که حالاً مصنفین اختراع نموده اند، عرب آن را نمی دانستند۔ اگر این را باور نمی داری قصائد شعرائے محضر مین را تامل کن و رسائل آنحضرت ﷺ و مکاتیب عمر ﷺ را برخوان۔ تا این معنی روشن شود۔ پس اگر خلاف طور ایشان گفته شود بحیرت در مانند۔ و چیز سے نا آشنا بگوش ایشان مشوش سازد۔ و نیز مقصود نه مجرد افاده است بلکہ افاده مع التکرار والاستحضار۔ وایں معنی در غیر مرتب اقویٰ و اتم است))

"(قرآن کے غیر مرتب ہونے میں) حکمت یہ ہے کہ ایسا اس کے مخاطبین کے لحاظ سے ہے۔ دراصل قرآن کے نزول کے وقت عربوں کے پاس کوئی کتاب نہ تھی۔ نہ الہامی اور نہ کسی انسان کی لکھی ہوئی۔ لہذا جو ترتیب آج کتابوں کے مصنفوں نے اختیار کی ہے اہل عرب اس سے بالکل ناواقف تھے۔ اگر ان شاعروں کا کلام دیکھا جائے جنہوں نے اسلام کا زمانہ پایا۔ یا اگر نبی ﷺ کے خطوط اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خطوط کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے، جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ اگر قرآن کی ترتیب کے لیے کوئی ایسا انداز اختیار کیا جاتا، جس سے اہل عرب واقف نہ ہوتے تو وہ اس قرآن کوں کراجنیت (STRANGENESS) محسوس کرتے۔ ان کا ذہن الجھ کر رہ جاتا، وہ صاف صاف باتیں بھی سمجھنے پاتے۔ لیکن قرآن کا مقصد ان کو صرف کوئی بات سمجھادینا یا کسی واقعے کی خبر پہنچادینا نہ تھا۔ بلکہ اس کا مقصود یہ تھا کہ تمام باتیں ان کے ذہن نشین کی جائیں۔ یہ مقصد صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا تھا، جب ہر بات اچاکن غیر موقع طور پر سامنے آئے۔ سنن والاء سے سن کر چونک اٹھے۔ وہ اس پر پوری توجہ دے، تاکہ وہ بات اس کے دل و دماغ پر نقش ہو جائے۔"

کچھ اس کتاب کے بارے میں:

یہ تفسیر موجودہ دور میں قرآن حکیم کو صحیح طور پر سمجھنے سمجھانے کی ایک ادنیٰ کوشش ہے۔ اس کے مخاطبین میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور دینی حلقة دونوں شامل ہیں۔ اس کی زبان اور انداز بیان کو حتیٰ الواقع مربوط اور آسان بنانے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ قاری کو بات سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔

میں اس بارے میں اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ موجودہ مذہبی گروہ بندی اور فرقہ پرستی کے انتہائی متعصب اور جنونی ماحول میں رہنے کے باوجود، میں نے ہر طرح کے گروہی اور مسلکی تقبیبات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے یہ کام کیا ہے۔ مجھے اپنی علمی کم ماسیگی کا پورا احساس ہے لیکن تحدید نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ میری شعوری عمر کا بڑا حصہ قرآن مجید کو سمجھنے سمجھانے اور اس کی خوبی و تفسیری مشکلات حل کرنے میں گزارا ہے۔ شہادۃ العالمیہ کے علاوہ میں نے جامعہ پنجاب سے عربی اور اسلامیات میں ماسٹرز کیا ہے۔ اس سے پہلے کئی دینی کتب کی تالیف کے علاوہ قرآن کریم کا اردو اور انگلش میں ترجمہ کر چکا ہوں۔ یہ دونوں تراجم مطبوعہ موجود ہیں۔ اردو اور عربی زبان کی درجنوں قدیم و جدید تفاسیر میرے زیر مطالعہ رہی ہیں، علوم قرآن سے متعلق کئی امہات کتب نظر سے گزر چکی ہیں اور میں نے اس کام میں ان سب سے استفادہ کیا ہے۔ اس کے بعد جیسا کچھ قرآن کو سمجھ سکا ہوں، اسے میں نے آئندہ صفحات میں پیش کر دیا ہے۔ اگرچہ قرآن فہمی کا معاملہ کچھ ایسا ہی ہے کہ

در رو عشقِ نشد کس بِ یقینِ محِرم راز

ہر کے بر حسبِ فہم گمانے دارو

تفسیر البلاغ کی پہلی جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کام کو مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، ہماری خطاؤں سے درگزر کرے۔ جس مقصد کے لیے یہ کاوش کی گئی ہے، وہ پورا ہو۔ لوگ اس سے مستفید ہوں اور یہ میرے لیے آخرت میں مغفرت کا ذریعہ بن جائے۔ آمین!

وَمَا تَوْفِيقٌ إِلَّا بِاللَّهِ، عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُرْبِيْ

والسلام

محمد رفیق عنہ

2 جنوری 2013ء مطابق 19 صفر 1434ھ



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

”شروع اللہ کے نام سے، جو بڑی رحمت والا اور ہمیشہ رحمت کرنے والا ہے۔“

الفاظ کی تحقیق:

بِسْمُ: یہ 'ب' اور 'سم' کا مرکب ہے۔ اسم کے معنی نام کے ہیں۔ اس کی جمع آسماء آتی ہے۔
اللّٰہ: اس کے معنی ”خاص معبوڈ“ کے ہیں، جو ساری کائنات کا خالق اور مالک ہے۔ اللہ اسم ذات ہے اور باقی تمام اسمائے حسنی اس کے صفاتی نام ہیں۔ جیسے: رازق، قادر، رحیم وغیرہ۔ یاد رہے کہ کسی مخلوق کے لیے اللہ کا لفظ استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ: یہ دونوں الفاظ ”رحم“ اور ”رحمة“ سے بنے ہیں جس کے معنی ہیں: نرمی اور رقت کا ایسا جذبہ جس سے کسی دوسرے کے لیے بھلائی اور شفقت کا ارادہ جوش میں آجائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ لفظ ”رحمة“ میں محبت، شفقت، مہربانی اور فضل و احسان کا جامع مفہوم پایا جاتا ہے۔

الرَّحْمٰنُ اور الرَّحِيْمُ کے معنی ایک دوسرے کے قریب قریب ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی دو الگ الگ صفات کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ دونوں اسمائے حسنی میں سے ہیں اور اللہ سُبْحٰنَہُ کی رحمت کے دو مختلف پہلوؤں کو واضح کرتے ہیں۔
 رحمان فعلان کے وزن پر ہے اور **الرَّحْمٰنُ** کے معنی ہیں، وہ ذات جس میں رحمت ہی رحمت ہے، رحمت کا جوش و خروش ہے، رحمت کی فراوانی ہے، جس کے پاس رحمت کے بے پناہ خزانے ہیں، جس کی رحمت کا کوئی ٹھکانہ نہیں، وہ بے پایا اور لا محدود ہے۔ یہ لفظ گویا اللہ تعالیٰ کی صفاتی حیثیت کو نمایاں کرتا ہے۔

رَحِيْمُ فَعِيْلُ کے وزن پر ہے۔ اس کے معنی اس ذات کے ہیں جو اپنی تمام مخلوقات پر ہمیشہ رحمت کرتی ہے اور کرتی رہے گی۔ اس کی رحمت میں بیشگی اور دوام ہے۔ اس کی رحمت کا فیضان کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ اس طرح **الرَّحِيْمُ** کا لفظ اللہ تعالیٰ کی فعلی حیثیت کو ظاہر کرتا ہے۔

جو لوگ **الرَّحْمٰنُ** کے بعد **الرَّحِيْمُ** کی صفت کو بعض مبالغے، تاکید، یا برائے بیت کے معنوں میں لیتے ہیں، ان کی رائے عربیت کے خلاف ہے۔

الرَّحْمٰنُ کے ساتھ **الرَّحِيْمُ** کی صفت لا کر رحمت خداوندی کے جامع تصور کو اُجاگر کیا گیا ہے کہ اللہ وہ ہستی ہے، جس میں نہ صرف رحمت کا جوش اور خزانہ پایا جاتا ہے، بلکہ وہ ہر لمحہ اپنی یہ رحمت دوسروں پر کرتی رہتی ہے۔ اس طرح **الرَّحْمٰنُ** کے بعد **الرَّحِيْمُ** کی صفت نے گویا پہلی صفت کے لیے دلیل بھی مہیا کر دی کہ جو لوگ **الرَّحْمٰنُ** کی ان دیکھی صفت کا تصور رہن میں لٹا چاہیں، وہ اس کی صفت **الرَّحِيْمُ** کی کارفرمائی کا نظارہ کر لیں، جس کے آثار و مظاہر ان کے

چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ رحمان کا لفظ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس کے سوا کسی اور کے لیے اس کا استعمال درست نہیں ہے۔

نظاہر و شواہد (PRECEDENTS):

قرآن مجید میں درج ذیل مقامات پر بسم اللہ کا مضمون آیا ہے:

(1) ﴿إِنَّهُ مِنْ سُلَيْمَنَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾ (النمل: 27)

”بے شک یہ سلیمان کی طرف سے ہے اور یہ ہے بسم اللہ الرحمن الرحيم۔“

(2) ﴿وَقَالَ ارْكُبُوا فِيهَا بِسْمِ اللَّهِ مَجْرِيَهَا وَمُرْسَهَا طَإِنَّ رَبِّي لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (ہود: 11)

(41:11)

”اور اس (نوح غلیل) نے کہا: کشتی میں سوار ہو جاؤ، اللہ کے نام سے اس کا چلنا اور اللہ کے نام سے اس کا رکنا ہے۔ بے شک میر ارب بخششے والا مہربان ہے۔“

تعمیہ اور قرآن:

تعمیہ کے بارے میں سب کا اتفاق ہے کہ یہ قرآن کا حصہ اور اس کا جزء ہے۔ لیکن بعض اسے صرف سورہ الفاتحہ کی ایک آیت مانتے ہیں۔ بعض نے اسے ہر سورت کا جزء اور اس کی ایک ابتدائی آیت مانا ہے۔ بعض کے نزدیک یہ سورہ الفاتحہ سمیت کسی بھی سورت کی آیت نہیں ہے بلکہ صرف سورتوں کی ابتداء اور اختتام کو ظاہر کرنے اور ان کے درمیان فصل (الگ الگ کرنے) کے لیے آئی ہے۔

ہماری رائے میں ان تینوں میں سے آخری قول کو ترجیح حاصل ہے، جس کے حق میں صرف یہی دلیل کافی ہے کہ جس عبارت کے قرآن ہونے یا نہ ہونے کا اختلاف پایا جائے، اسے قرآن کا حصہ یا جزو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ قرآن کا متن اور اس کی ترتیب امت کے تواتر اور اجماع علمی کے ذریعے یقینی ہے اور اس میں کسی اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کے علاوہ بعض صحیح احادیث میں بھی جہاں سورہ الفاتحہ کا ذکر آیا ہے، وہاں بسم اللہ موجود نہیں ہے۔ (لاحظہ ہو، صحیح بخاری، رقم: 4474، صحیح مسلم، رقم: 1457، ناسی، رقم: 910، ابو داود، رقم: 821)

تفسیر:

”بسم اللہ کو تعمیہ اور بسمہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے آغاز میں ”میں شروع کرتا / کرتی ہوں“ کا مضمون مخدوف ہے، جسے ترجیح میں کھول دینا چاہیے۔

قرآن کے نزول سے پہلے عرب مشرکین میں یہ روان تھا کہ وہ اپنے کاموں کا آغاز بتوں کا نام لے کر کیا کرتے تھے تاکہ برکت حاصل ہو۔ جیسے بِاسْمِ اللَّاتِ (لات کے نام سے) اور بِاسْمِ الْعَزِيزِ (عزیزی کے نام سے) وغیرہ۔

بعض دوسری بت پرست قوموں میں بھی ایسا روانج موجود تھا، یہاں تک کہ بعض قومیں اپنے بادشاہوں (KING) GODS کا نام لے کر اپنے کام شروع کرتی تھیں، تاکہ اس طرح ان کی برکت اور خوشنودی حاصل کی جائے۔ قرآن میں ہے کہ جب مصر کے جادوگروں نے مویں علیلۃ اللہ سے مقابلہ شروع کیا تو پہلے فرعون کا نام اسی مقصد کے لیے لیا تھا۔

﴿فَالْقُوَا حِبَّالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ إِنَّا لَنَعْنَعُ الْغَالِبُونَ﴾

(الشعراء: 26)

”پھر انہوں (جادوگروں) نے اپنی رسیاں اور لاثمیاں ڈالیں اور کہا: عزت ماب فرعون کی قسم! ہم غالب رہیں گے۔“

پھر چونکہ قرآن مجید ہر قسم کے شرک کا مخالف ہے اور اسے ہر حال میں ختم کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے اس نے اس عالمگیر مشرکانہ رسم کے خاتمے کے لیے بسم اللہ کا طریقہ سمجھایا تاکہ لوگوں کے دلوں میں یہ عقیدہ پختہ کیا جائے کہ برکت صرف اللہ تعالیٰ سے حاصل کرنی چاہیے اور ہر کام میں صرف اسی کی رضا اور خوشنودی پیش نظر رکھنی چاہیے۔

ہر یک اور اہم کام کا آغاز بسم اللہ سے کرنا انبیاء کے کرام کا طریقہ رہا ہے۔ جب نوح علیہ السلام کی قوم پر پانی کا عذاب آیا، تو حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے مومن ساتھیوں کو کشتی میں سوار کراتے وقت بسم اللہ پڑھی تھی۔ (ہود: 41:11)۔ سیدنا سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا (بیت المقدس) کو جو دعویٰ خاط بھیجا تھا، اس خط کی پیشانی پر بھی بسم اللہ لکھی تھی (النمل: 30:27)۔ جب حضرت محمد ﷺ پر وحی کا آغاز ہوا تو اس کی ابتداء میں بھی حضور ﷺ کو رب کا نام لے کر قرآن پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ (العلق: 96: 1 تا 3)

یہ اسلامی شعائر میں سے ہے کہ ہر جائز، یک، م مشروع اور اہم کام کا آغاز بسم اللہ سے کیا جائے۔ اس سے ایک مسلمان کی پہچان ہوتی ہے اور کام میں برکت ہوتی ہے۔ ایسا کرنا نبویوں کی سنت بھی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے مختلف بادشاہوں اور حکمرانوں کو جو دعویٰ تبلیغ خطوط بھیجے، ان کے شروع میں بھی بسم اللہ لکھی گئی تھی۔

تسمیہ سے کام کے آغاز میں حکمتیں:

تسمیہ سے کام کا آغاز کرنے میں کئی حکمتیں ہیں، جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

1۔ ﴿إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى كَيْمَكَ لِلْحُكْمِ﴾۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿إِقْرَأْ أَبْسِمْ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ﴾

”پڑھو، اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔“

گویا وحی الہی کا سب سے پہلا حکم اور سب سے پہلا تعلیم بسم اللہ ہے۔

2۔ **بسم اللہ ایک دعا ہے جو اللہ تعالیٰ سے مانگی جاتی ہے، اور چونکہ ہر دعا عبادت ہے اس لیے بسم اللہ پڑھنے سے عبادت کا ثواب ملتا ہے۔**

- 3۔ بسم اللہ سے کام کی ابتدا کر کے بندہ اپنی ذات کی نفع کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات کا اثبات کرتا ہے کہ وہ یہ کام اپنی خواہش نفس کو پورا کرنے کے لیے نہیں کر رہا، بلکہ اس کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ بندہ صرف نیک کام ہی انجام دینے کی کوشش کرے گا، اور برے کاموں سے بچے گا۔
- 4۔ تسبید کے ذریعے مومن اپنے رب کے آگے اپنی عاجزی کا اظہار کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اسے ہر نیک کام کرنے کی توفیق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتی ہے۔ خود بندے کا اپنا کوئی کمال نہیں ہے، بلکہ وہ تو اس کام کو سرانجام دینے کی طاقت ہی نہیں رکھتا، اس لیے وہ اپنے رب سے مدد مانگتا ہے۔
- 5۔ تسبید سے کام کی ابتدا کے نتیجے میں برکت بھی حاصل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد اور اس کا فضل و کرم بندے کے شامل حال ہو جاتا ہے۔

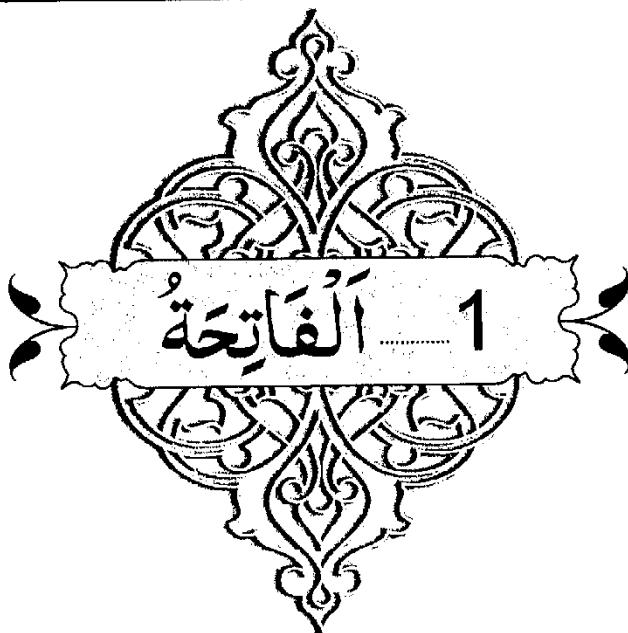
سنن ابن ماجہ میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

(کُلُّ أَمْرٍ ذُرْ بَالِ لَا يُدْعَءُ فِيهِ بِالْحَمْدِ، أَقْطَعُ) (ابن ماجہ، رقم: 1894)

”ہر اہم کام جو اللہ کی حمد کے بغیر کیا جائے، وہ ناقص اور بے برکت ہے۔“

- 6۔ قرآن کی سورتوں کے شروع میں بسم اللہ آنے کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے یہ حقیقت ظاہر کی گئی کہ آگے آنے والے تمام احکامات اور تعلیمات صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، کسی اور کی طرف سے نہیں ہیں، نہ یہ نبی کریم ﷺ کا کلام ہے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اور اسی کا کلام ہے۔ اس کی پیروی میں لوگوں کے لیے برکت و سعادت ہے اور اس میں ان کے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائی اور کامیابی ہے۔
اسوس آج بہت سے مسلمان، جہاں دوسرے اسلامی شعائر سے غافل ہو چکے ہیں، وہاں وہ بسم اللہ پڑھ کر اور دائیں ہاتھ سے کام شروع کرنے کے اسلامی طریقے کو بھی بھولے ہوئے ہیں۔ اس طرح انہوں نے اپنے آپ کو ایک عظیم برکت و سعادت سے محروم کر رکھا ہے۔





سورت کا نام:

اس سورت کے کئی نام ہیں۔ سب سے زیادہ مشہور نام الفاتحہ ہے، جو اصل میں فَاتِحَةُ الْكِتَابِ یعنی کتاب کا آغاز، قرآن کی ابتداء تھا۔ (صحیح بخاری، رقم: 756) پھر منحصر ہوا کہ الفاتحہ رہ گیا۔

اس سورت کے اور نام بھی آئے ہیں، جو اس کی بعض خصوصیات کو ظاہر کرتے ہیں جیسے: الحمد، سورۃ الصلوۃ (نماز والی سورت)، سبع مثانی (نماز میں سات دہرائی جانے والی آیتیں)، اساس القرآن (قرآن کی بنیاد)، ام القرآن (قرآن کے مضامین کی جامع)، ام الکتاب (اللہ کی کتاب کی جامع)، سورۃ الدعا، اور سورۃ الشفا وغیرہ۔

زمانہ نزول:

یہ سورت جس طرح قرآن کی ترتیب میں سب سے پہلی ہے، اسی طرح نزولی ترتیب کے لحاظ سے بھی یہ سب سے پہلی سورت ہے۔ اگرچہ بعض مفسرین نے اسے مدنی کہا ہے اور بعض اسے یک وقت کی اور مدنی مانتے ہیں، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ کلی سورت ہے۔ اس کے کمی ہونے کی بالکل واضح اور قطعی دلیل خود قرآن میں موجود ہے۔ سورۃ الحجر جس کے کمی ہونے پر سب کا اتفاق ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَقَدْ أَتَيْنَاكَ سَبِيعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ﴾ (الحجر 15:87)

”اور ہم نے آپ کو سات (7) دہرائی جانے والی آیتیں عطا کی ہیں، جو قرآن عظیم (کا حصہ)

پھر صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ ”سین مثنی“ سے سورہ الفاتحہ مراد ہے۔ (صحیح بخاری، رقم: 4474۔ صحیح مسلم، رقم: 1457) اور اسی پر اجماع امت ہے۔ لہذا سورہ الحجر، جس کے کلی ہونے پر سب متفق ہیں، اس میں سورہ الفاتحہ کا ذکر آگیا تو پھر اس سورت کے کلی ہونے میں کوئی شبہ باقی نہ رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سورت بالکل ابتدائی کلی دور میں نازل ہوئی۔ آثار و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلی نازل ہونے والی مکمل سورت یہی ہے۔ اس سے پہلے کچھ متفرق اور تمهیدی آیات نازل ہو چکی تھیں جو سورہ العلق، سورہ المزمل اور سورہ المدثر میں شامل ہیں۔

اس کے علاوہ اس سورت کو سورۃ الصلوۃ (نماز والی سورت) بھی کہا گیا ہے اور واقعہ معراج کے موقع پر پانچ نمازوں کے فرض ہونے سے بہت پہلے نماز فرض ہو چکی تھی، جس کا حکم ان ابتدائی سورتوں میں موجود ہے، جو واقعہ معراج سے پہلے نازل ہوئی تھیں، جیسے سورہ المزمل کی ابتدائی آیات اور سورہ الکوثر کہ جس میں نماز کا حکم موجود ہے۔ اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ابتدائی کلی دور میں نماز فرض ہونے سے پہلے پوری سورہ الفاتحہ نازل کی گئی تھی، تاکہ اسے نمازوں میں پڑھا جا سکے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو الفاتحہ ہی ایسی سورت ہے جو سب سے پہلے مکمل طور پر نازل ہوئی۔

مرکزی مضمون:

اس سورت کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی حمد و شانیابان ہوئی ہے۔ پھر اس کی چند صفات کا ذکر ہے۔ آگے ایک آیت میں توحید کا اقرار و اظہار کرتے ہوئے اللہ اور بندے کا باہمی تعلق ظاہر کیا گیا ہے۔ آخری آیتوں میں اللہ سبحانہ سے دعا کی گئی ہے کہ وہ ہماری رہنمائی فرمائے، تاکہ ہم اس کی بتائی ہوئی راہ ہدایت..... صراط مستقیم..... پر چل کر اس کی رضا اور خوشنودی حاصل کر سکیں اور اس کے نتیجے میں دنیا اور آخرت میں کامیاب اور سر بلند ہوں۔

سورہ الفاتحہ میں اسلام کے بنیادی عقائد..... توحید، آخرت اور نبوت و رسالت کا مختصر اور اجمالی ذکر ہے، اس لیے یہ سورت پورے قرآن کی تعلیم کا خلاصہ ہے۔ گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔



رَوْعَنَها - 1

سُورَةُ الْفَاتِحَةُ مَكْيَّةٌ ۖ ۱

آيَاتُهَا - 7

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝ مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ ۝
 إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۝ [إِهْدَان] الصَّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ صَرَاطَ
 الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝

”شروع اللہ کے نام سے جو براہم بریان اور نہایت رحم والا ہے۔“

”تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا رب ہے۔ براہم بریان، نہایت رحم والا اور بدالے کے دن کا مالک ہے۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہمیں سیدھے راست پر چلا۔ ان لوگوں کے راستے پر جن پرتو نے انعام فرمایا۔ نہ ان کے جن پر تیرا غصب نازل ہوا اور نہ ان کے جو گمراہ ہوئے۔“

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝ مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ ۝﴾
 الحمد:.....عربی زبان میں حمد کے اصل معنی ”ثاء، جیل“، ہیں، جس کا مطلب ہے ”کسی کی کوئی خوبی یا اچھائی بیان کرنا“، اس کی تعریف کرنا۔ لیکن حمد کے معنی شکر کے بھی آتے ہیں۔ اگرچہ شکر خود عربی زبان ہی کا لفظ ہے۔
 قرآن میں حمد کا لفظ دونوں معنوں میں آیا ہے۔ تعریف اور خوبی کے معنوں میں بھی اور شکر کے معنوں میں بھی۔
 لیکن اس کے استعمال میں فرق ہوتا ہے۔ جس مقام پر یہ اللہ سبحانہ کی قدرت اور عظمت کو ظاہر کرتا ہے، وہاں حمد کے معنی تعریف اور خوبی کے ہوتے ہیں اور جہاں حمد کے بعد کسی نعمت کا ذکر آتا ہے، وہاں اس کے معنی شکر کے ہوتے ہیں۔
 مثال کے طور پر سورہ الانعام کے شروع میں حمد کا لفظ تعریف اور خوبی کے معنوں میں آیا ہے، کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اظہار ہے۔

www.KitaboSunnat.com

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمَيْتِ وَالنُّورَ﴾ (الانعام 1:6)

”تعریف اس اللہ کے لیے ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا اور انہیروں اور روشنی کو بنایا۔“
 اسی طرح ایک صحیح حدیث میں اسی آیت کے لفظ حمد کے معنی حَمَدَنِي عَبْدِي ”میرے بندے نے میری تعریف کی۔“ آئے ہیں، یہ نہیں آئے کہ شَكَرَنِي عَبْدِي ”کہ میرے بندے نے میرا شکر کیا۔“ (صحیح مسلم،

رقم: 878، نسائي، رقم: (910)

اسی طرح شکر کے معنوں میں حمد کا لفظ سورہ ابراہیم میں آیا ہے، کیونکہ اس کے فوراً بعد ایک نعمت کا ذکر ہے:

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَهَبَ لِنَا عَلَى الْكِبِيرِ إِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ﴾ (ابراهیم، 14:39)

”شکر ہے، اُس اللہ کا جس نے مجھے بڑھاپے کے باوجود اس اعلیٰ اور اسحاق (دو بیٹے) عطا فرمائے۔“

یا جیسے ایک مسنون دعائیں ہے کہ:

((الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ)) (ابو داؤد، رقم: 3850)

”شکر ہے اللہ کا جس نے ہمیں کھلایا، پلایا اور مسلمانوں میں سے بنایا۔“

تو اس دعائیں چونکہ نعمتوں کا ذکر ہے، اس لیے اس میں حمد کے معنی شکر کے لیے جائیں گے۔

لیکن سورہ فاتحہ میں حمد کا لفظ تعریف اور خوبی کے معنوں میں آیا ہے، کیونکہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کا ذکر

تو ہے مگر کسی نعمت کا ذکر یا قرینہ نہیں آیا ہے۔ لہذا اس جگہ حمد کے معنی شکر کے نہیں ہو سکتے۔

رب:عربی زبان میں ”رب“ کے معنی ہیں: پالنے والا، پرورش کرنے والا، مالک اور آقا۔

ملائق کے لیے یہ ربویت اور پالنا جسمانی طور پر بھی ہے اور عقلیٰ و روحانی طور پر بھی۔ اس میں کسی چیز کو پال کر، اس کی صحیح پرورش کر کے، اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا مفہوم بھی شامل ہے۔ یہ لفظ جہاں اکیلا آتا ہے، وہاں یہ غیر اللہ اور مخلوقات کے لیے بھی آ جاتا ہے، اُس وقت اس کے معنی مالک اور آقا کے ہوتے ہیں، جیسے ربُ الدَّارِ (گھر کا مالک)۔

الْعَالَمُینَ: یہ الْعَالَمُ (عَالِمٌ) کی جمع سالم نہ کر ہے، جس کے معنی ہیں، جہاں، دنیا، مخلوقات، کائنات۔

اس کے علاوہ یہ لفظ ہر اس مخلوق کے لیے بھی آتا ہے، جو علم و شور رکھتی ہے، جیسے انسان، جن اور فرشتے۔ کسی ایک زمانے کے لوگوں کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے پھر اس سے ہر وہ چیز بھی مراد ہو سکتی ہے جو اپنے خالق کا پتہ دیتی ہے،

جبیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

وَ فِي كُلِّ شَيْءٍ لَهُ أَيْةٌ
تَدْلُّ عَلَى أَنَّهُ وَاحِدٌ

”اور ہر شے میں اللہ کی نشانی موجود ہے، جو اس بات کا پتہ دیتی ہے، کہ وہ ذات ایک ہی ہے۔“

الْهَدَارَبُ الْعَالَمِيَّنَ کے معنی ہیں، وہ ذات جو سارے جہانوں کی بلکہ ہر شے کی پرورش کرنے والی اور اس کی مالک ہے۔

الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ: ان الفاظ کی تحقیق بسم اللہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

مُلِّیک: اس کے معنی ذُو مِلْک کے ہیں جس کا مطلب ہے: آقا، مالک، صاحب تصرف اور با اختیار۔

اس لفظ کی مشہور قراءت ملک (مالک) ہے لیکن ایک اور متواتر قراءت میں اسے ملک بھی پڑھا جاتا ہے۔ تاہم دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔

یوْمٌ: عربی زبان میں اس لفظ کے معنی ہیں: دن، دن رات، مرحلہ (EVENT) اور واقعہ (PERIOD)۔ سورہ الفاتحہ میں یوْم سے مراد قیامت یا آخرت کا دن ہے۔ اس لفظ کی جمع آیام آتی ہے۔

آلِّيَّنِ: ”جِنْ“ کا لفظ مصدر ہے اور قرآن میں یہ چار مختلف معنوں میں آیا ہے۔

۱۔ بدله، حساب اور جزا اوسرا کے معنوں میں، جیسے:

﴿يَوْمَئِذٍ يُوَفَّيْهُمُ اللَّهُ دِينَهُمُ الْعَقْدُ﴾

”اس دن اللہ ان کے کاموں کا انہیں پورا پورا بدله دے گا۔“

۲۔ اطاعت اور فرمان برداری کے معنوں میں، جیسے:

﴿أَلَا لِلَّهِ الَّذِينَ الْخَالِصُونُ﴾

”یاد رکھو، اللہ ہی کے لیے خالص اطاعت ہے۔“

۳۔ قانون یا مکمل قانون (LAW OF THE LAND) کے معنوں میں، جیسے:

﴿كَذَلِكَ كَذَلِكَ لِيُوْسُفَ طَمَّا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ طَهِ﴾

(یوسف 12:12)

”اس طرح ہم نے یوسف کے لیے تدبیر کی۔ (ورنه) بادشاہ کے قانون کی رو سے وہ اپنے بھائی کو نہیں لے سکتا تھا، مگر جو اللہ چاہے۔“

۴۔ ضابطہ حیات (CODE OF LIFE) یا نظامِ زندگی کے معنوں میں:

﴿إِنَّ الَّذِينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ هُمْ﴾

(آل عمران 19:3)

”بے شک اللہ کے نزدیک سچا دین صرف اسلام ہے۔“

سورہ الفاتحہ میں **آلِّيَّنِ** کا لفظ اپنے پہلے معنوں میں آیا ہے، یعنی بدله اور جزا اوسرا کے معنی میں۔

خلاصہ مضمون:

سورہ الفاتحہ کی ان ابتدائی آیتوں میں اللہ سبحانہ کی تعریف اور حمد و شکار کا بیان ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی چار صفات..... رب، رحمان، رحیم اور مالک کا ذکر آیا ہے، جو کہ اسمائے حسنی میں سے ہیں۔ اس کے علاوہ ان آیات میں توحید اور آخرت کے عقیدوں کا مضمون آگیا ہے۔

۴۔ آیات کی تفسیر:

الْعَتَدُ لِلَّهِ: سورہ الفاتحہ کی ابتداء اللہ تعالیٰ کی حمد و شکار اس کی چند صفات سے ہوتی ہے۔ فطری طور پر جب

کوئی انسان حق کی تلاش میں (IN SEARCH OF TRUTH) لٹکے گا تو اسے سب سے پہلے یہ حقیقت معلوم ہو گی کہ اس کو اور اس کے ارد گرد دنیا کی تمام چیزوں کو کسی خالق نے پیدا کیا ہے۔ پھر وہ غور کرے گا کہ جب تخلیق (CREATION) موجود ہے تو اس کا کوئی خالق (CREATOR) بھی موجود ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ دنیا میں ہم کسی مخلوق کی جو تعریف کرتے اور خوبی بیان کرتے ہیں، تو وہ اصل میں خالق ہی کے لیے تعریف اور خوبی بیان کرتے ہیں، جس نے ہر مخلوق کو پیدا فرمایا ہے۔

الْحَمْدُ لِلّٰهِ کے الفاظ میں تمام تعریفیں، خوبیاں اور کمالات صرف ایک اللہ کی ذات میں جمع ہونے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ وہ ذات جس کی حمد و ثناء ہر وقت ہوتی ہے، صحیح کو بھی اور شام کو بھی، جس کی تحمید ہر جگہ ہوتی ہے، آسمانوں پر بھی اور زمین پر بھی۔

رَبُّ الْعَالَمِينَ: یہ اللہ تعالیٰ کی پہلی صفت بیان ہوئی ہے کہ وہ رب العالمین ہے۔ سارے جہانوں کا پالنے والا اور ساری کائنات کا مالک و مختار ہے۔

پچھے کی پروردش تو والدین بھی کرتے ہیں، مگر یہ رو بیت نہیں ہے۔ رو بیت کے معنی ہیں: ”کسی چیز کو جس وقت، جتنی اور جیسی کچھ ضرورت ہو، وہ اسے مہیا کر دینا تاکہ اس کی پروردش کی ہر طرح تکمیل ہو جائے۔“ اور یہ کام اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور نہیں کر سکتا، اس لیے کوئی اور رب نہیں ہو سکتا۔

الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ: اس کی قصیر بسم اللہ کی تفسیر میں پہلے گزر چکی ہے۔

مُلِكُ يَوْمِ الدِّينِ: یہ سورہ الفاتحہ میں اللہ تعالیٰ کی چوتھی اور آخری صفت بیان ہوئی ہے کہ وہ بد لے کے دن کا مالک ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں آج ہر کام کا بدلہ نہیں مل رہا لیکن خالق کائنات نے لوگوں کے اچھے برے اعمال کا پورا پورا بدلہ دینے کے لیے آخرت کا دن مقرر کر رکھا ہے۔

اس دنیا میں بھی اگرچہ انسان کو اس کے بعض نیک اعمال کا کچھ بدلہ مل جاتا ہے جو عام طور پر صحیح و تندرنی، امن و سلامتی، دل کے سکون و اطمینان اور نیکی کی توفیق کی صورت میں ہو سکتا ہے۔ اسی طرح بندے کو اس کی کسی برائی یا گناہ کی کچھ نہ کچھ سزا دنیا ہی میں مل جاتی ہے جو بعض اوقات بیماری، مصیبت، پریشانی اور بری صحبت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

سورہ الفاتحہ میں پہلے **الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ** کے الفاظ سے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور نرمی کو تمیاں کیا گیا اور پھر **مُلِكُ يَوْمِ الدِّينِ** کہہ کر اللہ سمجھانے نے اپنے عدل و انصاف اور قانون کی سختی کو ظاہر فرمایا ہے۔ ترغیب و ترهیب کا یہ قرآنی اسلوب ہے جس کی مثالیں قرآن مجید میں جا بجا ملتی ہیں، جیسے ارشاد ہوا کہ:

﴿نَّبِيٌّ عَبَادَىٰ إِنَّى أَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۝ وَأَنَّ عَذَابِيُّ هُوَ الْعَذَابُ الْأَلِيمُ ۝﴾
(الحجر 50,49:15)

”میرے بندوں کو آگاہ کر دیجئے کہ میں بخشنے والا ہربان ہوں، مگر میرا عذاب بڑا اور دنک عذاب ہے۔“
اس کے علاوہ ثواب کے ساتھ عذاب کا اور جنت کے ساتھ دوزخ کے ذکر کا قرآنی اسلوب بھی عام ہے۔

﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ﴾

”هم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تمھی سے مدد مانگتے ہیں۔“

الفاظ کی تحقیق:

نَعْبُدُ:..... یہ عبادۃ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ”خشوع و خضوع سے جھکنا۔“

گویا دل میں کسی کی عظمت اور بڑائی تسلیم کرتے ہوئے امید یا خوف سے اس کے آگے اس خیال سے جھکنا کہ اس کے پاس کوئی ایسی غیبی طاقت ہے، جو انسانی عقل میں نہیں آ سکتی۔ عبادت کی روح یہی ہے۔ اردو زبان میں عبادت کو بندگی، پستش اور پوجا پاٹ کے الفاظ سے ادا کیا جاتا ہے۔

نَسْتَعِينُ:..... یہ إِسْتِغْاثَة سے ہے جس کا مطلب ہے ”کسی سے ایسے کام میں مدد مانگنا جسے ظاہری اسباب و وسائل کے ذریعے پورا کرنا ممکن نہ ہو۔“ گویا کسی غیبی اور روحانی طاقت سے مدد طلب کرنا ”استغاثت“ ہے۔

آیت کی تفسیر:

اس آیت میں اللہ اور بندے کے باہمی تعلق کو واضح کیا گیا ہے۔ یہ تعلق خالق اور مخلوق کا ہے۔ معبد اور عابد کا ہے اور مُسْتَعِنٌ ”جس سے مدد مانگی جائے۔“ اور مُسْتَعِيْنُ ”مدد مانگنے والا“ کا ہے۔

بندے کا کام ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی کرنا ہے۔ قرآن نے جنوں اور انسانوں کے پیدائیے جانے کا مقصد یہ بتایا ہے کہ وہ ایک اللہ کی عبادت کریں:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (الذاريات 56:51)

”اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔“

اسلام میں عبادت صرف اللہ کا حق ہے اور اس کے سوا کسی اور کی عبادت جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَقَضَى رَبُكَ إِلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ﴾ (بنی اسرائیل 23:17)

”اور تیرے رب نے فیصلہ فرمادیا کہ تم اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو۔“

پھر ایا ک کو نَعْبُدُ کے بعد لانے کی بجائے پہلے لایا گیا، تاکہ یہ حقیقت ظاہر ہو کہ اصل عبادت وہ ہے جو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہو اور دوسری ہر عبادت جو غیر اللہ کے لیے ہو، یا اللہ کی عبادت کے ساتھ ملا کر ہو۔ وہ محض شرک اور گمراہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے عبادت کی ہر شکل مثلاً سجدہ، دعا، توکل، استغفار، نذر اور قربانی وغیرہ کو صرف اللہ تعالیٰ

کے ساتھ مخصوص کر دیا کیونکہ توحید کا بھی تقاضا تھا۔

سورہ الفاتحہ اکیلا شخص بھی پڑھتا ہے اور اسے باجماعت نماز میں بھی پڑھا جاتا ہے۔ نَعْبُدُ میں جمع کا صیغہ لانے میں یہ لکھتے ہیں، کہ بندہ یہ نہ سمجھے کہ اس دنیا میں صرف وہی اللہ کی عبادت کرتا ہے کیونکہ ایسا سمجھنا اس میں غرور اور تکبیر پیدا ہونے کا باعث بن سکتا تھا جو کہ ناپسندیدہ چیز ہے۔ اس جگہ جمع کے صینے نے انسان کے دل میں عاجزی اور افساری کا جذبہ پیدا کر دیا ہے کہ اکیلا وہ نہیں بلکہ یہ شمار لوگ ہیں جو اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔

مزید فرمایا: وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ "کہ ہم صرف تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔" اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ غنی اور بے نیاز ہے اور سب لوگ اس کے محتاج اور اس کے در کے سوالی ہیں:

(إِيَّاهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْعَوِيدُ) (الفاطر 35:15)

"اے لوگو! تم اللہ کے محتاج ہو اور اللہ بے نیاز اور تعریف کے لائق ہے۔"

پھر **إِيَّاكَ** کے ذریعے جتنی تاکید اس کی ہوئی کہ عبادت صرف اللہ کے لیے ہے اور اسی کا حق ہے، بالکل اتنی ہی تاکید اس بات پر ہوئی کہ استغانت یعنی مدد مانگنا بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ غیر اللہ سے مدد مانگنی جائز نہیں ہے اور اس غیر اللہ میں اللہ تعالیٰ کی ہر مخلوق شامل ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ استغانت بھی ایک طرح کی عبادت ہے اور کوئی عبادت جائز نہیں ہو سکتی جو کسی مخلوق کے لیے کی جائے۔

پھر یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ لفظ استغانت سے مراد وہ مدد نہیں ہے جو اساباب و وسائل کے ذریعے ہم ایک دوسرے کے لیے کرتے ہیں۔ ظاہری اساباب کے ذریعے ایسی مدد کرنا تو حید کے خلاف نہیں ہے اور یہ جائز ہے۔ مثال کے طور پر کوئی شخص کسی سے پانی مانگ کر پی لے، یا کوئی مریض کسی داکڑیا طبیب سے علاج کرنے میں مدد لے تو ایسی مدد یا اور مدد کرنا دونوں جائز ہیں، کیونکہ ان میں مادی اساباب و وسائل کا عمل دخل ہے اور یہ درست ہے اور نیکی کا کام بھی ہے۔

لیکن اگر اللہ کے سوا کسی مخلوق سے اس تصور کے ساتھ مدد مانگی جائے کہ وہ کوئی آن دیکھی قوت و طاقت رکھتی ہے اور بغیر مادی وسائل و اساباب کے غیری اور روحانی طور پر ہماری مدد کر سکتی ہے تو یہ استغانت (مدد مانگنا) ہے اور یہ شرک اور حرام ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے سوا کسی اور سے دعا نہیں کی جاسکتی۔ اس کے سوا کوئی حاجت روا اور مشکل کشانہیں ہے۔ اس کے سوا کوئی مرادیں پوری کرنے والانہیں۔ اس کے سوا کوئی اولاد دینے والانہیں اور اس کے سوا کوئی بگڑی بنانے والانہیں۔

افسوں! آج بہت سے مسلمان اپنی نمازوں میں سورہ الفاتحہ کی یہ آیت بھی پڑھتے ہیں اور غیر اللہ کی پوجا بھی کرتے ہیں، اسے اپنا مشکل کشانہ سمجھتے ہیں اور اس سے استغانت طلب کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے ایمان کو شرک سے آلوہہ کر

دیتے ہیں۔ قرآن نے ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا ہے کہ:

﴿وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ﴾ (یوسف ۱۲: ۱۰۶)

”اور ان میں سے اکثر اللہ کو بھی مانتے ہیں اور شرک بھی کرتے ہیں۔“

اگر غلط تاویلوں سے غیر اللہ سے استغاثت کو جائز قرار دے لیا جائے تو پھر غیر اللہ کی عبادت بھی جائز مانی جائے گی جو کہ شرک اور حرام ہے، کیونکہ قرآن نے استغاثت اور عبادت دونوں کو ایک ہی انداز میں صرف اللہ ہی کے ساتھ مخصوص کر کے بیان کیا ہے۔

لیکن سورہ الفاتحہ کی اس آیت نے ہر قسم کے شرک کا قلع قلع کر دیا ہے اور خالص توحید کو اجاگر کر دیا ہے کہ بنده صرف ایک اللہ کی عبادت کرے۔ ہر معاملے میں صرف اسی پر بھروسہ رکھے، اسی کو اپنا کار ساز سمجھے اور مشکل میں صرف اسی کو پکارے، کیونکہ وہی ایک ذاتِ مستعان ہے جس سے مدد مانگی چاہیے۔

﴿وَرَبُّنَا الرَّحْمَنُ الْمُسْتَعَنُ عَلَىٰ مَا تَصْفُونَ﴾ (الانیاء ۲۱: ۱۱۲)

”اور ہمارا رب رحمان اور مستعان ہے، تمہاری غلط باقتوں کے مقابلے میں ہم اسی سے مدد مانگتے ہیں۔“

وہ خود ہی کہہ رہا ہے کہ مانگو مدد مگر

إِيَّاكَ شرطِيادِ رَبِّيَ نَسْتَعِينُ کی

﴿إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ﴿صِرَاطًا الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ

عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

إِهْدِنَا: (تو ہمیں ہدایت دے)۔ یہ **ہدایۃ** (ہدایت) سے ہے، جس کے معنی ہیں راستہ دکھانا، راہ پر چلانا اور منزل تک پہنچانا۔ گویا ہدایت وہ کامل رہنمائی ہے، جس میں مادی اور روحانی ہر قسم کی رہنمائی شامل ہے۔
الصِّرَاطُ: اس کے معنی راستے کے ہیں۔

الْمُسْتَقِيمُ: یہ **إِسْتِقَامَة** سے اسم فاعل ہے۔ اس کے معنی ہیں: ”سیدھا“۔ صراطِ مستقیم کا مطلب ہے ”سیدھا راستہ“۔

أَنْعَمْتَ: یہ **إِنْعَامُ** سے ہے جس کے معنی ہیں: انعام کرنا، فضل کرنا۔

الْمَغْضُوبُ: یہ **غَضَبَ** سے اسم مفعول ہے۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے اس کے غضب کے مبتلى ہوئے۔

الْضَّالِّينَ: یہ **الضَّالُّ** کی جمع سالم ہے جس کے معنی گمراہ کے ہیں۔ اس سے وہ لوگ مراد ہیں، جن کو ہدایت

کی راہ دھکائی گئی مگر وہ اس سے بھٹک کر گمراہ ہو گئے۔
خلاصہ مضمون:

اللّٰہ تعالیٰ کی حمد و شا، اس کی چند صفات اور بندے کے ساتھ اس کے تعلق کو واضح کرنے کے بعد اب اصل مدعایاں ہوا ہے جس میں بندہ اپنے لیے اور تمام انسانوں کے لیے رب سے دعا کرتا ہے کہ وہ سب کو اس راہ حق پر چلنے کی توفیق دے جس پر اللّٰہ تعالیٰ کے نیک، پسندیدہ اور انعام یافتہ لوگ چلتے رہے۔
ان آیات میں ضمنی طور پر عقیدہ نبوت و رسالت کا ذکر بھی آ گیا کیونکہ اس کے بغیر صحیح راہ حق معلوم کرنا اور اس پر چلناممکن نہیں ہے۔

﴿إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝﴾

اس آیت میں بندہ اپنے رب کو خطاب کر کے اس سے ہدایت کی دعا کرتا ہے۔ اس سے پہلے تمہید کے طور پر اللّٰہ تعالیٰ کی حمد و شا بیان کی گئی۔ بندے اور رب کے باہمی تعلق کو ظاہر کیا گیا اور آخر میں دعا کے ذریعے اپنا عرض مدعایا گیا ہے۔ مانگنے کا یہ نہایت ہی عمده انداز اور بہترین طریقہ ہے۔
پھر صحیح کا صیغہ استعمال کر کے بندے نے اپنی دعا میں دوسروں کو بھی شامل کر لیا ہے کیوں کہ سارا جہاں ہی اللّٰہ کے در کا سوالی ہے۔

اس آیت سے لے کر سورت ختم ہونے تک جو دعا کی گئی ہے، وہی اس سورت کا اصل مضمون ہے، جس کی رو سے اس سورت کو سورۃ الدعا، یعنی دعا والی سورت کہا گیا ہے۔

بھی وہ مقام ہے جہاں سے مذہب (RELIGION) کی ابتداء ہوتی ہے اور نبوت و رسالت کی ضرورت پڑتی ہے۔ کیونکہ خود انسان اپنے لیے کوئی ایسی راول تجویز نہیں کر سکتا، جس پر چل کر وہ دنیا اور آخرت میں اپنے لیے فائدے حاصل کر سکے اور نقصان سے فتح سکے۔ بلکہ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ کس چیز میں اس کے لیے فائدہ اور کس کام میں اس کے لیے نقصان ہے۔ وہ قدم قدم پر وحی اور نبوت و رسالت کی رہنمائی کا محتاج ہے۔

اس کائنات کے خالق نے دوسری حاجتوں کی طرح انسان کی اس حاجت کو بھی پورا کر دیا اور اس کی ہدایت و رہنمائی کے لیے وحی اور نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری کر دیا۔ کیونکہ جس ہستی نے انسان کے جسم کی ضروریات پوری کرنے کا سامان پیدا فرمایا ہے، اسی ذات نے انسان کی روح کے لیے بھی غذا فراہم کر دی ہے اور اس کی رہنمائی کے لیے وہی کاظم قائم کیا ہے۔

اس مقام پر بندہ اپنے رب سے جو ہدایت مانگتا ہے، اسے اللّٰہ تعالیٰ نے وجدان، حواس، عقل اور وحی کے چار در جوں میں عطا فرمایا ہے:

وَجْدَان (INTUTION) کی ہدایت یہ ہے کہ ایک بچہ پیدا ہوتے ہی غذا کے لیے رونے لگتا ہے اور بغیر کسی کے

سکھائے ماں کی چھاتی منہ میں لے کر اسے چوستا شروع کر دیتا ہے اور اپنی غذا حاصل کر لیتا ہے۔ اس کے بعد حواس (SENSES) کا درجہ آتا ہے۔ اس درجے میں ہمیں دیکھنے، سنبھلنے، چھونے اور سو گنے کی صلاحیتیں دی گئی ہیں، جن کے ذریعے ہم اپنے سے باہر کی معلومات حاصل کرتے ہیں۔

پھر حواس کے بعد عقل کا درجہ ہے جو حواس کے ذریعے حاصل شدہ معلومات سے متاثر اخذ کر کے فیصلے کرتی ہے۔ لیکن اس کا دائرة کار (JURISDICTION) بھی محسوسات تک محدود ہے۔ یہ کبھی حواس کی طرف سے غلط معلومات (DISINFORMATION) ملنے کی وجہ سے درست فیصلے نہیں کر سکتی اور اپنی غایمیوں اور ناقص کی اصلاح کے لیے وحی کی رہنمائی کی محتاج ہے۔ اس کے علاوہ زندگی کے بعض مسائل ایسے ہیں، جن کو ہما عقل حل نہیں کر سکتی۔

آخر میں وحی (REVELATION) کی ہدایت کا درجہ ہے۔ جو ہدایت کا سب سے اعلیٰ و افضل درجہ ہے کیونکہ یہ یقین پر ہی، ہر تقضیہ و عیوب سے پاک اور ہر خامی اور کمی سے مبرأ ہے۔ اس میں حقیقت کی روشنی ہے۔ یہ سرپا حق ہے۔ اس میں انسان کے لیے مکمل ہدایت رہنمائی ہے۔ جس خالق نے انسان کو وجود ان، حواس اور عقل کی ہدایت بخشی، اُسی نے اس کی کامل رہنمائی کے لیے نبوت کے ذریعے وحی کا سلسلہ قائم کیا۔ اس کی ابتداء سب سے پہلے انسان حضرت آدم ﷺ سے کی جو اللہ کے نبی اور صاحب وحی تھے۔ پھر ہر زمانے میں ہر قوم کے لیے کوئی نہ کوئی نبی یا رسول بھیجا گیا جو لوگوں کو وحی کی ہدایت اور رہنمائی دکھاتا رہا۔ اس سلسلے کی آخری کڑی خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ ہیں، جن کی نبوت و رسالت قیامت تک کے لیے ہے۔

صراطِ مستقیم کیا ہے؟

بندہ اپنے رب سے جس صراطِ مستقیم کی ہدایت مانگتا ہے اس سے کون سی سیدھی راہ مراد ہے؟ اس سے مراد دین اسلام سے جیسا کہ فرمایا گیا:

﴿قُلْ إِنَّنِي هَدَيْتُ رَبِّي إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ دِينًا قِيمًا﴾ (الانعام: 6:162)

اس جگہ، جیسا کہ مشہور مفسر زمشیری نے لکھا ہے، دیناً قِيمًا بدل ہے صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ کا۔ گویا صراطِ مستقیم سے مراد سچ دین ہے جسے اسلام کہا جاتا ہے۔

دین اسلام کے لیے صراطِ مستقیم کی تعبیر اور تشبیہ کتنی عمدہ اور سچی ہے!

سیدھے راستے کی چند خصوصیات یہ ہیں:

- 1۔ کسی ایک نقطے یا مقام سے دوسرے نقطے یا مقام تک صرف ایک ہی سیدھا راستہ ہو سکتا ہے۔
- 2۔ سیدھے راستے کو سمجھنا آسان ہوتا ہے۔
- 3۔ سیدھے راستے کو اختیار کرنا آسان بھی ہے۔
- 4۔ سیدھے راستے پر چلنے اور منزل تک پہنچنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آتی۔

- 5۔ سیدھا راستہ فطری اور قدرتی راستہ ہوتا ہے۔
- 6۔ سیدھی راہ پر چلنے کے لیے عقل، ہدایت، روشنی اور رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ میزھے راستوں پر چلنے کے لیے ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔
- دین اسلام یہ تمام خصوصیات رکھتا ہے۔ یہ فطری بھی ہے، سچا بھی ہے، قابل فہم بھی ہے، آسان اور قابل عمل بھی ہے۔

پھر دین اسلام کے صراط مستقیم پر چلنے کے لیے ایک یاد بار دعائیں کی جاتی، بلکہ اسے بار بار نمازوں میں دھرانے کا حکم دیا گیا ہے اور اس راہ پر ہمیشہ ثابت قدم رہنے کے لیے روزانہ کم سے کم سترہ (17) بار دعا کی جاتی ہے۔

﴿صِرَاطُ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾

پہلے بھل اور محض طور پر سیدھے راستے کی ہدایت کے لیے دعا کی گئی۔ اب اسی کی وضاحت اور تفصیل کے لیے ثبت (POSITIVE) اور منفی (NEGATIVE) دونوں طرح سے پوری نشاندہی کی جا رہی ہے کہ وہ راہ ان لوگوں کی ہونی چاہیے، جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام اور فضل و کرم ہوا اور جو اس کے فرمان بردار بندوں کی راہ ہے۔ ان لوگوں کی راہ نہیں ہونی چاہیے جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا اور نہ ان کی جو گمراہ ہو گئے۔

یہ انعام یافتہ گروہ کون سا ہے؟ قرآن نے اس کی وضاحت اور پیچان کرادی ہے، کیونکہ قرآن اپنی تفسیر آپ بھی کرتا ہے۔ ((الْقُرْآنُ يُفْسِرُ بَعْضَهُ بَعْضًا))۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:

﴿وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَ الرَّسُولَ فَأُولَئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّلِحِينَ وَ حُسْنَ اُولَئِكَ رَفِيقًا﴾ (النساء 4:69)

”اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے، وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے، جن پر اللہ نے انعام کیا..... انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔ کیسی اچھی ہے ان کی رفاقت اور ہمراہی!“

اس آیت میں انبیائے کرام، صدیقین، شہداء اور صالحین..... سب کو ایک ہی انعام یافتہ گروہ کہا گیا ہے۔

﴿غَيْرُ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾ (7)

بندہ جب اپنے رب سے دعا کرتا ہے کہ وہ اسے نیک اور انعام یافتہ لوگوں کے راستے پر چلنے کی توفیق دے، تو اس کے ساتھ ہی وہ ان برے لوگوں کی راہ سے بچنے کی دعا بھی کرتا ہے جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا، یا جو گمراہ ہو گئے۔ یہ دونوں قسم کے برے لوگ کون ہیں؟ ترمذی کی ایک حدیث میں بتایا گیا ہے کہ اس سے مراد یہودی اور عیسائی تو میں ہیں۔ (ترمذی، رقم: 2954)

قرآن نے بھی یہودیوں کو مغضوب قرار دیا ہے کہ یہ وہ قوم ہے جس پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔

﴿فَبَأَءُ وَ بِغَضَبٍ عَلَى غَضَبٍ﴾ (البقرہ 2:90)

”تو ان (یہود) پر اللہ کا غضب ہی غضب ہوا۔“

اسی طرح قرآن نے نصاریٰ یعنی عیسائیوں کو گمراہ ٹھہرا�ا:

﴿وَ لَا تَتَبَعُوا أَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا مِنْ قَبْلٍ وَّ اَضَلُّوا كَثِيرًا وَّ ضَلُّوا عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ﴾
(المائدہ 5:77)

”اور ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو، جو اس سے پہلے گمراہ ہوئے، جنہوں نے دوسرا بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا اور خود سیدھی را سے بھٹک گئے تھے۔“

لیکن دنیا میں صرف یہودی قوم ہی ایسی قوم نہیں جو اللہ تعالیٰ کی مغضوب ٹھہری ہو اور نہ عیسائی ایسی قوم ہے کہ صرف وہی گمراہ ہوئی ہو۔ قرآن کے مطابق ایسی اور بھی قومیں ہو گزری ہیں اور ایسے افراد بھی تھے جو اللہ کے غضب کا شکار ہوئے اور گمراہ ٹھہرے، جن کی تفصیل سورہ ہود، 11:71، سورہ الافق، 8:16، سورہ الصافات، 37:69 تا 71 میں دیکھی جاسکتی ہے۔

دراصل حدیث کا منشاء اور مقصد بطور مثال ان قوموں کو بیان کرنا تھا، جو اس وقت کے عرب ماحول میں مغضوب کے لیے یہود اور ضالیں کے لیے نصاریٰ، دو انتہائی موزوں اور سامنے کی مثالیں تھیں۔

عربیت کی رو سے یہ مطلب بھی درست ہے کہ **الَّذِينَ اعْمَلُوا عَلَيْهِمْ اُولَئِكَ هُمُ الْمَغْضُوبُونَ** اور **الظَّالِمُونَ** کے ایک ہی گروہ یا جماعت مراد لے لی جائے اور یہ مفہوم لیا جائے کہ ان لوگوں کے راستے پر چلنے کی دعا کی گئی ہے جن پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور انعام ہوا، جن پر اللہ کا غضب نازل نہیں ہوا اور جو گمراہ نہیں ہوئے۔

5۔ سورہ الفاتحہ کے فضائل:

صحیح احادیث میں سورہ الفاتحہ کے کئی فضائل بیان ہوئے ہیں، جیسے:

1۔ حضرت ابو سعید خدري رضی اللہ عنہ سے ایک متفق علیہ حدیث مروی ہے، جس میں نبی ﷺ نے سورہ الفاتحہ کو قرآن کی سب سے زیادہ عظمت والی سورت قرار دیا، اسے سبع مثانی اور قرآن عظیم (کا حصہ) قرار دیا۔

(صحیح بخاری، رقم: 4474۔ صحیح مسلم، رقم: 1457، سنن نسائی، رقم: 914)

2۔ ایک دفعہ نبی ﷺ کی سفر میں ایک مقام پر ٹھہرے، ایک اور شخص بھی آپ ﷺ کے پاس ٹھہر ا تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا:

((أَلَا أَخْيُرُكَ بِأَفْضَلِ الْقُرْآنِ؟ قَالَ: بَلَى، فَتَلَاهُ: ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾))

(صحیح ابن حبان، مستدرک حاکم عن انس رضی اللہ عنہ)

”کیا میں تمہیں قرآن کی سب سے افضل سورت نہ بتاؤں؟ اس شخص نے عرض کیا: جی ہاں، ضرور بتائیے، پھر آپ ﷺ نے ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ....﴾ سورہ الفاتحہ تلاوت فرمائی۔“

3۔ سید ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم ایک مرتبہ سفر میں ایک جگہ ٹھہرے۔ اچانک ایک لوگوی آئی اور بولی کہ یہاں کے قبیلے کے سردار کو سانپ (یا پھو) نے ڈس لیا ہے۔ ہمارے آدمی یہاں موجود نہیں، آپ میں سے کوئی جھاڑ پھوک کرنے والا ہوتا وہ اس کا علاج کر دے۔ ہم میں سے ایک شخص انھ کراس کے ساتھ چلا گیا۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ وہ دم کرنا بھی جانتا ہے۔ اس نے ڈہاں جا کر کچھ دم کیا تو اللہ کے فضل سے وہ سردار بالکل ٹھیک ہو گیا۔ اس موقع پر اس نے ہمارے آدمی کو تمیں (30) مکریاں تھنے میں دین اور ہماری مہمانی کے لیے بہت سادو دھبھیجا۔ جب وہ شخص والپیں آیا تو ہم نے اس سے پوچھا: کیا تمہیں دم کرنا بھی آتا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں نے تو سورہ الفاتحہ پڑھ کر دم کر دیا تھا۔ ہم نے کہا کہ اس آئے ہوئے مال کا معاملہ ملتی رکھو۔ پہلے رسول اللہ ﷺ نے اس بارے میں پوچھا تو مدینے پہنچ کر ہم نے حضور سے اس واقعے کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”اسے کیسے معلوم ہو گیا کہ یہ پڑھ کر دم کرنے کی سورت ہے؟ اس مال کے حصے کرو اور اس میں سے ایک حصہ میرے لیے بھی رکھو۔“ (صحیح بخاری، رقم: 2276۔ ابو داؤد، رقم: 3418)

4۔ اس سورت کی فضیلت میں ایک حدیث قدسی بھی ہے کہ

”سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں نے نماز (سورہ الفاتحہ) کو اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان آدھا آدھا تقسیم کر رکھا ہے۔ میرے بندے کو وہ کچھ ملے گا جو اس نے مانگا۔ جب بندہ کہتا ہے ﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری تعریف کی۔ جب وہ ﴿الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ﴾ کہتا ہے تو اللہ فرماتا ہے: میرے بندے نے میری حمد و شایان کی۔ پھر جب وہ ﴿مَلِكُ يَوْمِ الدِّينِ﴾ کہتا ہے تو اللہ فرماتا ہے: میرے بندے کے درمیان مشترک (COMMON) ہے اور میرے بندے کو وہ ملے گا جو اس نے مانگا ہے۔ پھر جب وہ ﴿إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرَ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝﴾ کہتا ہے تو اللہ فرماتا ہے کہ یہ میرے بندے کے لیے ہے اور میرے بندے کو وہ ملے گا جو اس نے مانگا ہے۔ (صحیح مسلم، رقم: 878۔ نسائی، رقم: 910)

بندہ ادھر اپنی دعا پوری کرتا ہے تو ادھر اللہ کی طرف سے اسے قرآن پیش کیا جاتا ہے کہ یہ تیری دعا کا جواب ہے۔

اسی میں وہ روایت ہے جو تو نے مانگی ہے:

﴿ذُلِّكَ الْكِتَبُ لَا رَيْبٌ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ﴾

”یہ اللہ کی کتاب ہے، اس بارے میں کوئی شک نہیں ہے۔ یہ سراپا ہدایت ہے، اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے۔“

6۔ سورہ الفاتحہ کے مسائل و احکام:

سورہ الفاتحہ کے حوالے سے چند مسائل و احکام یہ ہیں:

- 1۔ سورہ الفاتحہ کی کل سات آیتیں ہیں۔ اس پر امت کا اتفاق اور اجماع ہے۔
- 2۔ جمہور فقہا کے نزدیک نماز میں سورہ الفاتحہ پڑھنی واجب ہے۔
- 3۔ باجماعت نماز میں امام کے پیچھے مقتدى سورہ الفاتحہ پڑھے یا نہ پڑھے۔ اس بارے میں تین مسلک ہیں: پہلا مسلک یہ ہے کہ جبکہ نماز میں جب امام قراءت کر رہا ہو تو مقتدى سورہ الفاتحہ نہ پڑھے اور سری نماز میں پڑھ لے۔ یہ امام مالک رضی اللہ عنہ، امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ اور امام محمد رضی اللہ عنہ کا مسلک ہے۔ دوسرا مسلک یہ ہے کہ امام کے پیچھے مقتدى کسی نماز میں بھی خواہ وہ جبکہ نماز میں بھی خواہ وہ جبکہ نماز میں بھی خواہ ہو یا سری، سورہ الفاتحہ نہیں پڑھے گا۔ کیونکہ ایک حدیث کے مطابق امام کی قراءت ہی مقتدى کے لیے کافی ہے۔ یہ مسلک امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا ہے۔ تیسرا مسلک یہ ہے کہ امام کے پیچھے مقتدى ہر نماز میں خواہ وہ جبکہ نماز میں بھی خواہ وہ جبکہ نماز میں بھی خواہ ہو تو سورہ الفاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ (صحیح بخاری، رقم: 756۔ صحیح مسلم، رقم: 874۔ ابو داؤد، رقم: 822۔ ترمذی، رقم: 247، نسائی، رقم: 910) یہ مسلک امام شافعی رضی اللہ عنہ اور اہل حدیث کا ہے۔

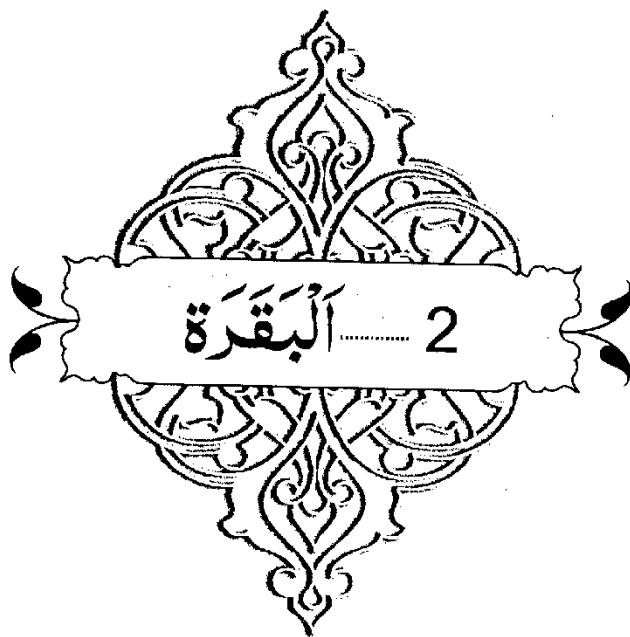
ہماری رائے میں پہلا مسلک بہتر اور راجح ہے، کیونکہ اس صورت میں قرآن و حدیث دونوں پر عمل ہو جاتا ہے اور ان کی باہم مطابقت بھی ہو جاتی ہے۔ اس کے عکس دوسرا مسلک میں ایک صحیح حدیث کی خلاف ورزی کا پہلو نکلتا ہے اور تیسرا مسلک میں قرآن کے اس حکم کی خلاف ورزی کا امکان ہے جس میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ:

﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لِلَّهُمَّ تُرْحَمُونَ﴾ (الاعراف: 7)

”اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے غور سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر حرم کیا جائے۔“



- 4۔ سورہ الفاتحہ پڑھ کر مریض پر دم کرنا (رقیہ) جائز اور مشروع ہے۔
- 5۔ سورہ الفاتحہ کے بعد آمین کہنا سنت سے ثابت ہے۔

نام:

قرآن مجید کی سورتوں کے نام عام طور پر ان کے مضامین کے اعتبار سے نہیں ہیں، بلکہ مخصوص نشانی اور علامت کے طور پر رکھے گئے ہیں۔ اس سورت کا نام البقرہ (گائے) ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ سورت جس میں گائے کا ایک واقعہ بیان ہوا ہے۔ لیکن ادکام و مضامین کی کثرت اور جامعیت کی وجہ سے اس سورت کو ”فُسْطَاطُ الْقُرْآن“ (قرآن کا خیمه) بھی کہا گیا ہے۔

زمانہ نزول:

یہ سورت مدنی ہے۔ هجرت کے بعد ابتدائی ڈیڑھ دو برس کے اندر نازل ہوئی ہے۔ اس میں کچھ آیتیں، خاص طور پر وہ آیات جو سود سے متعلق ہیں، بھی شامل ہیں۔ حالاں کہ وہ بالکل آخری مدنی دور میں نازل ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ اس کی آخری چند آیات جو کئے میں اتری تھیں، مضمون کی مناسبت سے اس میں شامل کر دی گئیں۔

سورہ البقرہ کے فضائل:

ذیل میں سورہ البقرہ کے بہت سے فضائل میں سے کچھ بیان کیے جاتے ہیں جو صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔ ایک

حدیث میں ہے کہ:

.....1 ((عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا تَجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ مَقَابِرَ، إِنَّ الشَّيْطَانَ

يَنْفَرُ مِنَ الْبَيْتِ الَّذِي تَقْرَأُ فِيهِ سُورَةُ الْبَقَرَةِ) (صحيح مسلم، رقم: 1824 - ترمذى، رقم: 2877)

”سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے گھروں کو قبریں (قبرستان) نہ بناؤ۔ بے شک شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے جس میں سورۃ البقرہ پڑھی جاتی ہے۔“

ایک اور حدیث میں اس سورت کی یہ فضیلت بیان ہوئی ہے کہ:

2 ((عَنْ أَبِيْ أُمَامَةَ الْبَاهْلِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ يَقُولُ: إِقْرَأْ وَا سُورَةَ الْبَقَرَةِ، فَإِنَّ أَخْدَهَا بَرَكَةً، وَتَرْكَهَا حَسْرَةً، وَلَا يَسْتَطِعُهَا الْبَطْلَةُ))

(صحیح مسلم، رقم: 1874)

”حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے شا..... سورۃ البقرہ پڑھا کرو۔ اس کو حاصل کرنے میں برکت ہے۔ اس کو چھوڑ دینے میں حسرت و پشیمانی ہے اور اس پر شیطان اور جادو گروں کا کوئی زور نہیں چلتا۔“

رَوَّاهُنَا - 40

أَيَّا تُهَا - 286

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْكَمَرُ ۝ ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَبَّ لَهُ ۝ فِيهِ هُدَىٰ لِلْمُتَّقِينَ ۝ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ

بِالْغَيْبِ وَ يُقْيِيمُونَ الصَّلَاةَ وَ مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ۝ وَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا

أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَ مَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۝ وَ بِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ۝ أُولَئِكَ عَلَىٰ

هُدَىٰ مِنْ رَبِّهِمْ وَ أُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝

”الف، لام، میم۔ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اس بارے میں کوئی شک نہیں ہے۔ یہ سراپا حدیث ہے، اللہ سے ڈرنے والوں (متقین) کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے نیکی کی راہ میں خرج کرتے ہیں۔ اور جو لوگ اس چیز پر ایمان لاتے ہیں جو آپ ﷺ پر نازل کی گئی اور اس پر بھی جو آپ ﷺ سے پہلے نازل کی گئی اور وہی آخرت پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ یہ سب لوگ اپنے رب کی ہدایت پر ہیں اور یہی کامیاب ہونے والے ہیں۔“ (5-1)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

﴿الْمَّكَّ﴾ (الف، لام، ميم) (1)

اس طرح کے حروف جو قرآن مجید کی بعض سورتوں کے شروع میں آئے ہیں ”حروف مقطعات“ کہلاتے ہیں کیونکہ یہ الگ الگ کر کے پڑھے جاتے ہیں۔ ان کے معنی کے بارے میں بہت سے اقوال ہیں مگر ہمارے نزدیک ان میں سے دو قول زیادہ اہم اور قابل غور ہیں۔

1۔ پہلا قول یہ ہے کہ یہ حروف اس بات کی دلیل ہیں کہ قرآن مجید واقعی اللہ تعالیٰ کا کلام اور ایک مجذہ ہے۔ یہ انسانی کلام ہرگز نہیں ہے۔ ان کے ذریعے گویا اہل عرب کو تحدي اور چلنچ (CHALLENGE) دیا گیا ہے کہ دیکھو، اگرچہ یہ پورا قرآن تمہاری ہی عربی زبان کے حروف تھیں (ALPHABETS) پر مشتمل ہے مگر تم سب مل کر بھی اس جیسا کوئی کلام پیش نہیں کر سکتے۔ بلکہ اس جیسی کوئی چھوٹی سے چھوٹی سورت بھی بنا کر نہیں لاسکتے۔

2۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ان حروف کی حیثیت ”حروف ندا“ یا ”حروف تنہیہ“ کی ہے تاکہ مخاطبین کو متوجہ کیا جائے اور پھر اصل مقصود و مدعایاں کیا جائے۔ یہ اس وقت کا ایک اسلوب کلام تھا جسے قرآن نے اختیار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں جہاں بھی یہ حروف آئے ہیں، عام طور پر اس کے بعد قرآن مجید کا ذکر آیا ہے، یا پھر وحی و رسالت کا مضمون ہے جس سے یہ اشارہ لکھتا ہے کہ یہ حروف وحی کے کلام کی عظمت و اعجاز کو ظاہر کرنے کا پیش خیسہ ہیں۔

ہماری رائے میں دوسرے قول ہی کو ترجیح حاصل ہے۔

یاد رہے کہ تمام حروف مقطعات قرآن مجید ہی کا حصہ ہیں اور ان کی تلاوت کی جاتی ہے۔

﴿ذَلِكَ الْكِتَبُ لَا رَبَّ يَرِبُّهُ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ﴾ (2)

ذلک: عربی زبان میں عام طور پر قریب کے اشارے کے لیے ہذا (This) اور دور کے اشارے کے لیے ذلک (That) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ لیکن جب کسی چیز کی خاص اہمیت اور شان ظاہر کرنی ہو تو اس کے لیے ہذا کی جگہ ذلک لے آتے ہیں۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ کی کتاب کی اہمیت، عظمت اور شان کو نمایاں کرنے کے لیے ہذا کی بجائے ذلک آیا ہے۔

الْكِتَبُ: اس سے مراد قرآن مجید ہے جو اللہ تعالیٰ کا کلام اور اس کی کتاب ہے، اس کی نظریہ ہے۔

﴿وَ هَذَا كِتَبٌ أَنزَلْنَاهُ مُبَرَّكٌ مُصَدِّقُ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَ لِتُنذِرَ أُمَّ الْقُرْبَى وَ مَنْ حَوْلَهَا﴾ (الانعام: 6)

”اور یہ کتاب (قرآن) ہم نے نازل کی ہے جو برکت والی ہے۔ اپنے سے پہلی کتابوں کو یہ ثابت کرنے والی ہے، تاکہ آپ اس کتاب کے ذریعے کے والوں کو اور اس کے آس پاس والوں کو خبردار کر دیں۔“

”کتاب“ کا لفظ قرآن مجید میں کئی دوسرے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسے خط، پیغام، تحریر، حکم، تقدیر، اعمال نامہ اور الہامی کتب وغیرہ۔

﴿لَا رَيْبَ ﴿فِيهِ﴾ ”اس بارے میں کوئی شک نہیں۔“ (2)

اس جگہ معاونت کا وقف ہے جو فیہ سے پہلے بھی ہو سکتا ہے اور فیہ کے بعد بھی۔ ہماری رائے میں فیہ کے بعد کے وقف کو ترجیح حاصل ہے کیونکہ یہ قرآنی اسلوب کے زیادہ قریب ہے۔

قرآن نے لَا رَيْبَ فِيهِ ”اس بارے میں کوئی شک نہیں“ کی وضاحت دوسرے مقامات پر کر دی ہے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ ارشاد ہوا کہ:

﴿الَّهُ أَنْزَلَ الْكِتَابَ لَا رَيْبَ فِيهِ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (السجدة 1:32)

”الف، لام، میم۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب رب العالمین کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔“

مطلوب یہ ہے کہ اس بارے میں کسی کو کوئی شک نہیں ہونا چاہیے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے اور یہ کسی مخلوق کا کلام نہیں ہے۔ پھر ریب سے پہلے لَا (لَا نَفْعَ جنس) لا کہ اس حوالے سے ہر قسم کے شک و شبہ کی نفعی کر دی گئی۔

قرآن کے مخالفین یہ نہ کہتے تھے کہ ان کو قرآن کی بنائی ہوئی باتوں پر شک ہے۔ ان کا اصل اعتراض یہ تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ نہیں ہے اور اسے نبی ﷺ نے خود گھڑ لیا ہے:

(1)﴿إِنِّي أَفْتَرَهُ﴾ (الأنبياء 5:21)

”بلکہ اس (نبی) نے اسے یعنی قرآن کو خود گھڑ لیا ہے۔“

(2)﴿أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَهُ بَلْ هُوَ الْعَقْدُ مِنْ رَبِّكَ لِتُنذِرَ قَوْمًا مَا آتَهُمْ مِنْ نَذِيرٍ مِنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهَتَّدُونَ﴾ (السجدة 3:32)

”کیا وہ لوگ کہتے ہیں، آپ نے اس (قرآن) کو خود گھڑ لیا ہے؟ نہیں یہ تو آپ کے رب کی طرف سے برحق نازل ہوا ہے تاکہ آپ اس قوم کو خبردار کر دیں، جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا تاکہ وہ ہدایت پائیں۔“

یہاں مخالفین کے اسی جھوٹے دعوے کی تردید کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو نبی ﷺ پر وقی کیا گیا ہے۔ لہذا اس بارے میں کسی کو کوئی شک نہیں ہونا چاہیے۔

پھر جب یہ مان لیا جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور اس کی طرف سے نازل شدہ ہے تو اس میں بیان کی گئی تمام باتوں کے بارے میں ویسے ہی کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا۔

﴿هُدًى لِّلْمُسْتَقِيمِ﴾ (2)

”ہدیٰ“ کے معنی ہدایت اور رہنمائی کے ہیں۔ جس کے لغوی معنی بچنے کے ہیں۔ اصطلاح میں گناہوں سے بچنے کو تقویٰ کہتے ہیں۔

”متقین“، متقیٰ کی جمع ہے جو تقویٰ (وقیٰ) سے بنا ہے۔ جس کے لغوی معنی ”بچنے“ کے ہیں۔ اصطلاح میں گناہوں سے بچنے کو تقویٰ کہتے ہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں متقیٰ وہ شخص ہے جو گناہوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور نیکیاں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

فرمایا گیا کہ یہ کتاب، جس کے کتاب الہی ہونے میں کوئی شک نہیں، ”متقین“ کے لیے ہدایت ہے اور ان کی رہنمائی کرتی ہے۔

اس جگہ بعض لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ قرآن صرف متقیٰ لوگوں کے لیے ہدایت کیوں ہے، وہ تو پہلے سے ہدایت یافتہ ہیں، یہ گناہ گاروں اور عام لوگوں کے لیے ہدایت کیوں نہیں ہے؟ اس سوال کا جواب قرآن نے اپنے آپ کو ہدیٰ لِلنَّاسِ (سب لوگوں کے لیے ہدایت) کہہ کر دے دیا ہے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ...﴾ (البقرہ 2: 185)

”رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا جو لوگوں کے لیے ہدایت ہے۔“

اس کے علاوہ اس کے مخاطب صرف ”متقین“ نہیں ہیں بلکہ وہ اپنی دعوت کے لیے تمام انسانوں کو کئی مقامات پر ”یَا أَيُّهَا النَّاسُ“ (اے لوگو) کہہ کر پکارتا ہے:

”یَا أَيُّهَا النَّاسُ“..... (البقرہ 2: 21)

حقیقت یہ ہے کہ متقین کو بھی اسلامی زندگی گزارنے کے لیے قدم قدم پر قرآن کی ہدایت و رہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے، جو ان کی ہدایت میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَالَّذِينَ اهْتَدَوا زَادُهُمْ هُدًى...﴾ (محمد 47: 17)

”اور جنہوں نے ہدایت کی راہ اختیار کی، اللہ ان کو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے۔“

تقویٰ کیا ہے؟

تقویٰ کے لفظی معنی ”بچنے“ کے ہیں۔ قرآنی اصطلاح میں یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جب بندہ اللہ سے ڈرتے ہوئے برائی سے بچتا اور نیکی اختیار کرتا ہے۔

ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے تقوے کے بارے میں سوال کیا کہ اس کی کیا حقیقت ہے؟ انہوں نے جواب میں فرمایا: کیا آپ کا گزر کبھی ایسے راستے سے ہوا جہاں جھاڑیاں کانٹے ہوں؟ انہوں نے جواب دیا: بھی ہاں، پھر پوچھا: ایسی جگہ سے گزرتے ہوئے تم کیا کرتے تھے؟ کہا: میں اپنے آپ کو سنبھال کر اور اپنے کپڑوں کو سمیٹ کر احتیاط سے گزر جاتا ہوں۔ اس پر انہوں نے فرمایا: اس تقویٰ میں ہی ہے کہ آدمی سنجھل سنجھل کر احتیاط کے ساتھ

اپنی زندگی گزارے۔"

یاد رہے کہ اس جگہ قرآن کی تین خصوصیات بیان ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کی کتاب ہے۔ دوسری یہ کہ اس کے کتاب الہی ہونے میں کوئی شک نہیں۔ تیسرا یہ کہ وہ متفقین کے لیے ہدایت ہے۔

﴿الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ﴾ (3)

یہ متفقین کی پہلی صفت بیان ہوئی ہے کہ وہ "غیب" پر یعنی غیب کی چیزوں پر ایمان لاتے ہیں۔ وہ ان چیزیں حقائق تو کو مانتے ہیں جو ان کی نظر وہ سے اوچھل ہیں، اگرچہ وجہ ان ان کو محسوس کرتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ، فرشتے، وحی، نبوت و رسالت، آخرت اور جنت و دوزخ وغیرہ۔ بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوا ہے کہ نبی اور کتاب تو غیب نہیں ہوتے، پھر ان پر ایمان لانے کو ایمان بالغیب کیسے کہا جائے گا۔

اس شبے کا جواب یہ ہے کہ کسی شخص کی شخصیت اور اس کا فلاں بن فلاں ہونا تو بے شک ظاہر کی چیز ہے گر اس شخص کا نبی اور صاحب وحی ہونا سراسر غیب کی چیز ہے کیونکہ نبوت اور وحی کا تعلق صرف غیب سے ہے جسے ہم دیکھنے نہیں سکتے۔ رہی کتاب تو قرآن مجید نہ تو کتابی صورت میں آسمان سے نازل ہوا اور نہ نبی ﷺ لوگوں کو قرآن کے لکھواۓ ہوئے اجزاء دکھا کر ان پر ایمان لانے کی دعوت دیتے تھے۔ یہ بھی وحی ہی کی صورت میں تھا جو کہ غیب کی چیز ہے اور جسے ہماری آنکھیں دیکھنے نہیں سکتیں۔

یاد رہے کہ ایمان کی بنیاد انسانی حواس کے تجربے (EXPERIMENT) اور مشاہدے (OBSERVATION) پر نہیں ہے، بلکہ اس کی بنیاد چند آن دیکھی حقائق تو کو مانتے اور یقین کرنے پر ہے۔

اس جملے کے دوسرے معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ جو لوگ غالبہ طور پر بن دیکھے، ان چیزوں پر ایمان لاتے ہیں جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اسی میں بندوں کے لیے ان کے رب کی طرف سے امتحان بھی ہے کہ کون ان غیبی حقائق پر ایمان لاتا اور کون ان کو جھٹلاتا ہے۔

اس مقام پر کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ "متفقین" کا ایمان انداھا ایمان (BLIND FAITH) ہوتا ہے اور اس میں عقل و شعور کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایسا خیال صحیح نہیں ہے۔ متفقین جن چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں، ان کی کوئی نہ کوئی عقلی بنیاد بھی ہوتی ہے اور ان کا ایمان عقل کے تقاضوں کے عین مطابق ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر اس دنیا میں بے شمار مخلوقات پائی جاتی ہیں اور عقل کا تقاضا یہ ہے کہ ہر مخلوق کے لیے ایک خالق کا ہونا ضروری ہے۔ بغیر خالق کے کوئی تحلیل نہیں ہو سکتی۔ خواہ وہ خالق ہمیں نظر آئے یا نظر نہ آئے۔

وحی عقل کے اسی تقاضے کا جواب دیتی ہے اور کہتی ہے کہ مخلوق کے لیے جو خالق "ہونا چاہیے"۔ وہ خالق حقیقت میں موجود ہے اور اسی کا نام اللہ ہے۔

اسی طرح ہماری عقل کا ایک تقاضا ہے کہ ہر شخص کو انصاف ملنا چاہیے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ تقاضا پورا نہیں ہوتا اور

لوگوں کو پورا انصاف نہیں ملتا۔ تو کیا یہ بات عقل کے تقاضے کے خلاف ہوگی، اگر وہی یہ بتا دے کہ خاتم کائنات نے ہر شخص کو انصاف مہیا کرنے کے لیے دنیا کے بعد آخرت کا ایک دن مقرر کر رکھا ہے؟

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ متعین کا ایمان کوئی اندازہ بہرا اور انہی تقاضید کا حامل نہیں ہوتا، بلکہ عقلی تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے۔ اسلام کے ہر عقیدے کی کوئی نہ کوئی عقلی بنیاد ہے، وہ ہمارے کسی فطری تقاضے اور طلب کا جواب ہوتا ہے۔ وجہاں اسے محسوس کرتا ہے اور ہمارا ضمیر اس پر مطمئن ہوتا ہے۔

﴿وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ﴾ (3)

یہ متعین کی دوسری صفت بیان ہوئی ہے۔ ”کروہ نماز قائم کرتے ہیں۔“

”**يُقِيمُونَ**“ اقامۃ سے ہے جس کے لفظی معنی ہیں: کسی چیز کو اس طرح سیدھا کر دینا کہ اس میں کوئی ثیڑھ اور تقصی باقی نہ رہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿فَوَجَدًا فِيهَا جِدَارًا يُرِيدُ أَن يَنْقَضَ فَأَقَامَهُ﴾ (الکھف 18:77)

”پھر وہاں ان دونوں نے ایک دیوار دیکھی جو گراچا ہتھی تھی، تو اس شخص نے اسے سیدھا کر دیا۔“

الصلوۃ: صلوۃ کے لغوی معنی دعا کے ہیں، جیسا کہ قرآن میں ہے:

﴿وَصَلَّى عَلَيْهِمْ...﴾ (النوبہ 9:103)

”اور آپ ان کے لیے دعا کریں۔“

شریعت کی اصطلاح میں ”الصلوۃ“ سے وہ نماز مراد ہے جو مسلمانوں کے ہاں رائج ہے۔ اس سے کوئی اور معنی لینا گمراہی اور زندقة ہے۔

قرآن نے صرف نماز پڑھنے کا حکم نہیں دیا بلکہ اس نے اپنی خاص اصطلاح میں ”اقامت الصلوۃ“، یعنی نماز قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور اس اقامت الصلوۃ میں نماز کے اوقات، اس کے ادا کرنے کا طریقہ، اس کے اركان، شرائط، واجبات، سفن، مستحبات، اس میں خشوع و خضوع، باجماعت نماز، اور نمازوں کی بہیش پابندی وغیرہ سب شامل ہیں۔ قرآن و حدیث میں ان تمام چیزوں کی وضاحت موجود ہے۔

یاد رہے کہ نماز دین اسلام کے بجدادی ارکان میں سے ہے۔ یہ ایمان کا لازمی تقاضا، اس کی خاص نشانی اور کفر و اسلام کے درمیان حد فاصل کی حیثیت رکھتی ہے۔

بعض گمراہ لوگ کہتے ہیں کہ چونکہ قرآن نے نماز قائم کرنے کا حکم دیا ہے، نماز پڑھنے کا حکم نہیں دیا ہے، لہذا نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔ ایسے لوگ نہیں جانتے کہ جس چیز کو قرآن نے نماز قائم کرنا کہا ہے، اسی چیز کو اردو محاورے میں نماز پڑھنا کہتے ہیں۔ بلکہ اسی چیز کو فارسی محاورے میں ”ماز کردن“ کہتے ہیں، جس کے معنی ہیں: ”نماز کرنا۔“ اس کے علاوہ قرآن مجید میں کئی مقامات پر نماز قائم کرنے کی بجائے نماز پڑھنے کا ذکر بھی موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَأَنْهُرُ﴾ (الکوثر 108:2)

”پس آپ اپنے رب کے لیے نماز پڑھیں اور اسی کے لیے قربانی کریں۔“

مزید حوالوں کے لیے دیکھئے: الاعلیٰ 87:15۔ العلق 96:10

﴿وَمَسَارِزَقْنَاهُمْ يُغْقُونَ﴾ (3)

قرآن سے ہدایت پانے کے بعد متقین میں پیدا ہونے والی یہ تیسری صفت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عطا کیے ہوئے مال میں سے نیکی کی راہ میں بھی خرچ کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں عام طور پر نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر آیا ہے لیکن اس جگہ زکوٰۃ کی بجائے انفاق کا بیان ہے جو زکوٰۃ سے بھی زیادہ وسعت رکھتا ہے۔ اس میں زکوٰۃ کے علاوہ ہر قسم کے صدقات اور خیرات شامل ہیں۔

اس جگہ نہیں فرمایا گیا کہ وہ سارا مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتے ہیں بلکہ میں کا لفظ استعمال ہوا ہے کہ اپنے مال کا کچھ حصہ نیکی کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

یاد رہے کہ عربی زبان میں ’رُزْقُ‘ کا لفظ صرف مال و دولت کے لیے استعمال نہیں ہوتا بلکہ اس کے علاوہ وہ انسان کی تمام جسمانی اور رُوحی صلاحیتوں اور نعمتوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

پھر انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دلانے کے لیے فرمایا کہ یہ مال ہمارا ہی دیا ہوا ہے۔ یہ سارا نہیں بلکہ اس کا صرف کچھ حصہ ہی ہماری راہ میں خرچ کر دو تو اسی میں اللہ کی خوشنودی ہے۔

یہ جو متقین کی صفات بیان ہوئی ہیں کہ وہ ایسا کرتے ہیں، تو اس میں یہ مفہوم بھی پایا جاتا ہے کہ ان کو ایسا کرنا چاہیے، جب ہی وہ متقین کی صفات میں شامل ہو سکتے ہیں۔

اس مقام پر متقین کی صرف تین صفات بیان ہوئی ہیں کہ وہ غیب پر ایمان لاتے، نماز قائم کرتے اور اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے اس کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ لیکن قرآن میں بعض دوسرے مقامات پر متقین کی کئی دوسری صفات کا ذکر بھی آیا ہے۔ گویا اس جگہ اجمال ہے اور باقی جگہوں پر اس کی تفصیل ہے۔

مثال کے طور پر آیت بڑی میں، ان لوگوں کو ترقی ترا دیا گیا ہے، جو چند دوسری صفات کے علاوہ عہد کو پورا کرنے اور مشکل حالات میں صبر کرنے کی صفات رکھتے ہیں۔

﴿... وَ الْمُؤْمُونُونَ بَعَهْدِهِمْ إِذَا أَعْهَلُوا حَوَّالَ الصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَ الضَّرَّاءِ وَ حِينَ الْبَأْسِ طُ اولِئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا حَوَّالَ اولِئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾ (البقرہ 2:177)

”اور جب وعدہ کریں تو اسے پورا کریں۔ کوئی مالی پریشانی یا جسمانی تکلیف ہو تو صبر کریں اور جہاد میں

ثابت قدم رہیں۔ ایسے لوگ ہیں پچھے اور پہنیز گاریں۔“

زیر بحث آیت کے بارے میں کسی کا نہایت عمدہ قول ہے کہ:

”ایمان میں نجات ہے، نماز میں اللہ سے مناجات ہے اور انفاق فی سہیل اللہ میں بلندی درجات ہے۔“

﴿وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَإِلَّا خَرَقَ هُمْ يُؤْقِنُونَ ﴾ (4)

اُنزَلَ: یہ نازل ہونے سے ہے۔ اس جگہ اس سے مراد وہ وحی اور الہامی کتب ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتاری گئیں۔

يُؤْقِنُونَ: یہ یقین اور ایقاں سے ہے، جس کے معنی یقین کرنے اور یقینی علم ہونے کے ہیں۔ اس کی ضد شک اور گمان ہیں۔ جس طرح ایمان کی ضد کفر اور انکار ہے۔

اس آیت سے کون لوگ مراد ہیں، جو قرآن، پہلی الہامی کتب اور آخرت کو ماننے والے ہیں۔ اس بارے میں دو قول ہیں اور عربیت کے لحاظ سے دونوں درست ہیں:

پہلا قول یہ ہے کہ اس آیت سے بھی وہی لوگ مراد ہیں، جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے کہ وہ غیب پر ایمان رکھتے، نماز قائم کرتے اور اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے مال میں سے اس کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

دوسرा قول یہ ہے کہ اس سے وہ اہل کتاب (یہودی اور عیسائی) مراد ہیں، جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ امام ابن حیر طبری نے اسی قول کو ترجیح دے کر اسے اختیار کیا ہے اور بتایا ہے کہ اصل میں یہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ آیت 3 میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو عام عرب مشرکین میں سے ایمان لائے اور آیت 4 میں ان کا ذکر ہے جو اہل کتاب میں سے ایمان لائے۔

ہمارے نزدیک یہی قول صحیح ہے اور اس کے دلائل یہ ہیں:

1۔ اس سے پہلے ایمان بالغیب کے ذکر میں پہلی کتابوں اور آخرت پر ایمان لانا بھی شامل تھا۔ اس کے بعد اس ایمان کو دوبارہ بیان کرنے کی خاص ضرورت نہ تھی۔ اس لیے آیت 4 میں کوئی دوسرਾ گروہ تسلیم کرنا پڑے گا، جس کا الگ سے ذکر کیا گیا ہے۔

2۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، جن کو ترجمان القرآن بھی کہا جاتا ہے، کا قول بھی اسی کے حق میں ہے کہ آیت 4 میں ایک اور گروہ کا ذکر ہے، جو ایمان بالغیب والے گروہ سے مختلف ہے۔ ظاہر ہے ان کا یہ قول بجائے خود ترجیح رکھتا ہے۔

3۔ قرآن کے نزول کے وقت اس کے مخاطب لوگوں میں پہلا گروہ عرب کے عام مشرکین کا تھا۔ دوسرਾ گروہ اہل کتاب (یہود و نصاری) کہلاتا تھا۔ پہلے گروہ میں ایسے افراد بھی تھے جو موحدین تھے، بت پرستی نہیں کرتے تھے اور ابراہیمی طریقے پر تھے۔ اس کے علاوہ اس گروہ میں کچھ ایسے سلیم الفطرت لوگ تھے، جن کو دین حق کی ملاش تھی، کیونکہ وہ بت پرستی کے ماحول میں گھٹن محسوس کرتے تھے۔ ان دونوں قسم کے افراد نے جب قرآن کی دعوت سنی تو

اسے جلد قبول کر لیا۔ کلی دور میں اسلام لانے والے یہی صحابہ تھے جو بعد میں السالبون الاؤلُون کہلاتے۔ ان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے اسلام کی سچائی اور حقانیت سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا تھا۔ ایسا نہیں ہوا کہ یہ لوگ اسلام کے غلبے اور طاقت سے مرعوب ہو کر ایمان لائے ہوں۔

بقرہ کی آیت 3 میں انہی لوگوں کا ذکر ہے۔

دوسری طرف اہل کتاب (یہودیوں اور عیسائیوں) میں بھی کچھ ایسی سعید روئیں تھیں جو حق پسند اور حق کی مثالی تھیں۔ یہ لوگ بھی اپنے مروجہ مذہب سے تنفر تھے۔ پھر ان کو ایک آنے والے نبی کا انتفار بھی تھا، جس کا ذکر ان کی الہامی کتابوں توریت اور انجیل میں موجود تھا۔ ان لوگوں نے جب یہ سنا کہ وہی نبی مبعوث ہو گیا ہے، جس کی پیش گوئی ان کی کتابوں میں پائی جاتی تھی، تو انہوں نے بھی فوری طور پر حضور ﷺ کی دعوت پر بلیک کی۔ جیسے عبد اللہ بن سلام (یہودی عالم) اور تمیم داری (عیسائی عالم)۔

قرآن نے کئی مقامات پر اس طرح کے حق پسند اہل کتاب کی تحسین فرمائی ہے۔ جیسے:

﴿لَيَسُوا سَوَاءٌ طِّينٌ أَهْلُ الْكِتَبُ أُمَّةٌ قَاتَّهُ يَتَلَوُنَ أَيْتَ اللَّهُ أَنَّاءَ الَّيلِ وَ هُمْ يَسْجُدُونَ ۝ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمَ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ ۝ وَأُولَئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ﴾ (آل عمران: 113، 114: 3)

”سب اہل کتاب ایک جیسے نہیں ہیں۔ ان میں ایک گروہ سیدھی راہ پر ہے۔ وہ راتوں کو اللہ کی آیتیں پڑھتے ہیں اور اس کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں، اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، یعنی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں بڑھ پڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔“

پھر اہل کتاب ہی کے ایک گروہ نصاریٰ کے حق پسند لوگوں کے بارے میں فرمایا:

﴿وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزَلَ إِلَيَ الرَّسُولِ تَرَى أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَمْنَا فَأَنْتَبْنَا مَعَ الشَّهِيدِينَ ۝ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا جَاءَنَا مِنَ الْحَقِّ لَا وَنَطَعْ ۖ أَن يُدَخِّلَنَا رَبَّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصَّلِحِينَ ۝ فَأَثَابَهُمُ اللَّهُ بِمَا قَالُوا جَنَّتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَرُ خَلِيلِينَ فِيهَا طَوْ ۝ وَذَلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ ۝﴾

(المائدہ: 5، 83 تا 85)

”اور جب وہ (نصاریٰ) کلام سنتے ہیں جو رسول پر نازل ہوا تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، کیونکہ انہوں نے حق بات کو پیچاں لیا۔ وہ پکار لختے ہیں: ”اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے، ہمیں دین حق کی گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔“ اور وہ کہتے ہیں: ”آخر ہم کیوں ایمان نہ لائیں اللہ پر اور اس حق پر جو ہم تک پہنچا ہے؟ ہماری آرزو ہے کہ ہمارا رب ہمیں یہی لوگوں کے ساتھ شامل کرے۔“ ان کی

اس بات کے سلے میں اللہ انہیں ایسے باغ دے گا، جن میں نہیں بہتی ہوں گی۔ وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے اور نیک لوگوں کی بیکی جزا ہے۔“

سورہ البقرہ کی اس آیت 4 میں انہی حق پسند اہل کتاب کا ذکر ہے۔ ان کو الگ سے اس لیے بیان کیا گیا کہ وہ قرآن کے علاوہ پہلی آسمانی کتابوں پر بھی ایمان رکھتے تھے۔ اور اس لیے بھی کہ یہ لوگ آخرت پر پختہ اور سچا ایمان رکھنے والے بن گئے، جب کہ دوسرے عام اہل کتاب کا عقیدہ آخرت برائے نام تھا اور اس میں اتنا بگاڑ پیدا ہو چکا تھا کہ اس کی اصل روح ہی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔

ایک آخری اشکال یا سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ وَالَّذِينَ كَانُوا عَظِيمًا فِي الدُّنْيَا فَلَمَّا مَرَءُوا إِلَيْهِمْ كَانُوا أَعْلَمُ مِنْهُمْ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بعض اوقات وَالَّذِينَ كَانُوا عَظِيمًا فِي الدُّنْيَا کا عطف دو الگ الگ گروہوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور اس وقت اس سے دو الگ الگ گروہ مراد ہوتے ہیں اور کبھی ان کو جمع کر کے ایک جماعت بھی مراد ہی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید میں اس کی ایک نظر یہ ہے:

وَالَّذِينَ أَمْنَوْا وَهَاجَرُوا وَجَهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ أَوْفُوا وَنَصَرُوا أُولَئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًا لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ۔
(الانفال: 8)

”اور جو لوگ ایمان لائے، انہوں نے ہجرت کی، اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے ان کو پناہ دی اور ان کی مدد کی، یہ سب سچے مومن ہیں، ان کے لیے بخشنش ہے اور عزت کی روزی۔“

دیکھ لجیے، اس چکرے قرآن مجید نے پہلے الَّذِينَ میں مهاجرین کا ذکر کیا، پھر الَّذِينَ میں انصار کا ذکر کیا اور پھر اُولَئِكَ کے ذریعے ان دونوں کو ملا کر سچے مومنین کا ایک، یہ گروہ قرار دیا اور پھر ان کے لیکاں ثواب کا ذکر فرمایا۔

أُولَئِكَ عَلَى هُدَىٰ مِنْ رَّبِّهِمْ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ⑤

مُفْلِحُونَ بجمع ہے مُفْلِحٌ کی، جس کے معنی فلاح پانے والے اور کامیاب کے ہیں اور قرآن میں فلاح و کامیابی سے مراد آخرت کی فلاح و کامیابی ہے جو کہ حقیقی زندگی ہے۔

اس آیت میں دونوں طرح کے ان مومنین کو جمع کر دیا گیا ہے، جن کا ذکر آیت 3 اور 4 میں آیا ہے۔ (جس کی نظر بھی دی جا چکی ہے)۔ ان کے بارے میں فرمایا گیا کہ اگر کسی کو یہ دیکھنا ہو کہ اس وقت کون لوگ اس ہدایت پر مضبوطی سے قائم ہیں جو ہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے، تو وہ ان دونوں قسم کے اہل ایمان کو دیکھ لیں، ان میں سے ایک قسم کا تعلق پہلے مشرکین عرب سے تھا لیکن اب وہ ایمان لا چکے ہیں، دوسری قسم کا تعلق پہلے اہل کتاب سے تھا لیکن اب وہ بھی ایمان لے آئے ہیں۔ ان دونوں قسم کے اہل ایمان دنیا میں چی ہدایت پر قائم ہیں اور آخرت میں ان کے لیے فلاح و کامرانی ہے جہاں ان لوگوں کو جنت میں عیش و عشرت کی زندگی نصیب ہو گی۔ اسی سے ملتا جلتا مضمون سورہ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ آیتوں میں ایک اور اسلوب سے آیا ہے، جہاں فلاح سے مراد جنت لی گئی ہے۔

آیت 4 اور 5 میں ان اہل کتاب پر طزو و تعریض بھی ہے جو اپنے آپ کو ایمان کا علم بردار اور ہدایت کا ٹھیکے دار سمجھتے تھے، اور جنت کو صرف اپنا اتحاق قرار دیتے تھے۔ قرآن نے ان کو ایسی خام خیالوں اور غلط فہمیوں کی تروید کرتے ہوئے فرمایا کہ اہل کتاب میں سے صرف وہی لوگ صحیح ایمان والے، آخرت پر یقین رکھنے والے، پچی ہدایت والے اور آخرت میں فلاج و کامرانی سے ہم کنار ہونے والے ہیں جو حضرت محمد ﷺ کی نبوت و رسالت اور قرآن پر ایمان لا پچھے ہیں۔ ان کے سواباتی اہل کتاب کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔

اہل ایمان کے بعد ان کفار کا ذکر آرہا ہے جو دین اسلام کے سخت مخالف تھے۔ جنہوں نے حق کے مقابلے میں باطل کو پسند کیا اور ضد اور ہست دھرمی سے کام لیا۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ عَانِذَرَتْهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ①

خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ ۚ وَعَلَى إَبْصَارِهِمْ غَشَاوَةٌ ۗ وَلَهُمْ

عَذَابٌ عَظِيمٌ

فِي

”بے شک جو لوگ کافر ہو گئے، آپ کا ان کو ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے، وہ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔ اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگادی ہے، ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے ہر اعذاب ہے۔“ (7-6)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

كَفَرُوا..... یہ کُفر سے بنا ہے۔ اس کے اصل معنی کسی چیز کو ڈھانپنے یا چھپانے کے ہیں۔ معلقہ کے مشہور شاعر لسید کا مصرع ہے:

((فِي لَيْلَةِ كَفَرَ النُّجُومُ عَمَّا مَهَا))

”ایک رات جس میں بادلوں نے ستاروں کو ڈھانپ (چھپا) دیا تھا۔“

عربی میں کسان کو بھی کافر کہتے ہیں، کیونکہ وہ زمین میں بیج کو چھپا دیتا ہے۔ کافر کو کافر اس لیے کہتے ہیں کہ وہ حق بات کو دل میں چھپا دیتا ہے۔ کافر کی جمع **كُفَّارٌ** ہے۔ قرآن مجید میں کفار کا لفظ کسانوں کے لیے بھی آیا ہے:

﴿كَمَثَلٍ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَأُهُ ثُمَّ يَهْيَجُ فَتَرَاهُ مُضْفَرًا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا﴾

(الحدید 20:57)

”جیسے زمین پر بارش بر سی۔ پھر اس کی پیداوار دیکھ کر کسان خوش ہوئے۔ پھر وہ کھیتی خشک ہو کر زرد نظر آنے لگی اور پھر پورا پورا ہو کر رہ گئی۔“

کافر کے مقابلہ میں مومن کا لادر کافر کے مقابلہ میں ایمان کا لفظ آتا ہے۔

اسلامی اصطلاح میں کفر سے مراد ان چیزوں کا انکار ہے، جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔ پھر کفر کا لفظ ناشکری کے معنوں میں بھی آتا ہے لیکن ایسے موقع پر اس کے ساتھ کسی نعمت کا حوالہ یا قریبہ موجود ہوتا ہے جیسے:

﴿إِنَّمَا تَرَى إِلَيَّ الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَةَ اللَّهِ كُفُراً وَ أَحَلُوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ﴾ (ابراهیم: 14)

”کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا، جنہوں نے اللہ کی نعمت کی ناشکری کی، اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر تک پہنچا دیا۔“

کبھی کفر کا لفظ شکر کے مقابل میں بھی آتا ہے:

﴿فَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ اذْكُرْ كُمْ وَ اشْكُرُوا لِيْ وَ لَا تَكُفُرُونِ﴾ (البقرہ: 2)

”پس تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر ادا کرو، میری ناشکری نہ کرو۔“

خَاتَمُ:..... اس کے معنی ”مہر لگانے“ کے ہیں۔ مہر (SEAL) کو عربی میں خاتم کہتے ہیں۔ خاتم کا مطلب ہے، کسی چیز کو اس طرح بند کر دینا کہ اس میں نہ کوئی چیز داخل ہو سکے اور نہ اس پر کوئی اور چیز اثر انداز ہو سکے۔

قُلُوبِهِمْ:..... قلوب، قلب کی جمع ہے، جس کا ترجمہ عام طور پر دل کیا جاتا ہے، لیکن عربی زبان میں قلب اور فواد کے معنی صرف دل کے نہیں ہوتے بلکہ اس سے دل و دماغ دونوں مراد ہوتے ہیں۔

سَمْعِهِمْ:..... ’سمع‘ کے معنی ہیں: سننا، سننے کی طاقت یعنی ساعت اور کان۔ یہ لفظ قرآن میں ان تینوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ البتہ جہاں سمع کا لفظ قلوب (دلوں)، ابصار (آنکھوں) کے ساتھ عطف کے طور پر آتا ہے، وہاں اس کے معنی، اذان، یعنی کانوں (EARS) کے ہوتے ہیں اور اس جگہ یہ کانوں ہی کے معنوں میں آیا ہے۔ اس کی ایک اور نظریہ ہے:

﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَ سَمْعِهِمْ وَ أَبْصَارِهِمْ وَ أُولَئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ﴾ (آل عمران: 108)

(النحل: 16)

”یہی لوگ ہیں، جن کے دلوں اور کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے ٹھپہ لگا دیا ہے اور وہ غافل ہیں۔“

گویا اس اسلوب میں مصدریت غالب آ جاتی ہے اسیست پر۔

أَبْصَارِهِمْ:..... ابصار جمع ہے بصر کی، جس کے معنی آنکھ کے ہیں اور یہ نظر کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اس جگہ اس سے مراد آنکھیں ہیں۔

غِشَاوَةُ:..... اس کے معنی پر دئے کے ہیں۔ ﴿وَعَلَى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ﴾ میں جَعَلَ مخدوف ہے۔ اصل میں یوں ہے: ﴿وَجَعَلَ عَلَى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ﴾ ”اور اس نے ان کی آنکھوں پر پرده ڈال دیا ہے۔“

ان دو آیتوں میں جن کافروں کا ذکر ہے وہ عام کافرنیں ہیں، بلکہ کترجم کے کفار ہیں، کیونکہ ان کے بارے میں یہ

کہا گیا ہے کہ:

- 1۔ ان کو ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو سمجھانا یا نہ سمجھانا برابر ہے۔ (یاد رہے کہ ہر جی کی دعوت و تبلیغ کا پہلا مرحلہ ڈرانا ہے اور دوسرا خوش خبری دینا)
- 2۔ وہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔
- 3۔ ان کے دلوں اور کانوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پروہ پڑا ہوا ہے۔ ظاہر ہے یہ حال سب کافروں کا نہیں ہو سکتا۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جو شروع میں کافر تھے، مگر بعد میں انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔

اصل میں اس جگہ جن کافروں کا ذکر ہے، اس سے قریش اور اہل کتاب کے وہ سردار مراد ہیں جنہوں نے اپنے مخصوص مفادات کی خاطر نبی ﷺ کی دعوت دین کا بڑی شدود میں انکار کیا اور حسد، تکبیر اور غرور کے ساتھ اسلام کی مخالفت پر اتر آئے۔ ان سرداروں کا کفر عام کفر نہ تھا بلکہ کفر جو دینی ضد کا کفر تھا جس کے بعد ان میں ایمان لانے کے صلاحیت اور استعداد ہی باقی نہیں رہی تھی، جیسے قریش میں سے ابو جہل اور عتبہ اور یہودیوں میں سے کعب بن اشرف اور حبی بن اخطب وغیرہ۔ ان دونوں آیات میں نبی ﷺ کے لیے تسلی ہے کہ ایسے لوگ کبھی ایمان نہ لائیں گے، اس لیے آپ ﷺ ان کے ایمان نہ لانے کا غم نہ کریں۔

دل پر مہر لگ جانے سے کیا مراد ہے؟

اس جگہ دلوں پر مہر لگ جانے کا ذکر آیا ہے۔ اسی چیز کو قرآن نے کہیں ”دلوں پر ٹھپہ لگ جانے“ سے تعبیر کیا ہے:
 ﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَ سَيِّعَهُمْ وَ أَبْصَارِهِمْ وَ أُولَئِكَ هُمُ الْغَفِيلُونَ﴾ (الحل 16: 50)

”یہی لوگ ہیں، جن کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے ٹھپہ لگا دیا ہے اور وہ غافل ہیں۔“

کہیں اسے ”دلوں کا سخت ہو جانا“ کہا ہے:

﴿ثُمَّ قَسَّتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً﴾ (البقرہ 2: 74)

”پھر اس کے بعد تمہارے دل ایسے سخت ہو گئے جیسے پھر بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت۔“

﴿فَوَيْلٌ لِلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ مِنْ ذُكْرِ اللَّهِ طَ﴾ (الزمر 39)

”پس ہلاکت ہے، ان کے لیے جن کے دل اللہ کی یاد سے غافل ہو کر سخت ہو گئے۔“

کسی مقام پر اسے ”دلوں پر زنگ لگ جانا“ قرار دیا ہے:

﴿كَلَّا بَلْ سَكَرَانَ عَلَى قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكُسِبُونَ﴾ (المطففين 83)

”ہرگز نہیں، بلکہ ان لوگوں کے دلوں پر ان کی بداعمالیوں کا زنگ لگ گیا ہے۔“

کسی جگہ اسے ”غافل ہونا“ یا ”لوں کا غافل ہونا“ بتایا ہے:

﴿وَلَقَدْ ذَرَّا نَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسَنِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبَصِّرُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَذْانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا اُولَئِكَ كَلَّا لَنَعَمْ بَلْ هُمْ أَضَلُّ اُولَئِكَ هُمُ الْغُفَّلُونَ﴾ (الاعراف: 7) (179:7)

”اور ہم نے بہت سے جنوں اور انسانوں کو ان کے برے اعمال کی وجہ سے دوزخ کے لیے پیدا کیا ہے۔ ان کے دل میں جن سے وہ سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں میں جن سے وہ دیکھتے نہیں، ان کے کان میں جن سے وہ سنتے نہیں۔ وہ ایسے ہیں جیسے جانور بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔ یہی لوگ میں ہونے والے غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔“

﴿لَا هِيَةَ قُلُوبُهُمْ﴾ (الأنبياء: 21) (3:21)

”ان کے دل غافل ہیں۔“

اسی مضمون کو ایک حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

((عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا أَخْطَأَ حَطِّيَّةً نُكَتَتْ فِي قَلْبِهِ نُكَتَتْ سُوَادَاءُ فَإِذَا هُوَ نَزَعَ وَاسْتَغْفَرَ وَتَابَ سُقِّلَ قَلْبُهُ، وَإِنْ عَادَ زِيدٌ فِيْهَا حَتَّى تَعْلُوْ قَلْبَهُ وَهُوَ الرَّأْنُ الَّذِي ذَكَرَ اللَّهُ "كَلَّا، بَلْ رَأَنَ عَلَى قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ")

(ترمذی، رقم: 3334۔ ابن ماجہ، رقم: 4244)

”جب کوئی مومن گناہ کر بیٹھتا ہے تو اس کی وجہ سے اس کے دل میں ایک سیاہ دھبہ سا پڑ جاتا ہے۔ پھر اگر وہ بازا آ جاتا ہے، اللہ سے معافی مانگ لیتا ہے اور توبہ کر لیتا ہے تو اس کے دل کا وہ دھبہ صاف ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ بار بار گناہ کرتا ہے تو ان گناہوں کی سیاہی پورے دل پر چھا جاتی ہے۔ یہی وہ رین (زنگ) ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمایا ہے کہ:

﴿كَلَّا بَلْ سَكَرَ رَأَنَ عَلَى قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ (المطففين: 83) (14:83)

”ہرگز نہیں، بلکہ ان لوگوں کے دلوں پر ان کی بداعماںیوں کا زنگ لگ گیا ہے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ انسان پیدائشی طور پر گناہ گا رہنیں ہے بلکہ جب وہ جان بوجھ کر حق بات کی مخالفت کرتا ہے تو پھر اس کے دل پر مہر لگ جاتی ہے اور یہ مہر گناہ اس کے اپنے گناہوں کا قدرتی نتیجہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب ہوتا ہے کیونکہ بندے نے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کی ناشکری کی ہوتی ہے اور خداداد صلاحیتوں کو صحیح طور پر کام میں نہیں لایا ہوتا۔ اسی لیے آخر میں فرمادیا کہ ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ ”گویا آخرت کا یہ عذاب، گناہوں کے نتیجے میں دلوں پر مہر لگنے کا شاخasan ہو گا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ أَمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ بِعُوْمِنِينَ ۝
 يُخْدِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا ۝ وَمَا يَخْدِعُونَ إِلَّا أَنفُسُهُمْ وَمَا
 يَشْعُرُونَ ۝ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ لَا فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا ۝ وَلَهُمْ عَذَابٌ
 أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْنِي بُونَ ۝ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ لَقَالُوا
 إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ۝ إِلَّا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَكِنْ لَا يَشْعُرُونَ ۝
 وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمَنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا آتُوْمُنْ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ ۝
 إِلَّا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَكِنْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا
 قَالُوا أَمَنَّا ۝ وَإِذَا أَخْلَوُا إِلَى شَيْطَانِهِمْ لَقَالُوا إِنَّا مَعْكُمْ لَا إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ ۝
 أَللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمْدُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ۝ أُولَئِكَ الَّذِينَ
 اشْتَرَوُ الظَّلَّةَ بِالْهُدَىٰ فَهَا رَبَحُتْ تِجَارُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ۝
 مَثَلُهُمْ كَمِثْلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۝ فَلَهَا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ
 بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلْمَتِ لَا يُبَصِّرُونَ ۝ صُمْ بَكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا
 يَرْجِعُونَ ۝ أَوْ كَصَّبَ مِنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلْمَتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ
 أَصَابِعَهُمْ فِي إِذَا نِهَمُ مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۝ وَاللَّهُ مُحِيطٌ
 بِالْكُفَّارِ ۝ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطُفُ أَبْصَارَهُمْ كَمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشْوَافِيهِ ۝
 وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ۝ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَاهَبٌ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۝

إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

”بعض لوگ کہتے ہیں ”ہم بھی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔“ حالاں کہ وہ ایمان والے نہیں۔ وہ اللہ کو اور ایمان والوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں، مگر وہ صرف اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں اور وہ نہیں سمجھتے۔ ان کے دلوں میں کھوٹ ہے، جسے اللہ نے اور بڑھا دیا ہے۔ ان کے لیے دردناک عذاب ہے، کیونکہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ جب ان سے کہا جاتا ہے زمین میں فساد نہ کرو تو کہتے ہیں: ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ یاد رکھو، یہی لوگ فسادی ہیں مگر سمجھتے نہیں۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے، تم بھی ایمان لاو جیسے اور لوگ ایمان لائے تو کہتے ہیں: کیا ہم اس طرح ایمان لا کیں جیسے بے وقوف لوگ ایمان لائے۔ یاد رکھو، اصل میں بے وقوف یہی ہیں لیکن یہ نہیں جانتے۔ جب یہ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم بھی ایمان لائے۔ اور جب اپنے شیطانوں کے پاس اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم تمہارے ساتھ ہیں، مسلمانوں سے تو ہم مذاق کرتے ہیں۔ اللہ ان لوگوں کو ان کے مذاق کا مزہ چکھائے گا۔ ابھی ان کی سرکشی میں انہیں ڈھیل دے رہا ہے اور وہ بھکتے پھر رہے ہیں۔ انہوں نے ہدایت کے بد لے گمراہی خریدی۔ انہیں اس سودے میں نہ کوئی نفع ہوا اور نہ وہ ہدایت پا سکے۔“

ان کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے آگ جلائی۔ جب آگ نے اس کے آس پاس کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کی روشنی بجھا دی اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا۔ اب انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ بہرے، گونگے اور انہے ہیں، کبھی سیدھی راہ پر نہیں آ کیں گے۔

یا ان کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے بارش برے، اس میں اندھیرا ہی اندھیرا ہو، اور گرج اور بجلی ہو۔ وہ کڑک سے ڈر کر موت سے بچنے کے لیے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھوں رہے ہوں۔ حالاں کہ اللہ نے کافروں کا گھیراؤ کر رکھا ہے۔ قریب ہے کہ بجلی ان کی آنکھیں اچک لے۔ جب بجلی چمکتی ہے تو یہ چل پڑتے ہیں، اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو رک جاتے ہیں۔ اگر اللہ چاہتا تو ان کے کان اور ان کی آنکھیں چھین لیتا۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“ (20-8)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

﴿وَمَنِ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ أَمَّا بِاللَّهِ وَإِلَيْهِ الْأُخْرَ وَمَا هُمْ بِغُوْنِيْنَ ۝﴾ (8)

مطلوب یہ ہے کہ بعض لوگ صاحب ایمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر حقیقت میں ایمان والے نہیں ہیں۔ اس آیت میں جن لوگوں کا ذکر ہے، اس سے عام طور پر منافقین کا وہ گروہ مراد یا گیا ہے جو ظاہری طور پر مسلمان تھا، مگر باطن میں کافر تھا۔ لیکن ہمارے نزدیک اس مقام پر عام اہل کتاب کے منافق لوگ مراد ہیں اور اس جگہ عام منافقین مراد لینا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ان دونوں قسم کے منافقوں میں بڑا نمایاں فرق تھا۔

۱۔ عام منافقین اپنے آپ کو مسلمانوں میں شامل رکھتے تھے مگر یہ گروہ ظاہری اور باطنی طور پر اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار نہیں کرتا تھا۔

۲۔ عام منافقین اپنے آپ کو مسلمانوں کا دشمن ظاہر نہیں کرتے تھے۔ اگرچہ بعض موقعوں پر ان کی دشمنی خود بخود کھل کر سامنے آ جاتی تھی، لیکن یہ لوگ غرور اور حسد کا شکار تھے اور مسلمانوں کو علامیہ بے وقوف کرتے تھے۔

۳۔ ان آیات کے نزول تک عام منافقین کا گروہ ابھی نمایاں طور پر سامنے نہیں آیا تھا۔ جب کہ اہل کتاب میں سے عام یہودی بالکل نمایاں تھے اور اس جگہ وہی مراد ہیں۔ اور قرآن نے ان کو بھی ان کے غرور، حسد، بغض اور بد نیت کی وجہ سے منافق قرار دیا ہے۔

اگرچہ قرآن میں جہاں بھی «فِيْ قُلُوبِهِ مَرَضٌ» کے الفاظ آئے ہیں، ان سے عام طور پر منافقین ہی کا گروہ مراد لیا گیا ہے اور یہ صحیح بھی ہے۔ لیکن عربی زبان میں ((فَلَانٌ فِيْ قُلُوبِهِ مَرَضٌ)) کے یہ معنی ہوتے ہیں: ”فلان شخص کے دل میں بد نیت ہے۔“ ”اس کے دل میں کھوٹ ہے۔“ ”اس کی نیت خراب ہے۔“ ”وہ بد نیت آدی ہے۔“ اور ضروری نہیں کہ ایسا شخص اصطلاحی طور پر ”منافق“ ہی ہو۔

سورہ الاحزاب میں ازواج مطہرات کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ:

﴿يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحِيلَّ مِنَ النِّسَاءِ إِنَّ الْقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضُعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْبَعَ الَّذِي فِيْ قُلُوبِهِ مَرَضٌ وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَعْرُوفًا﴾ (الاحزاب: 32:33)

”اے نبی کی بیوی! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ اگر تم اللہ سے ذرنے والی ہو تو کسی ناخرم سے بات کرتے ہوئے اپنے لبھ میں نرمی اختیار نہ کرو کہ جس شخص کی نیت خراب ہو وہ لائچ میں پڑ جائے، بلکہ صاف اور کھری بات کہو۔“

اس آیت میں «الَّذِي فِيْ قُلُوبِهِ مَرَضٌ» ”جس کے دل میں کھوٹ ہے۔“ ”جس کی نیت خراب ہے۔“ ”جو بد نیت ہے۔“

ظاہر ہے اس سے اصطلاحی ”منافق“ مراد لینا ضروری نہیں ہے۔

قرآن کے اولین مخاطبین دو ہی گروہ تھے۔ ایک عرب کے مشرکین۔ جن کو ”امیتین“ کہا جاتا تھا، اور دوسراۓ اہل کتاب تھے۔

پھر مشرکین میں کچھ ایسے تھے جو دین حنفی کے پیروکار اور موحد تھے۔ بت پرستی سے پیزار تھے۔ ان کو حق کی جلاش تھی۔ جب ان لوگوں تک اسلام کی دعوت پہنچی تو انہوں نے اسے جلد قبول کر لیا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو شروع میں کافر تھے مگر بعد میں مسلمان ہو گئے۔ سورہ البقرہ آیت 3 میں ان دونوں قسم کے مومنین کا ذکر ہے۔ لیکن ان میں سے کئی مشرک سردار ایسے تھے جنہوں نے ضد اور ہٹ دھرمی کے ساتھ کفر کی راہ اختیار کی اور وہ آخردم تک اسلام کے دشمن رہے۔ ان

کے دلوں پر مہر لگا دی گئی اور یہ ایمان لانے کی صلاحیت سے عاری ہو گئے۔ آیت ۶ اور ۷ میں انہی کفر قسم کے کافروں کا ذکر آیا ہے۔

قرآن کا دوسرا مخاطب گروہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کا تھا لیکن ان میں بھی کئی طرح کے لوگ تھے۔

ایک وہ تھے جو اپنے مذہب یہودیت یا نصرانیت کے سچے پیروکار تھے۔ حق پسند اور سلیم الفطرت تھے۔ جب ان کو رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا علم ہوا تو ان لوگوں نے بہت جلد اسلام قبول کر لیا۔ آیت ۴ میں انہی کا ذکر ہے۔

پھر ان میں بعض علماء اور سردار تھے جو آخر وقت تک اسلام کے خلاف رہے۔ ان کے دلوں پر بھی مہر لگ گئی اور یہ لوگ بھی ایمان لانے سے محروم ہوئے۔ آیت ۶ اور ۷ میں جن کٹر کفار کا ذکر ہے، ان میں یہ لوگ بھی شامل ہیں، جیسے کعب بن اشرف اور حبی بن الخطب وغیرہ۔

ان کے علاوہ عام اہل کتاب بھی تھے جو ایمان کا دعویٰ تو کرتے تھے، مگر ایمان سے خالی تھے۔ آخرت کو بھی مانتے تھے مگر ان کا آخرت کو ماننا یا اسہ ما نابرا بر تھا۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو ”بختے بختا شے“ سمجھتے تھے۔ یہ بگڑے ہوئے اہل کتاب تھے۔ اوہاں (SUPERSTITIONS) کا شکار تھے اور خوش فہمیوں (امانی) میں بتلا تھے۔ قرآن نے ان کو بھی ان کے کفر، غرور، حسد اور تعصب کی وجہ سے منافقین کہا ہے، حالاں کہ یہ عام منافقین کی طرح نہ تھے جو ظاہر میں مسلمان اور باطن میں کافر تھے اور جن کا ذکر آگے چل کر سورہ آل عمران اور سورہ النساء میں آئے گا جو سورہ البقرہ کے کچھ عرصہ بعد نازل ہوئی ہیں، جب منافقین کا گروہ معاشرے میں نمایاں ہو کر سامنے آ چکا تھا۔

اس مقام پر بعض لوگوں کو، جو قرآن کے ایک خاص اسلوب سے صحیح طور پر واقف نہیں ہیں، یہ غلط فہمی لاحق ہو گئی ہے کہ یہودی منافقین کا مذکورہ گروہ صرف اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتا تھا جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ پورے ایمان کا دعویٰ کرتے تھے، جس میں نبیوں اور کتابوں وغیرہ پر بھی ایمان لانا شامل تھا کہ ہم بھی ایمان والے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ حضرت محمد ﷺ کی نبوت و رسالت اور قرآن پر ایمان نہیں رکھتے تھے، اس لیے ان کے بارے میں کہا گیا کہ ﴿مَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ﴾ کہ ”وہ مومن نہیں ہیں۔“ قرآن کا یہ اسلوب بہت عام ہے کہ وہ صرف ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا ذکر کر کے اس سے پورا ایمان مراد لیتا ہے جس میں نبیوں اور کتابوں وغیرہ پر بھی ایمان لانا شامل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سورہ النور میں ہے کہ:

﴿الرَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاجِدٍ مِنْهُمَا مِائَةً جَلْدَةً وَلَا تَأْخُذْ كُمْ بِهِمَا رَأْفَةً فِي دِينِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَيَشَهَدُ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۵۰﴾

(النور: 24)

”زانی عورت اور زانی مرد دنوں میں سے ہر ایک کو سو (100) کوڑے مارو، اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو تو اللہ کے حکم کی قیمتی میں تمہیں ان دنوں پر حرم نہیں آنا چاہیے۔ اور ان دنوں کی سزا کے

وقت مسلمانوں کا ایک گروہ وہاں موجود ہونا چاہیے۔“

دیکھ لیجیے، اس جگہ صرف ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا ذکر ہے مگر اس سے مراد مکمل ایمان ہے۔

ایک اور مثال دیکھئے۔ سورہ النساء میں ہے کہ:

﴿هُنَّا يَأْتِيهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطْبَعُوا اللَّهَ وَ أَطْبَعُوا الرَّسُولَ وَ أُولَئِكَ الْأَمْرُ مِنْكُمْ حَفَّ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرْدُوهُ إِلَى اللَّهِ وَ الرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَ الْيَوْمِ الْآخِرِ طَذِيلَكَ خَيْرٌ وَ أَحْسَنُ تَأْوِيلًا﴾ (النساء: ۴)

”اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی، اطاعت کرو رسول کی، اور ان کی جو تم میں سے صاحب اختیار ہیں۔

پھر اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اے اللہ اور اس کے رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی طریقہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اس کا انجام بہت اچھا ہے۔“

مذکورہ آیت میں بھی صرف اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان لانے کو پورا ایمان لانا قرار دیا گیا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اس آیت 8 میں عام الہ کتاب مراد ہیں اور ان کے کفر، حسد، تعصب اور بعض کی وجہ سے ان کو بھی منافق کہا گیا ہے۔ اللہ اعلم بالصواب۔

یہ آیت آج ان مسلمانوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے جو زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں مگر اپنے اعمال میں کافروں سے بھی بدتر ہیں۔

﴿يُخَذِّلُونَ اللَّهَ وَ الَّذِينَ آمَنُوا وَ مَا يَخْدَلُ عَوْنَ إِلَّا أَنفُسُهُمْ وَ مَا يَشْعُرُونَ ط﴾ (9)

پہلے ان یہودی منافقوں کے بارے میں بتایا گیا کہ یہ ایمان کے مدعی تو ہیں مگر حقیقت میں ایمان والے نہیں ہیں۔ اب اس جگہ ان کی یہ خصوصیت بیان کی جا رہی ہے کہ یہ لوگ اپنے دل کا حسد اور تعصب چھپا کر اللہ تعالیٰ اور اہل ایمان کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ جب کہ اللہ بجائے ان کی ہر چھپی اور ظاہر حرکت کو جانتا ہے۔ اس لیے یہ اللہ تعالیٰ اور اہل ایمان کو دھوکا دینے کی جو کوش کر رہے ہیں، وہ حقیقت میں اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں لیکن ان کو اس کا شعور نہیں ہے۔ بالآخر یہ لوگ اپنے کیے کی سزا بھکتیں گے۔

﴿فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَرَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا وَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ لَمَّا كَانُوا يَكْنِي بُوْنَ﴾ (10)

عربی محاورہ ہے کہ ((فُلَانٌ فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ)) ”فلان شخص کے دل میں فتور ہے“ یا اس کے دل میں بد نیتی ہے، یا اس کی نیت خراب ہے۔ مَرَضٌ کے اصل معنی تو شک کے ہیں مگر یہ منافق، تعصب، حسد اور دشمنی کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ اس آیت میں الہ کتاب کے عام یہود مراد ہیں۔ جنہوں نے حسد اور تعصب کی بنا پر نبی ﷺ کی

دھوت کا انکار کیا۔ پھر جس قدر اسلام پھیلتا گیا، اسی نسبت سے ان لوگوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف حسد، تعصب اور بغض بڑھتا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمادیا کہ ان کو ان کے ایمان کے جھوٹے دعوے اور اسلامی دشمنی کی وجہ سے آخرت میں دوزخ کا دردناک عذاب ہو گا۔

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ۝ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَكِنْ لَا يَشْعُرُونَ ۝﴾ (12,11)

‘فساد فی الارض’ قرآن کی ایک اصطلاح ہے، جس سے مراد کوئی متعین جرم یا گناہ نہیں ہوتا، بلکہ اس کے مفہوم میں شریعت کے کسی بھی حکم کی خلاف ورزی سے لے کر اسلامی نظم اجتماعی کے خلاف بغاوت تک، ہر قسم کے جرائم اور گناہ شامل ہوتے ہیں۔ قرآن کی رو سے چوری بھی فساد فی الارض ہے، جیسا کہ سورہ یوسف 12:73 میں چوری کا الزام لگنے پر یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا بیان ہے کہ:

﴿قَالُوا تَاللَّهِ لَقَدْ عِلِمْتُمْ مَا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كُنَّا سُرْقِينَ ۝﴾ (یوسف 73:12)
”انہوں (یوسف علیہ السلام کے بھائیوں) نے کہا: اللہ کی قسم! تمہیں معلوم ہے ہم لوگ زمین میں فساد کرنے نہیں آئے، ہم چور نہیں ہیں۔“

اسی طرح ناپ قول میں کمی کرنا بھی فساد فی الارض ہے۔ (ہود 11:85)۔ تکبیر اور اشکار بھی فساد فی الارض ہے۔
(القصص 28:83) اور اسلامی حکومت سے بغاوت کرنا بھی فساد فی الارض ہے۔ (المائدہ 5:33)

عربی زبان میں ”فساد“ کی ضد ”صلاح“ (یا اصلاح) ہے۔

اس مقام پر عام یہودیوں کا فساد فی الارض یہ تھا کہ انہوں نے حضرت محمد ﷺ کی نبوت و رسالت اور قرآن پر ایمان لانے کی بجائے ان کا انکار کیا۔ اپنی یہودیت کو راہ ہدایت، دین حق اور نجات کا راستہ سمجھا۔ مسلمانوں کو سر عالم بے وقوف کہا۔ کفر و اسلام کی کلکش میں کفار و مشرکین کا ساتھ دیا اور دین اسلام کو پھیلنے سے روکنے کے لیے اس کی راہ میں روڑے انکائے۔

﴿إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ﴾ ”ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔“ کی تفسیر میں حضرت عبد اللہ بن عباس کا قول ہے کہ:
(انما نرید الاصلاح بين الفريقيين من المؤمنين واهل الكتاب)
”ہم تو مسلمانوں اور اہل کتاب (یہودیوں) کے درمیان صلح صفائی چاہتے ہیں۔“
افسوس! آج مسلمانوں کے کتنے ہی حکمران، سیاسی لیڈر اور مذہبی پیشوائیسے ہیں جو اصلاح کے نام پر فساد فی الارض کے مرتكب ہیں۔

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَعْنُوا كَمَا أَمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا أَمَنَ السُّفَهَاءُ وَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَكِنْ لَا يَعْلَمُونَ ۝﴾ (13)

السُّفَهَاءُ: یہ سَفِيْهَهُ کل جمع ہے جس کے معنی بے وقوف اور احمق کے ہیں۔

جب یہودیوں کو دین حق کی دعوت دی جاتی اور ان سے یہ کہا جاتا کہ جس طرح دوسرے لوگ مہاجرین، انصار اور دوسرے صحابہ کرام جیسے عبد اللہ بن سلام رض ایمان لائے ہیں، اس طرح تم بھی ایمان لاو، تو جواب میں بڑی رعنوت اور تکمیر سے کہتے "یہ سب تو بے وقوف ہیں۔ ہم ان کی طرح کے نہیں ہیں کہ ایمان قبول کر کے اپنی حماقت کا خبوت دیں۔"

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ لوگ تمہیں بے وقوف کہر ہے ہیں حالاں کہ بے وقوف یہ خود ہیں اور نہیں جانتے کہ صحیح ایمان کیا ہوتا ہے۔ فساد اور اصلاح میں کیا فرق ہے اور خود ان کا اپنا لفظ نقصان کس چیز میں ہے۔

﴿كَمَا آمَنَ النَّاسُ﴾ "جیسے دوسرے لوگ ایمان لائے۔" میں لفظ "كَمَا" (جیسے) سے بعض لوگوں نے یہ مطلب سمجھا ہے کہ سچائی اور خلوص سے ایمان لانا مراد ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ محض تکلف ہے کیونکہ دوسرے مقام پر انہی یہودیوں کے بارے میں فرمادیا کہ:

﴿فَإِنْ أَمْنُوا بِيُشْلِ مَا أَمْنَتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَإِنْ تَوَلُّوا فَإِنَّهَا هُمْ فِي شِقَاقٍ﴾ (البقرہ 2:137)

"پھر اگر یہ اہل کتاب یہودی بھی اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم مسلمان ایمان لائے ہو تو پھر یہ بھی ہدایت پا گئے۔ لیکن اگر وہ منہ موڑیں تو پھر وہ ضد میں اڑے ہوئے ہیں۔"

﴿وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ أَمْنُوا قَالُوا إِنَّا أَمْنَأُّا وَإِذَا خَوَوْا إِلَى شَيْطَنِيهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعْلُومُ إِنَّهَا لَحُنْ عَسْتَهُزَءُونَ﴾ (14)

شیاطین جمع ہے شیطان کی۔ ہر سرکش، شریر اور خود سرخواہ وہ انسان ہو یا جن، شیطان ہے۔ اس جگہ کفار و یہود کے سرداروں کو شیاطین کہا گیا ہے کیونکہ وہی اسلام کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ جب عام یہودی لوگ مسلمانوں سے ملتے تو کہتے "جناب ا صرف آپ لوگ ہی ایمان والے نہیں ہو، ہم بھی ایمان والے ہیں۔ بلکہ جدی پشتی مون ہیں۔" وہ بھی یوں نہ کہتے کہ: ہم بھی ان سب چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں جن پر تم ایمان رکھتے ہو۔ کیونکہ اس طرح کا ایمان رکھنے والوں کو وہ علاویہ بے وقوف کہا کرتے تھے۔ یاد رہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان لانے والوں کو ہی وہ احمد کہتے تھے۔

یہ عام قسم کے یہودی بھی اگرچہ اسلام کے خلاف تھے مگر اپنے ان سرداروں کی طرح اسلام کے کثر دشمن نہ تھے، جن کا ذکر آیت 6 اور 7 میں آیا ہے۔ بلکہ یہ لوگ چاہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان کوئی سمجھوتہ (COMPROMISE) ہو جائے جس کے بعد وہ ایک دوسرے کو برداشت کر لیں۔ ہر فرقی اپنے دین پر چل مگر دوسرے کے دین میں کوئی دخل نہ دے۔ گویا یہ لوگ میں المذاہب ہم آہنگی اور مکالے (INTER FAITH) HARMONY AND DIALOGUE کے قائل تھے۔ ان کے خیال میں اسلام کی دعوت نے ملک میں افراتفری اور باہمی فساد کی حالت پیدا کر دی ہے جس کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ اس لیے جب ان سے کہا جاتا کہ تم

لوگ سچا ایمان قبول کر کے کفر و اسلام کی شکش میں اپنا وزن اسلام کے پڑائے میں ڈالو۔ جھوٹ، فریب اور تعصب کے ذریعے فساد فی الارض کا ارتکاب نہ کرو تو یہ جواب دیتے کہ ”هم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔“ مسلمانوں سے ”مفاهیم“ اور ”ذہبی رواداری“ کا اظہار کرنے کے بعد جب یہ لوگ اپنے شریروں کی مجلسوں میں جاتے تو وہاں ان پر ان کے اس طرزِ عمل پر سخت اعتراض ہوتا تو جواب میں ان سے کہتے ”ارے میاں! ہم تمہارے ہی ساتھی ہیں، مسلمانوں سے سمجھوتے اور صلح صفائی کی باتیں ہم صرف دل لگی اور مذاق کے طور پر کرتے ہیں۔

﴿اللّٰهُ يَسْتَهِزُ عَبِيهِمْ وَ يَمْلُدُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَلُونَ﴾ (15)

”مُسْتَهِزُءُونَ“ کے جواب میں ﴿اللّٰهُ يَسْتَهِزُ عَبِيهِمْ﴾ ”اللّٰہ بھی ان سے مذاق کرتا ہے۔“ فرمانا عربی زبان کے ایک خاص اسلوب کے لحاظ سے ہے، جسے اصطلاح میں ”مشاکلہ“ کہا جاتا ہے۔ اس میں کسی لفظ کے جواب میں وہی لفظ دہرایا جاتا ہے جس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ ایک غلط کام جس نے کیا ہے، وہ اس کا بدله پائے گا، اس کا نتیجہ بھگتے گا اور اس کی غلط حرکت کی سزاوی جائے گی۔ جیسا کہ قرآن مجید میں دوسرے مقام پر ہے کہ:

﴿وَجَرَأَ عَلَى سَيِّئَةٍ سَيِّئَةً مُّغْلَهَا﴾ (الشوری 40:42)

”اور برائی کا بدله اتنی برائی سے لیا جاسکتا ہے جتنی برائی کی گئی۔“

حالاں کہ سب جانتے ہیں کہ برائی کے بدله میں جو برائی کی جائے گی وہ حقیقت میں برائی نہیں ہوتی لیکن ”مشاکلہ“ کی وجہ سے اسے بھی برائی سے تعمیر کیا گیا۔

مشہور جاہلی شاعر عمرو بن كلثوم اپنے ”معلقة“ میں کہتا ہے:

أَكَالَا يَجْهَلُنْ أَحَدُ عَلَيْنَا فَنَجَهَلْ فَوْقَ جَهَلِ الْجَاهِلِينَا

”خبردار! کوئی ہمارے خلاف جہالت نہ کرے، ورنہ جاہلوں کی جہالت سے بڑھ کر ہم جہالت کریں گے۔“

مراد ہے کہ بدله لیں گے۔

انگلش میں ایسے موقع کے لیے یہ محاورہ بولا جاتا ہے:

”TO PAY IN THE SAME COIN“

طغیان: یہ طغی سے ہے جس کے معنی حد سے بڑھنے یا سرکشی کرنے کے ہیں۔

یعْمَهُونَ: اس کا ماضی عہدہ ہے جس کے معنی ہیں: کسی شخص کا بے بصیرت ہونا۔ عقل کا انداہا ہوتا، بدھواں ہوتا اور بھٹکا یا بہکا ہوتا ہوتا۔

اللّٰہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ان کے مذاق کرنے کی سزادے گا۔ ابھی انہیں اتنا جنت کے لیے ڈھیل اور مہلت دی جا رہی ہے تاکہ یہ لوگ اپنی سرکشی اور نافرمانی میں ساری حدیں پھلاگ لیں اور گمراہی کی حالت میں پریشان پھریں۔

﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُ الْضَّلَالَةَ بِإِلْهُدَىٰ فَهَا رَيَحْتُ تِجَارَتُهُمْ وَ مَا كَانُوا

(16) ﴿۱۶﴾ مُهْتَدٰيُنَ

إشتُرَىٰ کے معنی ”خریدنے“ کے ہیں لیکن قرآن میں یہ لفظ اکثر ”ترجیح دے کر کوئی چیز حاصل کرنے“ کے معنوں میں آیا ہے۔ کیونکہ جو چیز خریدی جاتی ہے وہ اپنی رقم پر ترجیح دے کر ہی خریدی جاتی ہے۔ اس جگہ بھی یہ اسی مفہوم میں ہے۔ عام یہودیوں کے بارے میں فرمایا گیا کہ انہوں نے ہدایت کی بجائے گمراہی خریدی۔ ایمان کی جگہ کفر لے لیا۔ اپنے لیے گھاٹے کا سودا کیا۔ اہل ایمان کو بے وقوف کہنے والے خود احمد اور بے وقوف ثابت ہوئے۔ ہدایت کی سیدھی راہ پر چلنے کی بجائے گمراہی کی بھول بھلیوں میں بھکلتے پھر نے کو ترجیح دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ایمان سے محروم اور ہدایت کی منزل سے دور ہو گئے۔

یاد رہے کہ عرب یہودیوں کی اکثریت نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔

﴿مَثَلُهُمْ كَمِثْلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا إِنَّمَا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ﴾

وَتَرْكُهُمْ فِي ظُلْمٍ تِّلْكُمْ لَا يُبَصِّرُونَ ﴿١٧﴾

مَثُلُ (یا مِثْلٌ) کے معنی ”مثال“، ”حالت“ اور ”کیفیت“ کے ہیں۔

ذہب (ب) کے معنی اذہب کے ہیں کہ ساری روشنی لے گیا۔

یہ مثال ان یہودی سرداروں (جیسے کعب بن اشرف وغیرہم) کے بارے میں بیان ہوئی ہے جو اپنے ذاتی مقادات کی خاطر اسلام کے کثر دشمن اور مخالفین گئے تھے اور جن کا ذکر آیت 6 اور 7 میں آچکا ہے۔ ان کے سامنے ایک روشنی نمودار ہوئی، جس نے اپنے ماحول میں اجالا کر دیا، لیکن جب ان لوگوں نے نہ تو اس روشنی کی کوئی قدر کی، اور نہ اس سے کوئی فائدہ اٹھایا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے روشنی ختم کر دی، ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا، جہاں ان کو پکھج دکھائی نہیں دیتا۔

(١٨) ﴿صَمْ بِكُمْ عَمَّى فَهُمْ لَا يُرِجِّعُونَ﴾

﴿صُمْ بُكْمٌ عُمَى﴾ کے الفاظ حرف عطف ”واد“ کے بغیر لانے میں بلا غلط کا یہ نکتہ ہے کہ ان لوگوں میں بیک وقت یہ تینوں صفات پائی جاتی ہیں۔ جیسا کہ اسماعے حصتی بھی بغیر واد کے آتے ہیں۔ اب گویا ان لوگوں کے کام بہرے ہیں کہ حق بات سن نہیں سکتے۔ ان کی زبان میں گنگ ہیں کہ حق بات کہہ نہیں سکتیں۔ ان کی آنکھیں انہی ہیں کہ حق ان کو نظر نہیں آتا۔ یہ لوگ سوچنے سمجھنے اور غور و فکر کرنے کی ساری صلاحیتوں سے عاری ہو چکے ہیں۔ اب ان کا راہ ہدایت کی طرف پلٹنا ناممکن ہو گیا ہے کیونکہ ان کی فطرت سلیمانہ مردہ ہو گئی ہے اور ان میں قبول حق کی استعداد ختم ہو چکی ہے، ان کی اسی حالت کو آیت 6، اور 7 میں ﴿خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ...﴾ ”اللَّهُ تَعَالَى نے ان کے دلوں پر مهر لگا دی۔“ کے الفاظ سے بیان کیا ہے۔

﴿أَوْ كَسِيرٌ مِّن السَّمَاءِ فِيهِ طُلُمْتُ وَرَعْدٌ وَّبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصْبَاعَهُمْ فِي أَذَانِهِمْ﴾

١٩- مِنَ الصَّوَاعِقِ حَتَّىٰ الْهُوَتْ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكُفَّارِينَ

صَيْبٌ: کے معنی ”موئے موئے قطروں کی زوردار برسنے والی بارش“ کے ہیں۔

صَوَاعِقُ: یہ صاعقه کی جمع ہے جس کے معنی ہیں: آسمانی بجلی جوز میں پر گرتے ہی ہرشے کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔

یہ دوسری مثال ان عام یہودیوں کی وہنی حالت کی ہے جن کا ذکر آیت 8 کے الفاظ ﴿وَمِنَ النَّاسِ﴾ سے شروع ہوا ہے۔ گویا ان لوگوں کے سامنے ایک ایسی بارش بر سی جس کی کالی گھٹاؤں سے اندر ہمراہ اندھیرا چھا گیا۔ جس میں بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک تھی۔ بجلی گرنے کے خوف اور موت کے ڈر سے وہ اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیتے ہیں۔ جب وہ چکتی ہے تو اس کی روشنی میں دو چار قدم چل لیتے ہیں۔ پھر اندر ہمراہ ہو جاتا ہے تو کھڑے رہ جاتے ہیں۔

اس مثال میں بارش سے مراد اسلام کی دعوت ہے، جو بارش کی طرح اہل زمین کے لیے فائدہ مند ہے۔ گرج، کڑک اور اندر ہمراہ اسلامی احکامات ہیں جو ان یہودیوں پر، جو ایمان اور شریعت کے جھوٹے دعوے دار تھے، سخت گران گزرتے تھے۔ یہ بات ان کے قوی غرور اور نسلی تقویت کے خلاف تھی کہ وہ بنی اسماعیل علیہ السلام کے بنی حضرت محمد ﷺ پر ایمان لا سیں۔ یہ لوگ توریت کے علاوہ قرآن مجید کو اللہ کا کلام مانتے کے لیے ہرگز تیار نہ تھے۔ ان پر نماز، روزے، زکوٰۃ اور جہاد جیسے احکام بہت بھاری تھے۔ وہ خواہشات کے پچاری، جھوٹی آرزوؤں کے دل دادہ اور نجات پا لینے کی خوش ہنگی میں مبتلا تھے۔ ابتدائی دور کے مہاجرین کی تجھ دستی دیکھتے ہوئے ان مفاد پرستوں کو اسلام میں کوئی کشش محسوں نہیں ہوتی تھی۔

آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کافروں کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ یہ اس کے قابو میں ہیں۔ اس کی گرفت سے بچ کر کہیں جاسکتے، وہ جب چاہے گا ان کو ان کے گناہوں کی سزا دے گا۔

﴿يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطُفُ أَبْصَارَهُمْ إِذَا مُلِمْلِمًا أَضَاءَ لَهُمْ مَشْوَافِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا وَكَوْشَأَ اللَّهُ لَذَّهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ (20)

وہ اسلام کی دعوت کو پھولتا پھلتا دیکھ کر سخت پریشان اور حواس باختہ ہو گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس صورت حال کا مقابلہ کیسے کریں۔ یہودی سرداروں کے گروہ کے بر عکس ان عام یہودیوں میں قبول حق کی تھوڑی بہت صلاحیت موجود تھی مگر انہوں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا اور اسلام کی مخالفت کر کے وہ استعداد بھی ضائع کر دی۔

اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، وہ چاہے تو انسان کو اپنی عطا کی ہوئی سونپنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے جب چاہے، محروم کر دے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿٣﴾ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الشَّهَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا اللَّهَ بِنَاءً ۚ آنذاً وَآنَّتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٤﴾

”اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو، جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے ہو گزرے، تاکہ تم عذاب سے نجّ جاؤ۔ اسی نے تمہارے لیے زمین کا فرش بنایا، آسمان کی چھت بنائی، وہ بادلوں سے بارش بر ساتا اور اس کے ذریعے تمہاری روزی کے لیے پھل اور انواع پیدا کرتا ہے۔ لہذا تم جانتے ہو مجھے کسی کو اللہ کا شریک نہ بناؤ۔“ (22-21)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴾ (21)

مومنین، کفار اور یہودی متفقین کے ذکر کے بعد اب تمام انسانوں کو خطاب کر کے وہ اصل دعوت دی جا رہی ہے، جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے میں پیغمبر بھیجے کہ صرف ایک اللہ کی عبادت کی جائے:

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنْ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنَبُوا الطَّاغُوتَ ﴾ (التحل: 16)

”اور ہم نے ہر امت میں کوئی نہ کوئی پیغمبر بھیجا کہ (اے لوگو!) ایک اللہ کی عبادت کرو اور شیطان سے بچو۔“ بندوں پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا حق ہی ہے کہ بندے صرف اسی کی عبادت کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ بنایں۔ عبادت کی شرائع سورہ الفاتحہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ اب اس حوالے سے فطری دلیل دی گئی ہے کہ جب تم سب کا خالق ایک ہے تو معبود بھی ایک ہونا چاہیے۔ جب دوسرا کوئی خالق نہیں ہے تو دوسرا کوئی معبود بھی نہیں ہو سکتا۔

یاد رہے کہ قرآن کے اولین مخاطبین اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا خالق مانتے تھے، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

﴿وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ...﴾ (الزخرف: 43)

”اور اگر ان سے پوچھو کہ ان کو کس نے پیدا کیا؟ تو کہیں گے ”اللہ نے۔“

آخر میں فرمایا کہ صرف اللہ کی عبادت کر کے تم اس کے غضب اور عذاب سے نجّ سکتے ہو اور اس کی رضا اور

خوشنودی حاصل کر کے دنیا اور آخرت میں کامیاب ہو سکتے ہو۔

﴿الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَ السَّمَاءَ بِنَاءً...﴾ (22)

بَنَاءً کے اصل معنی ”کسی چیز پر کوئی دوسرا چیز رکھ کر مخصوص شکل بنادینے“ کے ہیں۔ اس جگہ اس سے مراد یہ ہے کہ آسمان کو گویا ایک شامیانے، یا خیمے، یا گنبد کی گول چھپت کی طرح زمین پرتان دیا گیا ہے۔ اس جگہ یہ ارشاد ہوا کہ اللہ تعالیٰ فتنم انسانوں کے لیے زمین کو فرش کی طرح بچھا دیا تاکہ وہ تمہارے رہنے کی جگہ بن جائے۔ اسی مضمون کو قرآن نے دوسری جگہ اس طرح بیان کیا ہے:

﴿اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ قَرَارًا﴾ (المؤمن 40:64)

”اسی اللہ نے تمہارے لیے زمین کو مٹھکانہ بنایا۔“

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے لیے آسمان کو چھپت کی طرح بنادیا۔ اسی بات کو سورہ الانبیاء میں یوں فرمایا گیا:

﴿وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَحْفُوظًا...﴾ (الانبیاء 21:32)

”اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھپت بنایا۔“

﴿وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الشَّرَكِ رِزْقًا لَكُمْ﴾ (22)

اور تمہارا وہی رب ہے جو آسمان (یا بادلوں) سے پانی اتراتا ہے۔ اسے بارش کی صورت میں برساتا ہے۔ پھر اس کے ذریعے بچھل میوے اور انانچ پیدا کرتا ہے تاکہ تمہیں غذا مہیا کرے۔

جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوا:

﴿قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ..... فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ﴾ (یونس 10:31)

”کہہ دیجیے! کون تمہیں آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے؟..... تو وہ کہیں گے، اللہ۔“

﴿فَلَا تَجْعَلُوا إِلَهًا أَنَّدَادًا وَ أَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴾ (22)

انَّدَاد جمع ہے بَنْد کی جس کے معنی حریف، مقابل اور شریک کے ہیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی یہ ساری قدرتیں اور نعمتیں دیکھنے کے بعد تم کسی اور کو اس کا شریک یا حریف نہ بناو۔ کیونکہ تم جانتے ہو کہ تمہیں پیدا کرنے والا ایک ہی ہے، اس کے سوا کوئی اور خالق نہیں۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ زمین کا فرش بچھانے والا، آسمان کی چھپت بنانے والا، بارش برسانے والا، اس کے ذریعے تمہاری روزی کی خاطر زمین سے بچھل میوے اور انانچ پیدا کرنے والا ایک ہی ہے، اس کے سوا کوئی اور نہیں۔ جب تم یہ سب کچھ جانتے اور مانتے ہو تو اسی ایک رب کو اپنا معبود سمجھو۔ کسی اور کو اپنا معبود نہ بناؤ صرف اسی کی عبادت کرو۔ اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو۔ توحید کا اقرار کرو اور ہر قسم کے شرک سے بچو۔

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَى عَبْدِنَا فَأُتُوا بِسُورَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ^۱
وَادْعُوا شَهِدًا إِذَا كُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَدِيقِينَ ^۲ فَإِنْ لَمْ
تَفْعَلُوا وَلَكُنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ^۳
أُعِدَّتْ لِلْكُفَّارِينَ ^۴

”اور اگر تمہیں اس کلام میں ذرا بھی شک ہو جو ہم نے اپنے خاص بندے پر اتنا رہے، تو تم بھی اس جیسی کوئی سورت بنالا اور اللہ کے مقابلے میں اپنے سارے حمایتیوں کو مدد کے لیے بلا لو، اگر تم سچے ہو۔ پھر اگر تم ایسا نہ کر سکو، اور تم ہرگز نہ کر سکو گے تو ڈروں آگ سے جس کا ایندھن بنیں گے آدمی اور پتھر، اور جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔“ (24-23)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

﴿وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَى عَبْدِنَا فَأُتُوا بِسُورَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ وَادْعُوا
شَهِدًا إِذَا كُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَدِيقِينَ ^۱﴾ (23)

شہدائُ، شہید کی جمع ہے جس کے اصل معنی گواہ کے ہیں، لیکن اس جگہ یہ ”حمایتی“ اور ”مدگاز“ کے معنوں میں ہے، خواہ وہ بت ہوں، یا انسان ہوں، یا جنات ہوں۔ جیسا کہ فرمایا گیا:

﴿قُلْ لَعِنْ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلَى أَنْ يَأْتُوا بِيُمْلِ هَذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِيُمْلِهِ
وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا^۵﴾ (بنی اسرائیل 17:88)

”کہہ دیجیے، اگر تمام انسان اور جنات مل کر اس جیسا قرآن لانا چاہیں تو نہیں لاسکتے، اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مدگار بن جائیں۔“

مطلوب یہ ہے کہ جن مذکورین کو حضرت محمد ﷺ پر اللہ تعالیٰ کا کلام نازل ہونے کے بارے میں شک ہے اور وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ اس شخص کا اپنا کلام ہے جسے وہ اللہ تعالیٰ کے کلام کے طور پر پیش کر رہا ہے، تو اگر وہ اپنے اس دعوے میں سچے ہیں تو ان کے لیے چیلنج ہے کہ وہ خود بھی طبع آزمائی کریں، اس کام میں اپنے سارے حمایتیوں کی مدد بھی حاصل کر لیں اور سب مل کر اس قرآن جیسی کوئی ایک سورت ہی بنا کر پیش کریں۔ پھر فیصلہ ہو جائے گا کہ خالق اور مختلفوں کے کلام میں کیا فرق ہوتا ہے۔

﴿فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا لَكُنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ^۶

اُعَدَّتْ لِلْكُفَّارِينَ ﴿٢٤﴾

الْعِجَازَةُ مُجَمَّعٌ هے حَجَرٌ کی، جس کے معنی پتھر ہیں۔ لیکن اس جگہ وہ بت مراد ہیں جن کی دنیا میں پوجا کی گئی۔ فرمایا کہ اگر وہ اس جیسی ایک سورت لانے کے چیلنج کا جواب نہ دے سکیں، اور وہ کبھی بھی اس کا جواب نہیں دے سکیں گے، تو ذریں جہنم کی اُس آگ سے، جو انسانوں اور پتھروں کو اپنا ایندھن بنالے گی، جو ان کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے جو وحی اور رسالت کا انکار کرتے ہیں۔

اس سے پہلے قرآن مجید نے اپنے مخالفین کو کئے میں چیلنج کیا تھا کہ اگر وہ اسے اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں مانتے، کسی مخلوق کا کلام مانتے ہیں تو اس جیسی کوئی ایک سورت ہی بنائیں کرو خدا دیں، یا اس جیسی دس سورتیں بنائیں کرو جیسا کہ سورہ ہود میں ہے:

﴿أَمْ يَقُولُونَ اُفْتَرَهُ طُولُ فَاتُوا بِعَشْرِ سُورٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيٍّ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَدِيقِينَ ﴾۵۰﴾
(ہود: 13)

”کیا وہ کہتے ہیں، اس شخص نے قرآن خود گھڑ لیا ہے۔ آپ کہیں: تم بھی ایسی دس (10) سورتیں بنالاؤ اور اپنی مدد کے لیے اللہ کے مقابلے میں جن کو بلا سکتے ہو، بلا لو، اگر تم سچ ہو۔“

اور تیسرا چیلنج یہ دیا کہ اس قرآن جیسا کوئی قرآن (یا کتاب) بنائیں کرو جیسا کہ اوپر سورہ بنی اسرائیل (17) کی آیت (88) کے حوالے میں آپ کہا ہے۔ یہ چیلنج بھی کمی دور میں دیا گیا تھا۔

یہ واقعہ ہے کہ قرآن کے اس چیلنج کا جواب نہ تو اُس زمانے کے مکرین دے سکتے تھے جب قرآن کا نزول ہوا، اور نہ اس کے بعد آج تک قرآن کا مخالف کوئی شخص اس چیلنج کا جواب دے سکا ہے۔ ایک آدھے نے اس کی کوشش بھی کی مگر منہ کی کھائی۔ اس کا سبب ظاہر ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور مجرہ ہے، جس کی نظر پیش کرنے سے تمام مخلوقات عاجز اور قاصر ہیں۔

کافروں کے ساتھ جن پتھروں کو دوزخ کی آگ کا ایندھن کہا گیا ہے، ان سے مراد دیوبندی دیوتاؤں کے وہ بت ہیں جو پتھروں سے تراش کر بنائے گئے اور جن کو معبود سمجھ کر ان کی پوجا کی گئی۔ ان بتوں کو دوزخ میں ڈالنے سے ان کے بیچاریوں کو یہ دکھانا مقصود ہے کہ جن کو تم نے خدائی کا درجہ دیا اور معبود بنائی کر پوجا، وہ دنیا میں خود کتنے بے نیں اور کمزور ہیں کہ اپنے آپ کو عذاب سے نہیں بچا سکتے۔

یہی مضمون ایک اور جگہ بھی آیا ہے:

﴿إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ حَصْبٌ جَهَنَّمَ طَأْتُمْ لَهَا وَرِدُونَ ۝ لَوْكَانَ هُوَلَاءُ إِلَهَةً مَا وَرَدُوهَا طَوْ كُلُّ فِيهَا خَلِدُونَ ﴾۵۰﴾
(الانبیاء: 21)

”بے شک تم اور تمہارے معبود جن کو تم اللہ کے سواب پختے تھے، سب دوزخ کا ایندھن بنیں گے۔ تمہیں وہیں

جانا ہے۔ اگر وہ پچے معبدوں ہوتے تو دوزخ میں نہ جاتے۔ اور تم سب کو اس میں ہمیشہ رہنا ہے۔“

اعجاز القرآن

اعجاز القرآن یعنی قرآن مجید کے مجھہ (Miracle) ہونے کے کئی پہلو ہیں۔ ذیل میں اس کی چند نمایاں خصوصیات بیان کی جاتی ہیں:

1۔ کلام الٰہی (Word of God):

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام (Word of God) ہے۔ اس کی دلیل خود قرآن میں موجود ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

﴿وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ إِسْتَجَارَكَ فَاجْرُهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلْمَةَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلَغُهُ مَا مَأْمَنَهُ طَذْلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (التوبہ: 6)

”اور اگر کوئی مشرک آپ سے پناہ طلب کرے، تو اسے پناہ دے دیں تاکہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اسے اس کی امان کی جگہ پہنچا دیں۔“

آج دنیا میں کوئی اور ایسا کلام نہیں جو کلام الٰہی کہلانے کا مستحق ہو اور کوئی کتاب ایسی نہیں جو اللہ کی کتاب ہو۔ یہ اعزاز آج صرف قرآن مجید کو حاصل ہے کہ وہ اللہ کا کلام بھی ہے اور اللہ کی کتاب بھی۔

2۔ محفوظ کلام:

قرآن مجید سے پہلے الہامی کتب نازل ہوئیں، لیکن آج وہ اپنی اصلی صورت میں کہیں موجود نہیں۔ امتداد زمانہ، مذہبی پیشواؤں کی خواہشات نفاسی اور شرارت کے باعث آج کوئی الہامی کتاب اپنی اصلی حالت میں محفوظ نہیں رہی۔ یہ خصوصیت صرف قرآن عزیز کو حاصل ہے کہ وہ اول روز سے آج تک اپنی اصلی صورت میں بالکل محفوظ ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک محفوظ رہے گا۔ کیونکہ اس کی خفاعت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھی ہے۔ قرآن اہل ایمان کے سیتوں میں اور تحریری طور پر مصاحف کی شکل میں موجودہ سو برس سے محفوظ ہے اور اس میں آج تک کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اس حقیقت کو اپنے اور بیگانے سب تسلیم کرتے ہیں۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الْدِّيْنَ كَرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَفِظُونَ﴾ (الحجر: 9)

”بے شک ہم نے اس ذکر یعنی قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔“

3۔ مجھہ کلام:

قرآن ایسا مجھہ (Miracle) ہے جس کی زبان، جس کا اسلوب (Style)، جس کا ظلم، جس کی فصاحت و

بلاغت اور جس کی اثر انگیزی (Effectiveness) سب مجھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو یہ مستقل اور ابدی (Permanent and Eternal) مجھہ عطا فرمایا ہے اس کے علاوہ قرآن عربی زبان کا بھی شاہکار (Masterpiece) ہے۔

قرآن نے اپنے مکرین اور مخالفین (Opponents) کو چیخ دیا ہے کہ اگر وہ اسے اللہ کا کلام نہیں مانتے تو اس جیسا کوئی اور کلام پیش کریں۔ اس جیسی دس سورتیں لا کر دکھائیں یا کم سے کم ایک ہی سورت اس جیسی بنا کر لے آئیں۔ مگر کوئی شخص قرآن کے اس چیخ کا جواب نہیں دے سکتا اور کوئی بھی اس جیسا کلام پیش کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

1- ایک مقام پر ارشاد ہوا کہ:

﴿قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْأَنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى أَنْ يَأْتُوَا بِيُشْلِ هَذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُوْنَ بِيُشْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا﴾ [بنی اسرائیل: 88]

”کہہ دیجیے کہ اگر تمام انسان اور جنات مل کر اس جیسا قرآن لانا چاہیں تو نہیں لاسکتے، اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مدگار بن جائیں۔“

2- دوسرے مقام پر فرمایا کہ:

﴿إِمَّا يَقُولُونَ افْتَرَاهُ طُقُلْ فَأَتُوا بِعَشْرِ سُورٍ مِثْلِهِ مُفْتَرِيٍّ وَادْعُوا مِنْ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَدِيقِينَ﴾ [ہود: 13]

”کیا وہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے قرآن خود گھڑ لیا ہے؟ آپ کہیں کہ تم بھی ویسی ہی دس (10) سورتیں بناؤ کر لے آؤ اور اپنی مدد کے لیے اللہ کے سوا جس کو بلا سکتے ہو بلا لو، اگر تم پچھے ہو۔“

3- تیسرا جگہ ارشاد ہوا کہ:

﴿وَ إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَى عَبْدِنَا فَاتُوا بِسُورَةٍ مِّنْ مِثْلِهِ وَ ادْعُوا شُهَدَاءَ آءَكُمْ مِّمَّنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَدِيقِينَ﴾ [البقرة: 23]

”اور اگر تمہیں اس کلام کے بارے میں ذرا بھی شک ہو، جو ہم نے اپنے خاص بندے پر اتنا رہے تو تم بھی اس جیسی کوئی سورت بنا لاؤ اور اللہ کے سوا اپنے سارے سماجی بھی اپنی مدد کے لیے بلا لو، اگر تم پچھے ہو۔“

4- کامل ہدایت (Complete Guidance):

قرآن مجید پوری انسانیت کے لیے کامل ہدایت نامہ ہے۔ انسانی زندگی کے ہر شعبے سے متعلق قرآنی ہدایات موجود ہیں۔ قرآن کے علاوہ دوسری ہر الہامی کتاب اس طرح زندگی کے تمام شعبوں کے بارے میں کامل ہدایت دینے سے قاصر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلْنَّاسِ ﴾ [البقرة: 185]

”رمضان وہ مبینہ ہے، جس میں ایسا قرآن نازل ہوا جو لوگوں کے لیے ہدایت ہے۔“
اور یہ قرآنی ہدایت انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔

5۔ عالمگیر کتاب:

قرآن سے پہلے کی تمام الہامی کتب کسی خاص علاقے، قوم یا نسل کے لیے ہدایت بن کر آئی تھیں کیونکہ وہ جن پیغمبروں پر نازل ہوئی تھیں وہ بھی کسی خاص علاقے، قوم یا نسل کی طرف میتوڑتے گئے تھے۔ لیکن قرآن عالمگیر کتاب ہے، کیونکہ یہ اللہ کے جس رسول حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوا وہ سارے جہان کے لیے معمouth ہوئے تھے۔

قرآن کا ایک عالمگیر ہونا خود قرآن مجید سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿ وَمَا هُوَ إِلَّا ذُكْرٌ لِّلْعَلَّمِينَ ﴾ [القلم: 52]

”اور یہ قرآن سارے جہان والوں کے لیے فتحت ہے۔“

اسی طرح حضرت محمد ﷺ کی رسالت کا عالمگیر ہونا درج ذیل آیات سے ثابت ہوتا ہے:

1.... ﴿ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَئِيْنَاعَ ﴾ [الاعراف: 158]

”کہہ دیجیے، اے لوگو! ابے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔“

دوسرے مقام پر ارشاد ہوا کہ:

2.... ﴿ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَلَّمِينَ ﴾ [الابیاء: 107]

”اور ہم نے آپؐ کو سارے جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔“

6۔ فتح و بیان کلام:

قرآن مجید ایک فتح و بیان کلام ہے۔ اس کی فصاحت و بلاغت کی نظر لانا مخلوق کے بس کی بات نہیں۔ قرآن کے الفاظ کی فصاحت، اس کے معانی کی بلاغت اور اس کا انداز بیان (Style)، سب مجذہ ہیں۔ قرآن کا انداز بیان نظم یا شاعری (Poetry) کا بیان نہیں ہے، لیکن اس میں اعلیٰ درجے کی شعریت موجود ہے۔ اس کا انداز بیان نثر (Prose) کا بھی نہیں کیونکہ اس میں جو سچع اور آہنگ (Rhythm) پایا جاتا ہے وہ کسی اور نثر میں نہیں۔

دور جدید کے نامور مصری ادیب ڈاکٹر طاہر حسین نے اس حوالے سے کیسی عمدہ بات کہی ہے:

((الْقُرْآنُ لَا نَظَمٌ وَ لَا نَثَرٌ بَلْ هُوَ الْقُرْآنُ))

”قرآن نہ تو نظم ہے، اور نہ نثر، بلکہ قرآن قرآن ہے۔“

7۔ تضاد (Contradiction) سے یا ک:

قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اللہ کا علم ہر شے پر محیط اور حاوی ہے۔ اس کے لیے ماضی، حال اور مستقبل

سب ایک جیسے ہیں۔ اس لیے قرآن مجید کی تعلیمات (Teachings) میں کوئی تضاد اور باہم اختلاف نہیں پایا جاتا، بلکہ اس کے مضمون میں مکمل آہنگی (Harmony) اور ارتباط (Integrity) پایا جاتا ہے۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿فَقَالَ يَعْنَدَرُونَ الْقُرْآنَ طَوَّلُوكَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا﴾

[النساء: 82]

”کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے آیا ہوتا تو وہ اس کے اندر بڑا اختلاف اور تضاد پاتے۔“

اس کے بعد دنیا کے فلاسفوں اور دانشوروں کے افکار و نظریات میں ہمیشہ تضاد پایا جاتا ہے۔

8۔ پُر تاثیر (Effective) کلام:

قرآن مجید ایک پُر تاثیر کلام ہے۔ اس کی اثر انگیزی مسلم ہے۔ یہ انسان کے دل و دماغ پر اثر کرتا ہے۔ جب کوئی قاریٰ قرآن پڑھتا ہے، تو اسے سنتے والا شخص خواہ قرآن کو سمجھے یا نہ سمجھے اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔
قرآن کا یہی وہ اعجاز تھا، جس نے کفار اور مشرکین کی نیندیں حرام کروی تھیں۔ وہ اس کی اثر انگیزی کو جادو سے تعبیر کرتے تھے اور صاحب قرآن علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نعمود باللہ جادوگر کہتے تھے۔

صحابہ کرام کی ایک تعداد صرف قرآن سن کر مسلمان ہوئی تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مشہور واقعہ ہے کہ وہ اپنی بہن حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے قرآن سن کر اسلام لائے۔ اسی طرح عرب کا سب سے مشہور شاعر لبید بھی قرآن سن کر ہی دائرہ اسلام میں داخل ہوا تھا۔

اسی مضمون کی یہ متفق علیہ حدیث بھی ہے:

((عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ تَعَالَى: مَا مِنَ الْأَنْبِيَاءِ مِنْ نَبِيٍّ إِلَّا قُدِّمَ أُعْطِيَ مِنَ الْآيَاتِ مَا مِثْلُهُ أَمَّنْ عَلَيْهِ الْبَشَرُ، وَإِنَّمَا كَانَ الَّذِي أُوْتِيتُ وَحْيًا أَوْحَى اللَّهُ إِلَيَّ، وَأَرْجُو أَنْ أَكُونَ أَكْثَرُهُمْ تَابِعًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ))

(صحیح بخاری، رقم: 4981۔ صحیح مسلم، رقم: 385)

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ تَعَالَى نے فرمایا:
تمام انبیاء کرام علیهم السلام کو مجرے دیے گئے، جن کے مطابق بعض انسان ان پر ایمان لائے۔ مجھے جو مجرے عطا ہوا وہ وہی یعنی قرآن مجید ہے جو اللہ تعالیٰ نے میری طرف نازل کیا۔ مجھے امید ہے کہ قیامت کے دن ان (انبیاء کرام) کے مقابلے میں میرے پیر و کاروں کی اکثریت ہوگی۔“

وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصِّلَاحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا
الْأَنْهَرُ كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ شَرَكَةٍ رِزْقًا لَقَاءً وَاهْدَى اللَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ
وَأَتْوَابِهِ مُتَشَابِهًًا وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَهُمْ فِيهَا خَلِدُونَ ۝

”اور آپ ﷺ ان کو جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے، یہ خوش خبری دیں کہ ان کے لیے ایسے باغ ہوں گے، جن میں نہیں بہتی ہوں گی۔ جب انہیں کھانے کو کوئی پھل پیش کیا جائے گا، تو کہیں گے: یہ وہی ہے جو اس سے پہلے ہمیں دیا گیا۔ حالاں کہ انہیں ملے گا ایک دوسرے سے ملتا جلتا۔ اور وہاں ان کے لیے پا کیزہ جوڑے (SPOUSES) ہوں گے اور وہ ہمیشہ رہیں گے۔“ (25)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

ازْوَاجُ..... یہ زوج کی جمع ہے، جس کے معنی جوڑے (SPOUSE) کے ہیں۔ مرد کے لیے عورت زوج اور جوڑا ہے، عورت کے لیے مرد زوج اور جوڑا ہے۔

اس سے پہلے کافروں کے لیے دوزخ کی آگ کے عذاب کا ذکر تھا۔ اب ایمان والوں کے لیے جنت اور اس کی نعمتوں کا ذکر ہے۔ قرآن میں تہیب و ترغیب کا یہ اسلوب عام ہے۔

ارشاد ہوا کہ اے نبی! آپ ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں، اور انہوں نے نیک کام کیے ہیں، جنت کی خوش خبری دے دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جنت میں داخلے کا معیار (MERIT) ایمان اور نیک اعمال ہیں۔

فرمایا کہ اہل ایمان جس جنت میں جائیں گے، وہاں سدا بہار باغات ہوں گے جن میں نہیں ہر وقت بہتی ہوں گی۔ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَرُ کے الفاظ سے بعض لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ باغات کہیں بلندی پر واقع ہوں گے اور ان کے نشیب میں نہیں جاری ہوں گی۔ لیکن عربیت کی رو سے یہ ضروری نہیں ہے۔ بلکہ باغوں کے پاس یا ان کے پیچوں بیچے والی نہروں کو بھی مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَرُ کہنا عربی زبان اور روز مرے کے لحاظ سے بالکل درست ہے جس کی دلیل سورہ الزخرف (51:43) میں موجود ہے۔

﴿وَنَادَىٰ فِرْعَوْنُ فِي قَوْمِهِ قَالَ يَا قَوْمِ الَّذِي لَىٰ مُلْكُ مِصْرَ وَهُنَّهُ الْأَنْهَرُ تَجْرِي مِنْ تَحْتِي حَافَّلًا تُبَصِّرُونَ﴾ [الزخرف: 51]

”اور فرعون نے اپنی قوم کو جمع کر کے کہا ”اے میری قوم! کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں اور یہ میرے پاس بہتی ہوئی نہیں بھی میری نہیں؟ کیا تم لوگ دیکھتے نہیں؟“

ظاہر ہے مصر کی سلطنتی نہریں اور دریا فرعون کے نیچے یا نشیب میں نہ تھے۔

اہل جنت کو جب جب کھانے کے لیے پہل پیش کیے جائیں گے تو وہ دل میں، یا زبان سے کہیں گے کہ اس طرح کے پہل تو ہم پہلے بھی کھا پکھے ہیں۔ حالاں کہ وہ صرف شکل و صورت میں ملتے جلتے ہوں گے، لیکن اپنے ذائقے اور لذت کے لحاظ سے مختلف ہوں گے۔ اس کے علاوہ وہاں ان کے لیے پاکیزہ جوڑے (SPOUSES) ہوں گے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مرد اور عورتیں ہر طرح کی تجاست اور آلاتش سے ہر وقت پاک رہیں گے۔ میاں بیوی پاکیزہ سیرت و اخلاق کے مالک ہوں گے۔ عورتیں حیض و نفاس سے پاک رہیں گے۔

اہل جنت کے بارے میں حدیث میں ہے کہ:

(عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ أَهْلَ الْجَنَّةِ يَأْكُلُونَ فِيهَا وَيَسْرِبُونَ، وَلَا يَقْلُلُونَ وَلَا يَبْوَلُونَ، وَلَا يَتَغَوَّطُونَ، وَلَا يَمْتَخِطُونَ۔ قَالُوا: فَمَا بِالظَّعَامِ؟ قَالَ: جُشَاءُ وَرَشْحُ كَرَشْحُ الْمُسْكِ، يُلْهَمُونَ التَّسْبِيحَ وَالْتَّحْمِيدَ كَمَا تُلْهَمُونَ النَّفْسَ)

(صحیح مسلم، رقم: 7152)

”حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اہل جنت وہاں کھائیں گے۔ لیکن نہ وہ تھوکیں گے۔ نہ ان کو پیشاب پاخانے کی حاجت ہوگی۔ اور نہ ان کی ناک سے آلاتش نکلے گی۔ صحابہ کرام نے عرض کیا: تو پھر کھانا کدھر جائے گا؟ فرمایا: صرف ڈکار اور پیشہ آئے گا (جس سے کھانا ہضم ہو جائے گا)۔ پسینہ بھی کستوری کی طرح خوشبودار ہو گا۔ وہ لوگ اس طرح (آسانی اور سلسیل کے ساتھ) اللہ تعالیٰ کی تسبيح و تحمید کریں گے جیسے تم سانس لیتے ہو۔“

ایک متفق علیہ حدیث قدسی میں جنت کی نعمتوں کا ذکر اس طرح آیا ہے۔

(عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى: أَعَدَّتُ لِبَعِيَادِي الصَّالِحِينَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ، وَلَا أُذْنٌ سَمِعَتْ، وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ。 وَأَقْرَءَ وَإِنْ شَتَّتْمُ "فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَا أَخْفَى لَهُمْ مِنْ فُرَّةٍ أَعْيُنٍ")

(صحیح بخاری، رقم: 3498۔ صحیح مسلم، رقم: 7132)

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں نے اپنے بندوں کے لیے (جنت میں) ایسی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کاں نے شا، اور نہ ان کا خیال بھی کسی انسان کے دل و دماغ میں بکھی آیا۔ اگر تم چاہو تو یہ (قرآنی آیت) پڑھ لو ”کوئی کیا جانے کہ لوگوں کے لیے ان کے اعمال کے بدالے میں آنکھوں کی کیا ٹھنڈک چھپا رکھی گئی ہے؟“

(السجدہ 17:32)

جنت کے بارے میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی بہت مشہور ہے کہ:

((لَيْسَ فِي الدُّنْيَا مِمَّا فِي الْجَنَّةِ شَيْءٌ إِلَّا أَسْمَاءُ))

مطلوب یہ ہے کہ جنت اور اس کی نعمتوں کو وحی کی زبان میں جن الفاظ اور ناموں سے بیان کیا گیا ہے، ان کی اصل حقیقت اس دنیا میں رہتے ہوئے معلوم نہیں ہو سکتی۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بِعْوَضَةً فَهَا فَوْقَهَا فَإِنَّمَا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهِذَا مَثَلًا مُّبِينًا كَثِيرًا وَيَهْدِي مَنْ يَشِيرًا وَمَا يُبَيِّنُ بِهِ إِلَّا فَالْفَسِيقُونَ لِلَّذِينَ يَنْقَضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيشَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوَصِّلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَئِكَ هُمُ الْخَسِرُونَ

”بے شک اللہ اس بات سے نہیں شرمناتا کہ مجھر یا اس سے بڑھ کر کسی چیز کی مثال بیان کرے۔ پھر جو ایمان والے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ جو مثال ان کے رب نے دی ہے، وہ تھیک ہے۔ مگر جو کافر ہیں، وہ کہتے ہیں: اللہ کا اس مثال کو بیان کرنے سے کیا مطلب ہے؟ اس طرح اللہ اپنی مثالوں کے ذریعے بہتوں کو گمراہ کرتا اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے۔ مگر گمراہ صرف نافرانوں کو کرتا ہے، جو اللہ سے عہد کر کے اسے توڑ ذاتے ہیں۔ اللہ نے جس چیز کے جوڑنے کا حکم دیا ہے، وہ اسے توڑتے ہیں اور زمین میں فساد کرتے ہیں۔ یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔“ (26-27)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

«إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بِعْوَضَةً فَهَا فَوْقَهَا» (26)

ضرب المثل یعنی مثال بیان کرنے کا مطلب ہے: ”کسی حقیقت کو مثال یا تشبیہ کے ذریعے واضح کر کے سمجھانا۔“ ہر صفحہ و بلیغ کلام میں مثالیں اور تشبیہیں پائی جاتی ہیں جو اس کلام کا حُسن ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں بھی، جو فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے مجھہ ہے، مضامین کو واضح کرنے کے لیے مثالوں اور تشبیہوں سے کام لیا گیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: **«وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ تُضَرِّبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعُلَمَوْنَ» (43:29)** ”اور ہم یہ مثالیں لوگوں کے (غور کرنے کے) لیے بیان کرتے ہیں۔ لیکن صرف علم والے ہی ان کو سمجھتے ہیں۔“

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ مدینے کے یہودیوں نے قرآن مجید کے بارے میں یہ اعتراض کیا تھا کہ اس میں کھمی (الحج 73:22)، چھڑا اور مکٹری (العنکبوت 29:41) جیسی حقیر چیزوں کا ذکر ہے، اس لیے یہ اللہ کا کلام نہیں ہو سکتا۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ اس سے نہیں شرمناتا کہ اپنی کوئی بات انسانوں کو سمجھانے کے لیے چھڑیا اس سے بھی چھوٹی چیزوں (مثلاً جراشیم) کی مثال دے۔ کیونکہ مثالیں دینے کا مقصد بعض حقائق اور تصورات (CONCEPTS) کو واضح کر کے لوگوں کو سمجھانا ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے کسی چھوٹی، بڑی یا حقیر چیز کی مثال دی جاسکتی ہے۔ اس طرح کی مثال کسی کلام کا عیب نہیں ہوتا بلکہ اس کی خوبی اور حسن ہوتا ہے۔ مگر جن لوگوں نے اعتراض ہی کرنا ہوتا ہے، وہ یہ تو نہیں دیکھتے کہ ان کے کسی اعتراض میں کتنی معقولیت (RATIONALE) ہے۔ وہ تو اعتراض برائے اعتراض کرتے ہیں۔

﴿فَإِنَّمَا الظَّنِينَ أَمْنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحُقُوقُ مِنْ رَبِّهِمْ وَأَمَّا الظَّنِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهِذَا مَثَلًا مَثَلًا...﴾ (26)

اہل ایمان جب وہی کے کلام میں ایسی مثالیں دیکھتے ہیں تو سمجھ لیتے ہیں کہ ان کا رب جو مثال بھی بیان کرتا ہے، وہ صحیح، برحق اور مفید ہوتی ہے۔ چونکہ یہ لوگ ہدایت و رہنمائی کے طالب ہوتے ہیں، اس لیے ان کو ایسی مثالوں سے مزید ہدایت و رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَعْجَلُ بِإِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ يُنِيبُ﴾ (الشوری 13:42)

”اللہ جسے چاہتا ہے جن لیتا ہے، اور ہدایت اسے دیتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔“

مگر جہاں تک منکر ہیں حق کا معاملہ ہے، انہیں تو اعتراض کے لیے کوئی بہانہ چاہیے، اس لیے وہ ایسی مثالیں دیکھ کر کہتے ہیں کہ یہ تو ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ دیکھو جی! اتنی حقیر چیزوں کا ذکر کراہی اللہ کا کلام کیسے ہو سکتا ہے؟

اس کے جواب میں مزید فرمایا:

﴿يُضْلِلُ إِلَهٌ كَثِيرًا وَيَهْدِي إِلَهٌ كَثِيرًا وَمَا يُضْلِلُ إِلَهٌ إِلَّا الْفَسِيقُونَ﴾ (26)

فَاسْقِيْفِيْنُ: ناسن کی جمع ہے جو ”فقن“ سے بناتے ہیں۔ فتن کے اصل معنی ((الخُرُوجُ عَنِ الشَّيْءِ)) یعنی ”کسی چیز سے نکل جانے“ کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ اطاعت سے نکل گیا تھا:

﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ طَهِ﴾ (الکھف 18:50)

”وہ (ابلیس) جنات میں سے تھا۔ اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔“

اس مقام پر منافق یہودیوں کو فاسقین کہا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نکل چکے تھے۔ اس لیے قرآن پر فضول اعتراض کرتے تھے۔

یاد رہے کہ قرآن کی زبان میں فاسق وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے دائرے سے نکل جائے اور اس کی نافرمانی کرے، خواہ یہ نافرمانی چھوٹی ہو یا بڑی، اور خواہ اس کا کرنے والا مسلمان ہو یا کافر۔ اگرچہ قرآن مجید میں یہ لفظ عام طور پر بڑے نافرمانوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے کہ:

﴿إِنَّمَا يُحِبُّ الْمُؤْمِنُونَ مَنْ كَانَ فَاسِقًا طَّالِبًا لَا يَسْتَوْنَ﴾
(السجدة: 32)

”کیا مومن اور فاسق ایک ہیے ہیں؟ یہ دونوں برادر نہیں ہو سکتے۔“

اس آیت میں ”مومن“ کے مقابل میں ”فاسق“ کا لفظ آیا ہے جو کہ کافر کے معنوں میں ہے۔

بعد میں علم فقہ اور علم کلام کی اصطلاح میں فاسق ایسے مسلمان کو کہا جانے لگا جو کبیرہ گناہ کرتا ہو جیسے شرابی اور بے نماز۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کلام کے ذریعے جو مثالیں بیان فرماتا ہے، تو اس کے نتیجے میں بہت سے لوگ گمراہ ہوتے ہیں اور بہت سے ہدایت پاتے ہیں۔ ایسی مثالوں سے اہل ایمان کو ہدایت و رہنمائی ملتی ہے، وہ سمجھ جاتے ہیں کہ فلاں مثال دینے میں کیا حکمت ہے اور اصل حقیقت کیا ہے؟ مگر جن کے دلوں میں جہالت اور اسلام دشمنی ہائی ہوئی ہے اور جن کی زندگی سرکشی اور اللہ کی نافرمانی سے عبارت ہے، ان کو ان مثالوں سے سوائے گمراہی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

بارش کی مثال بھی، یہ جب زرخیز زمین پر برستی ہے تو اس کو سربرزو شاداب کر دیتی ہے۔ مگر جب وہ کوڑا کرکٹ کے ڈھیر پر برستے تو اس میں تعفن اور بدبو پیدا کر دیتی ہے۔ یہی کیفیت قرآن مجید کی مثالوں کی ہے، جو اہل ایمان کے لیے ہدایت و رہنمائی کا ذریعہ نہیں ہیں، مگر سرکشوں اور ہدھموں کے لیے گمراہی کا سبب بن جاتی ہیں۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب کہا ہے:

باراں کہ در لاطافت طبعش خلاف نیست

در باغ لالہ روید و در بوم خار و خس

بارش کے عمدہ اور لطیف ہونے سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اس کے برنسے سے باغوں میں لالے کے پھول اگتے ہیں مگر درپر انوں میں کائنے اور جھاڑیاں پیدا ہوتی ہیں۔

﴿أَلَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَ يَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوَصَّلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَئِكَ هُمُ الْخَيْرُونَ ﴾^④ (27)

یہ فاسقین کے بارے میں ہے کہ یہ لوگ زبان سے اللہ تعالیٰ کو مانتے اور اس کی اطاعت کا پختہ عہد کرتے ہیں، مگر شریعت کے احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے جن روابط اور تعلقات کو جوڑنے کا حکم دیا ہے، ان کو توڑ ڈالتے ہیں۔ قطع وجہی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ان کو نہ تو حقوق اللہ کا خیال آتا ہے اور نہ حقوق العباد کا پاس ہوتا ہے۔

ایے لوگ فساد فی الارض کرتے ہیں۔ دنیا میں اصلاح کی بجائے بگاڑ پیدا کرتے ہیں۔ ان کا کار و بار نفع کی بجائے گھائٹے کا سودا ہے۔ ان کے لیے دنیا میں ذلت و رسائی ہے اور آخرت میں ان کو اللہ تعالیٰ کا عذاب ملے گا۔

**كَيْفَ تَكُفُّرُونَ بِاللَّهِ وَ كُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَاحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمْتِتُكُمْ ثُمَّ
يُحِيِّكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا
ثُمَّ أُسْتَوِي إِلَى السَّمَاءِ فَسُوِّيْهُنَّ سَبْعَ سَيْوَاتٍ ۚ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝**

”تم الله کا انکار کیسے کر سکتے ہو، جب کہ تم بے جان تھے، اسی نے تمہیں زندگی عطا کی۔ پھر وہی تمہیں موت دے گا۔ پھر وہی زندہ کرے گا، اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ اسی نے تمہارے لیے زمین میں سب کچھ پیدا کیا۔ پھر وہ آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا، اور سات آسمان درست کر کے بنادیے۔ اور وہ ہر چیز کو جانے والا ہے۔“ (29-28)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

**كَيْفَ تَكُفُّرُونَ بِاللَّهِ وَ كُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَاحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمْتِتُكُمْ ثُمَّ يُحِيِّكُمْ
ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝ (28)**

یہ انہی فاسقین کو خطاب کر کے فرمایا گیا کہ تم اللہ تعالیٰ پر سچا ایمان لانے اور اس کے احکام کی صحیح اطاعت کرنے سے انکار کیسے کر سکتے ہو؟ اس کے لیے تمہارے پاس کیا دلیل ہے؟

اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ توحید کے عقیدے کو نہیں مانتے، اللہ تعالیٰ کی کسی کتاب، یا اس کے کسی ایک نبی کا بھی انکار کرتے ہیں اور علانية اللہ سبحانہ کے احکام کی نافرمانی کرتے ہیں، وہ سچے ایمان والے نہیں ہیں۔

فرمایا، انسان ہر چیز کا انکار کر سکتا ہے مگر خود اپنے وجود کا انکار نہیں کر سکتا۔ جب وہ اپنے وجود کا انکار نہیں کر سکتا تو جس نے اسے وجود بخشنا ہے اس کا انکار کیسے کر سکتا ہے؟ کیا کوئی تحقیق یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ اس کا کوئی خالق نہیں؟ کیا کوئی تصویر کہہ سکتی ہے کہ اس کا کوئی مصور نہیں؟ کیا کوئی کتاب بول سکتی ہے کہ اس کا کوئی مصنف نہیں؟

ارشاد ہوا کہ کیا تم اس اللہ کو ماننے سے گریز کر سکتے ہو، یا اس کی اطاعت کرنے سے فرار کی راہ اختیار کر سکتے ہو، جس نے تمہیں وجود بخشنا اور زندگی عطا کی، جس نے ایک دن تم کو موت کے گھاث اتار دینا ہے، پھر تمہیں دوبارہ اس لیے اٹھا کھڑا کرنا ہے تاکہ تم سب کو جمع کر کے تمہارے اعمال کا حساب لے؟

اس آیت میں دنیا کی زندگی کو آخرت کی زندگی کے لیے دلیل بنایا گیا ہے کہ جو حقیقتی کسی چیز کو عدم سے وجود میں لا سکتی ہے، کیا وہ مردہ انسانوں کو زندہ نہیں کر سکتی؟

﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾ (29)

اس میں لکھ کا لام (ل) انتقال کا ہے جس کا مطلب ہے، زمین کی تمام چیزیں انسان کے فائدے کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ پرندے، جانور، مچھلیاں، پھاڑ، دریا، سمندر، درخت، پودے، خوبصورت، رنگ اور پھول سب اس لیے بنائے گئے ہیں کہ انسان ان سے فائدہ اٹھائے۔ اور خود اسے کس مقصد کے لیے پیدا کیا گیا؟ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے!

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّةَ وَالْإِنْسَانَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (الذاريات 51:56)

”اور میں نے جوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔“

اس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ انسان کا درجہ روئے زمین کی تمام مخلوقات سے بڑھ کر ہے، جو صرف اس لیے پیدا کی گئی ہیں کہ انسان ان سے خدمت لے، ان کو اپنے کام میں لائے اور فائدے اٹھائے۔

پھر اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ انسان جو کہ اشرف المخلوقات ہے، جب وہ زمین کی کسی مخلوق کے آگے جھلتا اور اسے معبدوں سمجھتا ہے تو نہ صرف شرک کرتا ہے بلکہ انسانیت کی توہین و تذلیل کرتا ہے۔

﴿ثُمَّ أَسْتَوْيَ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّهُنَّ سَبْعَ سَوْاًٍ﴾ (29)

السماءُ..... اس کے معنی ایک آسمان کے بھی ہیں اور اس جس کے لحاظ سے ”آسمانوں“ کے بھی ہیں۔ چونکہ اس کے بعد اس کی ضمیر هُنَّ جمع آئی ہے اس لیے یہ اس جگہ جمع کے معنوں میں ہے۔ اس کی نظریہ یہ ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِي عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَ لَا فِي السَّمَاءِ﴾ (آل عمران 5:3)

”بے شک اللہ سے کوئی شے چھپی ہوئی نہیں، نہ زمین میں نہ آسمانوں میں۔“

یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ ایک آسمان میں تو کوئی چیز چھپی نہیں، لیکن باقی چھ آسمانوں میں چھپ سکتی ہے۔

مراد یہ ہے کہ زمین کو بنانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے آسمان بنائے۔ پھر ایک نہیں بلکہ سات آسمان اور تلے ٹھیک

طرح سے بنادیے جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا گیا:

﴿الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَوْاًٍ طَبَاقًا طَمَّا تَرَى فِي خَلْقِ الرَّحْمَنِ مِنْ تَفَاؤلِ طَفَارِ جَعْ الْبَصَرَ هَلْ تَرَى مِنْ فُطُورٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبُ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ﴾ (الملک 4:367)

”ای (اللہ) نے اپر تلے سات آسمان بنائے۔ تم خداۓ رحمان کی اس تخلیق میں کوئی نقش نہیں دیکھو گے۔

پھر نگاہ ڈال کر دیکھو لو۔ کہیں تمہیں کوئی نقش دکھائی دیتا ہے؟ بار بار نگاہ ڈال کر دیکھو، تمہاری نظر تھک ہا رکر

ناکام والیں لوٹ آئے گی۔“

وَهُوَ يُحِلُّ شَيْءًا عَلَيْهِ ۝ (٢٩)

آخر میں فرمایا کہ جس خالق نے یہ سب کچھ پیدا فرمایا اور جو پوری کائنات کا نظام چلا رہا ہے، وہ زمین و آسمان کی ایک ایک چیز کا علم رکھتا ہے، کوئی چھوٹی بڑی چیز اس کی نگاہوں سے اوچھل نہیں ہو سکتی۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ قَالَوْا
أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ ۖ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ
بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ وَعَلَمَ آدَمَ
الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلِكَةِ ۖ فَقَالَ أَنْبِعُونِي بِاسْمَاءِ
هَؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَدِيقِينَ ۝ قَالُوا سَبِّحْنَاكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَمْنَا ۖ
إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ۝ قَالَ يَا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِاسْمَائِهِمْ ۖ فَلَمَّا
أَنْبَاهُمْ بِاسْمَائِهِمْ ۖ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْرَ السَّمَوَاتِ وَ
الْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تَبِدُونَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُبُونَ ۝ وَإِذْ قَلَنَا لِلْمَلِكَةِ
اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ ۖ أَبِي وَاسْتَكْبَرَ ۖ وَكَانَ مِنَ
الْكُفَّارِ ۝ وَقَلَنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا
رَغْدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۖ وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونُوا مِنَ الظَّالِمِينَ ۝
فَأَذْلَلَهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ ۖ وَقُلَنَا اهْبَطْنَا
بِعِضَّمِ لِبَعْضٍ عَدْوَنِ ۖ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقْرٌ وَمَتَاعٌ إِلَى حِينِ ۝
فَتَلَقَّى آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ إِنَّهُ هُوَ التَّوَابُ الرَّحِيمُ ۝

**قُلْنَا أهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنْ هُدًى فَمَنْ تَبِعُ
هُدَائِي فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ وَالَّذِينَ كَفَرُوا
وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَلِدُونَ ۝**

”اور یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا: ”میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔“ انہوں نے کہا: کیا تو اسے بنائے گا جو اس میں فساد کرے اور خون بھائے؟ جب کہ ہم تیری تعریف کرتے اور تیری پاکیزگی بیان کرتے رہتے ہیں۔“ اللہ نے فرمایا: ”جو کچھ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔

اور اللہ نے آدم ﷺ کو سب چیزوں کے نام سکھا دیے۔ پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: اگر تم سچے ہو تو مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ؟ فرشتوں نے کہا: تو پاک ہے۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں جتنا تو نے ہمیں سکھایا۔ بے شک تو علم والا، حکمت والا ہے۔ پھر فرمایا: اے آدم! ان کو بتاؤ ان چیزوں کے نام! جب آدم نے انہیں ان چیزوں کے نام بتا دیے تو اللہ نے فرشتوں سے کہا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ آسمانوں اور زمین کے بھید میں ہی جانتا ہوں اور میں تمہارا ظاہر و باطن سب جانتا ہوں۔“

اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ ”آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا۔ مگر ابلیس نے سجدہ نہ کیا اس نے حکم نہ مانا، الشَّتَّاكِبَرَ کیا اور وہ کافروں میں سے ہو گیا۔

پھر ہم نے آدم سے کہا: تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو، اور اس میں جہاں سے چاہو، خوب مرے سے کھاؤ پوچھ لیکن اس درخت کے قریب نہ جانا، ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔“ لیکن شیطان نے ان دونوں کو بہکادیا اور انہیں اس عیش کی جگہ سے نکلوادیا، جس میں وہ تھے۔ اور ہم نے حکم دیا: تم سب یہاں سے چلے جاؤ۔ تم دونوں فریق ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ تمہیں دنیا میں ایک مدت تک رہنا اور فائدہ اٹھانا ہے۔

پھر آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ لیے، جن کی برکت سے اللہ نے ان کی توبہ قبول کی۔ بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا، رحم وala ہے۔ پھر ہم نے حکم دیا ”تم سب یہاں سے چلے جاؤ۔ اگر میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس آئے تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے، انہیں نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ لیکن جو کفر کی راہ پر چلیں گے اور ہماری نشانیوں کو جھٹلا کیں گے، وہ دوزخی ہوں گے اور ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔“ (39-30)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۝﴾ (30)

إِذْ..... عربی تفاسیر کے لحاظ سے جب فقرے کے شروع میں إِذْ آتا ہے تو اس سے پہلے ایک فعل محدود

(UNDERSTOOD) ہوتا ہے جیسے اُذُگُر (یاد کر)۔ عام طور پر اس کے بعد کوئی واقعہ بیان ہوتا ہے جو یا تو مخاطب کے علم میں ہوتا ہے، یا وہ کوئی مسلسل حقیقت ہوتی ہے۔ اس جگہ یہ دوسری صورت مراد ہے۔

مَلَائِكَةُ: یہ مَلَكٌ کی جمع ہے، جس کے معنی ”فَرَشَّتَهُ“ (ANGEL) کے ہیں جو ایک صاحب عقل و شعور اور سمجھ بوجھ رکھنے والی مخلوق ہے اور نور سے پیدا ہوئی ہے، جیسا کہ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا میں ہے:

((خُلِقَتِ الْمَلَائِكَةُ مِنْ نُورٍ، وَخُلِقَ الْجَانُ مِنْ نَارٍ، وَخُلِقَ آدَمُ مِمَّا وُصِّفَ لَكُمْ))

(صحیح مسلم، رقم: 7495)

”فرشته نور سے پیدا کیے گئے، جنت آگ سے، اور انسانوں کو تم جانتے ہو (مٹی سے پیدا کیا گیا)۔“ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کا خاص قرب حاصل ہے۔ یہ لا تعداد ہیں۔ انسانی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کائنات کا نظام چلاتے ہیں۔ ان پر ایمان لانا ضروری ہے۔ جو لوگ (جن میں منکرین حدیث شامل ہیں) ان کو محض تو تین سمجھتے ہیں اور ان کی ”شخصیت“ کے منکر ہیں، وہ غلطی پر ہیں اور جو لوگ فرشتوں کی پوجا کرتے ہیں، وہ شرک کرتے ہیں اور یہ سب سے بڑا اگناہ ہے۔

خَلِيفَةُ: یہ خلف سے بنا ہے۔ عربی زبان میں خلیفہ کے معنی نائب (DEPUTY) یا جاثین (SUCCESSOR) کے ہوتے ہیں۔ اس کی جمع خلفاء اور خلافت ہے۔ قرآن مجید میں خلیفہ کا لفظ ان دونوں معنوں میں آیا ہے۔

خلیفہ، نائب یا قائم مقام کے معنوں میں:

﴿يَا أَيُّهُ الْإِنْسَانُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِيقَ﴾ (ص 26:38)

”اے داؤدا بے شک ہم نے آپ کو زمین پر خلیفہ بنایا ہے۔ لہذا لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلے کریں۔“

خلیفہ، جاثین کے معنوں میں

﴿ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ مِنْ مَبْعَدِهِمْ لِيَنْنَظِرُ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ۝﴾ (یونس 10:14)

”پھر ہم نے ان کے بعد زمین پر تمہیں ان کا جاثین بنایا تاکہ ہم دیکھیں تم کیسے اعمال کرتے ہو۔“

اس بارے میں اختلاف ہے کہ مذکورہ آیت میں خلیفہ کا لفظ کن معنوں میں آیا ہے۔ ہمارے نزدیک اس جگہ یہ نائب یا قائم مقام کے معنی میں ہے۔ انسان اس زمین پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ اور نائب ہے۔ اس سے مراد ایسا شخص ہے جو اپنے حقیقی آقا کے دیے ہوئے اختیارات اس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے وہ خود اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرے اور دوسرے انسانوں پر ان کو ناذر کرے۔ لیکن اگر وہ خود آقا بن بیٹھے اور دیے گئے اختیارات کا ناجائز استعمال کرنے لگے تو ندار اور باغی کہلانے گا۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ ﷺ اپنی امت کو وہ واقعہ یاد دلائیں جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا تھا کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے لگا ہوں اور اس کے لیے آدم کو پیدا کر رہا ہوں جس کی اولاد ہوگی اور نسل چلے گی۔

اس پر فرشتوں نے عرض کیا:

﴿قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ﴾ (30)

فرشتوں نے تعجب سے پوچھا کہ کیا اسے خلیفہ بنایا جا رہا ہے جو زمین پر فساد پھیلائے گا اور خون ریزی کرے گا؟ یہ بات انہوں نے اس لیے کہی ہوگی کہ جسے اختیار مل جائے گا، وہ اس کا غلط استعمال بھی کر سکتا ہے، جس کے نتیجے میں دنیا میں فساد و فساد برپا ہو سکتا ہے اور قتل و غارت ہو سکتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

پھر اپنے بارے میں کہنے لگے:

﴿وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ﴾ (30)

تسبیح:..... اس کے معنی ”تنزیہہ تعالیٰ عتماً لا يليق به“ کے ہیں، جس کا مطلب ہے، اللہ تعالیٰ کو ایسی چیزوں سے پاک اور منزہ سمجھنا جو اس کی شان کے شایاں نہیں ہیں۔ جیسے اسے ہر عیب، نقص اور کمزوری سے پاک سمجھنا۔

تحمید:..... یہ حمد سے ہے۔ اس کے معنی تعریف کرنے اور خوبی بیان کرنے کے ہیں۔

تقدیس:..... یہ قدس سے ہے۔ جس کے معنی ہیں پاکیزگی۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر لحاظ سے پاک اور پاکیزہ صفات رکھتا ہے۔

فرشتوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم تو ہر وقت تیری حمد و شاخ اور تسبیح و تقدیس میں لگ رہتے ہیں۔ اس کام سے بڑھ کر کسی مخلوق سے اور کیا توقع ہو سکتی ہے، جب وہ ہر وقت تیری عبادت کرے؟

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ (30)

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کو جواب دیا گیا کہ جو کچھ میں جانتا ہوں، تم نہیں جانتے ہو کہ خلافت ارضی کا کون اہل ہے۔ اس معاملے میں تم کیا جانو کون زمین پر میرے قوانین کا نفاذ کر سکتا ہے، عدل و انصاف قائم کر سکتا ہے اور اصلاح کر سکتا ہے۔

یہ گویا پہلی دلیل تھی کہ تمہیں کیا معلوم نہیں پیدا ہونے والی مخلوق کن اوصاف کی حامل ہوگی۔ ان میں کیسی کیسی ہستیاں ہوں گی، جن کے علمی و عملی فضائل و محسنات تم سے بھی بڑھ کر ہوں گے۔

اب دوسرا دلیل آگئے آ رہی ہے، جو انسان کو خلیفہ بنانے کا باعث بنی۔

﴿وَعَلَمَ أَدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا﴾ (31)

الله تعالیٰ نے آدم علیہم السلام کو سب چیزوں کے نام سکھا دیے۔ جیسے اونٹ، گائے، بکری، چڑیا وغیرہ۔ یہ گویا کسی چیز کا نام رکھنے اور اس کے اوصاف و خصوصیات کو سمجھنے کی صلاحیت تھی جو سب سے پہلے انسان..... آدم علیہم السلام کو دی گئی۔ یہ علم کی فطری استعداد ہے اور سارے علوم و فنون کی کلید (KEY) جو انسانوں کو عطا ہوئی ہے اور جوان کی مادی، روحانی اور علمی ترقی کا ذریعہ ہے۔ لیکن فرشتے اس علمی استعداد اور علم اسماءِ اشیاء سے محروم ہیں۔

﴿ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْبَلِيلَكَةِ فَقَالَ أَنْتُوْنِي إِنَّمَا يَأْسِمَأَهُؤُلَاءُ إِنَّكُمْ صَدِقِينَ﴾ (31)

پھر وہی چیزیں، جن کے نام آدم علیہم السلام کو سکھائے جا پچکے تھے، فرشتوں کے سامنے پیش کی گئیں اور ان سے کہا گیا کہ اگر وہ اپنی بات میں سچ ہیں تو ان سب چیزوں کے نام بتائیں تاکہ ثابت ہو جائے کہ صرف وہی افضل ترین مخلوق ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے ان سے بہتر کسی اور مخلوق کے پیدا کیے جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

﴿قَالُواْسِبِحْنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلِمْنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيُّمُ الْحَكِيمُ﴾ (32)

فرشتوں نے عرض کیا: تیری ذات پاک ہے۔ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں، جتنا آپ نے ہمیں سکھایا ہے۔ اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں جانتے۔ بے شک تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے۔ تیرے علم کی کوئی انتہا نہیں ہے اور تیرا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

﴿قَالَ يَا أَدَمُ إِنَّ بَعِيْهِمْ بِإِسْمَائِيْهِمْ فَلَمَّا آتَيْنَا أَبْيَاهُمْ بِإِسْمَائِيْهِمْ قَالَ اللَّهُ أَقْلَلَ لَكُمْ إِنِّي

أَعْلَمُ عَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبَدِّلُونَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُبُونَ﴾ (33)

پھر فرمایا: اے آدم! اب تم ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ تو انہوں نے ان سب چیزوں کے نام بتا دیے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا: کہ کیا تمہیں اچھی طرح معلوم نہیں ہے کہ میں آسمانوں اور زمین کی سب چھپی چیزوں کو جانتا ہوں اور یہ کہ مجھے تمہارے ظاہر و باطن کا پورا علم ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ علم کو عبادت پر فضیلت حاصل ہے۔ یہی علمی فویقت (SUPERIORITY) ہے جو انسان کے لیے خلافت ارضی کی دوسری دلیل بن گئی کہ آدم اور اس کی اولاد ہی کو زمین پر اللہ کا خلیفہ ہونا چاہیے۔

﴿مَا تُبَدِّلُونَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُبُونَ﴾ کے الفاظ سے کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے سامنے کچھ چیزوں ظاہر کرتے اور کچھ اس سے چھپاتے تھے۔ بلکہ یہ عربی زبان کا روزمرہ اور قرآن مجید کا ایک عام اسلوب ہے اور اس سے مراد صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے ظاہر اور باطن کا علم ہے۔ ہم نے ترجیح میں بھی اسے واضح کر دیا ہے۔ جب کہ ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:

﴿مَا أَعْلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلْغُ طَ وَ اللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُبَدِّلُونَ وَمَا تَكْتُبُونَ﴾ (المائدہ 5:99)

”رسول پر صرف پہنچادیئے کی ذمہ داری ہے۔ آگے اللہ تمہارے ظاہر اور باطن (کے اعمال) کو جانتا ہے۔“

یا جیسے فرمایا:

﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ مَسْكُونَةٍ فِيهَا مَتَاعٌ لَكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدِلُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ﴾ (النور: 29:24)

”اس میں کوئی گناہ نہیں کہ تم ایسے گھروں میں داخل ہو جن میں کوئی نہ رہتا ہو اور ان میں تمہارا کچھ سامان پڑا ہو۔ اور اللہ تمہارے ظاہر اور باطن کو جانتا ہے۔“

﴿وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلِكَةِ اسْجُدْوَا لِأَدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ طَأْبَيْ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكُفَّارِ﴾ (آل عمران: 34)

”سجدہ“ کے اصل معنی **النَّذَلُ وَالْخُضُوعُ** کے ہیں یعنی عاجزی کرنا اور جھکنا۔ شریعت میں سجدے سے مراد ”وضع الجبهة على قصد العبادة.“ ہے جس کا مطلب ہے، عبادت کی نیت سے پیشانی زمین پر رکھ دینا۔

إِبْلِيسُ: یہ شیطان کا دوسرا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں۔

جمہور مفسرین کے نزدیک یہ عبادت کا سجدہ نہ تھا بلکہ تظمیم و تحریم کے لیے سجدہ تھا جو پہلی امتوں میں بھی جائز تھا۔ جیسا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کو ان کے والدین اور بھائیوں نے سجدہ کیا تھا۔

﴿وَرَفَعَ أَبُوئِيهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُوْلَهُ سُجَّدَ﴾ (یوسف: 12)

”اور اس (یوسف علیہ السلام) نے اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا اور سب نے اسے سجدہ کیا۔“

مگر ہماری شریعت میں اللہ تعالیٰ کے ہوا سی اور کے لیے کسی قسم کا سجدہ جائز نہیں ہے۔ صحیح حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَوْ كُنْتُ أَمْرُ أَحَدًا أَنْ يَسْجُدْ لِأَحْدَى لَأَمْرَتُ الْمَرْءَةَ أَنْ تَسْجُدْ لِزَوْجِهَا))

(ترمذی، رقم: 1159، ابن ماجہ، رقم: 1852)

”اگر میں کسی کو حکم دیتا کہ وہ دوسرے کو سجدہ کرے تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔“

اسی مضمون کی حدیث سنن ابی داؤد، رقم: 2140 میں بھی ہے۔ اس سے بیوی پر شوہر کے حق کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

اس آیت کے ظاہری الفاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس بھی کوئی فرشتہ تھا کیونکہ آدم کے لیے سجدہ کرنے کا حکم فرشتوں کو دیا گیا تھا۔ لیکن خود قرآن نے دوسرے مقام پر تصریح کر دی ہے کہ وہ فرشتہ نہ تھا بلکہ جنات میں سے ایک جن تھا۔

﴿وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلِكَةِ اسْجُدْوَا لِأَدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ طَأْبَيْ وَمِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ طَ﴾ (الکھف: 50:18)

”اور یاد کرو جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو، تو سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے سجدہ نہ کیا۔ وہ

جنات میں سے تھا۔ اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔“

اور جب فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ آدم کو بجہہ کریں تو اس حکم کا مخاطب ابلیس بھی تھا۔ قرآن نے اس کی صراحت بھی کر دی ہے۔

﴿قَالَ مَا مَنَعَكَ أَلَا تَسْجُدَ إِذْ أَمْرَتُكَ﴾ (الاعراف 12:57)

”فرمایا: جب میں نے تجھے حکم دیا تو کس چیز نے تجھے (آدم کو) سجدہ کرنے سے روکا۔“

اس سے معلوم ہوا کہ جب فرشتوں جیسی افضل مخلوق کو بجہہ کرنے کا حکم ہوا، تو ابلیس جو کہ جن تھا اور نبتابم درجے کی مخلوق میں سے تھا، وہ بھی جیسا کہ قاضی بیضاوی رضی اللہ عنہ (تفسیر بیضاوی) اور علامہ الہوی رضی اللہ عنہ (تفسیر روح المعانی) نے اپنی اپنی تفسیر میں لکھا ہے، عربی زبان کے ایک قاعدے ”علیٰ سیل التغلیب“ کے مطابق اس حکم میں شامل تھا، اس نے حکم کا انکار کیا تھا، جس کی طرف قرآن مجید کا لفظ ”آبی“ اشارہ کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے یہ تکبر اور گھمنڈ بھی کیا کہ:

﴿قَالَ آتَا خَيْرًا مِّنْهُ خَلْقَتِي مِنْ نَارٍ وَ خَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ﴾ (الاعراف 12:7)

”وہ (ابلیس) بولا: میں اس (آدم) سے بہتر ہوں۔ مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے۔“

یہ عجیب الہیسی منطق (LOGIC) تھی کہ وہ آگ سے پیدا ہوا ہے اور آدم مٹی سے، تو آگ افضل ہے مٹی سے، اعلیٰ گھٹیا کے آگے کیوں بھکے۔ اس نے یہ نہ سوچا کہ فرشتوں جو نور سے پیدا ہوئے ہیں اور افضل ترین مخلوق ہیں، جب وہ آدم کو بجہہ کر رہے ہیں، تو وہ کیوں سجدہ کرنے سے انکار کر رہا ہے۔ دوسرے یہ اللہ سبحانہ کا حکم تھا، کوئی افضل و مفضول، یا اعلیٰ اور ادنیٰ کا معاملہ نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کرنی ضروری تھی۔ لیکن ابلیس نے دوہرًا جرم اور گناہ کیا۔ ایک اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے سے انکار، دوسرا غرور و تکبر کا اظہار۔ گویا یہ ”غدر گناہ بدتر از گناہ“ والی بات ہو گئی۔ نتیجہ یہ تکلکہ وہ کافروں میں سے ہو گیا۔

یاد رہے کہ عربی زبان میں کان (گوئُں سے فعل یا ضمی صیغہ واحد مذکور غائب) کا لفظ تین مختلف معنی دیتا ہے۔ (۱)

وہ تھا (HE WAS)، (2) وہ ہے (HE IS) اور (3) وہ ہو گیا (HE BECAME)۔

(1) کان، ”تھا“ یا ”وہ تھا“ کے معنوں میں:

﴿مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصَارَائِيًّا﴾ (آل عمران 3:67)

”ابراهیم علیہ السلام تو یہودی تھے اور نہ یہسیائی۔“

(2) کان، ”ہے“ یا ”وہ ہے“ کے معنوں میں:

﴿وَ كَانَ اللَّهُ عَلَيْهَا حَكِيمًا﴾

”اور اللہ عالم والا حکمت والا ہے۔“

(النساء 4:17)

(3) کان، ”وہ ہو گیا۔“ (صَارَ) کے معنوں میں:

(43:11) ﴿وَ حَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِينَ﴾ (ہود ۱۱)

”اور ان دونوں (نوح علیہ السلام اور ان کے بیٹے) کے درمیان موج حائل ہو گئی اور (دوسرے) غرق ہونے والوں کے ساتھ وہ (نوح علیہ السلام کا بیٹا) بھی غرق ہو گیا۔“

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے فرمایا:

(وَ قُلْنَا يَا آدُمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا رَغْلًا أَحَيْثُ شِئْتَمَا وَ لَا تَنْقُرْبَا﴾ (ہدیۃ الشَّجَرَةَ فَتَكُونُوا مِنَ الظَّلَّمِينَ) (35)

رَغْلًا: اس کے معنی میں: وَأَسِعَا هَنِيَّتَمَا یعنی خوب سیر ہو کر مزے سے۔

ظالمین: یہ ظالم کی جمع ہے جو ظلم سے بنتا ہے۔ ظلم کے اصل معنی ”وضع الشی فی غیر موضعه“ کے ہیں کہ کسی چیز کو ایسی جگہ رکھنا جو اس کے رکھنے کی صحیح جگہ نہ ہو۔ پھر اسی سے اور معنی پیدا ہو گئے، جیسے کسی چیز میں کسی کا حق مارنا، اسے نقصان پہنچانا اور اس پر زیادتی کرنا، سب ظلم میں شامل ہے۔ پھر شرک اور گناہ حقوق اللہ میں ظلم ہے۔ دوسروں کی حق تلفی اور ان پر زیادتی کرنا حقوق العباد میں ظلم ہے، اور ہر قسم کا گناہ اپنے آپ پر ظلم ہے کہ اس کی سزا یا عذاب بھگتتا پڑے گا۔

آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے اور فرشتوں سے ان کو سجدہ کرانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے فرمایا کہ آپ اور آپ کی بیوی حواء (یہ نام احادیث سے ثابت ہے) جنت میں جا کر عیش و آرام سے رہیں۔ وہاں جو چاہیں اور جہاں سے چاہیں، خوب سیر ہو کر کھائیں پہیں، مگر فلاں درخت کے قریب نہ جائیں اور اس کا پھل نہ کھائیں، ورنہ وہ ظالم اور گناہ گار ہو جائیں گے۔

جمہور مفسرین کے نزدیک جس جنت میں آدم علیہ السلام اور ان کی بیوی کو رہنے کا حکم دیا گیا، وہ وہی جنت ہے جو آخرت میں نیک اہل ایمان کو عطا ہو گی۔ صحیح احادیث کے ظاہری الفاظ بھی اسی بات کی تائید کرتے ہیں۔

جنت میں وہ کون سا درخت تھا، جس کے قریب جانے اور اس کا پھل کھانے سے آدم علیہ السلام اور حواء علیہ السلام کو روکا گیا تھا؟ اس بارے میں کئی اقوال ہیں، مگر کوئی قول بھی قرآن مجید یا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ اس لیے اس کی کھون کرید میں پڑنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہی بات امام المفسرین ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں لکھی ہے۔

بہر حال وہ کوئی خاص درخت تھا جس کے قریب جانے اور اس کا پھل کھانے سے دونوں میاں بیوی کو منع کیا گیا تھا۔ لیکن انسان کی نظرت ہی کچھ ایسی ہے کہ جس چیز سے اسے روکا جائے، اسی کی طلب اور تجویز میں لگ جاتا ہے اور شیطان اس کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر وسوسوں کے ذریعے اسے گراہ کرتا ہے۔

مکرین حدیث اور بعض دوسرے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ قرآن میں جس آدم کا ذکر ہے، اس سے کوئی خاص فرد یا

خیست مراد نہیں ہے بلکہ اس سے پوری نوع انسانی (HUMANITY) مراد ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس جگہ ﴿أَنْتَ وَزَوْجُكَ﴾ ”تو اور تیری بیوی“ کے الفاظ ان لوگوں کے ذکورہ خیال کی تردید کے لیے کافی ہیں۔

احادیث سے بھی آدم علیہ السلام کا ابوالبشر ہونا (صحیح مسلم، رقم: 480) اور سب سے پہلا نبی ہونا (ابن ابی شیبہ، طبرانی اور مسند احمد، رقم: 21879 عن ابی ذر غفاری رضی اللہ عنہ) ثابت ہے۔ ظاہر ہے پوری نوع انسانی نہ تو ابوالبشر ہو سکتی ہے اور نہ نبی ہے۔

اس کے علاوہ بالکل میں بھی آدم (ADAM) اور حواء (EVE) مخصوص شخصیات کے نام آئے ہیں۔

﴿فَازْلَهُمَا الشَّيْطَنُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِنَّا كَذَّا فِيهِ وَقُنْدَنَا أَهْبَطُوا بِعَضْكُمْ لِيَعْرِضُ عَدُوًّا وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقْرَرٌ وَمَتَاعٌ إِلَى حِينٍ﴾ (36)

لیکن آدم علیہ السلام اور حواء علیہما السلام دونوں کو شیطان نے بہکا دیا۔ اس نے ان سے جھوٹ بولا۔ ان کو دھوکا دیا۔ (الاعراف 22:7) ان سے کہا کہ زندگی اور لازوال بادشاہی چاہتے ہو تو اس درخت کا پھل کھا جس سے تمہیں روکا گیا ہے۔ جیسا کہ طے میں ہے:

﴿فَوَسَوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَنُ قَالَ يَا آدُمْ هَلْ أَدُلُكَ عَلَى شَجَرَةِ الْعُلْمِ وَمُلِكٌ لَا يَبْلِي ۝﴾ (طہ 120:20)

”پھر شیطان نے اس (آدم علیہ السلام) کے دل میں وسوسہ ڈال دیا اور کہا: اے آدم! کیا میں تجھے ہمیشگی کا درخت بتاؤں اور ایسی بادشاہی جس کو زوال نہ ہو۔“

اس طرح شیطان کے بہکاوے میں آ کر دونوں میاں بیوی اس درخت کا پھل کھا بیٹھے، جس کے نتیجے میں ان کو جنت اور وہاں کے عیش و آرام سے محروم ہونا پڑا اور دنیا میں آ کر محنت و مشقت کی زندگی گزارنی پڑی۔

اس بارے میں قرآن کا بیان بالکل واضح ہے کہ شیطان نے آدم اور حواء علیہما السلام، دونوں ہی نے ممنوعہ درخت کا پھل کھایا اور دونوں ہی سے یہ لغوش ہوئی تھی۔ اس لیے اس حوالے سے عیسائیت کی طرح صرف حواء علیہ السلام کو مطلعون کرنا اور ان کو برائی کی جڑ قرار دینا کہ ان کے باعث آدم علیہ السلام نے اس درخت کا پھل کھایا تھا، ایک غیر قرآنی اور بالکل غلط تصور ہے۔

محققین نے تصریح کی ہے کہ جنت کے ممنوعہ پھل کھانے کا واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب آدم علیہ السلام بھی نبی نہیں بنائے گئے تھے۔ اس لیے یہ واقعہ عصمت انبیاء کے مسلمہ عقیدے کے منافی نہیں ہے۔

جنت سے نکالے جاتے وقت اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرمادیا کہ آئندہ آدم و حواء علیہما السلام اور ابليس، دونوں فریق، ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے۔ شیطان اور اولاً آدم میں ہمیشہ دشمنی اور عداوت رہے گی۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿فَقُلْنَا يَا ادْمٌ إِنَّ هَذَا عَدُولٌ لَكَ وَلَيَزُوْجَكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقُى﴾ (طہ 20:117)

”پھر ہم نے کہا: اے آدم! بے شک یہ (ایلبیس) تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے۔ ایسا نہ ہو وہ تم دونوں کو جنت سے نکلوادے اور پھر تمہیں مشقت اٹھانی پڑے۔“

پھر جنت سے زمین پر بھیخت ہوئے اللہ سبحانہ نے ارشاد فرمایا کہ تمہیں زمین میں ایک عارضی مدت تک رہنا اور وہاں کی چیزوں سے فائدہ اٹھانا ہے۔ یہ عارضی مدت آدم و حواء ﷺ کے لیے ان کی عمر وہ تک اور نوع انسانی کے لیے قیامت تک کے لیے ہے۔

﴿فَتَأْتَى أَدْمٌ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ طَرَانَةٌ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ﴾ (37)

تَابَ: اس کے اصل معنی اونٹے اور رجوع کرنے کے ہیں۔ جب اس کی نسبت بندے کی طرف ہو تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ بندے نے اپنے گناہ پر شرمندہ اور نادم ہو کر اپنے رب کی طرف رجوع کیا۔ جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ اپنے بندے کی طرف رحم کے ساتھ متوجہ ہوا۔ لیکن اس صورت میں تَابَ کے بعد عَلٰی کا صلح ضرور آتا ہے۔

پھر جب آدم ﷺ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ نادم و پیشمان ہوئے تو انہوں نے دعا مانگی جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو چند ایسے کلمات سکھا دیے جن کو پڑھ کر وہ اپنے گناہ سے توبہ کر سکتے تھے۔ ان کلمات کو جیسا کہ ان عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے، قرآن نے دوسرے مقام پر اس طرح یہاں کیا ہے:

﴿فَالَّذِي أَنْهَا طَلَمَنَا أَنْفُسَنَا سَكَرَ وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَسِيرِينَ﴾ (50)

(الاعراف 23:7)

”ان دونوں نے دعا کی: اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، اگر تو نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم بر باد ہو جائیں گے۔“

اس دعا کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدم و حواء ﷺ دونوں کی توبہ قبول فرمائی۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا اور ان پر رحم فرماتا ہے۔

﴿قُلْنَا أَهْبِطُوا مِنْهَا جَبِيعًا فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنْهُمْ هُدًى فَمَنْ تَبَعَ هُدًى فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَتِنَا أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَلِدُونَ﴾ (38-39)

﴿قُلْنَا أَهْبِطُوا﴾ ”ہم نے کہا: تم اتر جاؤ“ کا ارشاد دوبار فرمایا گیا۔ ایک جب آدم ﷺ سے لغزش ہوئی اور اس کے نتیجے میں ان کو جنت سے زمین کی طرف آنے کا حکم ہوا۔ پھر دوسری بار اس وقت جب ان کی توبہ قبول ہوئی اور اس کے بعد ان کو نئے امتحان میں ڈال دیا گیا کہ آئندہ انسانوں کے اچھے اور بے انجام کا فیصلہ وحی کی ہدایت

کی پیروی کرنے یا پیروی نہ کرنے کے اعتبار سے ہوگا۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی اور نبیوں اور رسولوں کی لائی ہوئی ہدایت یعنی دین اسلام کی پچیس پیروی کریں گے، وہی جنت کے مستحق ہوں گے، جہاں ان کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی غم۔ مگر جو لوگ کفر کی راہ اختیار کریں گے اور دین اسلام کو جھلائیں گے تو وہ دوزخ کی آگ میں ڈالے جائیں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

یاد رہے کہ ﴿فَلَا خُوفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَعْنَوْنَ﴾ کے الفاظ سے جنت مراد ہے، جہاں نہ کوئی خوف یعنی آئندہ کا خطرہ ہوگا اور نہ حزن یعنی ماضی کا کوئی غم۔ حزن اور غم کی ضد سرور (خوشی) ہے۔ جنت کی تعبیر کے لیے قرآن مجید کا یہ ایک خاص اسلوب ہے، جس کی طرف اگلی آیت (39) بھی واضح طور پر اشارہ کر رہی ہے۔ اس اسلوب کی پارہ (12) مثالیں قرآن میں موجود ہیں۔

قصہ آدم و ابليس میں حکمتیں:

مذکورہ دس (10) آیات میں بعض اہم حقائق اور حکمتیں پوشیدہ ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

1۔ انسان اس زمین پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ اور نائب ہے۔ وہ خود مختار اور مطلق العنان نہیں ہے کہ جو چاہے کرتا پھرے، بلکہ وہ اپنے رب کا حکوم اور تابع بندہ ہے۔ وہ خود بخود اتفاقاً (BY CHANCE) پیدا نہیں ہوا، اسے ایک خالق اللہ سبحانہ نے پیدا فرمایا ہے، جس کا کوئی شریک نہیں، جس کے سوا کوئی اور موجود نہیں۔ اسی نے انسان کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ نیکی اور بدی کی تمیز بخشی ہے اور ان میں سے ہر ایک کو اختیار کرنے کی پوری آزادی دی ہے۔ یہ دنیا انسان کے لیے امتحان کی جگہ ہے کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نبیوں کی بتائی ہوئی نیکی کی راہ پر پل کر آخرت میں جنت کی نعمتوں کا مستحق ٹھہرتا ہے اور شیطان کی سمجھاتی ہوئی برائی کی راہ اختیار کر کے آخرت میں دوزخ کے عذاب کا سزاوار ہوتا ہے۔

2۔ انسان پیدائشی طور پر گناہ گار نہیں ہے۔ اس کی فطرت میں نیکی ہے۔ مگر شیطان کے بہکانے سے برائی بھی کر لیتا ہے۔ لیکن اس کے بعد اگر وہ آدم ﷺ کی طرح اپنے کیے پر نادم ہو کر توبہ کر لیتا ہے تو اس کا رب اس کی توبہ قبول کر کے اس کا گناہ معاف کر دیتا ہے۔ لیکن اگر وہ ابليس کی طرح اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے اُنہاں تکبر کا اظہار کرتا ہے تو اس کے لیے معافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے عذاب ہے۔

3۔ انسان اپنی زندگی کے اصل مقاصد کو محض اپنی عقل کے مل بوتے پر حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے وہ اللہ تعالیٰ کی وحی کا محتاج ہے۔ اسے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی گزارنے کے لیے وحی و نبوت کی ہدایت ناگزیر ہے۔ اس کے لیے صحیح طرز عمل یہ ہے کہ وہ انبیائے کرام کی لائی ہوئی ہدایت کی پیروی کرے، تاکہ اسے دنیا اور آخرت کی کامیابی حاصل ہو۔ اگر وہ اس ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کے پیچھے چلے گا تو دنیا اور آخرت میں ناکامی سے دوچار ہو گا۔

بِيَدِنِي إِسْرَاءِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِي الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَوْفُوا بِعَهْدِنِي
 أُوْفِ بِعَهْدِكُمْ وَإِيَّاَيِ فَارْهَبُونِ ﴿١﴾ وَأَمِنُوا بِمَا أَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِمَا
 مَعَكُمْ وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرِيهِ وَلَا تَشْتَرُوا بِأَيْمَانِي ثُمَّنَا قَلِيلًا وَإِيَّاَيِ
 فَأَنْتُقُونِ ﴿٢﴾ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتُكْنِيُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ
 تُعْلَمُونِ ﴿٣﴾ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَأْتُوا الزَّكُورَةَ وَأْرْكِعُوا مَعَ الرِّكَعَيْنِ
 أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْإِيمَانِ وَتَنْسُونَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتَلَوُنَ الْكِتَابَ
 أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٤﴾ وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا
 عَلَى الْخَشِعِينِ ﴿٥﴾ الَّذِينَ يَظْنُونَ أَنَّهُمْ مُلْقُوا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ

اللِّيَهِ رَجُونَ ﴿٦﴾

”اے بنی اسرائیل! میری نعمتوں کو یاد کرو، جو میں نے تمھیں عطا کیں۔ اس اقرار کو پورا کرو، جو تم نے مجھ سے کیا تھا۔ میں اس اقرار کو پورا کروں گا، جو میں نے تم سے کیا تھا اور صرف مجھ سے ڈرو۔ اور اس کتاب پر ایمان لاو جو میں نے اتنا رکھا ہے، جو اس کتاب کو سچا کرنے والی ہے، جو تمہارے پاس پہلے سے موجود ہے۔ ایسا نہ ہو، دوسروں سے پہلے تم اس کا کفر و انکار کر بیٹھو اور دنیا کا حقیر معاوضہ لے کر میری آئیں نہ پہنچو اور مجھی سے ڈرو۔ حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاو اور سچ کو جان بوجھ کرنہ چھپاؤ۔ نہ از قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ یہ کیا ہے کہ تم لوگوں کو بیکی کرنے کا کہتے ہو مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو، حالاں کہ تم کتاب پڑھتے ہو! کیوں تم سمجھتے نہیں؟ اور صبر اور نماز سے مددلو۔ یہ کام مشکل تو ہے مگر ان لوگوں کے لیے مشکل نہیں جو اللہ کے آگے عاجزی کرتے ہیں۔ جو یقین رکھتے ہیں کہ ایک دن اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔“ (40-46)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

﴿بِيَدِنِي إِسْرَاءِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِي الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَوْفُوا بِعَهْدِنِي أُوْفِ بِعَهْدِكُمْ وَإِيَّاَيِ فَارْهَبُونِ﴾

وَإِيَّاكَ فَارْهَبُونِ ﴿٤٠﴾ (40)

إِسْرَائِيلَ: یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے جس کے معنی ہیں ”اللہ کا بندہ“۔ بنی اسرائیل سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ (12) بیٹے اور ان کی اولاد ہے جو اس باط کھلاتے ہیں۔ تمام یہود ان کی نسل میں سے ہیں اور یہودیت (JUDAISM) ایک نسلی مذہب ہے۔

فَارْهَبُونِ: یہ رہبہ سے بنا ہے۔ جس کے معنی کسی کے رعب و جلال اور خوف سے کانپ اٹھنے کی حالت کے ہیں۔

اس سے پہلے یا آئیہا النَّاسُ (اے لوگو) کا خطاب عام تھا (آیت 21) اور اب یا بَنِی إِسْرَائِيلَ کا خطاب خاص ہے۔ درمیان میں آدم علیہ السلام کا قصہ بیان ہوا جو دراصل انسان کی ابتداء کا قصہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی وحی و نبوت کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا۔

پھر قرآن کے نزول کے وقت چونکہ یہود (بنی اسرائیل) ہی کو وحی و کتاب کا سب سے بڑا حامل سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے اب ان کو خطاب کر کے بتایا جا رہا ہے کہ تمہیں تمہارے منصب سے معزول کر دیا گیا ہے۔ تم نام کے اہل کتاب رہ گئے ہو، ورنہ اللہ کی کسی کتاب سے تمہارا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اب تمہاری جگہ امت مسلمہ کو وحی و کتاب کا علم بردار بنا دیا گیا ہے۔ حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب..... قرآن مجید نازل ہو رہا ہے۔ اب تمہارے لیے نجات کی ایک ہی صورت ہے کہ تم لوگ حضرت محمد ﷺ کی نبوت اور قرآن مجید پر ایمان لاو، ورنہ تمہارے لیے دنیا میں ذلت و رسوانی اور آخرت میں جہنم کا عذاب تیار ہے۔

بنی اسرائیل کے قصے کے بارے میں یہ بات تمہید کے طور پر سمجھ لینی چاہیے کہ اس میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں، ان کا براہ راست تعلق اگرچہ مدینے کے یہودیوں سے نہیں تھا لیکن چونکہ یہ لوگ اپنے آباء و اجداد کے تمام اچھے برے کاموں کو نہ صرف اپنا سرمایہ سمجھا (OWN) کرتے تھے، بلکہ ان پر فخر کا اظہار بھی کرتے تھے، اس لیے ان کے بڑوں کے احوال و واقعات کو بھی مدینے کے یہودیوں سے منسوب کر کے ہر جگہ ان کو محاذب کیا گیا ہے۔

اس آیت میں بنی اسرائیل یہودیوں کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میری ان نعمتوں کو یاد کرو اور میرا شکر کرو جو نعمتیں میں نے تمہاری قوم کو عطا کیں۔ نعمتیں میں نعمت کا لفظ اگرچہ واحد آیا ہے مگر یہ مضاف ہونے کی وجہ سے جمع کے معنوں میں ہے۔ ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی صورت یہ ہے کہ نافرمانی کا روئیہ چھوڑو اور میری چیزیں اطاعت کرو۔ میرے آخری نبی محمد ﷺ اور قرآن مجید پر ایمان لاو۔ میرے ساتھ کیسے ہوئے عہد و اقرار کو پورا کرو تو میں بھی تمہارے ساتھ کیسے ہوئے عہد و اقرار کو پورا کروں گا۔

بنی اسرائیل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ عہد کیا تھا؟ اس بارے میں کئی اقوال ہیں۔

ہمارے نزدیک اس عہد سے مراد یہودیوں کی پوری شریعت ہے جس کی پابندی کرنے کا ان کو حکم دیا گیا تھا اور جسے

قرآن نے کئی مقامات پر بیان کیا ہے۔ جیسے سورہ المائدہ میں ہے:

﴿وَلَقَدْ أَخَذَ اللَّهُ مِيَثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَبَعْثَنَا مِنْهُمُ الْئَنْوَارَ نَقِيبِيَاً وَقَالَ اللَّهُ لِنِي مَعَكُمْ طَلَيْنِ أَقْتَمْتُ الصَّلُوةَ وَأَتَيْتُمُ الرَّزْكَوَةَ وَأَمْتَمْتُ بُرْسُلِيَ وَعَزَّزْتُبُوْهُمْ وَأَقْرَضْتُمُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا لَا كُفَّرَنَ عَنْكُمْ سَيِّتاْتُكُمْ وَلَا دُخْلَنَكُمْ جَنَّتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَرُ هُ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلُ﴾ (المائدہ 12:5)

”اور اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان میں بارہ (12) سردار مقرر کیے۔ اللہ نے ان سے کہا: میں تمہارے ساتھ رہوں اگر تم نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، میرے پیغمبروں پر ایمان لاو، ان کا ساتھ دو اور اللہ کو قرض حسنہ دو تو میں تم سے تمہارے گناہ دُور کروں گا، تمہیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن میں نہیں بہتی ہوں گی۔ مگر تم میں سے اس کے بعد جس نے کفر کیا وہ سیدھے راستے سے بھڑک گیا۔“

مگر قرآن کے نزول کے وقت تک یہودیوں کی اکثریت اس عہد کو پس پشت ڈال پچکی تھی۔

شریعت کے اس عہد میں دوسرے احکامات کے علاوہ حضرت محمد ﷺ کی نبوت کے بارے میں بھی بڑی واضح پیش گوئیاں موجود تھیں۔

قرآن نے آگے چل کر یہودیوں کی لگاتار بد عہدیوں کو یوں بے نقاب کیا ہے:

﴿أَوَ كُلَّمَا عَاهَدُوا عَهْدًا نَّبَذَنَكَ فَرِيقٌ مِنْهُمْ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۵ وَ لَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَرِّقٌ لَهُمْ بَنَادَ فَرِيقٌ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كَتَبَ اللَّهُ وَرَآءَ عَظُُهُورَهُمْ كَانُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (البقرہ 2:100,101)

”بنی اسرائیل کا حال یہ ہے کہ جب کوئی عہد کرتے ہیں تو ان کا ایک گروہ اسے توڑ پھینکتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر ایمان نہیں رکھتے۔ اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ رسول آگیا جوان کی اپنی کتاب کو چاکرنے والا ہے، تو اہل کتاب کے ایک گروہ نے کتابِ الہی کو اس طرح پیش کیا چکیا۔“

اس طرح قرآن نے یہ واضح کیا ہے کہ یہودی قوم بد عہدی اور عہد شکن واقع ہوئی ہے اور بد عہدی اور عہد شکن کی عادت ان کی گھٹکی میں پڑی ہوئی ہے۔

آخر میں فرمایا ﴿إِنَّمَا فَارَهُبُونِ﴾ ”کہ صرف مجھ سے ڈرو۔“ فارہبیونِ اصل میں فارہبیونی تھا۔ فقرے کے آخر میں سعج کے طور پر آنے سے نبی کا یہ حذف ہو جانے سے صرف نہ رہ گیا ہے۔

مطلوب یہ ہے کہ اگر اس عہد کی پابندی کرنے اور اسلام قبول کر لینے سے تمہیں اپنے دینی مفادات ضائع ہونے کا ڈر ہے تو ان کی پرواہ نہ کرو۔ بلکہ تمہاری بد عہدی کی سزا کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو قهر و غصب نازل ہوگا،

اُس سے ڈرو۔

قصہ بنی اسرائیل کے مقاصد:

اس مقام پر بنی اسرائیل کا قصہ بیان کرنے کے چار اہم مقاصد ہیں:

- 1۔ اس میں نبی ﷺ کی نبوت کے سچا ہونے کی دلیل ہے کہ اس سے پہلے آپ ﷺ بنی اسرائیل کے حالات و واقعات سے واقف نہ تھے اور قرآنی وحی کے ذریعے آپ ﷺ کو ان کے بارے میں علم دیا گیا۔
- 2۔ اس قصے میں بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا تفصیلی ذکر موجود ہے جو مدینے کے یہودیوں کے آباء و اجداد کو عطا کی گئی تھیں تاکہ وہ ان نعمتوں کو یاد کر کے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں اور اس کے آخری نبی ﷺ اور قرآن مجید پر ایمان لا کیں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے کی بجائے اس کی اطاعت اور فرمائی برداری کریں۔
- 3۔ اس میں نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام کے لیے تسلی کا پہلو ہے کہ جو قوم اپنے محسن نبیوں کی نافرمان رہی ہے، ان کے قتل کے درپے ہوتی رہی اور جو اللہ کی کتاب میں لفظی اور معنوی تحریف (DISTORTION) کرتی رہی، ان کی نسل اگر آج محمد ﷺ اور قرآن مجید پر ایمان نہیں لاتی اور اسلام و شہی کا مظاہرہ کرتی ہے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔
- 4۔ اس میں مدینے کے یہودیوں کے لیے تنہیہ (WARNING) بھی ہے کہ اگر وہ اسلام قبول نہیں کریں گے تو ان کا انعام اچھا نہیں ہو گا اور ان پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہو گا۔

﴿وَأَمِنُوا إِيمَانًا آتَنَا مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرِيهِ وَلَا تَشْتَرُوا إِيمَانَكُمْ ثُمَّا قَبِيلًا وَرَأَيَّا فَإِنَّكُمْ ۝ (41)﴾

مُصَدِّقاً:..... (تصدیق کرنے والا۔ مصدق): یہ مصدق سے ہنا ہے جس کے معنی سچائی کے ہیں۔ لیکن قرآن میں مُصَدِّق کا لفظ قرآن مجید کی ایک صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے جس کے دو معنی ہیں: ایک یہ کہ قرآن صرف اس لحاظ سے مُصَدِّق ہے کہ وہ اپنے سے پہلی کتابوں مثلاً توریت، زبور اور انجیل کی تصدیق (CONFIRMATION) کرتا ہے کہ وہ سب اللہ تعالیٰ کی کتابیں تھیں مگر بعد میں ان کے بدجنت حاملین نے ان میں روبدل کر کے ان کو مغلکوں اور مشتبہ بنا دیا اور اب وہ ناقابل اعتبار ہیں۔ (البقرہ 2: 79)

دوسرے قرآن ان معنوں میں مُصَدِّق ہے کہ پہلی کتابوں میں نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ، آپ ﷺ کے صحابہ کرام اور قرآن مجید کے بارے میں جو پیش گوئیاں (FORTELLINGS) موجود تھیں، ان کو سچا ثابت کرنے والا ہے۔ گویا قرآن کے نزول سے پہلی کتابوں کی پیش گوئیاں بھی ثابت ہو گئی ہیں اور وہ ان پیش گوئیوں کا صحیح مصدق ہے۔ انہی معنوں میں کسی حماہی کا شعر ہے:

فَدَتْ نَفْسِي وَ مَا مَلَكْتْ يَمْنِينِ
فَوَارِسَ صَدَقَتْ فِيهِمْ ظُنُونِي

”میری اور میرے غلام لوٹدیوں کی جانیں، ان شہسواروں پر قربان! جنہوں نے اپنے بارے میں میری توقعات کو پچ کر دکھایا۔“

اس جگہ یہود کو قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے کہ یہ وہ قرآن ہے جو تمہاری توریت کی ان پیش گوئیوں کو سچا ثابت کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کے بارے میں تھیں اور جن کے پورا کرنے کا تمہیں انتظار بھی تھا۔ گویا قرآن پر تمہارا ایمان لانا تمہارے خود اپنی کتابوں پر ایمان لانے کے مترادف ہے۔ اس لیے تم کو اس سے انکار نہیں ہونا چاہیے۔

﴿وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرِيهِ﴾ (41)

یہ بھی یہود سے فرمایا گیا کہ تم اس قرآن کی دعوت کا انکار کر کے ”سب سے پہلے کافر“ نہ بن جانا۔ لیکن معلوم ہے کہ اس سے پہلے قرآن کا انکار کر کے قریش مکہ کی اکثریت ”سب سے پہلے کافر“ بن چکی تھی۔ پھر قرآن کے اس خطاب کا کیا مطلب ہے؟

ہمارے نزدیک اس کا مطلب، جیسا کہ امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں اور امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر ”فتح القدر“ میں لکھا ہے، یہ ہے کہ اس جگہ مدینے کے یہود سے کہا گیا ہے کہ وہ اہل کتاب میں سے پہلے کافرنہ بیسیں۔ یہود کی اپنی کتابوں (توریت وغیرہ) میں جو پیش گوئیاں موجود تھیں، ان کا مصدق قرآن بھی تھا اور حضرت محمد ﷺ بھی تھے۔ اس لیے یہودیوں سے یہی توقع تھی کہ وہ آگے بڑھ کر قرآن کی دعوت پر بلیک کہیں گے اور اس پر ایمان لائیں گے، اس کا انکار نہیں کریں گے کیونکہ اس صورت میں ان کا اپنی کتابوں کی تمام باتوں پر ایمان بھی سچا ثابت ہو سکتا تھا۔ مگر انہوں نے نہ صرف قرآن کا انکار کیا، بلکہ اُنہا اسلام دشمنی میں پہلی کی۔ نتیجہ یہ لکلا کہ وہ اہل کتاب میں ”سب سے پہلے کافر“ بن گئے۔ چنانچہ کتب سیرت میں ہے کہ مدینے کے یہودیوں میں سب سے پہلے بنو قیقاع، پھر بن قریظہ، پھر بن نضیر نے قرآن کی دعوت کو مُنکر کیا اور وہ اولین کفار بنے اور ان کے بعد خبر کے یہودی اسلام کے دشمن بن گئے۔ جزیرہ العرب میں ہزاروں کی یہودی آبادی میں سے صرف وہ بارہ افراد ایمان لائے۔ جب کہ ان کے مقابل میں عرب مشرکین کی بہت بڑی تعداد (آفواج) نے بعد میں اسلام قبول کر لیا۔

﴿وَلَا يَشْتَرُو إِيمَانَنَا قَبِيلًا﴾ (41)

یہ یہودیوں کے علماء سے فرمایا گیا کہ وہ اللہ کی آیتوں اور شریعت کے احکام کو حقیر مال کے بدالے میں نہ بچیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر زیادہ رقم مل جائے تو بچ دیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات اور اس کی شریعت کے بدالے میں سالمی دنیا کا ملک و دولت بھی ﴿تَهْنَأْ قَلِيلًا﴾ حقیر پوچھی ہے اور تھوڑے پیسے ہیں۔ یاد رہے کہ یہودی علماء

رشوت لے کر دنیوی مفادات کی خاطر اللہ تعالیٰ کے احکام بدل دیتے، غیر شرعی عدالت فیصلے کرتے اور فتوے بیچتے تھے۔ افسوس آج مسلمانوں کے علمائے سوء بھی دین فروٹی کا بھی دھندا کر رہے ہیں!

﴿وَإِنَّا إِلَيْهِ فَانْتَقُونَ﴾ (41)

پہلے فارہبیوں (صرف مجھ سے ڈرلو) فرمایا اور اب فاتقون فرمایا ہے۔ کیونکہ پہلے بغیر ایمان کا ڈرنا (رہبہ) تھا اور اب ایمان کا ذکر کر کے، ایمان کے بعد کا ڈرنا (تقوی) ہے۔ جب ایمان ہو گا تو دل میں غیر اللہ کا ڈر بھی نہیں ہو گا۔ صرف اللہ کا ڈر ہو گا کیونکہ ایمان اور غیر اللہ کا ڈر کسی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔

﴿وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتُنَزِّهُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ (42)

تلبسوا: یہ "لبس" سے ہے جس کے اصل معنی "خلط" یعنی ملانے کے ہیں۔ عربی زبان میں ((لبس الشَّيْءِ بِالشَّيْءِ)) کا مطلب ہوتا ہے "کسی چیز کو کسی اور چیز کے ساتھ ملا دینا۔" یا "کسی چیز کو کسی دوسری چیز سے ڈھانک دینا۔" لباس کو بس اس لیے کہتے ہیں کہ یہ جسم کو ڈھانک (یا ڈھانپ) دیتا ہے۔

تکنُوموا: یہ کتم، کتمان سے ہے جس کے معنی چھپانے کے ہیں۔ اس جگہ اس سے پہلے وہ "لا" مذوف ہے جو تلبسوا سے پہلے آیا ہے۔ اس لیے یہ ﴿لَا تَكْنُومُوا﴾ "تم نہ چھپاؤ" کے معنوں میں ہے۔

وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ: میں وَ (واد) حالیہ ہے جس کے معنی ہیں۔ "حالاں کہ" یا "جب کہ"۔

اس آیت میں بھی یہود کے علماء سے خطاب ہے کہ وہ حق کو باطل کے ساتھ نہ ملا کیں اور حق کو نہ چھپائیں۔ یہودی علمائی گھناؤنی اور مکروہ حرکت کرتے تھے کہ اپنی گھڑی ہوئی باتوں کو توریت کی عبارتوں میں گڈنڈ (MIX UP) کر دیتے تاکہ حق و باطل کی الگ الگ پیچان نہ رہے۔ یہ پتہ نہ چلے کہ اس میں حق یعنی اللہ کا کلام کون سا ہے اور اس میں باطل، جو علمائے یہود کی اپنی طرف سے گھڑی ہوئی باتیں ہیں، وہ کون سی ہیں؟ اس کے علاوہ وہ ہندو یہہمتوں اور پنڈتوں کی طرح توریت کے احکام بھی عام لوگوں سے چھپاتے تھے۔ توریت کے اندر ان پیش گوئیوں کو بھی وہ چھپاتے تھے جو حضرت محمد ﷺ اور آپ ﷺ کی نبوت کے بارے میں موجود تھیں تاکہ عام یہودی ان کو دیکھ کر اسلام قبول نہ کر لیں۔ اور وہ یہ سب کچھ جان بوجہ کر کیا کرتے تھے۔

﴿وَأَقْبِلُوا الصَّلُوةَ وَأَتُوا الزِّكْرَ وَأَذْكُرُوا مَعَ الرِّكَعَيْنَ﴾ (43)

﴿وَأَرْكَعُوا مَعَ الرِّكَعَيْنَ﴾ "اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔" رکع، رکوع کے اصل معنی "جھکئے" کے ہیں۔ اس جگہ رکوع سے مراد نہماز ہے۔ گویا جزو کہہ کر گل مرا دیا گیا ہے جو ہر زبان کی طرح عربی زبان کا بھی ایک اسلوب ہے۔

اس سے پہلے بنی اسرائیل کو ایمان لانے کی دعوت دی گئی۔ اب ان کو نیک اعمال کی دعوت دی جا رہی ہے اور اس میں سب سے پہلے نہماز کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ دین میں ایمان کے بعد اعمال میں سب سے زیادہ اہمیت نہماز ہی کی ہے۔

پھر زکوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ نماز کے بعد اسی کا نمبر ہے۔ آخر میں باجماعت نماز کی تاکید کے طور پر یہود سے فرمایا کہ اب تم لوگ مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو جاؤ اور ان کے ساتھ رکوع والی باجماعت نماز ادا کرو۔ یاد رہے کہ یہود کی شریعت میں جو نماز تھی، اس میں رکوع نہیں تھا۔ یہ گویا ﴿وَاقِبُّمُوا الصَّلَاةَ﴾ ”نماز قائم کرو۔“ کے پہلے حکم کی مرید وضاحت اور تاکید ہو گئی۔

﴿أَتَامْرُونَ النَّاسَ بِالْيُرُّ وَتَنْسُونَ الْفَسْكُمُ وَإِنْتُمْ تَتَلَوُنَ الْكِتَبَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ (44)

بڑا..... اس کے معنی یہ ہے، بھلائی، دین داری، وفاداری، فرض شناسی اور حق کی ادائیگی کے ہیں۔

یہ بھی علمائے یہود کو خطاب کیا گیا، جن کا حال یہ تھا کہ وہ دوسروں کو نیکی کا وعظ کرتے مگر خود بے عمل تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس نفاق اور قول فعل میں تضاد پر گرفت فرمائی ہے۔ بالکل یہی نصیون انجلیل میں بھی ہمیں ملتا ہے کہ مسیح علیہ السلام نے یہودی علماء کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

”اے شرع کے عالمو! تم پر افسوس ہے کہ تم ایسے بوجھ، جن کا اٹھانا مشکل ہے، آدمیوں پر لادتے ہو اور اپنی ایک انگلی بھی ان بوجھوں کو نہیں لگاتے۔“ (لوقا، باب 11:47)

پھر ارشاد ہوا کہ ﴿وَإِنْتُمْ تَتَلَوُنَ الْكِتَبَ﴾ کہ تمہارا حال یہ ہے کہ تم اللہ کی کتاب، توریت بھی پڑھتے پڑھاتے ہو، شریعت کو بھی جانتے ہو، اس کے باوجود اپنی ذمہ داریاں ادا نہیں کرتے ہو۔ نفاق اور قول فعل میں تضاد کی بیماری میں یہودی علماء بیٹلا ہوئے تھے۔

افسوس، آج ہمارے مذہبی پیشواؤں کی اکثریت بھی اسی مرض کا شکار ہے۔ جب کہ ان کو بھی قرآن نے اس سے بچنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذْمَأْنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝ كَبُرَ مَقْتَنًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ﴾ (الصف 3:61)

”اے ایمان والو! تم کیوں ایسی بات کہتے ہو جو کرتے نہیں؟ اللہ کے نزدیک یہ بہت ناراضی کی بات ہے کہ تم ایسی بات کہو، جو کرنہ نہیں۔“

اس کے بعد عام یہود کو خطاب کر کے فرمایا:

﴿وَاسْتَعِينُوا بِالصَّابِرَةِ وَالصَّلَاةِ ۚ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَشِعِينَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ يُظْلَمُونَ أَنَّهُمْ مُلْقُوا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ لَجُوعُونَ ۝﴾ (46,45)

استعینو: یہ استغاثت (مد ماگنا) سے ہے۔ اس کی تشریح سورہ الفاتحہ کی تفسیر میں ”تَسْتَعِينُ“ کے تحت گزر چکی ہے۔

صَابِرٌ: عربی زبان میں اس کے اصل معنی ”جس“ یعنی روکنے کے ہیں۔

استعمال کے لحاظ سے اس کے یہ معنی مراد ہوتے ہیں: ہر حال میں ثابت قدم رہنا، مشکل حالات کا مقابلہ کرنا اور رکاوٹوں کے باوجود اپنے موقف پر مضبوطی سے جئے رہنا۔

صبر کے ان معانی کو قرآن مجید کے درج ذیل مقامات بالکل واضح کر دیتے ہیں:

(1) ﴿ وَ الصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَ الْضَّرَّاءِ وَ حِينَ الْبَأْسِ ﴾ (البقرہ: 2) (177)

”اور صبر کرنے والے مالی پریشانی میں، جسمانی تکلیف میں اور جنگ کے وقت۔“

(2) ﴿ إِنَّكُادَ لَيُضْلِلُنَا عَنِ الْهَدِّنَا لَوْلَا أَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ﴾ (الفرقان 42:25)

”اس (نبی) نے تو ہمیں ہمارے معیودوں سے ہٹا دیا ہوتا اگر ہم ان پر مجھے نہ رہتے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ اردو زبان میں لفظ ”صبر“ کے معنوں میں ”بے بُی“ اور ”بے چارگی“ کا جو غالب مفہوم پایا جاتا ہے، وہ عربی زبان کے لفظ ”صبر“ میں بالکل نہیں پایا جاتا۔

إِنَّهَا: اس میں ہائی ضمیر کے مرجع کے بارے میں تین قول ہیں:

(1) ایک یہ کہ اس کا مرجع ”الصلوٰۃ“ ہے۔ اس بارے میں مجاهد اللہ کا یہی قول ہے۔ مراد یہ ہے کہ نماز ایک بھاری اور مشکل کام ہے۔

(2) دوسرا قول یہ ہے کہ یہ ضمیر صبر اور الصلوٰۃ دونوں کی طرف لوٹی ہے اور اس کا مطلب ہے کہ صبر اور نماز دونوں بڑے بھاری اور مشکل کام ہیں۔

(3) تیسرا قول یہ ہے کہ یہ ضمیر ان تمام احکام کے مضمون کی طرف لوٹی ہے جو اس سے پہلے مذکور ہوئے ہیں۔ اگرچہ عربیت کے لحاظ سے یہ تینوں اقوال اپنی جگہ پر درست ہو سکتے ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کے حق میں خود قرآن مجید سے بھی دلائل مل سکتے ہیں۔ مگر ہمارے نزدیک اس میں پہلے قول کو، جو مجاهد اللہ کا قول بھی ہے، ترجیح حاصل ہے۔

تَكْبِيرَۃ: اس کے معنی ”شامة“ اور ”تفقیلة“ کے ہیں، یعنی بھاری، گران، کٹھن اور مشکل چیز۔ تحمل قبلہ کے حوالے سے بھی یہ لفظ اپنے انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے:

﴿ وَ إِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الْذِيَّنَ هَدَى اللَّهُ ۝ ۵ ﴾ (البقرہ: 2) (143)

”اور بے شک قبلے کی تبدیلی اللہ کے ہدایت یافتہ بندوں کے سواب پر گران گزری ہے۔“

مطلوب یہ ہے کہ قبلے کی تبدیلی لوگوں پر شاق اور گران گزری ہے، اور یہ ان کے لیے سخت امتحان تھا۔

اسی مفہوم میں تکبیر کا لفظ بھی قرآن مجید میں ائمی جگہ آیا ہے۔ جیسے:

﴿ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ ﴾ (الشوری 42:13)

”مشرکین پر وہ بات گران گزرتی ہے جس کی طرف آپ ﷺ ان کو بلا تے ہیں۔“

مراد یہ ہے کہ جس تو حیدر کی دعوت ان کو دی جاتی ہے وہ ان کو خت ناگوار اور گراں گزرتی ہے۔
خَاشِعِيَّيْنَ: یہ خشوع سے ہے اور خاشعی کی جمع سالم مذکور ہے۔

خشوع کے اصل معنی نرمی، جھکاؤ، پستی اور عاجزی کے ہیں۔ اس کا متراوف لفظ ”خشوع“ ہے۔ قرآن میں خاشعین کا لفظ ان موئین کی صفت کے طور پر آیا ہے جو اللہ سے ڈرتے ہوں، جن میں غرور اور تکبر نہ ہو اور جن کو ہر وقت آخرت کی جواب دی کا احساس رہتا ہو۔ جیسا کہ سورہ الاحزاب میں ہے۔

(الاحزاب 35:33) ﴿...وَالْخَشِعِيَّيْنَ وَالْغُشِعِيَّيْنَ...﴾

”..... اور خشوع کرنے والے اور خشوع کرنے والیاں.....“

ایک اور مقام پر ہے:

﴿فَقَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝﴾ (المؤمنون 2,1:23)

”وہ ایمان والے یقیناً فلاں پائیں گے جو انہی نماز میں عاجزی کرتے ہیں۔“

یَظْنُونَ: یہ ”ظن“ سے ملتا ہے جس کے اصل معنی ”گمان“ کے ہیں، مگر ”یقین“ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے بعض علماء نے اسے ”اضداد“ میں شمار کیا ہے۔

جمہور مفسرین نے اس مقام پر ”ظن“ کو ”یقین“ کے معنوں میں لیا ہے۔ ان کے نزدیک گویا یَظْنُونَ کے معنی (وہ یقین رکھتے ہیں) کے ہیں۔ جیسا کہ ایک اور مقام پر ایک جنتی شخص کے بارے میں ہے:

(الحاقة 69:20) ﴿إِنَّى ظَنَنْتُ أَنِّي مُلَاقٍ حِسَابِيَّةً ۝﴾

”بے شک مجھے یقین تھا کہ میرا حساب پیش آنے والا ہے۔“

ظاہر ہے آخرت میں حساب کتاب ہونے پر یقین مطلوب ہے نہ کہ اس کا گمان، ورنہ ایمان مکمل نہیں ہوتا جو کہ ”خَاشِعِيَّنَ“ کے لیے ضروری ہے۔

اس سلسلہ کلام میں پہلے بنی اسرائیل کو ایمان لانے کی دعوت دی گئی۔ پھر ان کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا گیا اور اب ان کو یہ نصیحت کی گئی ہے کہ دین کی راہ پر چلتے ہوئے جو مشکلیں اور آزمائشیں آئیں تو ان کئی حالات سے عہدہ برنا ہونے کے لیے صبر اور نماز سے مدد لینا۔

جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿يَا إِيَّاهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلْوَةِ ۖ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِيَّنَ ۝﴾ (البقرہ 2:153)

”اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد لو۔ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

پھر صبر کا مشکل ہونا تو واضح تھا، نماز کے بارے میں خاص طور پر بتایا کہ یہ بڑا مشکل کام ہے۔ منافقوں، ریا کاروں اور آرام طلب انسانوں کے لیے نماز کی پابندی اور اسے باجماعت ادا کرنا آسان نہیں ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ

حقیقت بھی واضح فرمادی کہ خاشعین کے لیے یہ کام مشکل نہیں ہے جو ایمان رکھتے ہیں، عاجزی کرتے ہیں، جن کو آخرت کی فکر رہتی ہے اور جن کو اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ اس کے صلے میں ان کو اپنے انعامات سے نوازے گا، اور جنت عطا فرمائے گا۔

یہ انسانی نفیات ہے کہ اگر انسان کو کسی کام کے کرنے سے بڑے فائدے یا انعام کی توقع ہو تو وہ اس کے لیے ہر مشقت اٹھانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ پھر محبت کا تو معاملہ ہی اور ہے جس میں ہر کلفت، راحت اور ہر تلخی، شیرین محسوس ہوتی ہے۔

از محبت تلخ ہا شیریں شود (مولانا روم رضا)

”محبت کی وجہ سے کڑوی چیزیں بھی میلھی ہو جاتی ہیں۔“

ایک شاعر کہتا ہے:

آلِم روزگار کو آسان بنا دیا

جو حُم ملا اُسے غمِ جانش بنا دیا

پھر اہل ایمان کو ہر چیز سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ سے محبت ہوتی ہے:

﴿وَالَّذِينَ أَمْنَوْا أَشَدُ حُبًا لِّلَّهِ﴾ (البقرہ 2:165)

”اور ایمان والے سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔“

وَهُنَّا اللَّهُ تعالیٰ، جو کہ ان کا محبوب ہے، کے حکموں کی پابندی میں بھی لذت و سرور محسوس کرتے ہیں۔ ایک حدیث میں نبی ﷺ نے فرمایا:

((..... وَفُرُّهُ عَيْنِي فِي الصَّلَاةِ))

”اوہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔“

اسی طرح جہاد کے میدان میں غازیوں کو سرور حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ شاعر مشرق کہتا ہے:

سرورِ جو حق و باطل کی جنگاہ میں ہے

تو حرب و ضرب سے بیگانہ ہو تو کیا کہیے!

ایک ”دہن قبوری“ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس آیت میں صبر اور نماز سے استعانت یعنی مدد مانگنے کا ذکر موجود ہے، اور صبر اور نماز غیر اللہ ہیں۔ لہذا غیر اللہ سے استعانت طلب کرنا بالکل جائز ہے اور یہ ﴿إِنَّكَ نَسْتَعِنُ عَلَىٰ خَلْفٍ نَّبِيلٍ﴾ کے خلاف نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک یہ ایک مغالطہ (ILLUSION) ہے جو شرک اور بدعت کے جواز کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور یہ ٹھیک ٹھیک تفسیر بالرائے مذموم کے ذیل میں آتا ہے۔

جب سورہ الفاتحہ میں واضح طور پر نفس صرخ موجود ہے کہ:

﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ ٥

”هم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور صرف تھجی سے مدد مانگتے ہیں۔“

تو جس طرح ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کے بعد غیر اللہ کی عبادت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، اسی طرح ﴿إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ کے بعد غیر اللہ سے استغانت یعنی مدد مانگنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔

کیونکہ دونوں باتوں میں تاکید اور حصر ایک جیسا ہے۔ پھر **الْمُسْتَعَانُ** ”جس سے مدد مانگی جائے۔“ صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ کوئی اور اللہ تعالیٰ کی اس صفت میں اس کا شریک نہیں ہو سکتا۔ (الانبیاء 21:112)

يَبْنَىٰ إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ
عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿٤﴾ وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْعًا وَ لَا
يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعةٌ وَ لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَ لَا هُمْ يُنَصَّرُونَ ﴿٥﴾
وَإِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِّنْ أَلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ
أَبْنَاءَكُمْ وَيُسْتَحْيِونَ نِسَاءَكُمْ وَفِي ذَلِكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ ﴿٦﴾
وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا أَلِ فِرْعَوْنَ وَأَنْتُمْ
تَنْظَرُونَ ﴿٧﴾ وَإِذْ وَعَدْنَا مُوسَى أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْنَاهُ الْعِجْلَ
مِنْ بَعْدِهِ وَأَنْتُمْ ظَلِمُونَ ﴿٨﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ
لَعْلَكُمْ تَشَكُّرُونَ ﴿٩﴾ وَإِذْ أَتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ
تَهْتَدُونَ ﴿١٠﴾ وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ يَقُولُ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنفُسَكُمْ
بِأَنَّهَا دِرَكُ الْعِجْلَ فَتَوَبُّوا إِلَيَّ بَارِيِّكُمْ فَاقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ ذَلِكُمْ
خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِيِّكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ إِنَّهُ هُوَ التَّوَابُ

الرَّحِيمُ ۝ وَ إِذْ قُلْتُمْ يَمُوسَى لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى اللَّهَ
جَهَرَةً فَاخَذَنَا الصُّعْقَةُ ۝ وَ أَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ۝ ثُمَّ بَعْثَنَكُمْ
مِّنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ وَظَلَّنَا عَلَيْكُمُ الْغَيَامَ
وَ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلُوٰى ۝ كُلُّوٰمِنْ طَيِّبَتْ مَا رَزَقْنَكُمْ
وَ مَا ظَلَمْوُنَا وَ لِكُنْ كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۝ وَ إِذْ
قُلْنَا ادْخُلُوا هَذِهِ الْقَرِيَةَ فَكُلُّوٰ مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغْدًا
وَ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا ۝ وَ قُولُوا حِطَّةٌ نَغْفِرُ لَكُمْ خَطِيلَكُمْ
وَ سَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ۝ فَبَدَأَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي
قِيلَ لَهُمْ فَإِنْزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِّنَ السَّيَاءِ بِمَا

كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝

ب

”اے بنی اسرائیل! میری نعمتیں یاد کرو جو میں نے تم پر کیں۔ خاص طور پر جو میں نے تمہیں دنیا والوں پر فضیلت دی تھی۔ اور اس دن سے ڈرو جب کوئی جان کسی اور کے کام نہ آئے گی، نہ کسی کی سفارش مانی جائے گی، نہ کسی سے مال لے کر اسے چھوڑا جائے گا، اور نہ کہیں سے کوئی مدد پہنچ سکے گی۔

وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تمہیں فرعون کے لوگوں سے نجات دلائی، جنہوں نے تمہیں سخت عذاب میں ڈال رکھا تھا۔ وہ تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے۔ اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش تھی۔

یاد کرو جب ہم نے سمندر پھاڑ کر تمہیں پار کرا یا اور بجا لیا، مگر تمہاری آنکھوں کے سامنے فرعون کی قوم کو غرق کر دیا۔ یاد کرو جب ہم نے موی کو چالیس (40) راتوں کے وعدے پر بلا یا۔ پھر ان کے پیچھے تم نے پھرے کو معبدوں بنا لیا اور تم ناطلم بنتے۔ اس کے باوجود ہم نے تمہیں معاف کیا، تاکہ تم شکر کرو۔

اور یاد کرو جب ہم نے موی کو کتاب دی اور حق و باطل کا فرق کرنے والی چیز دی، تاکہ تم ہدایت پاؤ۔ یاد کرو

جب موئی نے اپنی قوم سے کہا: اے لوگو! تم نے پچھرے کی پوجا کر کے اپنے اوپر ظلم کیا۔ اب تم اپنے پیدا کرنے والے کے آگے توبہ کرو اور اپنے لوگوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرو۔ باری تعالیٰ نے تمہارے لیے یہی بہتر فصلہ فرمایا ہے۔ پھر اللہ نے تمہاری توبہ قبول کی۔ بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ اور جب تم نے کہا تھا: اے موئی! جب تک ہم اللہ کو خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں، تمہاری بات کا یقین نہ کریں گے، اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے تم پر بخیلی گری اور تم ہلاک ہو گئے۔ پھر تمہاری موت کے بعد ہم نے تمہیں اٹھایا، تاکہ تم شکر گزار بنو۔

ایک وقت وہ تھا جب ہم نے تمہارے اوپر بادلوں کا سایہ کیا۔ تمہارے لیے من وسلوی کا رزق اتنا رہا۔ تاکہ ہماری عطا کی ہوئی پاکیزہ چیزیں کھاؤ۔ مگر اس کے بعد انہوں نے ہمارا کچھ نقصان نہیں کیا، خود اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔ یاد کرو جب ہم نے حکم دیا کہ اس بستی میں داخل ہو جاؤ اور وہاں جیسے چاہو، خوب کھاؤ پیو۔ جب اس بستی کے دروازے میں داخل ہونے لگو تو تمہارے سر بچکے ہوئے ہوں اور زبانیں توبہ و استغفار کر رہی ہوں۔ اس پر ہم تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے اور ٹھیک حکم بجالانے والوں کو اپنے فضل و کرم سے نوازیں گے۔ مگر ان ظالموں نے ہمارے حکم کو بدل ڈالا، تو ہم نے ان کی نافرمانی کی وجہ سے ان پر آسمان سے عذاب نازل کیا۔” (47: 47)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

﴿لِيَبْيَقُ إِسْرَائِيلَ أَذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ الَّتِي أَعْمَلْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ﴾ (47)

الْعَالَمِينَ: اس سے پہلے سورہ الفاتحہ کی تفسیر میں ہم لکھے چکے ہیں کہ اس لفظ سے مراد ”کسی ایک زمانے کے لوگ“ بھی ہوتے ہیں۔ اس جگہ یہ لفظ انہی معنوں میں آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو ایک خاص دور میں دنیا کی دوسری قوموں پر فضیلت دی گئی۔ ہر زمانے کے لوگوں پر ان کو فضیلت حاصل نہ تھی۔ ورنہ ہماری امت کے بارے میں یہ ارشاد نہ ہوتا کہ:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرَجْتُ لِلنَّاسِ...﴾ (آل عمران: 3)

”تم بہترین امت ہو جئے لوگوں (کی رہنمائی) کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔“

اس ارشاد سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ امت مسلمہ کو دنیا کی تمام امتوں اور قوموں پر فضیلت حاصل ہے۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان کی غفلت اور لاپرواہی کی وجہ سے دوبارہ خطاب کر کے فرمایا کہ تم لوگ میری نعمتوں اور میرے احسانات کو یاد کرو۔ ان کے حوالے سے جو ذمہ داریاں تم پر عائد ہوتی ہیں، ان کو پورا کرو۔ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کاشکرا دا کرو۔ پھر فرمایا کہ میں نے تمہیں یہ خاص نعمت بھی عطا کی کہ ایک مخصوص دور میں وقت کی تمام قوموں پر تمہیں فضیلت دی۔ یہ گویا عام کے بعد خاص کو بیان کرنے کا اسلوب ہے۔

یہی بات دوسری جگہ یوں فرمائی گئی:

﴿وَلَقَدْ أَخْتَرْنَا هُمْ عَلَىٰ عِلْمٍ عَلَىٰ الْعَالَمِينَ ۝﴾ (الدخان: 44)

”اور ہم نے اپنے علم کے مطابق ان (بني اسرائیل) کو دنیا والوں پر ترجیح دی تھی۔“

الله تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو کئی نعمتوں اور احسانات سے نوازا تھا۔ ان کی فضیلت کا ایک خاص پہلو یہ بھی تھا کہ ان میں کثرت سے انبیاء کرام بھیجے گئے، جن میں سے بعض بیک وقت نبی بھی تھے اور حکمران بھی۔ جیسے حضرت

یوسف علیہ السلام، داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ يَقُولُمْ إِذْ كُرُوا نِعْمَةُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ آنْبِيَاً وَ

جَعَلَكُمْ مُلُوْكًا وَأَتَكُمْ مَالَمْ يُؤْتَ أَحَدًا مِنْ الْعَالَمِينَ ۝﴾ (المائدہ: 5)

”اور یاد کرو جب علیہ السلام موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو، جو اس

نے تمہارے اندر نبی پیدا کیے، تمہیں بادشاہ بنایا اور تمہیں وہ کچھ دیا جو دنیا میں کسی کو نہیں دیا۔“

فرمایا کہ یہ فضیلت ذرا صل الہ تعالیٰ کا تم پر فضل و کرم تھا، تمہارا اپنا کوئی اتحاقاً یا کمال نہ تھا۔ اس کے علاوہ تمہیں ایسی نعمتیں دیں جو دوسری قوموں کو نہیں دی گئیں۔ اب تمہارا یہ فرضی منصی ہے کہ تم قرآن پر اور حضرت محمد ﷺ پر ایمان لاو، جن کی نبوت کی پیش گویاں خود تمہاری کتاب (توریت) میں موجود ہیں جس پر عمل کرنے کا اللہ تعالیٰ سے عہد بھی کر چکے ہو۔

﴿وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَ لَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَ لَا يُغَذَّنُ

مِنْهَا عَدْلٌ وَ لَا هُمْ يُنَصَّرُونَ ۝﴾ (48)

اس آیت میں بنی اسرائیل کو خبردار کیا گیا ہے کہ تم لوگ کسی غلط فہمی میں نہ رہو کہ نبیوں سے نسبت اور ان کی سفارش تمہیں آخرت میں نجات دلادے گی۔ بلکہ وہاں صرف سچا ایمان اور نیک اعمال کام آئیں گے۔ اس دن کوئی کسی کے کام نہ آئے گا کفر کی حالت پر مرنے والوں کے لیے کوئی شفاعت نہ ہوگی۔ دوزخ کے عذاب سے بچاؤ کے لیے کسی سے فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا اور جہنم سے نجات دلانے والا کوئی مدگار نہ ہوگا۔

البیت صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ ہماری امت کے بہت سے گناہ گار مسلمانوں کے لیے نبی ﷺ شفاعت کریں گے، جسے اللہ تعالیٰ قبول فرمائے گا۔ (دیکھیے: صحیح بخاری، رقم: 7510۔ صحیح مسلم، رقم: 479۔ ابو داؤد، رقم: 4739۔ ترمذی، رقم: 2435۔ ابن ماجہ، رقم: 4310)

﴿وَإِذْ نَجَّيْنَاهُمْ مِنْ أَلٰ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُونَكُمْ سُوْءَةَ الْعَذَابِ يُذَّهِّبُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ

نِسَاءَكُمْ وَفِي ذَلِكُمْ بَلَاءٌ مِنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ ۝﴾ (49)

آل:..... اس کے معنی خاندان، قوم یا پیروکار کے ہیں۔

فِرْعَوْنَ:.....یہ مصر کے بادشاہوں کا لقب تھا جیسے روم کے بادشاہ قیصر اور ایران کے بادشاہ کسری کہلاتے تھے۔
يَسُومُونَ:.....یہ ”سوم“ سے ہے۔ سَامَ يَسُومُ کے معنی ہیں، کسی پر بوجھوڑانا۔ اس جگہ اس سے یہ مراد ہے کہ فرعون کی قوم نے بنی اسرائیل پر ذلت ناک عذاب مسلط کر کھا تھا۔

بَلَاءُ کے معنی آزمائش کے بھی ہیں اور نعمت و احسان کے بھی۔ بنی اسرائیل کے لیے آزمائش یہ تھی کہ وہ مصر میں فرعونیوں کے غلام تھے جو ان پر ظلم و ستم کرتے تھے۔ ان کے بیٹوں کو ذبح کر دیتے اور ان کی عورتوں کو لوٹیاں بنانے کے لیے زندہ چھوڑ دیتے تھے۔ اور بنی اسرائیل کے لیے نعمت یہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو غلامی کی ذلت اور ظلم و ستم سے رہائی عطا فرمائی جیسا کہ ”نَجَّيْنَاكُمْ“ سے ظاہر ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اپنا یہ احسان یاد دلایا ہے کہ تم لوگ مصر میں فرعونیوں کے تحت ذلت آمیز غلامانہ زندگی بر کرتے تھے۔ وہ تم پر ظلم و ستم ڈھاتے تھے۔ تم سب غلامی کی سخت آزمائش میں بیٹلا تھے۔ وہ تمہارے بیٹوں کو پیدا ہوتے ہی مارڈا لتے تھے اور تمہاری عورتوں کو لوٹیاں کی خشیت سے زندہ چھوڑ دیتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر کتنا بڑا احسان کیا کہ تمہیں مصر کے فرعونیوں کی غلامی سے نجات دلائی۔

بنی اسرائیل کے بیٹوں کو ذبح کیے جانے میں ان لوگوں کی بے بسی کی طرف اشارہ ہے اور عورتوں کو لوٹیاں بنانے جانے میں ان کی غیرت کو جھنڈھوڑا گیا ہے۔

مصر کے فراعن نے بنی اسرائیل کی نسل گشی (GENOCIDE) کے لیے ایک سے زیادہ مرتبہ ہم چلانی تھی۔ اس دور میں بھی جب مویٰ ﷺ ابھی پیدائشیں ہوئے تھے اور اس زمانے میں بھی جب وہ رسول بن کر فرعون کے پاس آئے اور جادوگروں سے مقابلے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ سورہ الاعراف میں اسی دوسری ہم کا ذکر اس طرح آیا ہے:
 ﴿وَ قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمٍ فِرْعَوْنَ أَتَنْذِرُ مُؤْسِى وَ قَوْمَهُ لِيُفِسِّدُوا فِي الْأَرْضِ وَ يَنْذِرُكَ وَ إِلَهُكَ طَقَالَ سَنْقِتِيلُ أَبْنَاءَهُمْ وَ نَسْتَحْيِ نِسَاءَهُمْ ۝ وَ إِنَّا فُوقُهُمْ قَهْرُونَ ۝﴾ (الاعراف: 7)

”اور فرعون سے اُس کی قوم کے سرداروں نے کہا“ کیا تم مویٰ ﷺ اور اس کی قوم کو یوں ہی چھوڑ دو گے کہ وہ ملک میں فساد پھیلائیں اور تمہارے معبدوں کو محکراتے رہیں۔“ فرعون نے کہا: ہم ان کے بیٹوں کو جن چن کر قتل کریں گے، ان کی عورتوں کو زندہ رکھیں گے اور ہمیں ان پر پورا غلبہ حاصل ہے۔“

﴿وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا أَلَّا فِرْعَوْنَ وَ أَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ۝﴾ (50)
 الفرق:.....اس کے اصل معنی ”الفَصْلُ بَيْنَ الشَّيْئَيْنِ“ کے ہیں، یعنی دو چیزوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دینا۔ اس جگہ فرقنا البحر کے معنی ہیں، ہم نے سمندر کو چاڑ کر الگ الگ کر دیا۔

بِكُمْ:.....یہاں لَكُمْ (تمہارے لیے، تمہاری خاطر) کے معنی میں آیا ہے۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا:

(البقرة: 185)

﴿بُرِيَّدَ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ﴾

”اللَّهُ تَهَارَ لِيَ آسَانِي چاہتا ہے۔“

اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو خطاب کر کے ان پر اپنے ایک احسان کا ذکر فرمایا ہے کہ ایک ایسے موقع پر جب تمہارے آگے سندھر قلزم کی موجودی اور تمہارے پیچھے فرعون کی فوجیں تھیں اور تم ان کے درمیان میں سینڈوچ (SANDWITCH) بن کر نزغے میں آگئے تھے، اللہ تعالیٰ نے تمہاری حفاظت فرمائی۔ ہم نے سندھر کو پھاڑ کر تمہارے لیے پیٹ نکلنے کا راستہ بنادیا اور تم نے آگے چل کر ساحل پر سے اپنے دشمن کے غرق ہونے کا عبرت ناک منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

اللہ تعالیٰ کے حکم سے مویٰ علیہ السلام نے سندھر پر اپنا عصا مارا جس سے سندھر پھٹ گیا اور اس میں بنی اسرائیل کے بارہ (12) قبائل کے لیے بارہ (12) الگ الگ راستے بن گئے۔ یہ سراسر مجرمہ تھا جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے مویٰ علیہ السلام کے ہاتھوں رونما ہوا تھا۔ قرآن نے اس واقعے کو چھ (6) مقامات پر بیان کیا ہے۔ سورہ الشراء میں یہ واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے:

﴿فَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنِ اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْبَحْرَ فَأَنْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالظَّوْدِ
الْعَظِيمِ ۝ وَأَزْلَفْنَا ثَمَّ الْأَخْرِيَنَ ۝ وَأَنْجَيْنَا مُوسَىٰ وَمَنْ مَعَهُ أَجْمَعِينَ ۝﴾

(الشراء: 63-66)

”پھر ہم نے مویٰ کو وحی کی کہ ”اپنا عصا سندھر پر مارو!“ اس طرح سندھر کا پانی پھٹ گیا اور اس کا ہر حصہ پہاڑی تو دے کی طرح کھڑا ہو گیا۔ ہم نے دوسرے فریق کو بھی اس کے قریب پہنچا دیا۔ پھر ہم نے مویٰ اور ان کے ساتھیوں کو بچالیا مگر دوسرے فریق کو غرق کر دیا۔“

افسوں، ہمارے ہاں کے بعض لوگوں نے، جس میں سر سید مرحوم، قادریانی حضرات، مفسرین حدیث (مثلاً غلام احمد پرویز) اور اہل نظم (فرقة فراہیہ)..... شامل ہیں، قرآن مجید کے اس واضح اور صریح مجرمہ کا انکار کیا ہے اور سندھر کے مددو جزر (جوار بھائیا RISE & EBB oF THE SEA) کو بنی اسرائیل کے پیٹ نکلنے اور فرعونیوں کے غرق ہونے کا سبب قرار دیا ہے۔

غور کیجیے، عقل کے دھوے اور نیچپریت کی بنیاد پر اس یکسر مجرمہ کا انکار کرنے والوں نے یہ کتنی غیر معقول بات کہی ہے!

﴿وَإِذْ أَعْذَنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذَ ثُمَّ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَنْتُمْ ظَلَمُونَ ۝

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝﴾ (52,51)

وَعَذَنَا: اس کے معنی وَعَذَنَا (ہم نے وعدہ کیا) کے ہیں۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو مطابق کر کے ان پر اپنے ایک اور احسان کا ذکر فرمایا ہے۔

اس میں پہلے اس وعدے کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے مویٰ ﷺ کو توریت دینے کے لیے کیا تھا۔ مصر سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل کو بُدایت و رہنمائی کے لیے جب ایک کتاب کی ضرورت پڑی تو اللہ تعالیٰ نے مویٰ ﷺ سے وعدہ کیا کہ وہ کوہ طور پر چالیس (40) راتوں کے لیے قیام کریں تو ان کو توریت عطا کی جائے گی۔ مگر اصل میں یہ تیس (30) راتیں تھیں، جن میں دس (10) کا اضافہ کر کے چالیس (40) کر دیا گیا تھا کیونکہ مویٰ ﷺ مقررہ وقت سے پہلے ہی وہاں پہنچ گئے۔ ان کا ذوق و شوق دیکھ کر اللہ تعالیٰ نے ان کی مزید روحانی تربیت کے لیے دس (10) راتیں اور بڑھاوی تھیں، جیسا کہ سورہ الاعراف میں ہے:

﴿وَعَدْنَا مُوسَىٰ نَثَرِيْنَ لَيْلَةً وَأَتَمَّهَا بِعَشِيرٍ فَتَمَّ مِيقَلُتْ رَبِّهِ أَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً﴾ (الاعراف: 7)

”اور ہم نے مویٰ ﷺ سے تیس (30) راتوں کا وعدہ کیا۔ پھر اس میں دس (10) راتوں کا اضافہ کیا۔ اس

طرح مویٰ کے رب کی مقرر کردہ مدت چالیس (40) راتوں میں پوری ہوئی۔“

لیکن بنی اسرائیل نے مویٰ ﷺ کے کوہ طور پر چلنے جانے کے بعد ان کے پیشہ پیچھے سونے کی دھات کے بنے ہوئے پھرترے کی پوچھا کی اور شرک کا گناہ کر کے اپنے اوپر ظلم کیا۔ (یہی مضمون آگے آیت 54 میں ذرا تفصیل سے آرہا ہے۔) اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے اس شرک کے باوجود ان کو فوری طور پر عذاب میں نہیں پکڑا بلکہ مویٰ ﷺ کے واپس آجائے تک مہلت دی۔ پھر جب وہ تشریف لائے تو انہوں نے قوم کی معانی کے لیے توبہ اور کفارے کی ایک صورت نکالی تاکہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے اس انعام و احسان کا شکر ادا کریں جس نے ان کے شرک کے باوجود ان سب پر عذاب استیصال نہیں بھیجا۔

﴿وَإِذْ أَتَيْنَا مُوسَىٰ الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهَدُونَ﴾ (53)

الْكِتَابُ:..... اس جگہ اس سے توریت مراد ہے۔ اسی پر مفسرین کا اجماع رہا ہے۔

الْفُرْقَانُ:..... اس کے اصل معنی حق اور باطل میں فرق کرنے والی چیز کے ہیں۔ لیکن اس جگہ اس سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں کئی قول ہیں۔

بعض نے اس کے واو کو تفسیریہ (یا عطف بیان) کے معنوں میں لے کر توریت کی صفت 'فرقان' مانی ہے اور توریت ہی کو فرقان قرار دیا ہے کہ وہ حق و باطل میں فرق کرتی تھی۔ بعض نے الفرقان سے وہ مجرمات مراد لیے ہیں جو مویٰ ﷺ کو دیے گئے تھے جیسے عصا اور یہدیہ بیضا وغیرہ۔ مجاهد حاششہ کا یہی قول ہے۔ قرآن نے غزوہ بدر کو "یوم الفرقان" کہا ہے کیونکہ اس سے کفر کا باطل ہونا اور اسلام کا حق ہونا ظاہر ہوا تھا۔ (الانفال: 8)۔ خود قرآن کا ایک صفاتی نام "الفرقان" بھی ہے جیسا کہ ارشاد ہوا:

﴿تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا﴾ (الفرقان: 1:25)

”بَارِكَتْ هِيَ وَذَاتُهُ جس نے اپنے بندے (محمد) پر قرآن نازل کیا تاکہ سارے جہان والوں کو خبردار کر

”دے۔“

فرمایا کہ بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے توریت نازل فرمائی تھی اور موسیٰ علیہ السلام کو مجذات بھی عطا کیے تھے۔ پھر توریت میں اللہ تعالیٰ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کے بارے میں واضح پیش گویاں تھیں جن کو دیکھ کر مدینے کے یہودی بھی قرآن مجید پر اور حضرت محمد ﷺ کی نبوت پر ایمان لا کر ہدایت پاسکتے تھے۔

﴿وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ يُقَوِّمُ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنفُسَكُمْ بِأَنْ تَخَذُوا مِنَ الْعِجْلَ فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِيْكُمْ فَاقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ عِنْدَ بَارِيْكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ إِنَّهُ هُوَ التَّوَابُ الرَّحِيمُ﴾ (54)

باتخاذِ کم: میں ب سیبیہ ہے۔

بَارِيُّ: یہ بَرَعَ سے اسم فاعل ہے۔

البَارِيُّ: اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنی میں سے ہے جس کے معنی ہیں: مختلف قسموں اور شکلوں کی جاندار چیزیں پیدا کرنے والا۔

فَاقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ: اس کا مطلب خود کشی کرنا نہیں ہے بلکہ ایک نہب و ملت کے لوگ آپس میں بھائی بھائی ہوتے ہیں اور بھائی اپنی جان کی طرح ہوتا ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَلَا تَلْبِرُوا أَنفُسَكُمْ﴾ (الحجرات 11:49)

”اور تم (مسلمان) ایک دوسرے کو طعنے نہ دو۔“

الْتَّوَابُ: یہ مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں: بار بار تو بقول کرنے والا۔

بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ لوگ جنہوں نے پچھڑے کی پوجا نہیں کی، وہ اپنے ان رشتہ داروں اور دوستوں کو قتل کریں جو پچھڑے کی پوجا کر کے مشرک اور مرتد ہو گئے تھے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اپنی ایک اور نعمت یاد دلائی ہے کہ یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ تم لوگوں نے پچھڑے کو معبد بنایا کہ اور اس کی پوجا کر کے جو شرک کیا ہے، وہ اپنے اوپر بڑا ظلم کیا ہے۔ لہذا اب تم توبہ کرو اور معافی مانگو اس اللہ سبحانہ سے جس نے ہر قسم اور شکل و صورت کی مخلوق بنائی ہے۔ تم نے اپنے خالق کی عبادت کی بجائے اس کی ایک مخلوق۔۔۔ پچھڑے کی پوجا کی ہے۔ شرک واقعی بڑا ظلم ہے۔ سورہ لقمان میں ہے:

﴿إِنَّ الشَّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾ (لقمان 13:31)

”بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔“

ایک مشرک نہ صرف اللہ تعالیٰ کی حق تلفی کرتا ہے بلکہ انسانیت کی تذلیل و توبہ کرتا ہے کہ اپنے سے کمتر اور حقر شے کے آگے بھکتا ہے حالاں کہ وہ خود اشرف الخلوقات ہے۔

اس کے بعد مویٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو توبہ کے علاوہ یہ حکم بھی دیا کہ جنہوں نے شرک نہیں کیا، وہ موحدین ان مشرکین و مرتدین کو جنہوں نے شرک اور ارتداد کا ارتکاب کیا ہے..... قتل کر دیں۔ ہر قبیلے والے اپنے قبیلے کے مجرموں کی گرد نہیں اڑا دیں۔ ﴿فَاقْتُلُوا آنَفُسَكُمْ﴾ کا یہی مطلب ہے۔ باعثیل کا بیان ہے کہ اس دن تین ہزار (3000) افراد مارے گئے تھے۔ (کتاب خروج، باب 32، آیات 25-30)

اس سے معلوم ہوا کہ ہماری شریعت کی طرح بنی اسرائیل کی شریعت میں بھی مرتد کی سزا قتل تھی جو پچھرے کی پوجا کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے دی گئی تھی۔ اس طرح ان لوگوں کے گناہ کے لیے یہی اجتماعی توبہ کی صورت بن گئی، جنہوں نے اپنے سامنے کفر و شرک ہوتے دیکھ کر اسے نبی عن لمکر کے تحت روکا نہیں تھا۔

آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ بار بار قبول فرمانے والا اور ان پر محربان ہے۔ اسی نے اپنے بندوں کی بھلانی کی خاطر ان کو توبہ کے ذریعے گناہوں کی معافی کا طریقہ سکھایا ہے۔

**﴿وَإِذْ قُلْتُمْ يَهُوْلِي كُنْ نُؤْمِنَ لَكُ حَتَّىٰ تَرَى اللَّهَ جَهَرَةً فَاخَذْتُكُمُ الظَّعَقَةَ
وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ﴾ (55)**

یہ بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کے ایک اور انعام و احسان کا ذکر ہے جب ان کے ستر (70) سرداروں کو ان کی موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا گیا۔

مویٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کے ہم کلام ہونے کے بارے میں بنی اسرائیل نبی کی گمراہی میں بتتا تھے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ واقعی مویٰ علیہ السلام سے کلام کرتا ہے تو ہم اسے خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں، تاکہ وہ ہم سے بھی کلام کرے۔ اس کے بعد ہمیں یقین ہو گا کہ اللہ تعالیٰ بھی مویٰ علیہ السلام پر وحی بھیجتا اور ان سے ہم کلام ہوتا ہے۔

بنی اسرائیل کے اس مطالبے کو پورا کرنے کے لیے ان کے ستر (70) منتخب سرداروں کو ساتھ لے کر حضرت مویٰ علیہ السلام کوہ طور پر پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے اللہ تعالیٰ کی تجھی کو اپنے اوپر اس طرح ظاہر ہوتے دیکھا جیسے آسمانی بجلی گرتی ہے۔ اس کے نتیجے میں تمام سردار مر گئے۔ سورہ الاعراف (7:155) میں یہ واقعہ تفصیل سے بیان ہوا ہے مگر وہاں صاعقه یعنی آسمانی بجلی کے بجائے "رَجْفَةً" (زلزلے) کا ذکر آیا ہے۔ گویا آسمانی بجلی کے کڑ کے سے پھاڑ پر زلزلہ آگیا جس کی دہشت سے سارے سردار ہلاک ہو گئے۔

﴿ثُمَّ بَعَثَنَا مُّنْ بَعْدِ مَوْتِنَا لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴾ (56)

اس میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو خطاب کر کے فرمایا کہ ہم نے تمہارے سرداروں کو ان کی ہلاکت کے بعد دوبارہ زندہ کر دیا تاکہ تم ہمارے اس احسان کو یاد رکھو اور ہمارا شکر ادا کرو کہ اس طرح ہم نے تمہاری بے یقینی کا علاج کر دیا۔

سورہ الاعراف (7:155) میں اس واقعے کو بیان کرتے وقت ان سرداروں کی موت کے لیے "أَهْلَكْتُهُمْ" "تو نے ان کو ہلاک کر دیا" اور "تَهْلِكُنَا" "تو ہمیں ہلاک کرتا ہے۔" کے الفاظ آئے ہیں، جن سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے

کہ وہ لوگ واقعی ہلاک ہو گئے تھے اور ان کو دوبارہ زندہ کیا گیا تھا۔ یہ اسی طرح کا معجزہ ہے جس طرح عیلیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے۔ (المائدہ ۱۱۰:۵)

وَظَلَّنَا عَلَيْكُمُ الْعَيْمَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلَوَىٰ ۚ كُلُّوْمَنْ طَبِيبَتْ مَا رَزَقْنَكُمْ ۖ وَ مَا ظَلَمْوْنَا ۖ وَ لِكِنْ كَيْ أَنْوَأَ أَنْفَسَهُمْ يَقْطِيلُونَ ۝ (۵۷)

الْمَنَّ: اس کے اصل معنی ایسی چیز کے ہیں جو اللہ تعالیٰ کسی کو نعمت کے طور پر دیتا ہے، اور جسے حاصل کرنے کے لئے کوئی محنت مشقت نہیں کرنی پڑتی، مگر اس جگہ اس سے وہ رزق مراد ہے جو بنی اسرائیل کو صحرائے بینا میں کھانے کو ملتا رہا۔ یہ سا گودانہ جیسی ایک سفید میٹھی چیز تھی جو صح کے وقت شہبم کی طرح گرتی اور پالے کی طرح جم جاتی تھی۔ بنی اسرائیل اسے جلدی سے کھایتے، کیونکہ دھوپ تیز ہونے سے اس کے دانے سورج کی گردی سے پچھل کر ختم ہو جاتے تھے۔

السَّلَوَىٰ: یہ بیشتر کی قسم کا پرندہ تھا۔ شام کے وقت ان پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ کھیں سے آجائے۔ بنی اسرائیل ان کو آسانی سے پکڑ کر ذبح کرتے اور ان کا گوشت کھاتے تھے۔

كُلُّوْمَنْ طَبِيبَتْ مَا رَزَقْنَكُمْ ۖ سَيْرَلْيَهْمَنْ نَهْمَنْ نَهْمَنْ ۖ كَيْ فَعْلَ مَذْدُوفَ هَبَ

اس آیت میں بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی وہ نعمتوں یاد دلائی ہیں جو اس نے ان کو صحرائے بینا میں عطا کی تھیں۔ سخت دھوپ سے بچنے کے لیے ان پر بادلوں کا سایہ کیا گیا۔ بے آب و گیاہ صحرائے بینا میں کوم و سلوٹی کی غذا میں مہیا کیں، جس کا ذکر خود بائیبلی کی کتاب خروج، باب ۱۶، آیات ۲۱-۲۱ میں بھی موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو بہت سی نعمتوں سے نوازاً مگر انہوں نے ہر نعمت ملنے پر اس کی ناشکری کی، اور اطاعت کی بجائے نافرمانی اور سرکشی اختیار کی۔ ظاہر ہے وہ اپنی ان حرکتوں سے اللہ تعالیٰ کا کچھ نہ بگاڑ سکے، اتنا پناہی نقصان کرتے رہے۔ اس مقام پر پہلے مخاطب کا صیغہ تھا جسے آخر میں غائب کے صیغے میں بدل دیا گیا تاکہ بنی اسرائیل سے اللہ تعالیٰ کی بیزاری ظاہر ہو جائے۔

وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُّوْمَنْ هَنْهَا حَيْثُ شَعْتُمْ رَعَلَّا وَ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَ قُولُوا حَكَلَةُ نَغْفِرُ لَكُمْ خَطِيلُمْ وَ سَلِيْلُ الدُّحْسِينُينَ ۝ (۵۸)

الْقَرْيَةَ: (جمع الْقُرْيَى)، یہ قری سے بنا ہے، جس کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔ قریہ، رہائش کے لیے لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ چھوٹی بستی، قصبے اور بڑے شہر سب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس مقام پر اس سے مراد یا توبیت المقدس ہے جیسا کہ جہوہن مفسرین کی رائے ہے یا اور بحانا تی شہر ہے جہاں مصر سے آنے کے بعد بنی اسرائیل سب سے پہلے داخل ہوئے تھے۔

سُجَّدًا: یہ جمع ہے ساجدی کی، جو سجدہ سے بنا ہے، جس کے معنی سر جھلانے کے ہیں۔ یہ سر جھکانا معمولی اور تھوڑا سا بھی ہو سکتا ہے اور رکوع کے برابر بھی اور یہ نماز کے سجدے کی طرح بھی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ مشہور جاہلی شاعر

عمر بن كلثوم کے متعلقہ کا شعر ہے:

إِذَا بَلَغَ الْفَطَامُ لَنَا صَيِّبَا
تَخْرُّلُهُ الْجَبَابِرَ سَاجِدِينَا

”جب ہمارے قیلے کا کوئی بچہ دودھ چھڑانے کی مدت کو پہنچ جاتا ہے تو بڑے بڑے جبار اور سرکش اس کے آگے سجدے میں گرفتار ہیں۔“

حَطَّةُ: یہ حَطَّ کا مصدر ہے۔ اس کے معنی ہیں: توبہ، معافی، بخشش اور استغفار۔ یہ لفظ گویا غُفرانَكَ ”میری بخشش ہو“ کے معنوں میں ہے۔

الْمُحْسِنِينَ: یہ الْمُحْسِنُ کی جمع ہے جو ”احسان“ سے اسم فاعل ہے۔ عربی زبان میں احسان سے مراد ایسا کام ہے جو عقل اور دین دونوں کے لحاظ سے عمدہ، نفس اور اعلیٰ ہو۔ کسی اچھے اور نیک کام کو سلیقے، عمدگی اور خوش اسلوبی سے کرنے کو بھی ”احسان“ کہتے ہیں۔ یاد رہے کہ احسان کا لفظ اردو زبان میں بالکل مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے جو عربی زبان میں ہرگز مراد نہیں ہوتے۔ البتہ ایسی صورت میں جب اس کے ساتھ کوئی صłe (PREPOSITION) لگا ہوا ہو جیسے ”أَحَسَنَ بِ“ یا ”أَحَسَنَ إِلَى“ تو پھر اس میں اردو والے متین مراد ہوتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید کے درج ذیل مقامات پر استعمال ہوئے ہیں۔ (یوسف 12:100 - القصص 77:28)

مصر سے نکلے اور صحرائے سینا میں چالیں (40) برس تک پریشان پھرنے کے بعد بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا کہ وہ شام و فلسطین کے شہر بیت المقدس، یا اُریحا، یا شیطیم میں داخل ہوں۔ وہاں خوب سیر ہو کر مزے سے کھائیں پہیں۔ جب شہر کے دروازے میں سے گزریں تو مغروانہ اور مشکرانہ انداز اختیار نہ کریں بلکہ عاجزی سے سر جھکائے ہوئے اور زبان سے توبہ و استغفار کہتے ہوئے گزریں۔ اگر بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی پابندی کی تو اللہ تعالیٰ ان کے گناہ معاف کر دے گا اور ان کی نیکیوں میں اضافہ فرمائے گا۔

﴿فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُدُونَ ﴾ (59)

رجُزاً مِّنَ السَّمَاءِ: اس سے مراد ہے ”آسمانی عذاب“۔

لیکن توبہ اور معافی کے لیے بنی اسرائیل کو جو دعا یہ لفظ حَطَّةُ سکھایا گیا تھا، انہوں نے مذاق اور نافرمانی کرتے ہوئے اس لفظ کو بکاڑ کر کسی اور غیر متعلق لفظ حِنْطَةُ (گندم) ”یا حَبَّةُ فِي شَعَرَةَ“ میں بدل ڈالا اور وہ دروازے سے داخل ہوئے (يَزْحَفُونَ عَلَى أَسْتَاهِمْ) اپنے سرین (چوتزوں) کے بل رینگتے ہوئے۔

اس طرح اس بدجنت اور ظالم قوم نے اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناقدری اور ناشکری کی۔ اس کے نتیجے میں ان پر وبا کی صورت میں عذاب بھیجا گیا۔ جیسا کہ باہمیل کا بیان ہے، بنی اسرائیل کے چونیس ہزار (24,000) افراد ہلاک ہو گئے۔

احادیث میں بھی اس واقعے کا ذکر آیا ہے۔ (صحیح بخاری، رقم: 3403۔ صحیح مسلم، رقم: 7523)

وَإِذْ أَسْتَسْفَى مُوسَى لِقَوْمِهِ فَقَلَنَا أَضْرَبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ
مِنْهُ اثْنَتَانِ عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرِبَهُمْ كُلُّهُ
وَأَشْرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْثُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدُينَ ۚ وَإِذْ
قُلْتُمْ يَمُوسَى لَكُنْ نَصِيرٌ عَلَى طَعَامٍ وَأَحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرُجْ
لَنَا مِمَّا تُنِيبُ إِلَيْنَا تُنِيبُ إِلَيْنَا مِنْ بَقِيلَهَا وَقَتَابِهَا وَفُوْمَهَا وَعَدَسَهَا وَ
بَصَلَهَا ۖ قَالَ أَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَى بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ ۖ
إِهْبِطُوا مِصْرًا فَإِنَّكُمْ مَا سَأَلْتُمْ وَصُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ
وَالْمَسْكَنَةُ ۖ وَبَاءُوكُمْ بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ ذَلِكَ بِمَا نَهَمُ كَانُوا
يَكُفُرُونَ بِأَيْتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۖ
ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ۚ

”اور یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے پانی کی دعا کی۔ ہم نے حکم دیا کہ: اپنا عصا اس پتھر کی چٹان پر مارو۔“ عصا مارتے ہی بارہ (12) چشمے پھوٹ نکلے۔ ہرگز رو نے پانی لینے کی جگہ معلوم کر لی۔ ان سے کہا گیا اللہ کے دیے ہوئے رزق میں سے کھاؤ پیو، مگر زمین میں فساد نہ پھیلاو اور یاد کرو جب تم نے موسیٰ سے کہا تھا: ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر ہرگز صبر نہیں کر سکتے۔ تو ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کرو، وہ ہمیں زمینی پیدا اور مہیا کرے: ساگ، لکڑی، لہسن، مسور اور پیاز۔“ موسیٰ نے جواب دیا: کیا تم بہتر چیز کے بد لے کمر چیز لینا چاہتے ہو؟ اچھا، کسی بستی میں چلے جاؤ، وہاں تمہیں سب کچھ مل جائے گا جو تم مانتے ہو۔ پھر بنی اسرائیل پر ذلت اور رحمتی میں سلطنت کی گئی اور وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہوئے، کیونکہ وہ اللہ کی نشانیوں کا انکار کرتے اور اس کے نبیوں کو تاخت قتل کرتے تھے اور چونکہ انہوں نے نافرمانی کی تھی اور وہ حد سے بڑھ گئے تھے۔“ (60-61)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

﴿وَإِذَا سَتَسْقَى مُوسَى لِقَوْمِهِ فَقُولَنَا أَضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْتَنَانِ عَشْرَةً عَيْنَانِۚ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أَنْاسٍ مَّشْرِبَهُمْ كُلُّوَا وَأَشْرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْثُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ﴾ (60)

سَتَسْقَى:..... یہ سَقَى سے بات استعمال ہے۔ اس کے معنی ہیں: پانی مانگا، بارش کے لیے دعا کی۔ حضور ﷺ کے پچا ابوطالب کے مشہور خصیدہ لامیہ (ل) کا شعر ہے جس میں انہوں نے نبی ﷺ کی یوں تعریف کی ہے:

وَ أَبْيَضُ ، يُسْتَسْقَى الْغَمَامُ بِوَجْهِهِ
ثِمَاءُ الْيَتَامَى ، عِصْمَةُ لِلَّادَارِمِ

”وہ روشن چہرے والا، جس سے بارش کے لیے دعا کروائی جاتی ہے، جو تینوں کا سرپرست اور یہاں کی خبر گیری کرنے والا ہے۔“

اسی سے نماز استقاء ہے جو قحط سالی کے زمانے میں بارش کے لیے پڑھی جاتی ہے۔
أَنَّاسٌ:..... یہ ”انسان“ کی مجموع ہے۔

تَعْثُوا:..... یہ عثی سے ہے جس کے اصل معنی ”حد سے بڑھ جانے“ کے ہیں، لیکن اس جگہ یہ ”فساد پھیلانے“ کے معنوں میں آیا ہے۔

یہ صحرائے سینا ہی کا واقعہ ہے اور اس کا ذکر بائبل کی کتاب گنتی باب 20 میں بھی آیا ہے۔

بنی اسرائیل کو صحرائے سینا کی سخت گری میں پانی کی شدید قلت پیدا ہو گئی، یہاں تک کہ اس کے لیے انہوں نے آپس میں جھگڑا شروع کر دیا۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام نے ان کے لیے پانی کی دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ وہ اپنا عصا ایک چٹان پر ماریں۔ جب انہوں نے ایسا کیا تو اس چٹان میں سے بارہ (12) چشمے پھوٹ نکلے۔ بنی اسرائیل کے بھی بارہ (12) قبیلے تھے۔ ہر قبیلے نے اپنے لیے پانی لینے کی جگہ معلوم کر لی۔ اس طرح ان کے درمیان پانی کے معاملے میں کسی جھگڑے کا امکان باتی نہ رہا۔ بعض لوگوں نے اپنی جہالت سے اس مجرزے کا انکار کیا ہے حالانکہ یہ چٹان آج بھی صحرائے سینا میں موجود ہے اور اس میں پانی کے شگاف پائے جاتے ہیں۔

اس سے پہلے بنی اسرائیل کو اسی صحرائے سینا میں من وسلوئی کی قدرتی غذا کیں حاصل ہو چکی تھی۔ اب ان کو وافر مقدار میں پانی بھی میر آگیا۔ یہی وجہ ہے کہ من وسلوئی کی نعمت ملنے پر ان کو کُلُّوَا ”کھاؤ“ کہا گیا تھا لیکن اب پانی فراہم ہو جانے پر اس کے ساتھ وَأَشْرَبُواً ”اور پیو“ کا اضافہ فرمادیا گیا۔ پھر ان کو تاکید کی گئی کہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا رزق خوب کھاؤ پیو، اس کا شکر ادا کرو اور اس کی اطاعت و فرمان برداری اختیار کرو۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی نافرمانی کرتے ہوئے زمین میں فساد پھیلانے لگ جاؤ۔

﴿وَإِذْ قُلْتُمْ يَمْوُسِيَ لَنْ نَصِيرَ عَلَىٰ طَعَامِ وَآجِدِ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْهِيْتُ الْأَرْضُ مِنْ بَقْلَهَا وَفُوْمَهَا وَعَدَسَهَا وَبَصَلَهَاۚ قَالَ أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَىٰ بِالَّذِي هُوَ حَيْرٌ۝ إِهْبِطُوا مَصْرًا فَإِنَّ لَكُمْ مَا سَالَتُمْ۝ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الدِّلَلَةُ وَالْمُسْكَنَةُ۝ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ۝ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكُفُّرُونَ بِأَيْتِ اللَّهِ۝ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ۝ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ۝﴾ (61)

بَقْلَهَا: ‘بَقْلُ’ سے ہر قسم کی سبزی تکاری اور ساگ مراد ہے۔ عربی زبان میں سبزی فروش کو ‘بَقَالٌ’ کہا جاتا ہے۔ آج کل جزل سہور کو بَقَالَۃ کہتے ہیں۔

قِفَاعَهَا: قِفَاعَ کے معنی گڑی اور کھیرے کے ہیں۔

فُوْمَهَا: فُوْمَ کے معنی عام طور پر گندم (گیہوں) کے لیے گئے ہیں۔ لیکن مفسرین کی ایک جماعت نے اس سے ‘لہسن’ بھی مراد لیا ہے اور مسور کی دال اور پیاز کے ساتھ یہی معنی زیادہ مناسبت رکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں ‘تھوم’ کا لفظ شاید اسی کی بگری ہوئی شکل ہے۔

أَدْنَى: اس کے اصل معنی ‘أَقْرَبُ’، یعنی ”زیادہ قریب“ کے ہوتے ہیں، لیکن یہ کسی حقیر، معمولی اور گھشا چیز کے معنوں میں بھی آتا ہے اور اس جگہ یہی معنی مراد ہیں۔

إِهْبِطُوا: یہ ’ہبوط‘ سے ہے جس کے اصل معنی ہیں: کسی چیز کا اوپر سے نیچے گرنا۔ لیکن یہ ’نزول‘ (اترنے) کے معنوں میں بھی آتا ہے اور اس صورت میں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مسافر فلاں جگہ اتراء، یا اس نے وہاں قیام کیا۔ **مَصْرًا:** اس کے معنی ‘مَدِينَةُ’ یعنی شہر کے ہیں۔ اس سے مصر کا ملک مراد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ غیر منصرف ہوتا ہے اور اس پر تو نہیں آتی۔

مَسْكَنَةُ: اس کے معنی بے بسی، بے چارگی بختا جی اور کم ہمتی کے ہیں۔

الله تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو صحرائے سینا میں من و سلوی کی قدرتی غذا میں عطا فرمائی تھیں، مگر اس قوم نے ناشکری کی اور اس کے بجائے سبزی دال اور لہسن پیاز مانگتی رہی۔ ان سے کہا گیا کہ کیا تم اعلیٰ چیز کو چھوڑ کر ادنیٰ چیز لینا چاہتے ہو؟ تمہاری اخلاقی پستی کا یہ حال ہے کہ تم مصر کی سابقہ غلامانہ زندگی کی آسائشوں اور چٹکاروں کے لیے ترستے ہو اور اب آزادی کے ماحول کی معمولی رحمتیں گوارانہیں کر سکتے اور جفا کشی کی مجاہدات اور آبر و منداشہ زندگی برسنیں کر سکتے۔ اچھا، کسی قریبی شہر میں چلے جاؤ، وہاں تمہاری ساری فرمائیں پوری ہو جائیں گی۔

پھر فرمایا کہ بنی اسرائیل کی ناشکری، سرشی اور نافرمانی کی وجہ سے ان پر ذلت، بختی اور بے چارگی مسلط کر دی گئی۔ ان پر الله تعالیٰ کی لعنت اور پھنکار پڑی کیونکہ وہ نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔

بنی اسرائیل نے اپنے جن انبیاء کے کرام کو قتل کیا، ان میں زکر یا علیہ السلام اور ان کے بیٹے بیگی علیہ السلام شامل ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی انہوں نے اپنے دعوے کے مطابق سولی پر لٹکایا، اگرچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی خفاقت فرمائی اور ان کو آسمان پر اٹھا لیا۔

إِنَّ الَّذِينَ أَمْنَوْا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصْرَىٰ وَالصَّابِرِينَ مَنْ أَمْنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرٌ هُمْ عَنْهُ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزُنُونَ ۝

”بے شک مسلمانوں کی جماعت ہو، یہودی ہوں، عیسائی ہوں، صابی ہوں، جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں تو ایسے لوگوں کو نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔“ (62)

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی تفسیر:

النَّصْرَىٰ: یہ نصرانیٰ بھی جمع ہے۔ اس سے عیسائی مراد ہیں۔

مریم علیہ السلام، اپنے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کو، جب کہ وہ ابھی بارہ (12) برس کے تھے، بیت الحرم سے ناصرہ نامی بستی میں لے گئی تھیں۔ اس بستی کی نسبت سے مسیح علیہ السلام ناصری اور عیسائی لوگ نصاری کہلاتے۔

الصَّابِرِينَ: یہ الصَّابِرِیٰ کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے یہودیت اور نصرانیت چھوڑ کر فرشتوں اور ستاروں کی پوجا اختیار کر لی۔

الدکتور وہبہ زھیلی کی تفسیر الوہبیہ میں ہے کہ اس مذهب کے ماننے والوں کی ایک جماعت اب بھی عراق کے علاقے موصل کے قریب پائی جاتی ہے۔

أَمْنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ: یہ قرآن مجید کا ایک اسلوب ہے کہ وہ صرف اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان کا ذکر کر کے پورا ایمان مراد لیتا ہے۔ اس کی وضاحت ہم اسی سورت کی آیت 8 کے ضمن میں کر چکے ہیں۔

اس پوری آیت کی نظر سورة المائدہ میں موجود ہے:

إِنَّ الَّذِينَ أَمْنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِرُونَ وَالنَّصْرَىٰ وَالصَّابِرِينَ مَنْ أَمْنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزُنُونَ ۝ (المائدہ 5:69)

”بے شک مسلمانوں کی جماعت ہو، یہودی ہوں، صابی ہوں اور عیسائی ہوں، جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں تو انہیں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔“

سورہ العقرہ کی مذکورہ آیت اپنے سیاق و سبق (CONTEXT) میں یہودیوں کے اس جھوٹے دعوے کی تردید کرتی ہے، جو یہ کہتے تھے کہ آخرت میں صرف وہی نجات پائیں گے اور دوسری کوئی قوم نجات نہیں پائے گی۔ فرمایا، آخرت کی نجات کا دار و مدار کسی خاص قوم، جماعت یا مذہبی گروہ میں شامل ہونے پر نہیں ہے، خواہ وہ مسلمانوں کی جماعت ہو، یہودی ہوں، عیسائی ہوں یا صابی ہوں..... بلکہ نجات کا انحصار صرف پچھے ایمان اور نیک اعمال پر ہے۔ اسی معیار کے حامل لوگ جنت میں جائیں گے، جہاں ان کو نہ مستقبل کا کوئی خوف خطرہ ہو گا اور نہ ماضی کا کوئی غم۔ اس آیت میں آج ان مسلمانوں کے لیے بھی بڑا سبق ہے جو یہ سمجھے بیٹھے ہیں، کہ ان کے اعمال خواہ کیسے ہی ہوں، آخرت میں ان کے لیے بہر حال معافی اور نجات ہے۔ فرمایا، آخرت میں کوئی نسبت کسی کے کام نہ آئے گی، صرف ایمان اور عمل صالح کام آئیں گے۔

نوح ﷺ کے بیٹے کو اپنے پیغمبر باپ کی نسبت عذاب سے نہ بچا سکی۔ لوط ﷺ کی یوں کو اپنے شوہر کی نسبت نہ دنیا کے عذاب سے محفوظ رکھ سکی اور نہ آخرت میں دوزخ کے عذاب سے بچا سکے گی۔ صحیح بخاری اور سنن نسائی میں ہے کہ جب قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی کہ:

(الشعراء 26:214)
﴿وَأَنِيدُ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾

”اور (اے نبی) آپ اپنے قریبی رشتہ داروں کو خبردار کر دیں۔“

تو رسول اللہ ﷺ نے دوسروں کے علاوہ اپنی پھوپھی صفیہ (رضی اللہ عنہا) اور اپنی صاحبزادی فاطمہ (رضی اللہ عنہا) سے فرمایا: ((يَا صَفِيَّةَ عَمَّةَ رَسُولِ اللَّهِ، لَا أُغْنِيْ عَنْكَ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا، وَيَا فَاطِمَةَ بُنْتَ مُحَمَّدٍ سَلَيْلِيْنِيْ مَا شِئْتَ مِنْ مَالِيْ، لَا أُغْنِيْ عَنْكَ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا))

(صحیح بخاری، رقم: 2753۔ سنن نسائی، رقم: 3677)

”اے صفیہ (رضی اللہ عنہا)، اے میری پھوپھی جان، میں اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ کے کچھ بھی کام نہ آسکوں گا۔ اور اے میری بیٹی فاطمہ (رضی اللہ عنہا)! تم مجھ سے جو مال لینا چاہو، لے سکتی ہو، مگر میں اللہ تعالیٰ کے ہاں تمہارے کچھ بھی کام نہ آسکوں گا۔“

اس سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ سے رشتہ داری کی نسبت بھی آخرت میں کسی کے کام نہ آسکے گی۔

اس آیت سے بعض لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ جو اہل کتاب (یہودی اور عیسائی) اپنی الہامی کتابوں کو مانتے اور ان کے مطابق عمل کرتے ہیں، ان کے لیے رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے، وہ اس کے بغیر بھی نجات پائیں گے۔

لیکن ان لوگوں کا یہ خیال کئی لحاظ سے صحیح نہیں ہے:

1۔ قرآن مجید کا یہ اسلوب ہم پہلے بھی بیان کرچکے ہیں کہ وہ صرف اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لانے کا ذکر کر

کے اس سے پورا اور کامل ایمان مراد لیتا ہے، جس میں فرشتوں، کتابوں اور نبیوں پر ایمان لانا بھی شامل ہوتا ہے اور اس جگہ ”مَنْ أَمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ“ سے پورا ایمان مراد ہے جس میں تمام انبیاء و رسول پر ایمان لانا بھی شامل ہے۔

2۔ اس آیت میں ایمان کے اجزاء کی تفصیل بیان کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ آخرت میں نجات کا دار و مدار کسی خاص قوم، جماعت یا مذہبی گروہ ہندی پر نہیں ہے، جیسا کہ یہود نے سمجھ رکھا ہے بلکہ آخرت کی نجات کا انحصار صرف چے ایمان اور نیک اعمال پر ہے۔

3۔ یہ درست ہے کہ قرآن مجید اپنے سے پہلی کتابوں کے آسمانی ہونے کی تصدیق کرتا ہے، مگر وہ ان کو محفوظ نہیں مانتا، بلکہ ان میں روبدل اور تحریف کا قائل ہے جس کے بعد وہ معتبر اور قابل اعتماد نہیں ہیں۔ (ملاحظہ ہوں البقرہ 79:2)

4۔ اللہ سبحانہ نے بنی اسرائیل کو خطاب کر کے ان کو قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے اور ایمان نہ لانے کی صورت میں ان کو کافر قرار دیا ہے:

﴿إِبْيَانِي إِسْرَأَءِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِي الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ اُفْ بِعَهْدِي كُمْ وَ إِبَّانِي فَارْهَبُوْنِ ۵۰ وَ امْنُوا بِمَا أَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَ لَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرِ ۚ بِهِ مَوْلَانَا لَا تَشْتَرُوا بِأَيْمَنِي ثَمَنًا قَلِيلًا ۚ وَ إِبَّانِي فَاتَّقُونِ ۵۰﴾ (البقرہ 41:40)

”اے بنی اسرائیل! میری نعمتوں کو یاد کرو، جو میں نے تمھیں عطا کیں۔ اس عہد کو پورا کرو جو تم نے مجھ سے کیا تھا، میں اس عہد کو پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا تھا، اور صرف مجھ سے ڈرو۔ اور اس (قرآن) پر ایمان ناوجو میں نے اتنا رہے جو اس (توریت) کی تصدیق کرتا ہے جو تمہارے پاس ہے۔ ایمان ہو کہ دوسروں سے پہلے تم کافر بن بیٹھو۔ یاد رکھو، دنیا کا حقیر مال لے کر میری آیتیں نہ بیچو اور بھی سے ڈرو۔“

اب ظاہر ہے ان کے لیے قرآن پر ایمان لانا صرف اسی صورت میں ممکن ہے، جب وہ حضرت محمد ﷺ کی نبوت و رسالت کا بھی اقرار کریں۔ ورنہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے بغیر وہ صرف قرآن مجید پر کیے ایمان لاسکتے ہیں؟

اس سے واضح ہو گیا کہ اہل کتاب کی نجات کے لیے حضرت محمد ﷺ کی نبوت و رسالت پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔

5۔ صحیح مسلم میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ، لَا يَسْمَعُ بِيْ أَحَدٌ مِّنْ هُذِهِ الْأُمَّةِ، يَهُودِيٌّ وَلَا نَصَارَىٰ، إِنَّمَّا يَمُوتُ وَلَمْ يُوْمِنْ بِالَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ، إِلَّا كَانَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ) (صحیح مسلم، رقم: 386)

”تم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے کہ اس امت کا کوئی شخص ایمان نہیں ہے، خواہ وہ

یہودی ہو، یا عیسائی، جو میری رسالت کی خبر سنے اور اس پیغام کو جو میں لایا ہوں، نہ مانے، اور پھر دوزخیوں میں شامل نہ ہو۔“

محض یہ کہ حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے بعد ہر شخص کی نجات پانے کے لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ وہ آپ پر بھی ایمان لائے۔

البتہ اس اصول اور ضابطے سے، جیسا کہ اوپر والی حدیث میں اشارہ ہے، صرف وہ لوگ مستثنی ہو سکتے ہیں جن تک حضور ﷺ کی دعوت نہ پہنچی ہو۔ ان کے انجام کا فیصلہ بھی اللہ تعالیٰ جیسے چاہے گا، خود فرمائے گا، کسی اور کو اس بارے میں کسی فیصلے کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

**وَإِذْ أَخْلَدْنَا مِيشَانَ قَكْمُ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ طَحْذُوا مَآ أَتَيْنَكُمْ
بِقُوَّةٍ وَّ اذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعْلَكُمْ تَتَّقُونَ ⑥٣٣ ثُمَّ تَوَلَّتُمْ مِنْ مُّنْ بَعْدِ
ذَلِكَ هَلْوُلًا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَسِيرِينَ ⑥٣٤
وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبِيلِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا
قِرَدَةً خَسِيرِينَ ⑥٥ فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِلَّيَّا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَ**

مَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِينَ ⑥٦

”اور یاد کرو جب ہم نے تم سے عہد لیا اور اس وقت طور پر ہاؤ کو تمہارے اوپر کھڑا کر دیا، کہ جو کتاب ہم نے تمہیں دی، اسے مضبوطی سے پکڑو اور جو کچھ اس میں بیان کیا گیا ہے، اسے اچھی طرح یاد رکھو، تاکہ عذاب سے فیج جاؤ۔ مگر اس کے بعد تم اس عہد سے پھر گئے۔ پھر اگر اللہ اپنا فضل نہ فرماتا تو تم ہلاک ہو چکے ہو تے۔

اور تمہیں اپنے ان لوگوں کا قصہ یاد ہے، جنہوں نے ہفتے کے دن کے بارے میں زیادتی کی۔ ہم نے ان سے کہا: ”تم ذلیل بندر بن جاؤ۔“ ہم نے اس واقعہ کو ان لوگوں کے لیے جو اس وقت موجود تھے، اور ان کے لیے جو بعد میں آئے، عبرت کا نمونہ بنادیا۔ اور اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے اس میں نصیحت رکھدی۔“ (63-66)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

**وَإِذْ أَخْلَدْنَا مِيشَانَ قَكْمُ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ طَحْذُوا مَآ أَتَيْنَكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اذْكُرُوا مَا
فِيهِ لَعْلَكُمْ تَتَّقُونَ ⑥٣٣** (63)

مِيثَاقُكُمْ: میثاق، وثق سے بناتے ہے۔ اس کے معنی ہیں: پکا وعدہ، پختہ عہد، معاهدہ۔ دین و شریعت بھی رب اور بندے کے درمیان ایک معاهدہ ہوتا ہے، جسے میثاق بھی کہا جاتا ہے۔

الْطُّورَ: اس سے وہ پہاڑ مراد ہے جس پر موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ ہم کلام ہوا تھا۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کے جس میثاق اور معاهدے کا ذکر ہے، اس کے بارے میں قرآن مجید نے دوسری جگہ وضاحت کر دی ہے کہ اس سے مراد توریت کے احکام کی پابندی تھی۔

﴿أَلَمْ يُؤْخُذْ عَلَيْهِمْ مِيثَاقُ الْكِتَبِ أَنَّ لَا يَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقُّ وَ دَرَسُوا مَا فِيهِ طَ وَ الدَّارُ الْأُخْرَةُ خَيْرٌ لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ طَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ وَ الَّذِينَ يُمْسِكُونَ بِالْكِتَبِ وَ أَقَامُوا الصَّلَاةَ طَ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُصْلِحِينَ﴾ (الاعراف: 169-170)

”کیا ان (بنی اسرائیل) سے کتاب میں یہ عہد نہیں لیا گیا کہ وہ حق کے سوا اللہ کی طرف کوئی بات منسوب نہیں کریں گے؟ کیا جو کچھ کتاب میں لکھا ہے، وہ اسے پڑھنیں چکے؟ یہ کہ پرہیز گاروں کے لیے آخرت کا گھر بہتر ہے۔ کیا تم نہیں سمجھتے؟ جو لوگ اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں تو ایسے نیک لوگوں کا اجر ہم ضائع نہیں کرتے۔“

بنی اسرائیل کے نمائندہ سرداروں سے دامن کوہ میں یہ عہد لیا گیا تھا کہ وہ توریت کے احکام کی پابندی کریں گے، پھر عہد لینے کے بعد ان کے اوپر طور پہاڑ کو بلند کر دیا گیا، جس کی تشریع سورہ الاعراف میں اس طرح کی گئی ہے۔

﴿وَإِذْ نَتَقَنَّا الْجَبَلَ فَوَقَهُمْ كَانَهُ ظُلْلَةً وَ ظَنُونًا إِنَّهُ وَاقِعٌ بِهِمْ﴾ (الاعراف: 171:7)

”اور یاد کرو جب ہم نے ان (بنی اسرائیل) کے اوپر پہاڑ کو اٹھایا گویا وہ سائبان ہے۔ انہوں نے سمجھا، وہ ان پر آن پڑے گا۔“

نَتَقَنَّا الْجَبَلَ کے معنی ہیں کہ ہم نے پہاڑ پر زلزلہ سا طاری کر دیا۔ جس کے ملنے کے باعث اس کے دامن میں کھڑے لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ پہاڑ بھی ان پر گر پڑے گا۔

بنی اسرائیل سے توریت کی پابندی کا عہد لینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور جلال ظاہر کیا، کہ تم لوگ جس ہستی سے معاهدہ کر رہے ہو، وہ کوئی کمزور اور بے بس نہیں ہے بلکہ وہ قادر مطلق ہے۔ تم اگر توریت کے احکام کے پابند رہو گے تو وہ تمہیں دنیا اور آخرت کی نعمتیں عطا فرمائے گا اور اگر تم نے اس کے احکام کی خلاف ورزی کی تو وہ تم پر اپنا قہرو غصب نازل کرے گا اور تم اس کے عذاب سے فتح نہیں سکو گے۔

بعض لوگوں کو اس مقام پر یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے سروں پر کوہ طور لیکا کر ان سے یہ میثاق زبردست لیا تھا۔ لیکن یہ جیز اللہ تعالیٰ کی سنت اور دینِ اسلام کی روح (SPIRIT) کے خلاف ہے۔ معاهدہ وہی مددست (VALID) نہا جاتا ہے جو فریقین کی باہمی رضا مندی سے ہو۔ یہ معاهدہ بھی آزاد مرخصی سے اختیاری طور پر ہوا

تحا۔ معاهدہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے پہاڑ پر زرلہ طاری کر کے اپنی قدرت کی ایک نشانی دکھائی تھی، جیسا کہ تفسیر مراغی میں اسی جگہ پر ہے:

((وَكَانَتْ هَذِهِ الْآيَةُ بَعْدَ أَخْذِ الْمِيثَاقِ لِكُنْ يَأْخُذُوا مَا أُوتُوهُ مِنَ الْكِتَابِ بِقُوَّةٍ
وَاجْتَهَادٍ.....))

”کہ اللہ تعالیٰ نے معاهدے کے بعد اپنی قدرت کی یہ نشانی دکھائی، تاکہ وہ لوگ کتابِ الہی کے احکام پر مضبوطی سے قائم رہیں اور سرگرمی سے عمل کریں۔“

**﴿ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِنْ بَعْدِ ذِلْكَ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللَّهِ لَكُنْتُمْ مِنَ
الْخَسِيرِينَ﴾ (64)**

لیکن بنی اسرائیل نے توریت کی پابندی کے معاهدے کی خلاف ورزی کی۔ اس طرح انہوں نے اپنی سرکشیوں اور نافرمانیوں میں ایک اور اضافہ کر لیا۔

چونکہ مدینے کے یہود اپنے آباء و اجداد کے حالات و واقعات پر فخر کرتے تھے، اس لیے قرآن نے ان کو خطاب کر کے یہ بات کہی ہے۔

پھر فرمایا کہ تم لوگوں کے کرتوت ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں نیست و نابوکر دیتا مگر اس نے تمہیں مہلت دے رکھی ہے اور اب حضرت محمد ﷺ کی بعثت اور قرآن کے ذریعے تمہیں آخری موقع فراہم کر دیا ہے کہ تم اپنی سرکشی اور نافرمانی کی عادت چھوڑ کر سچا ایمان لاو اور اطاعت و فرمان برداری کی زندگی اختیار کرلو۔

**﴿وَلَقَدْ عِلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدُوا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقْلَنَا لَهُمْ كُوُنُوا قِرْدَةً
خَسِيرِينَ﴾ (65)**

السَّبْتُ:..... اس کے معنی ہیں: ہفتہ کا دن (SATURDAY)۔ بنی اسرائیل کے لیے یہ دن مقدس تھا اور عبادت کے لیے مخصوص تھا۔ اس میں وہ کاروبار، شکار، یا کوئی دنیوی کام نہیں کر سکتے تھے۔ مگر اس سرپھری قوم نے اس دن کے تقدس کا کوئی لحاظ نہ کیا، اس بارے میں حکم کی خلاف ورزی کی اور اس دن کی بے حرمتی کی۔

قِرْدَةُ:..... یہ قردگی جمع ہے جس کے معنی ہیں: بندر۔

خَسِيرِينَ:..... یہ خاسی کی جمع ہے جس کے معنی ذلیل اور حقر کے ہیں۔

اس آیت میں مدینے کے یہود کو ان کے باپ دادا کی سرکشی اور نافرمانی کا ایک اور واقعہ یاد دلایا گیا ہے۔ یہ واقعہ بحر احمر (RED SEA) کے پاس عقبہ کے علاقے میں ایلات نامی ساحلی بستی میں پیش آیا تھا، جہاں بنی اسرائیل کے لوگ آباد تھے۔ یہ لوگ سبت یعنی یہتھے کے دن کی بے حرمتی کرتے ہوئے اور اس کے تقدس کو پا مال کرتے ہوئے مچھلیوں کا شکار کر لیتے تھے جو کہ ان کے لیے اس دن منع تھا۔ اس جگہ یہ واقعہ مختصر بیان ہوا ہے۔

گلگوہ الاعراف میں اسے ذرا تفصیل سے بیان کیا گیا ہے:

«وَسَعَلَهُمْ عَنِ الْقَرِيَّةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةً الْبَحْرُ مَإِذْ يَعْدُونَ فِي السَّبُّتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِيَّاتَهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَيَوْمَ لَا يَسْبُتوْنَ لَا تَأْتِيهِمْ ثُمَّ كَذَلِكَ ثُمَّ تَبْلُوْهُمْ بِهَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝ وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِنْهُمْ لِمَ تَعْظُونَ قَوْمًا إِنَّ اللَّهَ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعِزِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۝ قَالُوا مَعْذِرَةً إِلَى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۝ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذِكْرُوا بِهِ الْجَيْنَانَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوَءِ وَأَخْدُنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَيْعِيسٍ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَا نَهَا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَسِئِينَ ۝»

(الاعراف: 163:7)

”اور (اے نبی) ان (نبی اسرائیل) سے اس بستی کا حال پوچھیں جو سمندر کے کنارے آباد تھی۔ جہاں کے لوگوں نے سبت یعنی ہفت کے دن کی خلاف ورزی کی، جب ہفتے کا دن ہوتا تو محبدیاں پانی کے اوپر کشت سے آ جاتیں۔ اور جب ہفتہ نہ ہوتا تو نہ آتیں۔ اس طرح ہم نے ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان کو آزمائش میں ڈالا۔

یاد کرو، اس بستی کے ایک گروہ نے بعض لوگوں سے کہا: ”تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو، جن کو اللہ ہلاک کرنے والا ہے، یا انہیں سخت عذاب دینے والا ہے۔“ انہوں نے جواب دیا: ”اس لیے تاکہ تمہارے رب کے سامنے عذر پیش کر سکیں (کہ ہم نے اپنا فرض ادا کیا) اور شاید وہ لوگ ڈریں۔ پھر جب انہوں نے وہ ساری نصیحتیں بھلا دیں جو ان کو کی گئی تھیں تو ہم نے ان لوگوں کو بچالیا جو برائی سے روکتے تھے مگر ظالموں کو ان کی نافرمانی کی وجہ سے سخت عذاب میں پکڑ لیا۔ پھر جب وہ اس بات میں حد سے زیادہ سرکش ہو گئے جس سے ان کو روکا گیا تو ہم نے انہیں حکم دیا کہ ”تم ذلیل بندر بن جاؤ۔“

جب ہر مفسرین کی رائے میں ان لوگوں کی شکلیں مسخ ہو گئی تھیں۔ وہ واقعی بندر بنا دیے گئے تھے اور تین دن کے اندر وہ بھوکے پیاس سے مر گئے تھے۔ لیکن مجاہد رَسُولُهُ کا قول ہے کہ ان کی شکلیں نہیں بدی تھیں، بلکہ ان کے دل و دماغ بندروں جیسے ہو گئے تھے اور وہ بندروں جیسی حرکات کرتے تھے، جیسا کہ بعض الٰی کتاب یہودیوں کے بارے میں ہے کہ ان کی مثال ایسے گدھے کی سی ہے، جس پر کتابیں لادو دی گئی ہوں اور وہ ان کی حقیقت سے بے خبر ہو۔

﴿مَثَلُ الَّذِينَ حُلِلُوا التَّوْرَةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْجِبَارِ يَعْهُلُ أَسْفَارًا﴾ (الجمعة: 5:62)
”جن لوگوں کو توریت کا حامل بنایا گیا اور انہوں نے اپنی ذمہ داری پوری نہ کی، تو ان کی مثال اس گدھے کی کی ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔“

تمادہ رَسُولُهُ کا قول ہے کہ ان کے جوانوں کو بندر اور بوڑھوں کو خنزیر ہنا دیا گیا جیسا کہ سورہ المائدہ میں اس

طرف اشارہ ملتا ہے۔

﴿قُلْ هَلْ أَنْبَعْكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذِلِّكَ مَشْوِيَّةٌ عِنْدَ اللَّهِ مَنْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَغَضِيبٌ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوتَ أُولَئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَأَضَلٌّ عَنْ سَوَاءٍ إِلَيْهِمْ السَّبِيلُ﴾ (المائدہ:50)

”کہہ دیجیے! کیا میں ایسے لوگ بتاؤں جو اللہ کے ہاں برے انعام سے دو چار ہوں گے؟ وہ جن پر اللہ نے لعنت کی، جن پر اپنا غصب نازل کیا، جن میں سے بندرا اور سورہ بنا دیے اور جنہوں نے شیطان کی پوجا کی۔ یہی لوگ ہیں جو درجے کے لحاظ سے بدتر ہیں اور سیدھی راہ سے بہت بھکٹے ہوئے ہیں۔“

حافظ ابن کثیر رضی اللہ عنہ نے اپنی تفسیر میں اسی قول کو ترجیح دی ہے۔

﴿فَجَعَلْنَاكُلَّا لِمَا يَدْبِيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِينَ﴾ (66)

نَكَلًا..... نکال سے مراد ایسی سزا ہے جس سے دوسروں کو بھی عبرت ہو۔

اللہ تعالیٰ نے چوری پر ہاتھ کائی کے سزا کو بھی نکال (عبرت ناک سزا) سے تجویز فرمایا ہے:

﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطُعُوا أَيْدِيهِمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبُا نَكَلًا مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ (المائدہ:38)

”اور چور مرد ہو یا عورت ہو، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔ یہی ان کی کمائی کا بدلہ اور اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا ہے۔“

مَوْعِظَةً..... وعظ سے ہے۔ اس کے معنی ایسی نصیحت کے ہوتے ہیں، جو خیر خواہی سے کی جائے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے اس واقعے کو ان کے اپنے زمانے کے لیے اور قیامت تک کے لیے ایک عبرت ناک واقعہ بنا دیا کہ جو احکام اللہ کی توڑے گا اور اللہ کی قائم کی ہوئی حدود سے تجاوز کرے گا، اس کا ایسا انعام بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کے لیے، جو تقوے کی زندگی کرنا چاہیں، اس واقعے میں بڑی نصیحت موجود ہے۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذَبَّحُوا بَقَرَةً

قَالُوا أَتَتَّخِذُنَا هُزُواً طَقَالَ أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَهَلِيِّينَ

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هَيَّ طَقَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا

بَقَرَةٌ لَا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ طَعَانٌ بَيْنَ ذِلِّكَ طَفَاعٌ لَوَمَرْوَنَ

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَنَا مَا لَوْنَهَا طَقَال إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا
بَقَرَةٌ صَفَرَاءٌ فَاقِعَ لَوْنَهَا تَسْرُ النُّظَرِينَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا
رَبَّكَ يُبَيِّن لَنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَبَّهَ عَلَيْنَا طَوَ إِنَّا إِنْ شَاءَ اللَّهُ
لَمْ يَهْتَدُونَ ۝ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا ذُولٌ تُشَيرُ إِلَارْضَ
وَلَا تَسْقِي الْحَرَثَ مُسْلِمَةٌ لَا شَيْةَ فِيهَا طَقَالُوا إِنْ حَتَّ بِالْحَقِّ طَ
فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ۝ وَإِذْ قَتَلْتُمْ نُفَسَّادًا دَرَعْتُمْ فِيهَا طَ
وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَا كُنْتُمْ تَكْنُونَ ۝ فَقُلْنَا أَضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا طَ
كَذَلِكَ يُوحِي اللَّهُ الْوَحْيَ وَيُرِيكُمْ أَيْتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝

”اور یاد کرو جب موسی علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا: ”الله تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو۔“ انہوں نے کہا: کیا ہم سے مذاق کرتے ہو؟ موسی علیہ السلام نے کہا: ”میں اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ ایسا نادان ہوں۔“ وہ کہنے لگے: تم اپنے رب سے پوچھو، وہ ہمیں بتائے کہ گائے کیسی ہو؟“ موسی علیہ السلام نے کہا: اللہ فرماتا ہے، وہ گائے نہ بوڑھی ہوا اور نہ نوجوان بلکہ درمیانی عمر کی ہو۔ اب تم اس حکم پر جلد عمل کرو۔“ وہ کہنے لگے: تم اپنے رب سے معلوم کرو، وہ ہمیں واضح طور پر بتائے، اس گائے کا رنگ کیسا ہو؟ موسی علیہ السلام نے کہا: اللہ فرماتا ہے، وہ گہرے زرد رنگ کی ہو، جو دیکھنے والوں کو اچھی معلوم ہو۔“ پھر وہ کہنے لگے: تم اپنے رب سے درخواست کرو، وہ ہمیں صاف طور پر بتائے، وہ گائے کیسی ہو؟ کیونکہ گائے کے بارے میں ہم شبے میں پڑ گئے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو جلد ہی اس گائے کا پتہ چلا لیں گے۔“ موسی علیہ السلام نے کہا: اللہ فرماتا ہے، وہ گائے ایسی ہو جس سے کوئی کام نہ لیا جاتا ہو۔ وہ زمین کو جو نتے والی اور کھیتوں کو پانی دینے والی نہ ہو۔ وہ صحیح سالم ہو، اس میں کوئی داع نہ ہو۔“ وہ بولے: اب تم نے ٹھیک بات کی۔“ پھر انہوں نے وہ گائے ذبح تو کر دی، مگر وہ یہ کام کرنے کے لیے تارنہ تھے۔

اور یاد کرو جب تم نے ایک آدمی قتل کر دیا۔ پھر ایک دوسرے پر اس کا الزام لگاتے تھے۔ حالاں کہ اللہ اس بات کو ظاہر کرنا چاہتا تھا جسے تم چھپانا چاہتے تھے۔ اس پر ہم نے حکم دیا کہ اسی گائے کے گوشت کا ایک ٹکڑا امردہ آدمی کی لاش پر مارو، وہ زندہ ہو جائے گا۔ اللہ اس طرح مردودہ انسانوں کو زندہ کرے گا، اور تمہیں وہ اپنی نشانیاں دکھاتا

ہے تاکہ تم سمجھو۔“ (73-67)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

﴿ وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذَبَّحُوا بَقَرَةً ۖ قَالُوا أَتَتَّخِذُنَا هُرُونًا ۖ قَالَ أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجِهَلِينَ ﴾ (67)

بَقَرَةً..... یہ اسم جنس ہے۔ اس سے گائے بھی مراد ہو سکتی ہے اور بیل بھی۔ کیونکہ آگے چل کر آیت 70 میں اسے الْبَقَرُ بھی کہا گیا ہے۔ ﴿إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا﴾ اور یہ بھی اسم جنس ہے جیسا کہ سورہ الانعام (144:6) میں ﴿وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ﴾ ”اور بیل گائے کا جوڑا“ آیا ہے۔ ویسے عربی زبان میں بیل کے لیے الگ سے لفظ ثور بھی موجود ہے۔ مکرمہ کے ایک پہاڑ کو جبل ثور کہتے ہیں کیونکہ وہ دور سے بیل کی پیشہ کی طرح نظر آتا ہے۔

سَيْئَتْ یعنی بیٹھنے کے دن کی بے حرمتی کے بعد بنی اسرائیل کی نافرمانی اور حیله بازی کا یہ دوسرا واقعہ ہے۔ اس میں ضروری نہیں کہ واقعات کی زمانی ترتیب (CHRONOLOGICAL ORDER) ہو۔ قرآن مجید عام طور پر اس ترتیب کا خاطر نہیں رکھتا کیونکہ وہ بنیادی طور پر تاریخ (HISTORY) کی کتاب نہیں ہے بلکہ ہدایت کی کتاب ہے، اور اس کا مقصد وعظ و نصیحت ہے جس کے لیے یہ ترتیب ضروری نہیں ہوتی۔

کہا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک امیر بوزھاتھا، جس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس کی وراثت کے لامچے میں اس کے چچا زاد بھائی نے اسے قتل کر دیا اور لاش کسی اور کے گھر کے پاس ڈال دی۔ پھر ان لوگوں پر قتل کا الزام لگا کر ان سے دیت کا مطالبہ کر دیا۔ جب یہ مقدمہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے لوگوں کو ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ اس حکم میں دو مقاصد تھے، ایک یہ کہ اس کے ذریعے قاتل کا سراغ لگایا جانا تھا اور دوسرے اس طرح بنی اسرائیل کے دلوں سے گائے کا قدس ختم کرنا تھا، جو مصر کی غلامی کے زمانے میں ان میں پیدا ہو چکا تھا، کیونکہ وہاں گائے کی پوجا ہوتی تھی۔ گائے کے اسی تقدس اور تعظیم کی وجہ سے اس سے پہلے بنی اسرائیل پھرے کی پوجا بھی کر چکے تھے۔ چونکہ یہ لوگ شریعت کے احکام کی نافرمانی اور ان میں حیله بازی کے عادی تھے، اس لیے انہوں نے گائے ذبح کرنے کے حکم پر بھی نال مژول شروع کر دی۔ لیکن آخر میں مجبور ہو کر بے دلی کے ساتھ اس حکم پر عمل کر لیا۔

اس آیت میں جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تو بنی اسرائیل کہنے لگے کہ کیا آپ ہم سے مذاق کرتے ہیں۔ ہم نے آپ سے قاتل کا سراغ لگانے کی درخواست کی ہے اور آپ ہمیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیتے ہیں! اس پر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

”میں اس بات سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں کہ شریعت کے معاملے میں تم سے پہنچی مذاق کروں اور نادان بہوں۔ میں تمہیں اللہ سمجھاتا ہوں کہ ایک حکم سنارہا ہوں، کوئی مذاق نہیں کر رہا ہوں۔“

﴿ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنُ لَنَا مَا هَيَّ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا فَارِضٌ وَلَا يُكَرِّعُ عَوَانٌ بَيْنَ ذِلِكَ قَافْلَهُ أَمَا تَؤْمِنُونَ ﴾ (68)

فارِضٌ:.....ایسی بوڑھی جو بچے دینے کے قابل نہ رہی ہو۔

بَكَرٌ:.....اتنی چھوٹی عمر کی جس نے اب تک کوئی بچہ نہ جتنا ہو۔

عَوَانٌ:.....درمیانی عمر کی جس نے ایک یادو بچے بننے ہوں۔ اصل میں پوری عبارت یوں ہے:

﴿ عَوَانٌ بَيْنَ ذِلِكَ وَهَذَا ﴾ کہ فَارِضٌ اور بَكَرٌ دونوں کے درمیان کی عمر والی ہو۔

بنی اسرائیل کو کوئی سی مناسب گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا، مگر انہوں نے نال مٹول کے لیے سوالات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ کہنے لگ کر آئے مویں! اپنے رب سے پوچھ کر ہمیں بتا کہ وہ گائے کیسی ہو؟ جواب دیا گیا کہ او سط عمر کی ہو، نہ بوڑھی ہو اور نہ بچھیا۔ پھر فرمایا کہ حکم کی تعمیل کرو، تاکہ قاتل کا پتہ چلا جائے اور غیر ضروری سوال نہ کرو۔ شریعت کے حکم سے بچنے کے لیے جیلے بازی نہ کرو۔ ورنہ دین کی آسانیوں میں تنگی پیدا کرو گے۔

﴿ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنُ لَنَا مَا لَوْنُهَا ﴾ قَالَ إِنَّهَا يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفَرَاءٌ

فَاقِعٌ لَوْنُهَا تَسْرُّ التَّنْظِيرِينَ ﴾ (69)

فَاقِعٌ لَوْنُهَا:.....یہ صَفَرَاءُ (زرد رنگ والی) کی تاکید کے لیے ہے، مراد یہ ہے کہ وہ گھرے شوخ زرد رنگ کی گائے ہے۔

گائے کے بارے میں یہ بنی اسرائیل کا دوسرا سوال تھا کہ بتایا جائے کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ فرمایا گیا کہ وہ گھرے شوخ زرد رنگ والی خوبصورت گائے ہو جو دیکھنے والوں کو خوش نمائگتی ہو۔ اس جواب پر بھی جب بنی اسرائیل کی تسلی نہ ہوئی تو انہوں نے ایک اور سوال کر دیا:

﴿ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنُ لَنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَبَّهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللَّهُ كَوْهْتَدُونَ ﴾ (70)

گائے سے متعلق بنی اسرائیل کا یہ تیسرا سوال ہے کہ ہمیں یہ معاملہ ابھی تک واضح نہیں ہو سکا کہ مطلوب گائے کون سی شکل و صورت کی ہے۔ اس کے بارے میں مزید وضاحت کر دی جائے تو کوئی راستہ نکل آئے گا۔ اس پر ان کو جواب میں فرمایا گیا کہ:

﴿ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا ذُلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرَقَ مُسَلَّمَةٌ لَا شَيْءَ يَفْهَمُهَا قَالُوا إِنَّهُ جُنْتَ بِالْحَقِّ فَذَبَّ بِحُوَاهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴾ (71)

ذُلُولٌ:.....یہ بَقَرَةٌ کی صفت آئی ہے کہ وہ محنت و مشقت کے کام نہ کرتی ہو۔

اس سے زمین میں مل چلانے یا کھیتوں کو پانی دینے کا کام نہ لیا جاتا ہو۔

مُسْلِمَةُ: وَهُجُّ سَالِمٌ هُوَ۔ اس میں کوئی جسمانی عیب نہ ہو۔ اس کا ایک ہی زر درنگ ہو۔
لَا شَيْءَةَ فِيهَا: یعنی اس کے رنگ میں کسی اور رنگ کی آمیزش نہ ہو۔
 وہ سر سے پاؤں تک زر درنگ کی ہو۔ اس میں کسی اور رنگ کا کوئی داغ نہ ہو۔

بِالْحَقِّ: حق کا لفظ قرآن مجید میں کئی معنوں میں آیا ہے۔ اس جگہ اس سے مراد ہے: ”بِالْكُلِّ وَاضْعَفُ اور ثَيِّبُ بَاتٍ۔“
 یہ بنی اسرائیل کے تیسرا سوال کا جواب ہے کہ وہ گائے ایسی ہو جس سے زمین میں ہل چلانے یا کھیتوں کو پانی
 دینے کی مشقت نہ لی جاتی ہو۔ وہ صحیح سالم ہو، ہر قسم کے جسمانی عیب سے پاک ہو۔ اس کا رنگ گہرا زرد اور شوخ ہو،
 جس میں کسی اور رنگ کی آمیزش یا داغ نہ ہو۔

یہ جواب سن کر جب بنی اسرائیل کے لیے کسی اور سوال کی گنجائش باقی نہ رہی اور اس حکم کی تعییل سے بچنے کا کوئی
 حلیہ نہ رہا تو انہوں نے نہ چاہتے ہوئے، بے دلی کے ساتھ وہ گائے ذبح کر دی۔

﴿وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَإِذْ رَأَيْتُمْ فِيهَا إِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَا كَنْتُمْ تَكْتُلُونَ﴾ (72)

إِذْ رَأَيْتُمْ تُمْ: اصل میں یہ تدارع تُمْ تھا۔ ادغام کی وجہ سے ”ت“ کو ”دال“ میں مغم کر دیا گیا۔ پھر ساکن دال کو پڑھنے کے لیے اس کے شروع میں ! (ہمزہ الاول) لگا دیا گیا۔ اس پر ”قا“ داخل ہونے سے اسے پھر ساکن کر دیا گیا اور یہ فاٹرَاءُ تُمْ ہو گیا جس کا مطلب ہے: قَدَّ أَفْعَتُمْ وَتَخَاصَّتُمْ کہ تم لوگ اپنے اوپر سے الزام کو ہٹاتے، دور کرتے اور جھٹڑا کر کے دوسروں کے سر تھوپ دیتے تھے۔ اس کا مصدر ”دَرَعُ“ ہے جس کے معنی ”دَفْعُ“ (ہٹانا، دور کرنا) کے ہیں۔

اس آیت میں بھی مدینے کے یہود سے خطاب ہے کہ وہ واقعہ یاد کرو جب تمہاری قوم میں ایک شخص قتل ہو گیا تھا اور قاتل کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ تم ایک دوسرے پر قتل کا الزام دھرتے تھے، اور آپس میں جھگڑتے تھے۔ پھر تم لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس یہ مقدمہ لے کر آئے اور انہوں نے تمہیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا۔

آیت کا یہ ضمoun، بعض مفسرین کے نزدیک جیسا کہ تفسیر مراغی میں اس مقام پر ہے: ((هذا مؤخر لفظاً مقدم معنی)) یعنی یہ لفظی اعتبار سے اگرچہ بعد میں آیا ہے مگر معنوی طور پر یہ اس سے پہلے کا ہے جہاں سے گائے ذبح کرنے کا حکم شروع ہوا ہے۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کے ایک قدیم واقعے کو مدینے کے یہود کا فعل اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ یہ لوگ اپنے آباء و اجداد کے تمام حالات و واقعات کو اپنے خاطر تمہارے وہ لوگ جو قاتل کے بارے میں جانتے تھے، اس کے بارے میں پھر فرمایا کہ اپنے ذاتی منادر کی خاطر تمہارے وہ لوگ جو قاتل کے بارے میں جانتے تھے، اس کے بارے میں

گواہی چھپاتے تھے، تاکہ اصل قاتل کا پتہ نہ چلے، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنا مجزہ دکھا کر قاتل کا سارا غ لگایا۔

﴿فَقُلْنَا أَضْرِبُوهُ بِعَصْبَاهَا۝ كَذَلِكَ يُنْهِي اللّٰهُ الْمُؤْمِنِ وَ يُرِيكُمْ أَيْتِهِ لَعْنَكُمْ﴾

تَعْقِلُونَ ﴿۷۳﴾

پھر جب بنی اسرائیل نے ٹال مٹول کے بعد مجبور ہو کر گائے ذبح کردی تو حکم ہوا کہ اس گائے کے گوشت کا کوئی کلڑا مقتول کی لاش پر مارو۔ جب ایسا کیا گیا تو مقتول عارضی طور پر زندہ ہو گیا اور اس نے اپنے قاتل کی نشان دہی کر دی۔ اس طرح ایک پیچیدہ چھڑے کا صاف فیصلہ ہو گیا اور قاتل پیڑا گیا اور اسے قصاص میں قتل کر دیا گیا۔ اس پر فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح اس مقتول کو زندہ کر دکھایا ہے، اسی طرح وہ قیامت کے دن مردوں کو زندہ کر دے گا۔ وہ دنیا میں تمہیں اپنی قدرت کی نشانیاں دکھاتا ہے، تاکہ تم عقل سے کام لو۔ اللہ تعالیٰ کی شریعت کی پیروی کرو، اس کی نافرمانی نہ کرو۔ خواہش پرستی کی جگہ خدا پرستی اختیار کرو۔

بنی اسرائیل کی گائے کے اس واقعے میں کئی سبق اور حکمتیں ہیں، مثلاً:

۱۔ دین کے بارے میں غیر ضروری اور فضول سوالات کرنے کی ممانعت ہے، کیونکہ ان کی وجہ سے شرعی احکام میں آسمانی کی بجائے سختی اور تنگی پیدا ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں اہل ایمان کو اس حرکت سے روکا گیا ہے۔

﴿هَيَأْتِهَا الَّذِينَ أَمْنَوْا لَا تَسْكُلُوا عَنْ أَشْيَاءَ آءٍ إِنْ تُبَدِّلَ كُمْ تَسُوْكُمْ﴾ (المائدہ 101:5)

”اے ایمان والو! ایسی چیزوں کے بارے میں سوال نہ کرو جو تمہیں بتائی جائیں تو تمہیں بری لگیں۔“

صحیحین کی ایک حدیث میں بھی فضول سوالات اور کثرت سوال سے منع کیا گیا ہے۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ اللَّهَ حَرَمَ عَلَيْكُمْ عُقُوقَ الْأَمَهَاتِ، وَوَادِ الْبَنَاتِ، وَمَنْعَ وَهَاتِ، وَكَرِهَ لَكُمْ قِيلَّ وَقَالَ، وَكَثْرَةَ السُّؤَالِ، وَإِضَاعَةَ الْمَالِ))

(صحيح بخاری، رقم: 5975۔ صحيح مسلم، رقم: 4483۔ دارمي، رقم: 2751)

”بے شک اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا، ماوں کی نافرمانی کرنے کو، بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے کو، اور بے جا مانگنے کو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ناپسند فرمایا، فضول باتوں کو، فضول سوالات کرنے کو اور مال ضائع کرنے کو۔“

صحیح مسلم کی ایک اور حدیث میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((هَلَكَ الْمُمْتَطَعُونَ، قَالَهَا ثَلَاثَةٌ)) (صحيح مسلم، رقم: 6784)

”ہلاک ہو گئے، اپنی باتوں میں مبالغہ آرائی کرنے والے! یہ بات آپ ﷺ نے تین مرتبہ دہرائی۔“

مُمْتَطَعُونَ کا لفظ تَنَطُّح سے ہے، جس کے معنی میں گفتگو اور کلام میں تکلف اور تصنیع برنا، مبالغہ آرائی کرنا، فضول اور بے فائدہ باقی کرنا، لوگوں کو ہنسانے یا ان پر رعب جمانے کے لیے میراثیوں کی طرح باقی کرنا، دوسروں کی خشامد

کرنا، ہربات میں میکھ نکالا اور بال کی کھال اتارنا، سب شامل ہیں۔ ان ساری چیزوں میں پڑنے والوں کو ہلاکت میں پڑنے والے قرار دیا گیا ہے اور وہ آخرت میں گھائی میں رہیں گے۔
فضول سوال کرنے کا ایک واقعہ صحیح مسلم میں بھی آیا ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رض سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایک خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

((يَا أَيُّهَا النَّاسُ! قَدْ فِرِضَ عَلَيْكُمُ الْحَجُّ فَحُجُّواً۔ فَقَالَ رَجُلٌ: أَكُلَّ عَامَ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ فَسَكَتَ حَتَّى قَالَهَا ثَلَاثَةً۔ فَقَالَ: لَوْ قُلْتُ: نَعَمْ، لَوْ جَبَتْ وَلَمَّا اسْتَكْعِطْتُمْ؛ ثُمَّ قَالَ: ذَرْوْنِي مَا تَرَكْتُمْ، فَإِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِكَثْرَةِ سُوَالِهِمْ، وَاخْتِلَافِهِمْ عَلَى أَنْسِيَاءِهِمْ، فَإِذَا أَمْرَتُكُمْ بِشَيْءٍ فَأَتُونِي مَنْهُ مَا اسْتَكْعِطْتُمْ، وَإِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَيْءٍ فَدَعُوهُ))

(صحیح مسلم، رقم: 3257۔ نسائی، رقم: 2619۔ ابو داؤد، رقم: 1721)

”اے لوگو! تم پرج فرض کر دیا گیا ہے، لہذا تم حج کیا کرو۔ یہ سن کر ایک آدمی بولا: یا رسول اللہ! کیا ہر سال حج کرنا ہے؟ اس پر آپ ﷺ خاموش رہے۔ اس آدمی نے تین بار اپنا سوال دہرا�ا۔ مگر آپ ﷺ تینوں مرتبہ خاموش رہے۔ پھر فرمایا: اگر میں ”ہاں“ کہہ دیتا تو پھر ہر سال حج لازم ہو جاتا اور پھر تم سے یہ نہ ہو سکتا۔ اس کے بعد فرمایا: جب میں کوئی بات نہیں بتاتا تو اس کے بارے میں سوال نہ کرو۔ تم سے پہلے لوگ صرف اس لیے ہلاک ہوئے کہ انہوں نے نبیوں سے بہت سوالات کیے اور پھر اختلافات کر کے احکام کی پابندی نہ کی، لہذا جب میں تمہیں کسی چیز سے روک دوں تو اس سے بچو، اور جب کسی کام کا حکم دوں تو جتنا ہو سکے، اس پر عمل کرو۔“

نسائی کی روایت میں اور دوسری کتب حدیث میں سوال کرنے والے شخص کا نام ”اقرع بن حابس“ آیا ہے۔

در اصل دین نام ہے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی کامل اور غیر مشروط اطاعت کا، اپنی خواہش کو اللہ کی مرضی کے تابع کر دینے کا، یہ جذبہ نہ ہو تو دین داری کی روح باقی نہیں رہتی۔ اس لیے دین کے معاملے میں غیر ضروری اور فضول سوالات کرنے سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ ان سے شریعت میں سختی اور تنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ البتہ ضروری سوالات جو دین کو سمجھنے کے لیے کیے جائیں، ان کی اجازت ہے۔

2۔ بنی اسرائیل کو کوئی اور جانور کے بجائے صرف گائے ذبح کرنے کا حکم اس لیے دیا گیا، کیونکہ وہ مصر کی غلامی کے اثر سے اس کے تقدس و عظمت کے قائل تھے، کیونکہ وہاں گائے کی پوجا ہوتی تھی۔ چنانچہ مصر سے نکلنے کے بعد انہوں نے پھرے کی پوجا بھی کی اور اسے اپنا معبود بنایا۔ لہذا ان کے دلوں سے گائے کی تقدیس و تقطیم دور کرنے کے لیے اسے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس طرح ایک کام سے دو مقاصد حاصل ہو گئے۔ ایک گائے کا تقدس ختم کرنا، دوسرے اس کے ذریعے قاتل کا پتہ چلانا۔

۳۔ اس واقعے سے بنی اسرائیل کی وہ ذہنیت سامنے آ جاتی ہے جو اللہ کی شریعت کے بارے میں اور اپنے نبیوں کے بارے میں وہ رکھتے تھے..... کہ ان کا مذاق اڑایا جائے، شرعی احکام پر عمل کرنے سے بچنے کی راہیں تلاش کی جائیں، مختلف حیلوں بہانوں سے شریعت کے احکام کی پابندی نہ کی جائے اور اطاعت کی بجائے نافرمانی اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکرگزاری کی بجائے ناشکری کا روایہ اختیار کیا جائے۔

ظاہر ہے قرآن نے بنی اسرائیل کا یہ واقعہ مسلمانوں کو لوری دینے کے لیے نہیں سنایا۔ بلکہ ان کے لیے اس میں برا سبق ہے کہ وہ بھی ہر معاملے میں اللہ اور رسول ﷺ کی بے چون و چرا اطاعت کریں۔ طرح طرح کی جیلے بازیوں سے شریعت کے احکام کا مذاق نہ اڑائیں اور ان پر عمل کرنے سے بچنے کے بہانے نہ بنائیں اور غیر ضروری اور فضول سوالات نہ کریں۔ دین کے بارے میں فضول کجھ بخیاں اور مین میکھ نہ نکالیں۔

افسوں آج ہمارے ہاں دین کے متعلق ایسے ایسے غیر ضروری اور فضول سوالات پیدا کر لیے گئے ہیں اور ان پر بحث برائے بحث کی جا رہی ہے کہ اصل دین کی روح مردہ ہو گئی ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ جھوٹ بولنے پر قادر ہے، کیا نبی ﷺ نور ہیں یا بشر، وہ حاضر و ناظر ہیں کہ نہیں ہیں، وہ اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں یا زندہ نہیں ہیں، مردے سنتے ہیں یا نہیں سنتے ہیں، کیا ان جیسے سوالات اٹھانے والے اور ان پر بحث و مناظرے کرنے والے دین کی خدمت کر رہے ہیں یا اپنی اس یہودی ذہنیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں جس کی قرآن نے نہ مرت فرمائی ہے؟

۴۔ اس قصے کے پہلے حصے میں قاری کے لیے ایک تجسس ہے کہ گائے ذبح کرنے کا حکم کیوں دیا گیا۔ پھر دوسرا حصے میں اس کا اصل مقصد بتایا گیا کہ اس سے قاتل کا پتہ چلانا مقصود تھا۔ اس طرح اس قصے کے شروع سے آخر تک قاری کا تجسس برقرار رکھا گیا ہے اور قصے میں اس کی وجہ پر برابر قائم رکھی گئی ہے۔

**ثُمَّ قَسَّتْ قُلُوبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَلُّ قَسْوَةً
وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَرُ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشْقَقُ
فِيْخُرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشِيشَةِ اللَّهِ وَمَا اللَّهُ
بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ④**

”پھر اس کے بعد تمہارے دل پھرلوں کی طرح سخت ہو گئے،“ بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت! کیونکہ بعض پھرایے ہوتے ہیں، جن سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں۔ بعض جب پھر جاتے ہیں تو ان سے پانی نکل آتا ہے، اور بعض پھرایے ہوتے ہیں جو اللہ کے خوف سے گرپتے ہیں۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں۔“ (74)

الغاظ کی تحقیق اور آیت کی تفسیر:

فَهِيَ الْجَارَةُ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً..... یہ اسی طرح کا اسلوب بیان ہے۔ جیسے سورہ النحل 16:77 میں قیامت کے بارے میں ہے: ﴿كَلِمَحَ الْبَصَرِ أَوْ هُوَ أَقْرَبُ﴾ ”جیسے آنکھ جھپکنا یا اس سے بھی جلد“۔ یہ اسلوب جیسا کہ زرکشی اللہ نے البرhan میں لکھا ہے ((الخطاب بالشئ عن اعتقاد المخاطب دون ما في نفس الأمر)) کہلاتا ہے، یعنی جس میں کوئی پیزاصل حقیقت کی بجائے مخاطب کے ذہن کے مطابق تشبیہ کے ذریعے بیان کر دی جاتی ہے کہ وہ اسے ایک طرح سمجھ لے یادوسری طرح سمجھ لے۔

خُشُبَيْةُ اللَّهِ..... (الله کے خوف سے) پھر وہ کے لیے مجازی طور پر فرمایا، حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت مراد ہے، کہ وہ اللہ سبحانہ کے قانون کے مطابق حرکت کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف گناہوں کی وجہ سے سخت ہو جانے والے انسانی دل اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل نہیں کرتے اور اس کی اطاعت سے نکل جاتے ہیں۔

فرمایا.....! بنی اسرائیل نے جس طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بڑی واضح نشانیوں، نعمتوں اور مجرموں کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا..... جیسے سمندر کا پھٹ جانا اور اس میں راستے بن جانا، صحرائے سینا کی گرمی میں بادلوں کا سایہ اُنکن ہونا، من و سلوٹ کی قدرتی غذا کا فراہم ہونا، پتھر کی چٹان سے بارہ چشموں کا بہہ لکنا، پہاڑ کا سروں پر معلق ہو جانا، سبت کی بے حرمتی کرنے والوں کا بندروں جیسا بن جانا، مردہ متفقہ کا دوبارہ زندہ ہونا..... ان سب عجائب کو دیکھنے کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ ان لوگوں کے دل اللہ تعالیٰ کی شکرگزاری اور فرمان برداری کے لیے نرم ہو کر جھک جاتے۔ مگر ان پر الثایہ اثر ہوا کہ ان کی عہد شکنی، سرکشی، نافرمانی اور ناشکری میں مزید اضافہ ہوتا گیا اور اس کے سبب ان کے دل پھر وہ اور جٹانوں سے زیادہ سخت ہو گئے۔

فرمایا، بعض پتھر تو ایسے ہوتے ہیں جن سے نہریں پھوٹ لکتی ہیں، جس سے انسانوں کو بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ بعض جب پھٹ جاتے ہیں تو ان سے بھی پانی بہہ لکتا ہے جس سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور بعض تو اللہ کے خوف اور اس کے قانون کے تحت پہاڑ کی بلندی سے گر پڑتے ہیں اور اپنی حساسیت (SENSITIVITY) ظاہر کر دیتے ہیں مگر بنی اسرائیل کے دل ایسے بے جس اور اپنی فطری صلاحیت سے عاری ہو چکے ہیں کہ وہ لوگ مردہ ضمیری کے چلتے پھرتے لاشے بن کر رہ گئے۔ دل سخت ہونے کے بارے میں قرآن مجید کی یہ تشبیہ نہایت عمدہ ہے۔ عربی زبان میں بھی اردو زبان کی طرح پتھر دل ہونے، یا سُگ دل ہو جانے کی تشبیہ موجود ہے۔ ایک عربی مصروع ہے۔

وَقَلْبُهُ كَالْحَاجَرِ الْقَاسِيِّ

”اور اس کا دل پتھر کی طرح سخت ہے۔“

لیکن قرآن مجید نے اس تشبیہ کو جس طرح استعمال کیا ہے وہ بلاغت کا مجوزہ ہے۔

أَفَتَنْظِعُونَ أَتْ يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَ قَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْعَوْنَ
 كَلْمَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِنْ بَعْدِ مَا عَقْلُوهُ وَ هُمْ يَعْلَمُونَ ۝
 وَ إِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا أَمْنَا ۝ وَ إِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَى
 بَعْضٍ قَالُوا أَتُهُدِّيُّونَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُوكُمْ بِهِ عِنْدَ
 رَبِّكُمْ ۝ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ أَوْ لَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ
 وَ مَا يُعْلِنُونَ ۝ وَ مِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا آمَانَى
 وَ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظْنُونَ ۝ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ
 بِأَيْدِيهِمْ ۝ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۝
 فَوَيْلٌ لَهُمْ مَمَّا كَتَبْتُ أَيْدِيهِمْ وَ وَيْلٌ لَهُمْ مَمَّا يَكْسِبُونَ ۝ وَ قَالُوا
 لَكُنْ نَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا آيَاتٌ مَمْعُودَةٌ ۝ قُلْ أَتَخَذُنَّمْ عِنْدَ اللَّهِ
 عَهْدًا فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا
 تَعْلَمُونَ ۝ بَلِّي مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَ أَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَئِكَ
 أَصْحَابُ النَّارِ ۝ هُمْ فِيهَا خَلِدُونَ ۝ وَ الَّذِينَ آمَنُوا وَ عَمِلُوا
الصِّلْحَاتِ أُولَئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۝ هُمْ فِيهَا خَلِدُونَ ۝

”(اے مسلمانو!) کیا تم امید رکھتے ہو کہ وہ (یہودی) تمہارے کہنے سے ایمان لے آئیں گے؟ حالانکہ ان کا ایک گروہ جب اللہ کا کلام سنتا تو اسے سمجھنے کے بعد جان بوجہ کر بدلتا ہے۔ یہ لوگ جب مسلمانوں سے ملتے ہیں۔ تو کہتے ہیں: ”ہم بھی ایمان لائے ہیں۔“ لیکن جب آپس میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں: کیا تم ان (مسلمانوں) کیے سامنے وقلا تیں ظاہر کرتے ہو جو اللہ نے تمہیں بتائی ہیں، تاکہ وہ کل کو تمہارے رب کے پاس

تمہارے خلاف بحث کریں؟ کیا تم نہیں سمجھتے؟ کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ اللہ سب کچھ جانتا ہے جو یہ چھپاتے اور ظاہر کرتے ہیں۔

اور ان میں ایسے ان پڑھ ہیں جو کتاب الٰہی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ان کے پاس خوش فہمیوں اور وہم و گمان کے سوا کچھ نہیں۔ پس خرابی ہے، ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں، اور کہتے ہیں ”یہ اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔“ تاکہ اس طرح وہ دنیا کا حاقیر مال حاصل کر لیں۔ پس خرابی ہے ان کے لیے اس تحریر کی وجہ سے جوان کے ہاتھوں نے لکھی! اور ان کے لیے خرابی ہے، ان کی اس کمائی سے جو وہ کماتے ہیں!

اور وہ کہتے ہیں: ”ہمیں دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی۔ اگر دوزخ میں ڈالے گئے تو صرف چند دنوں کے لیے ڈالے جائیں گے۔ (اے نبی ﷺ) آپ ﷺ ان سے کہیں: کیا تم نے اللہ سے کوئی وعدہ لے رکھا ہے، جس کی وہ خلاف ورزی نہیں کرے گا، یا تم اللہ کے بارے میں اسی بات کہتے ہو جو تم نہیں جانتے۔ بات یہ ہے کہ جس نے کوئی برائی کی اور اس کے گناہ نے اس کو بر باد کیا تو ایسے لوگ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ مگر جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے، وہ جنتی ہیں اور ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔“ (82-75)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

﴿أَفَتَطْعَمُونَ أَنْ يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فِي يَقِيقٍ مِنْهُمْ يَسْعَوْنَ كَلْمَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِنْ بَعْدِ مَا عَلِمُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ (75)

یہ درمیان میں مسلمانوں سے خطاب کیا گیا ہے کہ یہودیوں کے بارے میں زیادہ توقع نہ رکھو کہ وہ ایمان قبول کر کے دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں گے۔ ان کے علماء کی حالت یہ ہے کہ وہ جان بوجہ کرتوریت کی لفظی اور معنوی تحریف کرتے اور اس کے احکام میں رد و بدل کر دیتے ہیں، ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان کی اپنی قوم کا ایک نبی (مویٰ علیہ السلام) ان کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے تو وہ اس پر عمل نہیں کرنا چاہتے بلکہ مختلف جیلوں بہانوں سے ٹال مٹول کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی شریعت کے احکام کی اطاعت کرنے کی بجائے سرکشی اور نافرمانی اختیار کرتے ہیں۔ اس آیت میں حضرت محمد ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام کو تسلی دی گئی ہے کہ یہودیوں کے ایمان نہ لانے پر غمگین نہ ہوں۔ یہ قوم اپنے خاندان کے انبیاء کی نافرمانی کرتی رہی ہے اور اپنی مذہبی کتاب کے احکام کی پابندی نہیں کرتی اور اس کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنالیتی ہے تو وہ کسی اور قوم و خاندان کے نبی ﷺ اور قرآن مجید پر کیسے ایمان لائے گی؟

﴿وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا أَمَّا وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ قَالُوا أَتُعِزِّزُونَهُمْ إِيمَانَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُوكُمْ بِهِ عِنْدَ رِئِكْمَهُ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ (76)

اس سے ملتا جاتا مضمون آیات 8 تا 16 میں بھی لگز رچکا ہے۔ یہودی منافقین جب مسلمانوں سے ملتے تو کہتے ہم بھی ایمان والے ہیں، اور اس طرح وہ سادہ لوح مسلمانوں کو دھوکا دیتے۔ نیت یہ ہوتی کہ ہم اپنی کتابوں اور اپنے نبیوں پر ایمان رکھتے ہیں، اس لیے ہم بھی ایمان والے ہیں۔ پھر ایسا بھی ہوتا کہ بھی ان کے منہ سے یہ بات نکل جاتی کہ ہاں، ہماری کتابوں اور صحیفوں میں بھی ایک نبی کے آنے اور اس پر اللہ کا کلام نازل ہونے کی پیش گوئیاں موجود ہیں۔

پھر جب یہ منافق یہود اپنے غیر منافق یہودیوں سے ملتے تو وہ ان پر خوب برستے، ان کو ڈائٹ نت اور ان کا سخت محابہ کرتے کہ تم لوگ کیوں مسلمانوں کو وہ باتیں بتا دیتے ہو، جو ان کے حق میں جاتی ہیں۔ وہ کل قیامت کے دن یہی باتیں ہمارے خلاف جنت و دلیل بنائے کر پیش کر دیں گے۔ اس لیے مسلمانوں کو ایسی باتیں نہ بتایا کرو۔ تم اپنے دشمن کو دلائل کا تھیار فراہم کر کے اپنی بے عقلی کا بجوت کیوں دیتے ہو؟

﴿أَوَ لَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسْرِرُونَ وَ مَا يُعْلَمُونَ ﴾ (77)

اس آیت میں ملامت کرنے والے یہودیوں کے کفر، جھوٹ اور منافقت اور فریب کاری کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمہاری ان سب حرکتوں کا پورا علم ہے، وہ تم سے تمہارے سارے اعمال کا حساب لے گا۔ تم اس سے اپنی کوئی بات چھپانے سکو گے۔

﴿وَ مِنْهُمْ أُمِيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانَىٰ وَ إِنْ هُمْ إِلَّا يُظْنُونَ ﴾ (78)

امیوں..... یہ اُمیٰ کی بحث ہے جس کے معنی ایسے شخص کے ہیں جو کھنپ پڑھنا نہ جانتا ہو۔ آیت میں اس لفظ سے یہودیوں کے آن پڑھ عوام مراد ہیں۔

امانیہ:..... یہ اُمینیۃ کی بحث ہے، جس کے معنی متنا، آرزو، خواہش اور خام خیالی کے ہیں۔

فرمایا کہ یہود کے آن پڑھ عوام کی حالت یہ ہے کہ وہ نہ تو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں اور نہ اپنی کتاب توریت کی اصل تعلیم سے واقف ہیں۔ ان کے دنیا پرست علماء ان کو غلط مذہبی تعلیم دیتے ہیں۔ تبجھ یہ ہے کہ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی کتاب محض چند خواہشات کا مجموعہ بن گئی ہے۔ دین و شریعت کے احکام کی پابندی ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ اخلاق بگڑ چکے ہیں۔ غلط عقائد اور جھوٹے دعوؤں کی بھرمار ہے۔ دین کا صحیح علم غالب ہے اور وہ توہمات (SUPERSTITIOUS) میں بنتا ہیں۔ اس پر خروغ غرور ہے کہ وہ نبیوں کی اولاد ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور چھبیتے ہیں۔ آخرت کی جنت صرف ان کے لیے بنائی گئی ہے اور دوزخ کا عذاب صرف دوسرا تو میں بھگتیں گی۔

اسوں آج مسلمانوں کا حال بھی ان سے زیادہ مختلف نہیں ہے بلکہ انہی جیسا ہے۔

﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِإِيمَانِهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هُنَّ اُمَّنْ عِنْدِ اللَّهِ

لِيَشْتَرِوْا بِهِ ثِنَانًا قَبِيلًاٰ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مَمَّا كَتَبْتُ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مَمَّا يَكْسِبُونَ ﴾ (79)

فرمایا، یہودی علماء (احباد اور فریسیوں) کے لیے دوہری ہلاکت و بر بادی اور دوہر اعذاب ہے جو خود اپنے ہاتھوں

سے من گھڑت فتوے اور احکام لکھتے، مگر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ تاکہ اس طرح وہ اللہ کی کتاب میں تحریف کر کے اس کے بدلتے میں دنیا کا حقیر مفاد حاصل کریں۔

ہماری امت کے فتویٰ فروش اور شریعت کے احکام کی غلط تاویلیں کرنے والے ”ابو الفضل اور فیضی“، بھی علمائے یہود سے پچھئے نہیں رہے بلکہ وہ قدم آگے ہیں۔

﴿وَقَالُوا كُنْ تَهْسِنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّاً مَا مَعْدُودَةٌ قُلْ أَتَخَذُ تُمُّ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ (80)

یہ یہود یوں کی جھوٹی آرزوؤں اور خام خیالیوں کی ایک مثال ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے اعمال..... خواہ کچھ بھی ہوں مگر پونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ اور چیختی قوم ہیں۔ قوم کی یہی نسبت ان کو دوزخ سے بچا کر جنت میں لے جائے گی۔ اگر کچھ سزا ہو بھی گئی تو جتنا عرصہ ہمارے بڑوں نے پھر بے کی پوجا کی تھی، اتنے دنوں کی سزا ہو گی۔ اس پر فرمایا گیا کہ کیا تمہارے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کوئی معاهدہ ہو چکا ہے کہ وہ تمہارے گناہوں پر تمہیں عذاب نہیں دے گا۔ یا پھر اللہ کے بارے میں تم یونہی جاہلائے باتمیں کرتے ہو اور جھوٹے دعوے کرتے ہو۔

ایمان اور عمل صالح کی بجائے ”نسیوت“ سے آخری نجات کا یہ یہودیانہ تصور، افسوس، آج مسلمانوں میں بھی کثرت سے پایا جاتا ہے۔

﴿بَلِّيْ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ احَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَوَلِّيْكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَلِدُونَ﴾
وَ الَّذِينَ آمَنُوا وَ عَمِلُوا الصِّلَاةَ أُولَئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَلِدُونَ﴾ (80-81)

بلی:..... یہ لفظ ”ایجاد للنفی“ کے لیے آتا ہے۔ اپنے سے پہلی بات کی نفی کر کے اس کے خلاف بات کا اثبات کرتا ہے۔ گویا بات وہ نہیں جو تم نے کہی ہے بلکہ اصل بات یوں ہے کہ.....

فرمایا، آخرت میں نجات کا دار و مدار کسی نسلی یا گروہی نسبت پر نہیں ہے جیسا کہ یہود نے سمجھ رکھا ہے بلکہ جو لوگ بھی کفر و شرک اور کبیرہ گناہوں کی زندگی گزاریں گے اور توبہ کیے بغیر مر جائیں گے، وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ اور جو ایمان اور عمل صالح اختیار کریں گے، وہ جنت میں جائیں گے اور وہاں ہمیشہ رہیں گے۔

اسی سے ملتا جلتا مضمون آیت 62 میں بھی بیان ہو چکا ہے۔ تفصیل جانتے کے لیے اسے دیکھ لیا جائے۔

قرآن مجید میں تقابل کا یہ اسلوب عام ہے کہ جہاں دوزخ والوں کا ذکر آتا ہے، وہاں جنت والوں کا بھی ذکر کرہوتا ہے یا اس کے برعکس۔

وَإِذَا أَخْذُنَا مِيَثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهُۚ
وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمُسْكِينِينَ
وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَأَتُوا الرَّزْكَوَةَ ثُمَّ
تَوَلَّتُمُ الْأَقْلِيلَ مِنْكُمْ وَأَنْتُمْ مُعْرِضُونَ ﴿٨٧﴾ وَإِذَا أَخْذُنَا مِيَثَاقَكُمْ
لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ أَنفُسَكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ
أَقْرَرْتُمْ وَأَنْتُمْ تَشَهَّدُونَ ﴿٨٨﴾ ثُمَّ أَنْتُمْ هُوَلَاءَ تَقْتُلُونَ أَنفُسَكُمْ
وَتُخْرِجُونَ فِرِيقًا مِنْكُمْ مِنْ دِيَارِهِمْ تَظْهَرُونَ عَلَيْهِمْ بِالْإِثْمِ
وَالْعُدُوِّنَ وَإِنْ يَأْتُوكُمْ أَسْرَىٰ نَفْدُوهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْهِمْ
إِخْرَاجُهُمْ أَفْتَوِمُنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفِرُونَ بِبَعْضِهِ فَهَا
جَزَاءُ مَنْ يَفْعُلُ ذَلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْنَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَيَوْمَ
الْقِيَمَةِ يُرْدَوْنَ إِلَى أَشَدِ الْعَذَابِ ۖ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَنِّ
تَعْمَلَوْنَ ﴿٨٩﴾ أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۖ فَلَا

يُخَفَّ عَنْهُمُ الْعَذَابُ ۖ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ﴿٩٠﴾

بِعْ

”اور یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنا، تیبیوں اور مسکینوں سے ہمدردی کرنا، لوگوں سے اپھی بات کرنا، نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا، مگر تھوڑے لوگوں کے سو اتم سب اس عہد سے پھر گئے اور تم پھر جانے والے لوگ ہو۔ یاد کرو جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ اپنوں کا خون نہ بہانا اور اپنے لوگوں کو ان کے گھروں سے بے گھرنہ کرنا۔ تم نے اس عہد کا اقرار کیا اور تم خود اس کے گواہ رہے۔ مگر پھر یہ تھی ہو جو اپنوں کو قتل کرتے ہو، اپنے لوگوں کو گھروں

سے جلاوطن کرتے ہو۔ ان کے مقابلے میں دشمن کی مدد کرتے ہو، گناہ اور ظلم کرنے کے لیے۔ لیکن جب وہ تمہارے پاس قیدی بن کر آتے ہیں تو تم فدیہ دے کر انہیں چھرا لیتے ہو۔ حالاں کہ ان کو ان کے گھروں سے نکالنا ہی تمہارے لیے حرام تھا۔ کیا تم کتابِ اللہ کے ایک حصے کو مانتے اور دوسرے کا انکار کرتے ہو؟ تم میں سے جو لوگ ایسا کریں، ان کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ وہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہوں اور قیامت کے دن انہیں سخت عذاب میں ڈالا جائے۔ اور اللہ اس سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کے بدلتے دنیا خریدی۔ پھر نہ تو ان کے عذاب میں کم کی جائے گی اور نہ انہیں کہیں سے مدل سکے گی۔“ (86-83)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

﴿وَإِذَا أَخْدَلْنَا مِيقَاتَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُوهُنَّ إِلَّا اللَّهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمُسْكِينَ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَأَقِيمُوا الصَّلَاةُ وَأُتُوا الرِّزْكُوَةُ ثُمَّ تَوَلَّتُمُ الْأَقْلِيلَأَقْنُكُمْ وَأَنْتُمْ مُعْرِضُونَ﴾ (83)

لَا تَعْبُدُوهُنَّ إِلَّا اللَّهُ: کے معنی ہیں: لَا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهُ ”تم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو۔“ قُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا: اس کے معنی ہیں: لوگوں سے اچھی بات کہنا۔

مصر کی غلامی سے نکلنے کے بعد یہ عہد بنی اسرائیل کے ابتدائی زمانے میں ان سے لیا گیا تھا جسے بعد میں بھی ان کے انبیاء کرام ان کو یادداشتے رہے، مگر قوم کی اکثریت اس عہد کو مسلسل توڑتی رہی، یہاں تک کہ عہد شکنی ان کے قوی مزانج کا حصہ بن گئی۔

اس عہد میں سب سے پہلے صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کا حکم ہے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر آیا ہے، جیسے ارشاد ہوا:

﴿وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾ (النساء: 4:36) (بنی اسرائیل 17:23)

”اور تم اللہ کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ، اور اپنے والدین سے اچھا سلوک کرو،“ دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَقَضَى رَبُّكَ إِلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾ (بنی اسرائیل 17:23)

”اور تیرے رب نے حکم جاری کر دیا کہ تم اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو، اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔“

مطلوب یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے اور کسی اور کو مجبود نہ بنایا جائے۔ یہ اللہ کا حق ہے اور انسان پر

سب سے پہلا یہی حق ہے، اس کے بعد والدین سے حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ والدین کا حق اللہ تعالیٰ کے حق کے بعد اور باقی سب کے حقوق سے پہلے ہے۔ کیونکہ وہ انسان کی پرورش کرتے ہیں۔ والدین کے بعد رشتہداروں کا حق ہے کہ ان سے اچھا سلوک کیا جائے ان کی خدمت اور مالی امداد کی جائے۔

رشتہداروں کے حق کے بعد تینوں کا حق بیان کیا گیا اور ان کو مسکینوں پر ترجیح دی گئی کیونکہ مسکین اپنی ضروریات کے لیے کچھ نہ کچھ دوڑ دھوپ کر سکتا ہے جب کہ تینم اپنی کم عمری کی وجہ سے زیادہ ہمدردی اور تعاون کا محتاج ہے۔

اس کے بعد باقی تمام امت کے لیے لوگوں سے اچھی بات کہنے کا حکم ہوا جو ایک ایسا عمومی حکم ہے جس میں نیکی اور بھلائی کی بات کرنا، سچ بولنا، جھوٹ نہ بولنا، بالاخلاق گفتگو کرنا، بات کرتے وقت شریفانہ لہجہ اختیار کرنا، سیدھے منہ سے بات کرنا جس میں تکبر اور غرور نہ ہو، امر بالمعروف اور نہیں عن الممنکر کرنا یعنی نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا، سب شامل ہیں۔

اس کے بعد نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جو دین کے بنیادی اركان ہیں اور شریعت کے تمام احکام کے لیے نمائندہ عبادات ہیں۔ جوان و حکموں کی پابندی کرے گا، وہ باقی دین کے احکام کی پابندی بھی کر لے گا۔ پھر اس میں نکتہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے یہ دونوں حقوق ادا کرے گا، اسی سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے حقوق بھی ادا کرے گا۔ اسی طرح جوان دو حقوق اللہ میں کوتاہی کرے گا، وہ حقوق العباد میں بدرجہ اولیٰ کوتاہی کا مرحلہ ہو گا۔

لیکن بنی اسرائیل کی اکثریت نے اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے اس عہد کی بھی پابندی نہیں کی اور وہ عہد شکن مشہور ہو گئے۔ یہی روایہ انہوں نے نبی ﷺ کے ساتھ اختیار کیا اور آخر پر انعام کو پہنچ۔

﴿وَإِذَا أَخْذَنَا مِنْتَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دَمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ أَنفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ أَقْرَأْتُمُ وَأَنْتُمْ تُشَهِّدُونَ﴾ (84)

اس آیت میں بھی مدینے کے یہود کو مخاطب کر کے ان کے باپ دادا کا ایک عہد، جس کا ذکر توریت میں بھی ہے، یاد دلایا گیا ہے، کیونکہ یہ لوگ اپنے آباء و اجداد کی روایات پر فخر کا اظہار کرتے تھے اور ان کے کاموں کو اپنے کارنا مے شمار کرتے تھے۔

فرمایا، اللہ تعالیٰ نے تم سے یہ عہد لیا تھا کہ تم ایک دوسرے کا خون نہیں بھاؤ گے اور ظلم و زبردستی سے ایک دوسرے کو ان کے گھروں سے نہیں نکالو گے۔ اس عہد کو پورا کرنے کا تم نے خود اقرار بھی کیا تھا۔ اس کے تم گواہ بھی ہو اور اس کو توریت میں پڑھتے بھی رہتے ہو۔ اس لیے تم پر اس عہد کی پابندی لازم تھی۔

﴿ثُمَّ أَنْتُمْ هَوَلَاءُ تَقْتَلُونَ أَنفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظْهَرُونَ عَلَيْهِمْ بِالْأَشْمَدِ وَالْعُدُوَانِ ۖ وَإِنْ يَأْتُوكُمْ أُسْرَى شُفُّدُوهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ﴾

أَفَتُؤْمِنُونَ بِيَعْصِيِ الْكِتَابِ وَتَلْفُرُونَ بِيَعْصِيٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خَرْزٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَاۚ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرْدُونَ إِلَى أَشَدِ الْعَذَابِۖ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٨٥﴾

اسری: یہ جمع ہے اسی سیر کی جس کے معنی ”قیدی“ کے ہیں۔ اس کی ایک اور جمع اسری بھی آتی ہے جیسا کہ سورہ الانفال 8:67 میں دو دفعہ آتی ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جسے قتیل کی جمع قتلی آتی ہے۔

لیکن بنی اسرائیل نے اپنے دور زوال میں حبِ عادت توریت کے اس عہد کو بھی توڑا۔ ان کے مختلف فرقے ایک دوسرے کو قتل بھی کر دیتے تھے اور گھروں سے جلاوطن بھی کر دیتے تھے۔ یہی حال مدینے کے تین یہودی قبائل کا تھا، جہاں مشرکین کے دوقبیلوں اوس اور خرزج کے درمیان پشتی لایاں ہوتی تھیں تو یہ تینوں یہودی قبائل بنو قریظہ، بنو نصریں اور بنو قیتاں میں سے کچھ اوس کے ساتھ اور کچھ خرزج کے ساتھ حیف بن کرجنگوں میں حصہ لیتے۔ اپنے یہودی بھائیوں کو قتل کرتے، اور ان کو گھروں سے بے گھر کرتے تھے۔ پھر جب وہ قیدی بن جاتے تو قومی ہمدردی کے تحت اور توریت کے ایک حکم پر عمل کرتے ہوئے، اپنی دین داری ظاہر کرتے اور فدیہ دے کر ان کو چھڑایتے۔ قرآن نے یہودیوں کی ایسی منافقانہ ذہنیت کو بے نقاب کیا ہے کہ وہ توریت کے ایک حصے کو مانتے، اس پر عمل کرتے اور کہتے کہ قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑانا بڑے ثواب کا کام ہے۔ مگر توریت میں جو یہ حکم دیا گیا کہ ایک دوسرے کو ناحق قتل نہ کرنا اور زبردستی جلاوطن نہ کرنا تو وہ توریت کے اس حصے کی خلاف ورزی کرتے تھے۔

فرمایا، دین کے ساتھ یہ منافقانہ رویہ کہ شریعت کے جس حکم کو اپنی خواہش نفس کے خلاف دیکھا، اسے چھوڑ دیا جائے اور جسے اس کے مطابق دیکھا، اسے اختیار کیا جائے، تو یہ بات اللہ تعالیٰ کو خخت ناپسند ہے۔ وہ ایسے مناقوں کو دنیا میں بھی ذلیل و رسو اکرے گا اور آخرت میں دوزخ کے بڑے سخت عذاب کی طرف دھکیل دے گا۔

یہودیوں کی اس تاریخ کے آئینے میں آج کی مسلمان ریاستوں اور گروہوں کو اپنی صورت دیکھ لئی چاہیے جو دنیا کے حیرمند کی خاطر اپنے کلمہ گو بھائیوں کے قتل عام میں بالواسطہ اور بلاواسطہ شریک ہو جاتے ہیں اور قرآن کے بعض حکموں کو مانتے اور بعض کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ آج ﴿خَرْزٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ (دنیا کی زندگی میں ذلت و رسوانی) کی تصویر بنے بیٹھے ہیں۔

﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ۝ فَلَا يُحَفَّظُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ﴾ (86)

إِشْتَرَوْا: یہ لفظ اس مقام پر جیسا کہ قادہ اللہ کا قول ہے ترجیح دینے کے معنوں میں ہے۔ اکثر مفسرین نے بھی اسی مفہوم کو اختیار کیا ہے۔

فرمایا، کہ اس طرح کے لوگوں کو جو عہد شکنی اور کفر و منافقت کی روش اختیار کر لیں اور اپنے طرزِ عمل سے دنیا کی ادنیٰ

اور عارضی زندگی کو آخرت کی اعلیٰ اور ابدی زندگی پر ترجیح دے ڈالیں تو مرنے کے بعد وہ ایسے عذاب سے دوچار ہوں گے جو دامنی اور مستقل ہو گا۔ اس عذاب میں کسی وقت کوئی کمی یا وقفہ نہ ہو گا۔ ان کو وہاں کہیں سے ایسی مرد بھی نہ مل سکے گی، جس کے ذریعے وہ عذاب سے چھکارا پاسکیں۔



وَ لَقَدْ أَتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَ قَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ وَ أَتَيْنَا
 عِيسَى ابْنَ مَرِيمَ الْبَيِّنَاتِ وَ أَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدْسِ فَأَكْلَمَ
 جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهُوَى أَنفُسُكُمْ اسْتَكْبِرُتُمْ فَفَرِيقًا
 كَذَّبُتُمْ وَ فَرِيقًا تَقْتُلُونَ ۝ وَ قَالُوا قُلْوَبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَعْنُهُمْ
 اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَا يُؤْمِنُونَ ۝ وَ لَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ
 مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَ كَانُوا مِنْ قَبْلٍ يَسْتَفْتِحُونَ
 عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا ۝ فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ فَلَعْنَةُ
 اللَّهِ عَلَى الْكُفَّارِينَ ۝ بِئْسَهَا اشْتَرَوْا بِهِ أَنْ يَكْفُرُوا بِمَا
 أَنْزَلَ اللَّهُ بَعْنَىً أَنْ يُنَزِّلَ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ
 عِبَادِهِ فِياءً وَ بِغَضَبٍ عَلَى غَضَبٍ وَ لِلَّهِ الْكَفِيرُونَ عَذَابٌ مُّهِمِّينَ ۝
 وَ إِذَا قِيلَ لَهُمْ أَمْنُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَا أُنْزِلَ
 عَلَيْنَا وَ يَكْفُرُونَ بِمَا وَرَأَءُوا وَ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۝
 قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنْتُمْ أَيَّاءَ اللَّهِ مِنْ قَبْلٍ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ۝
 وَ لَقَدْ جَاءَكُمْ مُوسَى بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ اتَّخَذُتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهِ

وَ أَنْتُمُ الظَّالِمُونَ ۝ وَ إِذْ أَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فُوقَكُمْ
 الظُّورَ ۝ خُذُوا مَا أَتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَ اسْمَاعُوا ۝ قَالُوا سَمِعْنَا وَ
 عَصَيْنَا ۝ وَ أُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمُ ۝ قُلْ بِئْسَمَا
 يَأْمُرُكُمْ بِهِ إِيمَانُكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ قُلْ إِنْ كَانَتْ
 لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِنْ دُوْتِ النَّاسِ فَتَبَرُّوا
 الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَدِيقِينَ ۝ وَ لَنْ يَتَمَّمُوا إِبَدًا بِمَا قَدَّمْتُمْ
 أَيْدِيهِمُ ۝ وَ اللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۝ وَ لَتَعْجَلْنَاهُمْ أَحْرَصَ
 النَّاسِ عَلَى حَيَاةٍ ۝ وَ مِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا يَوْمَ أَحَدُهُمْ لَوْيَعْمَرَ
 أَلْفَ سَنَةً ۝ وَ مَا هُوَ بِمُزْحِزِهِ مِنَ الْعَذَابِ أَنْ يُعَمَّرَ ۝ وَ اللَّهُ

بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ۝

ب

"اور بے شک ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی۔ اس کے بعد ہم نے پے در پے رسول بھیجے۔ اور علیٰ ابن مریم کو
 کھلے مجھے دیے۔ اور روح پاک جبریل کے ذریعے ان کی مدد فرمائی۔ لیکن جب بھی کوئی پیغمبر ایسا حکم لے
 کر آیا جو تمہاری خواہش نفس کے خلاف ہوتا، تم اسے ٹھکرا دیتے۔ پھر تم بعض رسولوں کو جھلاتے اور بعض کو قتل کر
 ڈالتے تھے۔"

اور وہ (یہود) کہتے ہیں: "ہمارے دل محفوظ ہیں۔" حالاں کہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کر
 دی۔ اس لیے وہ بہت کم ایمان لاتے ہیں۔

اور جب ان لوگوں کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب آگئی جو اس کتاب کو سچا کرنے والی ہے، جو ان کے ہاں
 پہلے سے موجود تھی، اور جب کہ وہ اس نئی کتاب کے نازل ہونے سے پہلے تک دعا میں ماٹا کرتے تھے کہ
 (آخری نبی کی بعثت کے ذریعے سے) انہیں کافروں کے مقابلے میں فتح نصیب ہو۔ مگر جب وہ چیز سامنے آگئی
 جس کا انہیں انتظار تھا تو اسے اچھی طرح پہچان لینے کے بعد ماننے سے انکار کر دیا۔ ایسے کافروں پر اللہ کی لعنت

ہے۔ ان لوگوں نے ایک بڑی چیز حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو نجع ڈالا۔ اور یہ تو اس چیز کا انکار کر رہے ہیں، جسے اللہ نے نازل کیا ہے اور ان کا یہ انکار محسن اس خدکی وجہ سے ہے کہ، کیوں اللہ نے اپنے بندوں میں سے ایک خاص بندے پر اپنا فضل کیا۔ ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہی غضب ہے۔ اور ان کا فروں کو ذلیل کرنے والا عذاب دیا جائے گا۔

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ”اللہ نے جو کتاب نازل کی ہے، اس پر ایمان لاو۔“ اور وہ اس کتاب کو نہیں مانتے۔ حالاں کہ یہ کتاب برق ہے اور ان کی اپنی کتاب کی پیش گوئی کو سچ کر دکھانے والی ہے۔ (اے نبی ﷺ!) آپ ﷺ ان سے پوچھیں ”اگر تم واقعی ایمان والے ہو تو اس سے پہلے اللہ کے پیغمبروں کو کیوں قتل کرتے رہے؟“ اور موسیٰ تو تمہارے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے تھے، مگر تم نے ان کے پیچھے پیچھے پیچھے کو معبدوں بنا لیا۔ اور تم ہو ہی ظالم! اور یاد کرو جب ہم نے تم سے عہد لیا تھا اور اس وقت طور پر ہاؤز کو تمہارے اوپر کھڑا کر دیا۔ (عہد یہ تھا) کہ جو کتاب ہم تمہیں دے رہے ہیں، اسے مضبوطی سے پکڑو، غور سے سنو اور اس پر عمل کرو۔ تمہارا جواب یہ تھا کہ ہم نے سن لیا مگر مانیں گے نہیں۔ اصل میں ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں میں پیچھے کی محبت و عقیدت پیدا کر دی گئی۔ (اے نبی ﷺ) آپ ان لوگوں سے کہیں ”اگر تم واقعی ایمان والے ہو تو یہ کیسا ایمان ہے جو تمہیں برائی سکھاتا ہے۔“

(اے نبی ﷺ!) آپ ان سے کہیں ”اگر اللہ کے ہاں آخرت کے گھر کی ساری نعمتیں صرف تمہارے ہی لیے ہیں تو تمہیں ان کو حاصل کرنے کے لیے موت کی تہذیباً کرنی چاہیے، اگر تم پچھے ہو۔ مگر یہ لوگ اپنے برے کرتو تو ان کی وجہ سے بھی موت کی آرزو نہ کریں گے۔ اللہ ایسے ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ (اے نبی ﷺ) یہ یہودی تو مشرکوں سے بھی بڑھ کر دنیا پرست ہیں۔ ان میں ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ وہ ہزار برس چھینے۔ حالاں کہ اتنی طویل مدت جینا بھی اسے عذاب سے نہیں بچا سکتا۔ اور اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں۔“ (96-87)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

قَفِّيْنَا:..... اس کا مادہ (ROOT) ق ف د ہے۔ (و) بدل گیا ہے (ی) سے۔ اس کے معنی ہیں، کسی کے پیچھے آنا اور (ب) سے تعدد یہ ہو کہ اس کے معنی ”کسی کے پیچھے لانے“ کے ہو جائیں گے۔ اس جگہ مطلب یہ ہے کہ ہم نے موسیٰ ﷺ کے بعد لگا تاریخ سے رسول بھیجے۔ جیسا کہ سورہ المؤمنون میں ہے کہ:

(المومنون 23:44)

﴿ثُمَّ أَرْسَلْنَا رُسُلًا نَّتَرْتَبِي﴾

”پھر ہم نے لگاتار اپنے رسول بھیجے۔“

عِيسَى ابْنَ مُرْيَمَ:..... عربی زبان کا عیسیٰ، عبرانی میں یشوع اور سریانی میں یسوع تھا اور انگلش میں JESUS

ہے۔ قرآن مجید نے اکثر مقامات پر عیسیٰ (عَلَيْهِ الْكَلَمُ) کے ذکر کے ساتھ ان کی کیت اہن مریم کا اضافہ کیا ہے، تاکہ ان کے اہن اللہ (اللّٰہ کا جیتا) ہونے کے غلط نظریے کی تردید ہو جائے۔

الْبَشِّيرَةُ:..... اس کے معنی "کھلی نشانیاں" ، " واضح دلائل" ، "احکام" اور " مجرمات" کے آتے ہیں۔ اس مقام پر اس سے مراد وہ مجرمات ہیں جو عیسیٰ (عَلَيْهِ الْكَلَمُ) کو دیے گئے جیسے مردوں کو زندہ کرنا وغیرہ۔

أَيَّدِنُهُ:..... اس کے معنی قویّیناہ کے ہیں کہ ہم نے اس کو قوت دی، طاقت بخشی۔

رُوحُ الْقُدْسِ:..... اس کے معنی پاک روح (THE HOLY GHOST) کے ہیں اور اس سے مراد جریل علیہم السلام ہیں۔ قرآن نے ان کو الرُّوحُ الْأَمِينُ (امانت دار روح) بھی کہا ہے۔

﴿وَإِنَّهُ لَتَنْزِيلٌ رَّبِّ الْعَالَمِينَ ۝ نَزَّلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ۝﴾ (الشعراء: 4: 192 تا 194)

"اور (اے نبی ﷺ !) بے شک یہ رب العالمین کا نازل کیا ہوا کلام ہے۔ اسے جریل امین علیہم السلام لے کر اُترے ہیں۔ یہ قرآن آپ ﷺ کے دل پر نازل ہوا تاکہ آپ ﷺ خبردار کرنے والے بنیں۔"

إِشْتَرِأْءُ:..... اس جگہ اس کے معنی شرُّوا یا بَاعُوا کے ہیں کہ انہوں نے بچا۔

إِشْتِرَاءُ کے معنی خریدنے کے بھی ہیں اور بیچنے کے بھی۔ یہ اضداد میں سے ہے۔ ہر سو دے میں ایک فریق جو چیز خرید رہا ہوتا ہے، وہی چیز دوسرا فریق بیچ رہا ہوتا ہے۔ اس لیے اس معاملے اور لین دین کو إِشْتِرَاءُ (خریدنا، بیچنا) کہا جاتا ہے کہ یہ خریدنا بھی ہے اور بیچنا بھی۔

بَغْيًا:..... یہ بَغْيَ سے ہے جس کے اصل معنی فَسَدٌ یعنی بگزنا کے ہیں۔ فَسَدٌ الْجُرْحُ کے معنی ہیں رُخْم بگڑگی، رُخْم خراب ہو گیا۔ پھر اس لفظ کا استعمال ایسی چیز کے لیے ہونے لگا جو اپنی حد سے نکل جائے۔ بغاوت بھی اسی سے ہے جو قانون کے دائرے سے باہر نکلنے کی حالت ہے۔ اس جگہ اس سے مراد حسد ہے۔

وَرَاءَ:..... اس کے معنی "بیچھے" اور "آگے" دونوں کے آتے ہیں۔ اس لیے اسے اضداد میں بھی شمار کیا گیا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ اضداد میں سے نہیں ہے بلکہ ہر وہ چیز جو نظر وہ سے اوچھل اور باہر ہٹ کر ہو، اس کے لیے یہ لفظ آتا ہے، خواہ وہ چیز آگے ہو یا بیچھے ہو، یا کہیں بھی ہو۔ الگاش میں (BEYOND) کا لفظ قریب قریب اس کا ہم معنی ہے۔

اس جگہ یہ "سو" یا "سوائے" کے معنوں میں آیا ہے۔ یہود کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ اپنی کتاب توریت کے سوا کسی اور کتاب کو الہامی نہیں مانتے۔

الْعَجْلُ:..... اس سے پہلے حُبٰ (محبت) کا لفظ محفوظ ہے۔ مراد یہ ہے کہ جس پھرے کو بنی اسرائیل نے اپنا معبد بنایا کہ پوچھا تھا اس کی محبت ان کے دلوں میں رج جس گئی تھی۔

الْدَّارُ الْأُخْرَةُ:..... اس سے آخرت کی زندگی کا ثواب اور وہاں کی نعمتیں مراد ہیں۔

خَالِصَةُ:..... اس کے معنی ہیں: مخصوص

تَهْمَنُوا الْمَوْتَ:..... اس کا مطلب ہے کہ اپنے دلوں میں موت کی آرزو اور اس کا شوق پیدا کرو۔ دنیا پر تی چھوڑ کر آخرت کی فکر کرو۔ یہود ایک طرف جنت کو اپنے لیے مخصوص سمجھتے اور دوسری طرف موت سے بھاگتے اور دنیا میں طویل عمر پانے کے لیے ترتیب تھے۔ سورہ الجمعد میں ہے:

﴿قُلْ إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِي تَفِرُّونَ مِنْهُ فَإِنَّهُ مُلَاقِكُمْ ثُمَّ تُرْدُونَ إِلَى عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيَبْيَسُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ (الجمعد: 8:62)

"(اے نبی ﷺ) آپ کہہ دیجئے "جس موت سے تم بھاگتے ہو۔ وہ تمہیں آکر رہے گی۔ پھر تم اللہ کے سامنے پیش کیے جاؤ گے، جو ہر چیزیں اور ظاہر چیز کو جانتا ہے۔" پھر وہ تمہیں بتائے گا جو کچھ تم کرتے رہے۔"
بِهُزَّ حِزْجَهٖ:..... یہ زحżح سے اسم فاعل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ طویل عمر کا جینا بھی ان کو عذاب سے نجات نہیں دلا سکے گا۔ (8:62)

﴿وَلَقَدْ أَتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ وَأَتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرِيَمَ الْبَيْتَنَتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدْسِ مِنْ أَنْكَلِيَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا يَنْهَايِي أَنْفُسُكُمْ اسْتَكْبَرُتُمْ فَقَرِيْقًا كَذَبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتَلُونَ﴾ (87)

مدینے کے یہود کو مخاطب کر کے فرمایا گیا کہ دیکھو، آج محمد ﷺ پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک کتاب (قرآن) نازل ہوئی ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی ایک کتاب (توریت) نازل ہوئی تھی۔ تم اللہ تعالیٰ کے ایک نبی (موسیٰ علیہ السلام) پر کتاب نازل ہونے کو نہ صرف مانتے ہو بلکہ اس پر خیر و غرور بھی کرتے ہو، مگر اس کے ایک اور نبی (حضرت محمد ﷺ) پر کتاب (قرآن) نازل ہونے کو کیوں نہیں مانتے اور اس کی کیوں تکذیب و مخالفت کرتے ہو۔
پھر فرمایا کہ انسانوں کی غفلت اور کوتاہی کا حال یہ ہے کہ وہ کچھ عرصہ بعد دین و شریعت کو نہ صرف بھلا میختھے ہیں بلکہ اپنی خواہشات نفس سے اس میں رو بدل اور ترمیم و تنسیخ بھی کر دالتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں وہ گمراہ ہوتے اور ان کے دل سخت ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اپنے دین کی حفاظت اور بندوں کی پداشت و رہنمائی کے لیے ایک نبی کے بعد کوئی دوسرا نبی بھیجا رہا ہے اور ہر نبی بعثت میں زیادہ طویل وقف نہیں کرتا رہا۔ یہی بات قرآن مجید میں دوسرے مقام پر اس طرح بیان ہوئی ہے۔

﴿اللَّهُ يَأْنِي لِلَّذِينَ أَمْنُوا أَنْ تَغْشَى قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَّلَ مِنَ الْحَقِّ لَا يَكُونُونَ كَالَّذِينَ أَوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِ فَطَالَ عَلَيْهِمْ الْأَمْدُ فَقَسَّتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَسِقُوْنَ﴾ (الحدید: 16:57)

"کیا ایمان والوں کے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی نصیحت کے آگے جھک جائیں اور اس حق

کے آگے جوانازل ہو چکا ہے؟ اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو اس سے پہلے کتاب دی گئی۔ پھر ان پر لمبی مدت گزر گئی، تو ان کے دل سخت ہو گئے۔ ان میں سے اکثر نافرمان ہیں۔“

نبی اسرائیل میں پے در پے نبی بھیجے گئے، مگر انہوں نے اپنی خواہش پرستی اور تکبر و غرور سے ان کو نہ صرف جھٹلایا بلکہ ان میں سے بعض کو قتل بھی کر دیا، جیسے زکریا علیہ السلام اور یحییٰ علیہ السلام۔ پھر آخر میں ان کی طرف عیسیٰ علیہ السلام کو ایسے کھلے مجھزے دے کر بھیجا گیا، جن کی صداقت سے کوئی معقول آدمی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ مگر یہود نے نہ صرف سُبح علیہ السلام کی نبوت اور ان کے مجازات کا انکار کیا بلکہ اپنے خیال کے مطابق ان کو سولی پر بھی چڑھا دیا۔

قرآن نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کئی مقامات پر فرمایا ہے کہ ان کو روح القدس جبریل علیہ السلام کی تائید حاصل تھی۔ جیسے اسی سورہ البقرہ میں ہے:

﴿وَأَتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرِيمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدْسِ﴾ (البقرہ 2:253)

”اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کو کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس جبریل علیہ السلام کے ذریعے ان کی مدد فرمائی۔“

اسی طرح سورہ المائدہ (5:110) میں بھی یہی مضمون موجود ہے۔

جب کہ واقعہ یہ ہے کہ ہر نبی کو جبریل علیہ السلام کی تائید حاصل ہوتی ہے، لیکن خصوصیت کے ساتھ سُبح علیہ السلام کے حوالے سے اس تائید کا ذکر کریم یہودیوں کے اس غلط اڑام اور جھوٹے دعوے کی تردید کے لیے آیا ہے جو یہ کہتے تھے کہ عیسیٰ علیہ السلام جو مجھزے دکھاتے ہیں تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یا جبریل علیہ السلام کی تائید سے نہیں دکھاتے بلکہ جن بھتوں اور بدرتوں کے سردار بعلبر بول کی مدد سے دکھاتے ہیں۔ (ملاحظہ ہومتی باب 12)

اس مقام پر نبی ﷺ کے لیے تسلی اور اطمینان کا پہلو بھی ہے کہ آج اگر مدینے کے یہود آپ ﷺ کی نبوت پر ایمان نہیں لارہے تو اس میں کوئی تعجب اور حیرانی کی بات نہیں۔ یہ قوم ایسی ہے جو ہمیشہ سے اپنے انبیاء کرام کو جھٹلاتی رہی ہے اور ان کی جان کی دشمن رہی ہے۔ اس کے ہاتھوں بہت سے نبی اور رسول شہید ہو چکے ہیں۔

بعض لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ کوئی رسول کبھی قتل نہیں ہوا۔ مگر ان لوگوں کا یہ دعویٰ قرآن مجید کے نصوص اور واضح احکام کے خلاف ہے۔ کیونکہ جس طرح بہت سے انبیاء کرام کو بدجنت لوگوں نے شہید کیا۔ اسی طرح بعض رسولوں کو بھی شہید کیا گیا۔ مثال کے طور پر:

1۔ سورہ آل عمران میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ دوسرا رسولوں کی طرح حضرت محمد ﷺ کے لیے بھی وفات پانے یا قتل ہو جانے کی دونوں صورتوں کا امکان موجود ہے۔ گویا آپ ﷺ کو طبعی موت بھی آسکتی ہے اور آپ ﷺ مقتول بھی ہو سکتے ہیں۔

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُۖ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ

عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْۚ وَمَنْ يَنْقِلِبْ عَلَىٰ عَيْقَبَيْهِ فَلَنْ يَضْرِرَ اللَّهُ شَيْئًا۝ (آل عمران: 3) (144)

”اور محمد توہس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے اور بھی رسول گزر چکے ہیں۔ پس اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل ہو جائیں تو کیا تم ائمہ پاؤں واپس چلے جاؤ گے اور جو کوئی بھی ائمہ پاؤں واپس چلا جائے گا، وہ اللہ کا کچھ بھی نقصان نہ کرے گا۔“

2۔ اسی طرح مزید ارشاد ہوا کہ:

﴿الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ عَهْدُهُ إِلَيْنَا أَلَا نُؤْمِنَ لِرَسُولِهِ حَتَّىٰ يَأْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَأْكُلُهُ النَّارُۚ قُلْ قَدْ جَاءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيٍّ بِالْبَيِّنَاتِ وَبِالَّذِي قُلْتُمُ فِيمَا قَتَلْتُمُوهُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَدِيقِينَ﴾ (آل عمران: 50) (183)

”یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں حکم دیا تھا کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جب تک وہ ہمارے سامنے ایسی قربانی پیش نہ کرے جسے آگ کھا جائے۔ آپ ﷺ کہہ دیجئے کہ مجھ سے پہلے تمہارے پاس کسی رسول آئے، نشانیاں لے کر اور اس چیز کے ساتھ جسے تم کہہ رہے ہو۔ پھر تم نے ان کو قتل کیوں کیا؟ اگر تم پچھے ہو؟“

اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل کے ہاتھوں کئی رسول قتل ہوئے تھے۔

3۔ سورہ مائدہ میں ارشاد ہوا کہ:

﴿لَقَدْ أَخْدُنَا مِيشَاقَ بَنِيٍّ إِسْرَآءِيلَ وَأَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ رُسُلًا كُلَّهَا جَاءَهُمْ رُسُولٌ مُّبَشِّرًا لَا تَهُوَىٰ أَنفُسُهُمْ لَا فَرِيقًا كَذَّبُوا وَفَرِيقًا يَقْتَلُونَ﴾ (المائدہ: 50) (70)

”بے شک ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان کے پاس کئی رسول بھیجے۔ جب کبھی کوئی رسول ان کے پاس وہ چیز لایا جو ان کو پسند نہ آئی تو بعض کو وہ جھلاتے اور بعض کو قتل کر دلتے تھے۔“

اس آیت سے بھی صریح طور پر معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے کئی رسولوں کو قتل کیا تھا۔

اس مقام پر بنی اسرائیل کے بارے میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ عہد کر رکھا تھا کہ وہ کسی ایسے رسول پر ایمان نہ لائیں جو ان کے سامنے نیاز یا قربانی کو آسانی آگ سے نہ جلا دکھائے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس دعوے کا یہ جواب دیا ہے کہ اے بنی ﷺ! آپ ﷺ ان سے کہہ دیں کہ اگر یہی بات ہے تو جو رسول اور پیغمبر ان کے پاس دلائل اور مذکورہ مجرہ بھی لاتے رہے، ان کی انہوں نے مکنیزب کیوں کی تھی اور ان میں سے بعض کو قتل کیوں کیا تھا؟

قرآن مجید کے یہ واضح نصوص ہیں، جن سے صریح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبیوں کی طرح رسول بھی بعض اوقات اپنے قوم کے ہاتھوں قتل ہوئے ہیں۔ بالخصوص بنی اسرائیل کے بارے میں ارشاد ہوا کہ انہوں نے بہت

سے رسولوں کو نہ صرف جھٹلایا تھا بلکہ ان کو قتل کر بھی ڈالا تھا۔

نہ کورہ دلائل و برائین کے بعد یہ دعویٰ کرنے کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ قانون الہی یہی رہا ہے کہ کبھی کوئی رسول کسی قوم کے ہاتھوں قتل نہیں ہوا؟

اصل میں زمانہ حال کے بعض لوگوں کو جن آیات کی بنابر غلط فہمی لاحق ہوئی کہ کوئی رسول کبھی قتل نہیں ہو سکتا وہ درج

ذیل آیات ہیں:

۱. ﴿كَتَبَ اللَّهُ لَا يُغْلِبَنَّ أَنَا وَرَسُولِي إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ﴾ (المجادلة: 58)

”اللَّهُ لَنْ يَكْحُلْدِي إِلَيْهِ كَمْ مِنْ اُمَّةٍ أَمْرَى رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِ فَلَمَّا هُوَ أَنْتَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ هُوَ الْأَعْلَمُ“

۲. ﴿وَلَقَدْ سَبَقْتُكَ لِمَتَنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ ۝ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ﴾ (الصفات: 37)

(172, 171:37)

”اور ہم اپنے بھیجے ہوئے بندوں (رسولوں) سے پہلے ہی وعدہ کر چکے ہیں کہ بے شک انہیں ہماری مدد حاصل ہوگی، اور ہمارا شکر ہی غالب رہے گا۔“

لیکن ان آیات کی تشریع میں مفسرین حضرات نے اپنی اپنی تقاضیں مثلًا الکشاف، قرطبی، ابن کثیر، روح المعانی اور فتح القدير وغیرہ میں واضح طور پر لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دلیل و جدت کے موقع پر رسول ہمیشہ غالب رہتا ہے اور میدان جنگ میں مقابلے کے وقت بھی غالب رہتا ہے، مغلوب نہیں ہوتا۔ ان آیات سے یہ معنی نکالنا درست نہیں کہ وہ عام حالات میں بھی قتل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایسا دعویٰ خود قرآن مجید کے دوسرے واضح ادکام اور نصوص کے خلاف ہے، جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

﴿وَقَالُوا قُلُوبُنَا مُغْلُظٌ بَلْ لَعَنْهُمُ اللَّهُ يُكْفِرُهُمْ فَقَلِيلًا مَا يُؤْمِنُونَ﴾ (88)

اس سے پہلی آیت میں خطاب حاضر کے انداز میں تھا جواب غائب کے طریقے پر ہو گیا ہے۔ اس میں یہود کی تحقیق کا پہلو ہے کہ وہ ایسے گئے گزرے تھے جو خطاب کے قابل نہیں۔

غُلُظٌ غلاف کی جمع ہے۔ یہود کا یہ کہنا کہ ”ہمارے دل غلافوں میں بند اور محفوظ ہیں۔“ ان کے غزوہ و تکبیر کو ظاہر کرتا ہے۔ جس کا مطلب وہ یہ لیتے تھے کہ وہ اپنے خاندانی اور نسلی دین میں پکے، ثابت قدم اور اس پر سختی سے کار بند ہیں۔ باہر کی کوئی بات ان کے دلوں میں داخل نہیں ہو سکتی جو ان کے عقیدوں کو بدل سکے۔ اس لیے قرآن اور نبی ﷺ کی دعوت کا ان پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ اس بات میں ان کا گھمنڈ بھی شامل تھا کہ صرف ان کا دین ہی سچا دین ہے اور باقی ساری دنیا گمراہ ہے۔ قرآن نے ان کے اور عیسیائیوں کے اسی دعوے کے بارے میں فرمایا۔

﴿وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَى تَهَتَّدُوا طَرِيقًا﴾ (البقرہ: 2)

”اور وہ کہتے ہیں ہدایت چاہیے تو یہودی یا عیسائی ہو جاؤ۔“

لیکن اصل میں یہود کی اپنی انہی تقلید کے جمود کا یہ اثر تھا کہ وہ ایک ایسی دینداری پر فخر کا اظہار کرتے تھے جو سچے ایمان اور عمل صالح سے خالی تھی۔ جو دوسروں کی بات سننا بھی گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان لوگوں پر ان کے کفر کی لعنت اور پھٹکار پڑی ہوئی ہے اور وہ اس قسم کا دعویٰ کرتے ہیں جب کہ اسلام قبول کرنے سے انکاری ہیں۔ یہکی وجہ ہے کہ یہودیوں میں سے بہت کم لوگ ایمان لائے۔

﴿وَ لَيَّا جَاءَهُمْ كَيْتَبٌ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ وَ كَانُوا مِنْ قَبْلٍ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا إِنَّ فَلَيَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ (89)

اس جگہ کتاب سے مراد قرآن مجید ہے، جو ان پیش گوئیوں کو چاہابت کرتا ہے جو یہودیوں کے ہاں توریت اور دوسرے صحیفوں میں نبی ﷺ اور قرآن کے بارے میں تھیں، اور جو حضور ﷺ کی بعثت اور قرآن مجید کے نزول کے بعد پوری ہو گئیں۔ (لفظ مصدق کی تشریح اس سے پہلے آیت 40 میں گزر چکی ہے۔)

یہود ان پیش گوئیوں کے پورا ہونے کے منتظر تھے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ آنے والے نبی کی بعثت سے ان کا زوال اور عروج میں بدل جائے گا اور وہ اپنے دشمنوں پر فتح پا لیں گے۔ اس کے لیے وہ اللہ تعالیٰ سے فتح کی دعائیں بھی مانگ رکتے تھے۔

مگر جب ان کی آنکھوں کے سامنے وہ ساری پیش گوئیاں پوری ہو چکیں جو قرآن اور نبی ﷺ سے متعلق تھیں تو یہود نے جان بوجہ کر حضن حسد اور خاندانی تعصب سے حضور ﷺ اور قرآن مجید کا انکار کر دیا۔ اس طرح انہوں نے اپنے لیے بدایت ونجات کا آخری، قیمتی اور شہری موقع اپنے ہاتھ سے گنوادیا۔

﴿إِنَّهُمْ أَشْتَرُوا بِهِ أَنفُسَهُمْ أَنْ يَكْفُرُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ بَعْدِيًّا أَنْ يُنَزِّلَ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ قَبَاءً وَ بِغَصَبٍ عَلَى غَصَبٍ وَ لِلَّهِ الْكَفِيرُونَ عَذَابٌ مُّهِمُّٰنَ﴾ (90)

فرمایا کہ یہود نے اپنے لیے ایمان اور نجات کی راہ اپنانے کی بجائے حسد اور تعصب کا روایہ اختیار کیا۔ ان کو یہ ذکر تھا کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو چھوڑ کر عربوں کے بنی اسماعیل سے اپنا آخری رسول مبعوث فرمایا۔ حالاں کہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے کہ وہ جس قوم اور خاندان سے چاہے کوئی رسول بھیجے۔ یہود نے حسد اور تکبر سے حضرت محمد ﷺ کی نبوت و رسالت کا انکار کر کے کفر کا ارتکاب کیا، جس کے نتیجے میں وہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے مغضوب ٹھہرے اور آخرت میں جہنم کے ذلیل کرنے والے عذاب سے دوچار ہوں گے۔

﴿وَ إِذَا قِيلَ لَهُمْ أَمْنُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ يَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ وَ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ قُلْ فَلَمْ تَقْتُلُونَ أَنْبِياءَ اللَّهِ مِنْ قَبْلٍ

إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ﴿٩١﴾

جب یہود کو ایمان لانے کی دعوت دی جاتی تو وہ کہتے "ہم بھی ایمان والے ہیں۔ (البقرہ: 82)۔ صرف اپنی مذہبی کتاب توریت کو مانتے ہیں۔ اس کے سوا کسی اور کتاب کو نہ الہامی مانتے ہیں اور نہ اس پر ایمان لانا ضروری سمجھتے ہیں۔" اس طرح وہ قرآن کا انکار کر کے کافروں جو باتے تھے۔

فرمایا، اگر یہود کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ توریت کے مانے والے ہیں تو اپنے ان نبیوں کو کیوں قتل کرتے رہے ہیں جو توریت پر عمل کرنے کی تاکید کرتے تھے، جیسے زکر یا علیہم السلام اور بھی علیہم السلام۔ یاد رہے اس جگہ تَقْتَلُونَ کے معنی قَتَلْتُمْ (تم نے قتل کیا) کے ہیں۔

﴿وَلَقَدْ جَاءَكُمْ مُّوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ أَخْذَنَاهُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَنْتُمْ ظَلِيلُونَ﴾ ﴿٩٢﴾

اس سے پہلی آیت میں یہود کی جھوٹی دینداری کا ذکر کیا گیا۔ اب ان کی خدا پرستی کا پول کھولا گیا ہے کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں کھلے مجرمات دیکھنے کے باوجود اپنے رب کی عبادت کرنے کی بجائے پچھڑے کی پوچھا کر کے شرک کا ارتکاب کیا تھا۔ گویا ان یہودیوں کا حال یہ ہے کہ نہ تو اللہ تعالیٰ کی کسی کتاب پر ان کا بھی سچا ایمان تھا اور نہ انہیاں کے کرام پر۔ یہ اپنی دینداری اور ایمان کے دعوے میں بالکل جھوٹے ہیں۔

﴿وَإِذَا أَخْذَنَا مِنْتَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الظُّورَ خُدُوا مَا أَتَيْنَاهُمْ بِقُوَّةٍ وَأَسْعَوْا مَا قَاتَلُوا سَمِعَنَا وَعَصَيْنَا وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ يُكْفِرُهُمْ قُلْ يَسْأَلُوا يَا مَرْكُمْ يَهُ إِيمَانُكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ﴾ ﴿٩٣﴾

اس آیت کے ابتدائی حصے کا مضمون اس سے پہلے آیت 63 میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔

اس جگہ سمعنا و عصینا (ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی۔) میں عصینا (ہم نے نافرمانی کی) کا لفظ یہود نے اپنی زبان سے ادا نہیں کیا تھا، بلکہ بعد میں ان کا طرز عمل ایسا تھا جو زبان حال سے گویا عصینا "ہم نے نافرمانی کی" کہہ رہا تھا۔ دوسری زبانوں کی طرح عربی زبان میں بھی یہ اسلوب موجود ہے جس میں کسی حالت یا کیفیت کو زبان کی بات یا گفتگو سے تعمیر کیا جاتا ہے۔

دَقَّاتُ قَلْبِ الْمَرْءِ قَائِلَةُ لَهُ

إِنَّ الْحَيَاةَ دَقَّاتٌ وَثُوَانٌ

"ان کے دل کی دھڑکنیں کہتی ہیں کہ زندگی منتوں اور سیکنڈوں کا نام ہے۔"

اسی طرز اردو کا ایک شاعر کہتا ہے:

ابھی اس راہ سے گزرا ہے کوئی
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی
پھر فرمایا کہ یہود کے کفر و شرک کے نتیجے میں ان کے دلوں میں پھٹرے کی محبت اس طرح رچ لس گئی جیسے پانی کسی
جلدہ جذب ہو جاتا ہے۔

آخر میں مدینے کے یہود سے فرمایا گیا کہ تمہارا یہ کیسا ایمان ہے اور کیسی دینداری ہے کہ تمہارے اسلاف اپنے
نبیوں کو قتل کرتے رہے۔ انہوں نے توریت کے احکام کی خلاف درزی کی۔ وہ ایک اللہ کی عبادت کرنے کی بجائے
پھٹرے کو معبد بننا کر اس کی پوجا کرتے رہے۔ تم آج بھی ان کے ان غلط کاموں پر فخر و مبارکات کا اظہار کرتے ہو اور
انہی کی روشن اختیار کیے ہوئے ہو۔

**﴿فُلِّ إِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ حَالِصَةً مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَبَرُّوا
الْمَوْتَ إِنْ كَيْنُتُمْ صَدِيقِينَ﴾ (94)**

یہود کا دعویٰ تھا کہ آخرت کے گھر جنت کی ساری نعمتیں صرف ان کے لیے مخصوص ہیں۔ صرف وہی جنت میں
جا سکیں گے، باقی ساری دنیا ہبھم میں جائے گی۔ قرآن نے ان کے اس دعوے کو جھوٹا قرار دیا اور پیغام کیا کہ اگر وہ واقعی
جنتی ہیں تو پھر ان کو دنیا کی زندگی سے زیادہ آخرت کی زندگی سے بیمار ہونا چاہیے۔ ان کے دلوں میں موت کی آرزو اور
شوک ہونا چاہیے تاکہ وہ جلد از جلد جنت میں پہنچ کر وائیں کی زندگی بس کریں۔

جس شخص کو یہ یقین ہو کہ مرنے کے بعد اسے جنت ملے گی تو قدرتی طور پر وہ موت سے نہیں ڈرے گا بلکہ اس کی
آرزو کرے گا۔ بعض سلف صالحین سے ثابت ہے کہ وہ جنت کی طلب اور اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے شوق میں موت کی
تمنا کیا کرتے تھے۔ ایسا کرنا شریعت کے ہرگز خلاف نہیں ہے۔ البتہ کسی بیماری یا پریشانی سے نگل آ کر موت کی تمنا کرنا
شریعت کے خلاف اور ناجائز ہے۔ جیسا کہ ایک متفق علیہ حدیث ہے:

((عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: لَا يَتَمَنَّنَ أَحَدُكُمُ الْمَوْتَ مِنْ ضُرِّ أَصَابَهُ،
فَإِنْ كَانَ لَا بُدَّ فَأَعِلْمُ لَهُمْ أَحْبَنِي مَا كَانَتِ الْحَيَاةُ خَيْرًا لِيْ، وَتَوَفَّنِي إِذَا كَانَتِ
الْوَفَّةُ خَيْرًا لِيْ)) (صحیح بخاری، رقم: 5671۔ صحیح مسلم، رقم: 6814۔ ترمذی،
رقم: 970۔ ابو داؤد، رقم: 3108۔ نسائی، رقم: 1821)

”سیدنا انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص کسی تکلیف کی وجہ سے
موت کی تمنا نہ کرے۔ اگر ایسا ناگزیر ہو جائے تو پھر یہ دعا کرنی چاہیے: اے اللہ! مجھے اس وقت تک
زندہ رکھ جب تک میرا زندہ رہنا میرے لیے بہتر ہے، اور مجھے دنیا سے اٹھا لے اگر وفات میرے لیے
بہتر ہے۔“

﴿وَلَنْ يَتَمَّمُوا أَبَدًا إِيمَانَ قَدْ مَتْ أَيْدِيهِمْ وَاللَّهُ عَلَيْمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴾ (٩٥)

فرمایا، یہ یہود اپنے کفر اور اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مرنے کے بعد ان کے لیے عذاب کا شکنجه تیار ہے۔ اس لیے وہ موت سے خائف رہتے اور اس سے دور بھاگتے ہیں۔ (الجمعہ 8:62)

— مگر کمرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ دنیا کے یہ بچاری کب تک جنیں گے، آخر ایک دن ان کو مرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی ان کے کفر اور برے اعمال کو خوب جانتا ہے اور وہ ان کو سخت سزا دے گا۔

﴿وَلَتَجَدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيَاةٍ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا يَوْمًٌ أَحَدُهُمْ كُوْ
يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ وَمَا هُوَ بِمُزَاحِجِهِ مِنَ الْعَذَابِ أَنْ يُعَمَّرَ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا
يَعْمَلُونَ ﴾ (٩٦)

اس مقام پر یہود کی تضاد بیانی اور ان کے جھوٹے دعووں کی قلعی کھول دی گئی ہے کہ یہ لوگ ایک طرف بڑے دیندار اور اللہ تعالیٰ کے چھیتے ہونے اور جنتی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے سوا کسی کے لیے نجات کو تسلیم نہیں کرتے مگر دوسری طرف ان کا حال یہ ہے کہ یہ ان مشرکین سے، جو صرف دنیا کو مانتے ہیں اور آخرت کے منکر ہیں، بڑھ کر دنیا پرست واقع ہوئے ہیں۔ ہر یہودی کی خواہش ہے کہ وہ ہزار برس تک جیئے۔ حالانکہ زیادہ طویل عمر پانہ اسے آخرت کے عذاب سے نہیں بچا سکتا۔

یاد رہے کہ ہزار برس جینے کا روز مرہ طویل عمر کے لیے استغفار ہے جو عربی زبان کے علاوہ فارسی اور اردو زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان یہود کے تمام اعمال کو دیکھ رہا ہے اور ان کے مطابق ان کو بدل دے گا۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ
مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَى لِلْمُؤْمِنِينَ ۝
كَانَ عَدُوًّا لِّلَّهِ وَمَلِكِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَلَ فَإِنَّ
الَّهَ عَدُوٌّ لِّلْكُفَّارِينَ ۝ وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَمَا
يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفُسْقُونَ ۝ أَوْ كُلُّمَا عَاهَدُوا عَهْدًا نَّبَذَهُ فَرِيقٌ
مِنْهُمْ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ وَلَمَا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ

عِنْدِ اللَّهِ مَصْدِيقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أَوْتُوا
الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَانُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ وَاتَّبَعُوا
مَا تَتَّلُوا الشَّيْطَانُ عَلَى مُلْكِ سُلَيْمَانَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ
وَلَكِنَّ الشَّيْطَانَ كَفَرُوا يُعْلَمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ ۖ وَمَا أُنْزِلَ
عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَأْبَلٍ هَارُوتَ وَمَارُوتَ ۖ وَمَا يُعْلَمُ مِنْ أَحَدٍ
حَتَّىٰ يَقُولَا إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۖ فَيَتَعْلَمُونَ مِنْهُمَا مَا
يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمُرْءَ وَزَوْجِهِ ۖ وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ
أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ وَيَتَعْلَمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۖ
وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۗ
وَلَيُئْسَ مَا شَرَوْا بِهِ أَنفُسَهُمْ ۖ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝ وَلَوْ أَنَّهُمْ
أَمْنُوا وَاتَّقُوا لِتَّثْوِيَةً مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ خَيْرٌ لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝ ۱۲

(اے نبی ﷺ) کہہ دیجیے جو جبرائیل علیہ السلام کا دشمن ہے، وہ جان لے کر جبرائیل علیہ السلام وہ ہے جس نے اللہ کے حکم سے آپ کے دل پر ایسا کلام نازل کیا ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی پیش گوئی کوچ کر دکھانے والا ہے اور ایمان والوں کے لیے ہدایت اور خوبخبری ہے۔

جو کوئی دشمن ہو اللہ کا، اس کے فرشتوں کا، اس کے رسولوں کا، جبرائیل علیہ السلام اور میکائیل علیہ السلام کا، تو اللہ مجھی ایسے کافروں کا دشمن ہے۔ اور (اے نبی ﷺ) ہم نے آپ ﷺ پر بڑی واضح نشانیاں اتنا ری ہیں اور ان کا انکار وہی کر سکتے ہیں جو بڑے نافرمان ہوں۔

(بنی اسرائیل کا حال یہ ہے کہ) جب کوئی عہد کرتے ہیں تو ان کا ایک گروہ اسے توڑ پھینکتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر ایمان نہیں رکھتے۔ اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ رسول آگیا جوان کی اپنی

کتاب کو سچا کرنے والا تھا، تو اہل کتاب کے ایک گروہ نے کتاب الٰہی کو اس طرح پیچھے پھینک دیا، گویا وہ اسے جانتے ہی نہیں۔

اور وہ اس چیز کے پیچھے پڑ گئے جو سلیمان علیہ السلام کی سلطنت میں شیطان پڑھتے تھے۔ سلیمان علیہ السلام نے ہر گز کفر نہیں کیا، کفر تو ان شیطانوں نے کیا جو لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ اور وہ اس چیز کے پیچھے بھی پڑ گئے جو بابل شہر میں دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر اتاری گئی۔ حالاں کہ وہ فرشتے اس وقت تک کسی کو کچھ نہ بتاتے جب تک یہ نہ کہہ دیتے: دیکھو، ہم تمہاری آزمائش کے لیے آئے ہیں، اس لیے تم کافرنہ بنو۔“ لیکن وہ ان سے ایسا عمل سکھتے، جس کے ذریعے میاں یوں میں جدا ای ڈال سکیں۔ حالاں کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر کسی کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے۔ مگر وہ ایسی چیزیں سکھتے جو ان کے لیے فائدہ مند ہونے کی بجائے نقصان دہ تھیں۔ وہ یہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ جو کوئی اس چیز کا خریدار بنے گا اسے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ملے گا۔

کیسی بڑی چیز ہے جس کے بدلتے میں انہوں نے اپنے آپ کو نیچ ڈالا۔ کاش وہ سمجھتے! اگر وہ ایمان والے ہوتے اور اللہ سے ڈرتے تو انہیں اللہ کی طرف سے ثواب ملتا، جو ان کے حق میں بہتر تھا۔ کاش وہ جانتے۔“ (97-103)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

عَلَىٰ مُلْكِ سُلَيْمَانَ:..... اس میں علی (پر) فی (میں) کے معنوں میں ہے اور مُلْكُ سے پہلے عہدہ ضاف محفوظ ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے: **(فِي عَهْدِ سُلَيْمَانَ)** ”سلیمان علیہ السلام کی بادشاہی کے زمانے میں۔“

بَيْابَلَ:..... اس میں ب کا حرف فی کے معنوں میں ہے۔ یعنی فی بَيْابَلَ ”بابل شہر میں۔“

﴿فَلْ مَنْ كَانَ عَدُواً لِّجَبَرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلِيلٍ كَيْدِنَ اللَّهُ مُصَدِّقاً لِّمَا بَيْأَنَ يَدِيهِ وَ هُدَىٰ وَ بُشْرَى لِلْمُؤْمِنِينَ ﴾ (97)

قرآن اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ لانے کے لیے یہود جو حلیے بہانے کرتے تھے، ان میں سے ایک یہ تھا کہ وہ کہتے تھے: جبریل علیہ السلام جس نبی پر وحی لاتا ہے ہم اس نبی کو نہیں مانتے، کیونکہ جبریل علیہ السلام ہمارا دشمن ہے، اس کے ذریعے ہم پر عذاب اور مصیبیں نازل ہوتی رہی ہیں۔ البتہ میکا تسلیم علیہ السلام ہمارا خیر خواہ اور دوست ہے، جو ہمارے لیے بارش بر ساتا اور خوش حالی لاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے اس غلط اعتقاد کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ جو شخص جبریل علیہ السلام کو اپنا دشمن سمجھتا ہے، اسے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ایک معزز فرشتہ ہے، جس نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے نبی موسیٰ علیہ السلام پر قرآن مجید نازل کیا ہے جو پہلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے، انسانوں کے لیے ہدایت کا پیغام ہے، اور اہل ایمان کو جنت کی خوشخبری دیتا ہے۔

اس میں یہود کو بتا دیا گیا کہ جبریل علیہ السلام سے دشمنی کا مطلب اس کی لائی ہوئی وحی سے دشمنی ہے جس کی زصرف

قرآن پر نہیں پڑتی بلکہ خود ان کی اپنی توریت پر بھی پڑتی ہے، کیونکہ وہ بھی جبریل علیہ السلام کی لائی ہوئی وحی ہے۔ اگر وہ قرآن کو اس لیے نہیں مانتے کہ وہ جبریل علیہ السلام کا نازل کیا ہوا ہے تو پھر توریت کو مانتے کا کیا جواز ہے، جب کہ وہ بھی جبریل علیہ السلام کی نازل کی ہوئی ہے۔

اس آیت سے یہ بات بھی قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ پورے کا پورا قرآن حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعے نازل ہوا ہے اور کوئی آیت یا سورت اس واسطے کے بغیر نازل نہیں ہوئی۔

**﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلَّهِ وَ مَلِئَكَتِهِ وَ رُسُلِهِ وَ جِبْرِيلَ وَ مِنْكُلَ فَإِنَّ اللَّهَ عَمُّٰٰ
لِّلْكَفِرِينَ ﴾ (98)**

فرمایا، جبریل علیہ السلام سے دشمنی کا مطلب میکائیل علیہ السلام سے بھی دشمنی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے فرشتوں سے دشمنی کے معنی ہیں، خود اللہ تعالیٰ سے دشمنی۔ پھر جو اللہ تعالیٰ کا دشمن ہو تو وہ کافر ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے کافروں کا دشمن ہے۔ ان کو وہ سخت سزا بھی دے گا۔

ایک حدیث قدسی ہے، اللہ فرماتا ہے:

(مَنْ عَادَى لِنِي وَلِيَا فَقَدْ آذَنَهُ بِالْحَرْبِ) (صحیح بخاری، رقم: 6502)

”جو شخص میرے کسی دوست سے دشمنی کرتا ہے، میں اس کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہوں۔“

اصل بات یہ ہے کہ قرآن کی مخالفت کرنے کا مطلب تمام آسمانی کتابوں کی مخالفت کرنا ہے اور حضرت محمد ﷺ کی مخالفت کرنا، تمام نبیوں کی مخالفت کرنا ہے۔ گویا کسی ایک آسمانی کتاب کا انکار تمام آسمانی کتب کا انکار ہے اور کسی ایک نبی کا انکار تمام نبیوں کا انکار ہے اور یہ چیز کفر ہے۔

اس آیت میں فرشتوں کا ذکر کرنے کے بعد جبریل علیہ السلام اور میکائیل علیہ السلام کا الگ سے ذکر کرنا، ان کے شرف اور فضیلت کی وجہ سے ہے، اور یہ عام کے بعد خاص کے ذکر کا اسلوب ہے۔

﴿وَ لَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَتِمْ بَيِّنَاتٍ وَ مَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَسُوقُونَ ﴾ (99)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے آپ کی نبوت اور قرآن کی صداقت کی ایسی روشن نشانیاں اور ولیلیں نازل کر دی ہیں، جن کا کوئی معقول آدمی انکار نہیں کر سکتا۔ البتہ ان کا انکار وہ لوگ کر سکتے ہیں، جو یہود کی طرح کے عادی نافرمان، عہد شکن، ہشت دھرم اور حسد کے مارے ہوئے ہوں اور گمراہی کو ہدایت پر ترجیح دیتے ہوں۔

﴿أَوْ كُلَّمَا عَاهَدُوا عَاهَدًا ثَبَدَهُ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴾ (100)

فرمایا، ان یہودیوں کا تو یہ حال رہا ہے کہ جب بھی انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یا اس کے بندوں سے کوئی عہد کیا ہے، تو ان میں سے کسی کسی گروہ نے ہمیشہ اسے توڑ پھینکا ہے۔ وہ اب بھی نبی ﷺ سے کوئی معاهدہ کریں گے تو اس

کی ضرور خلاف ورزی کریں گے۔ ان کے کسی ایک گروہ کی بات نہیں، ان کی اکثریت پہلے بھی ایمان سے خالی تھی اور اب بھی آخری نبی ﷺ پر ایمان نہیں لائے گی۔

قرآن مجید کی یہ پیش گوئی بالکل درست ثابت ہوئی۔ نہ صرف حضور ﷺ کی حیات مبارکہ میں یہودیوں نے مسلم عہد خندیاں کیں اور ان میں سے بہت کم لوگ ایمان لائے، بلکہ بعد کے زمانے میں بھی اور آج تک ان کی اکثریت عہد شکن، سازشی اور ایمان سے محروم ہے۔

﴿وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِ الْأَنْفُسِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الظَّنِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابُ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورُهُمْ كَانُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (101)

اس آیت میں رَسُولٌ سے مراد حضرت محمد ﷺ ہیں۔

اب یہود کی عہد شکنی اور نافرمانی کی ایک واضح مثال دی گئی ہے، کہ جب ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا ایک عظیم الشان رسول ﷺ تشریف لایا، جوان کی توریت کی پیش گوئیوں کے بالکل مطابق آیا اور جس کے بارے میں پہلے سے بتائی گئی تمام نشانیاں پوری ہو گئیں تو یہودی علماء نے توریت کے اس حصے کو جس میں آخری نبی ﷺ کے تمام اوصاف بیان ہوئے تھے، اس طرح پیچھے پہنیک دیا گیا وہ اسے جانتے ہی نہیں۔ ظاہر ہے کتاب الہی کے کسی ایک حصے کا انکار پوری کتاب کا انکار ہے۔ اس طرح یہود نے حسد اور تعصب کے تحت گویا پوری توریت کو پس پشت ڈال دیا اور اس کی تعلیمات سے انحراف کیا۔ حالاں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اس کی پابندی کرنے کا عہد کر رکھا تھا اور اسی توریت پر فخر کر کے وہ اہل کتاب کہلاتے تھے۔

﴿وَاتَّبَعُوا مَا تَنْتَلُوا الشَّيْطَانُ عَلَىٰ مُلْكِ سُلَيْمَانَ وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَ لِكِنَّ الشَّيْطَانُ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ وَ مَا أُنْزِلَ عَلَى الْمُلْكَيْنِ بِإِيمَانٍ هَارُوتَ وَ مَارُوتَ وَ مَا يُعَلِّمُنَ مِنْ أَحَدٍ حَتَّىٰ يَقُولُ لَآتَاهُنَّ حُنْ فِتْنَةً فَلَا تَكُفُرْ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمُرْءَ وَ زَوْجِهِ وَ مَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا يَأْذِنُ اللَّهُ وَ يَتَعَلَّمُونَ مَا يَضْرُبُهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ لَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَقٍ وَ لَيْسَ مَا شَرَوُا بِهِ أَنْفُسُهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾ (102)

جب یہود نے کتاب الہی (توریت) پر عمل کرنا چھوڑا تو وہ جادو ٹو نے اور سفلی علوم کے پیچھے لگ گئے، جن کو ان سے پہلے بعض شرپر انسانوں اور برے جنات نے حضرت سلیمان ﷺ کے عہد حکومت میں رواج دیا تھا۔ پھر اس جادو ٹو نے کو ”قدس“ بنانے کے لیے اسے سلیمان ﷺ کی طرف منسوب کر دیا کہ ان کے سارے مجرمے دراصل جادو ٹو نے کے زور پر ظاہر ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہود کے اس جھوٹے الزام کی تردید فرمائی کہ جادو گری کے کفر کا ارتکاب

سلیمان علیہ السلام نے نہیں کیا تھا، بلکہ ان کے زمانے کے بعض شریر انسان اور بربے جنات یہ کافرانہ کام کرتے تھے۔ یہود میں جب اخلاقی پستی اور بد عملی بھیل گئی تو وہ اپنے کبیرہ گناہوں کو انیاء مسلم کی طرف منسوب کرنے لگے، تاکہ ان کے اپنے گناہوں پر پردہ پڑا رہے اور کوئی گناہ نہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے جادو ٹونے کو اختیار کر لیا تو اسے انہوں نے سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کیا اور ان کو جادو گر کہہ رہا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے یہود کے کتاب الہی سے اخراج اور جادو گری میں انہاک کی وجہ سے ان کی آزمائش کے لیے دو فرشتوں ہاروت اور ماروت کو بابل شہر (عراق) میں سچیج دیا۔ یہ بنی اسرائیل کی قید اور اسیری کا زمانہ تھا۔ وہ فرشتے خود جادو ٹونا نہیں کرتے تھے بلکہ لوگوں کو جادو کی حقیقت بتاتے تھے کہ یہ اس طرح کا عمل ہوتا ہے، تاکہ مجرمے اور جادو کا فرق نہیں ہو جائے اور لوگ جادو کو نبیوں کا علم نہ سمجھ بیٹھیں۔

ہاروت اور ماروت کے بارے میں ہمارے ہاں ایک جھوٹا اور یہودہ قسم کا قصہ مشہور ہے جو اسرائیلیات کی خرافات میں سے ہے۔

یہود کی اخلاقی پستی کا یہ حال تھا کہ وہ جادو ٹونا سیکھ کر اس سے میاں بیوی میں جدائی ڈالنے کا کام لیتے اور اس طرح بدمعاشی اور بے حیائی کو فروغ دیتے۔ ظاہر ہے، اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر کوئی مادی یا روحانی عمل موثر نہیں ہو سکتا۔ اللہ سبحانہ کی رضا صرف نیکی کے کاموں میں ہوتی ہے، برے کاموں میں نہیں ہوتی۔

پھر یہود اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ جادو ٹونے کرنے والوں کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنی اس حرکت سے باز نہیں آتے تھے۔ انہوں نے کتاب الہی کی ہدایت پر جادو گری کی گمراہی کو ترجیح دی اور اپنے برے انجام سے آنکھیں بند کر لیں۔

آج کے مسلم معاشرے میں بھی جادو ٹونے کا رواج بہت زور پکڑ چکا ہے۔ اس کا سبب بھی قرآن سے دوری اور مہجوری ہے۔ جب کوئی قوم کتاب اللہ سے دور ہو گی تو وہ شیطانی اور سفلی علوم کے پیچھے ہی چلے گی۔ اس آیت کے حوالے سے چند امور قابل غور ہیں۔

1۔ جادو کا اثر ہوتا ہے مگر جادو کرنا کفر ہے۔

2۔ جادو گر کا فر ہوتا ہے اور اسلامی شریعت میں اس کی سزا قتل ہے۔

3۔ کتاب اللہ سے دوری کے نتیجے میں لوگوں کے اندر جادو ٹونے اور سفلی علوم کا رواج ہو جاتا ہے۔

4۔ ہر معاملے میں نفع و نقصان کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی مشیت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

5۔ ہر کام اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوتا ہے، مگر یہ ضروری نہیں کہ اس میں اس کی رضا بھی شامل ہو۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کی رضا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

6۔ آخرت کی کامیابی کے لیے کتاب اللہ کی پیروی ضروری ہے۔

﴿وَلَوْ كَانُوا أَمْنُوا وَأَتَقْوَا لِهِتَّبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ خَيْرٌ لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾ (103)

فرمایا، اگر یہود جادوٹو نے اور سفلی علوم میں پڑنے کی بجائے کتاب الہی کا صحیح علم حاصل کرتے اور اس کی پیروی کرتے تو ان کو اس میں حضرت محمد ﷺ کی نبوت کی ساری نشانیاں مل جاتیں، جس کے بعد وہ نبی ﷺ پر ایمان لاتے اور تقوے کی زندگی اختیار کر لیتے تو آخرت میں ان کو اس کا بہترین اجر جنت کی نعمتوں کی صورت میں ملتا۔ کیونکہ صحیح علم کا نتیجہ صحیح عمل کی صورت میں نکتا ہے۔ جب کتاب اللہ پر ان کا عمل درست نہیں ہے تو لامحال ان کا علم بھی ناقص ٹھہرا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَأَيْنَا وَ قُولُوا انْظَرْنَا وَ اسْمَعُوا ط

وَ لِلْكُفَّارِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۚ ﴿۱۰۳﴾ **مَا يَوْدُدُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ**

وَ لَا الْمُشْرِكُونَ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۖ وَ اللَّهُ يَخْتَصُ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ ۖ وَ اللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۚ ﴿۱۰۴﴾ **مَا نَسْخَ**

مِنْ آيَةٍ أَوْ نُسِّهَا نَاتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا ۖ اللَّهُ تَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ

عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۚ ﴿۱۰۵﴾ **الَّهُ تَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ**

وَ الْأَرْضِ ۖ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَ لَا نَصِيرٌ ۚ ﴿۱۰۶﴾ **أَمْ**

تُرِيدُونَ أَنْ تَسْعَلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا سُلِّمَ مُوسَىٰ مِنْ قَبْلٍ ۖ وَ

مَنْ يَتَبَدَّلُ الْكُفُرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلُ ۚ ﴿۱۰۷﴾ **وَذَكَرَ**

كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرْدُونَكُمْ مِّنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا

حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ أَنفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ

فَاعْفُوا وَ اصْفِحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۖ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ

قَدِيرٌ ۚ ﴿۱۰۸﴾ **وَ أَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَ اتُوِّلِ الزَّكُوَةَ ۖ وَ مَا تُقْدِمُ مُوَالِنَفِسَكُمْ**

مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِنْدَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ وَ
قَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصْرَىٰ ۝ تِلْكَ
أَمَانِيهِمْ ۝ قُلْ هَا تُؤْتُوا بِرَهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ بَلْ مَنْ
أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرٌ عِنْدَ رَبِّهِ ۝ وَلَا خَوْفٌ
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصْرَىٰ عَلَىٰ
شَيْءٍ ۝ وَقَالَتِ النَّصْرَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ ۝ وَهُمْ يَتَلَوُنَ الْكِتَابَ
كَذِيلَكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۝ فَإِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ

يَوْمَ الْقِيَمَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۝

”اے ایمان والو! (نبی ﷺ) کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے رائعتا نہ کہا کرو بلکہ انظرنا کہا کرو، اور اُن کی بات غور سے سنا کرو۔ اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ (حقیقت یہ ہے کہ) کافرخواہ اہل کتاب میں سے ہوں، یا مشرکوں میں سے، کبھی نہیں چاہتے کہ تم مسلمانوں پر تمہارے رب کی طرف سے کوئی بھلائی نازل ہو۔ لیکن اللہ جسے چاہتا ہے، اپنی رحمت سے نوازنے کے لیے چن لیتا ہے۔ اللہ بڑے فضل والا ہے۔ جس آیت کو ہم منسون کرتے ہیں یا اسے نظر انداز کراتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی اور آیت لے آتے ہیں، کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ کیا تم نہیں جانتے، اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور تمہارے لیے اللہ کے سوانح کوئی حمایتی ہے اور نہ کوئی مددگار۔

(مسلمانوں) کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے اسی طرح کے (الٹے سید ہے) سوالات کرو، جس طرح اس سے پہلے موئی غاییلہ سے کیے گئے؟ جو شخص ایمان کی بجائے کفر اختیار کرتا ہے، وہ سیدھی راہ سے بھلک جاتا ہے۔ (اے مسلمانوں) حق بات واضح ہونے کے باوجود بہت سے اہل کتاب محض حسد کی وجہ سے یہ چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح تمہیں بھی کافر بنا دیں۔ مگر تم انہیں معاف کر دو، اور ان سے درگزر کرو، یہاں تک کہ اس بارے میں اللہ کا کوئی اور حکم آجائے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور نہماں قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور تم اپنے لیے جو بھلائی آگے بھیجو گے، اس کا اجر اللہ کے ہاں ضرور پاؤ گے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔

اہل کتاب کہتے ہیں، جنت میں صرف یہودی جائیں گے یا عیسائی جائیں گے۔ یہ ان کی آرزو میں ہیں۔ (اے نبی ﷺ) آپ ان سے کہہ دیجیے: ”اگر تم سچے ہو تو اپنے دعوے کی دلیل پیش کرو۔“ حقیقت یہ ہے کہ جس نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا، اور نیک بھی ہوتا وہ اپنے رب کے ہاں ضرور اجر پائے گا۔ ایسے لوگوں کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

یہودی کہتے ہیں، عیسائیوں کا مذہب غلط ہے اور عیسائی کہتے ہیں، یہودیوں کا مذہب غلط ہے، حالاں کہ دونوں آسمانی کتاب پڑھتے ہیں۔ یہی بات وہ لوگ بھی کہتے ہیں، جن کے پاس علم نہیں۔ اللہ قیامت کے دن اس بات کا فیصلہ فرمائے گا، جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔“ (104-113)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

رَأَيْنَا: یہ رَأَيْ اور نَا کا مجموعہ ہے۔ **مُرَاعَةً** (باب مفائلہ) سے فعل امر حاضر واحد کا صیغہ ہے۔ اس کا حرفل علت (ی) حذف ہو گیا ہے۔ اس کے معنی ہیں: ہماری رعایت کیجیے، ہمارا لحاظ کیجیے، ہماری طرف متوجہ ہو جائیے۔ **أُنْظُرْنَا:** یہ **أُنْظُرْ** اور نَا کا مرکب ہے۔ **أُنْظُرْ** سے فعل امر حاضر واحد کا صیغہ ہے۔ اس کے معنی دیکھنے، دھیان کرنے اور مہلت دینے کے ہیں۔

یاد رہے کہ **رَأَيْنَا** اور **أُنْظُرْنَا** کے الفاظ اپنے مفہوم کے اعتبار سے باہم مترادف ہیں اور ان کا ایک ہی مطلب ہے کہ ہماری طرف متوجہ ہو کر بات کریں، تاکہ ہم آسمانی سے اسے سن سکیں اور سمجھ سکیں، یا بات کو دوبارہ دہرا جائے۔ **تَسْنِيْخُ:** یہ نئی سے ہے جس کے معنی زائل کرنے، ہٹانے اور مٹانے کے ہیں۔

جیسا کہ سورہ الحج میں آیا ہے:

﴿فَيَنْسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَنُ ثُمَّ يُعِكِّرُ اللَّهُ أَيْتَهُ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾ (الحج 22:52) “پھر اللہ اس چیز کو مٹا دیتا ہے، جو شیطان و سوہہ ڈالتا ہے۔ پھر اللہ اپنی آیتوں کو مسح کر دیتا ہے، اور اللہ علم والا ہے۔“

نُنْسِيْهَا: یہ نیسی سے بات افعال انسی نیسی انساء ہے جس کے معنی ہیں: ”کسی کے حافظے سے کوئی بات بھلا دینا یا فراموش کر دینا۔“

سَوَاءَ السَّبِيلُ: (راتے کا درمیانی حصہ) اس سے مراد سیدھا راستہ ہے۔ سورہ الدخان میں ہے کہ ﴿خُذُوهُ فَاغْتَلُوهُ إِلَى سَوَاءِ الْجَحِيْمِ﴾ (47:44) ”اے فرشتو! اس (گناہ گار) کو پکڑ و اور گھسیت کر دوزخ کے درمیان میں لے جاؤ۔“ سبیل راستے کو کہتے ہیں۔

الْآمَانِيْ: یہ اُمنیَّۃ کی جمع ہے، جس کے معنی ایسی تمنا اور آرزو کے ہیں جو کبھی پوری نہ ہو سکے۔ اس لیے عربی

زبان میں یہ لفظ ”خام خیالی، غلط فہمی، خیالی پلاو پکانا، مگر اسی اور خوابوں کی دنیا میں رہنے“ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن تمثیل کے معنی پڑھنے کے بھی آتے ہیں اور اُمُنیَّۃٌ پڑھی گئی یا سانائی گئی پیغام کو بھی کہتے ہیں، جیسا کہ سورہ الحج میں آیا ہے۔

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى الْقَوْشَيْطُونَ فِي أُمُنْيَّاتِهِ حَفِيَّنَسْخُ اللَّهُ مَا يُقْرِبُ الشَّيْطَنُ ثُمَّ يُعَكِّمُ اللَّهُ أَيَّتِهِ وَاللَّهُ عَلَيْهِ حَكِيمٌ ۝﴾ (الحج: 22)

”اور (اے نبی ﷺ) ہم نے آپ ﷺ سے پہلے جو بھی رسول اور نبی بھیجا اور اس نے پیغام حق سنایا تو شیطان نے اس میں کوئی نہ کوئی وسوسہ ڈالا۔ پھر اللہ نے شیطان کے ڈالے ہوئے وسوسے کو ختم کر دیا اور اپنی آیتوں کو مستحکم کر دیا۔ اور اللہ علم والا حکمت والا ہے۔“

الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ: (جو لوگ علم نہیں رکھتے) اس سے مراد عرب کے مشرکین ہیں، جن کے پاس نہ کوئی آسمانی کتاب نہیں اور نہ وہ وحی کا علم رکھتے تھے۔

قرآن مجید نے ان کو اہل کتاب کے مقابل میں اُمیّیَّنَ بھی کہا ہے۔

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمَمِينَ رَسُولًا مِنْهُمْ﴾ (الجمعة: 2)

”وہی (اللہ) ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا۔“

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَأَيْنَا وَ قُولُوا انْظُرْنَا وَ اسْمَعُوا وَ لِلْكُفَّارِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝﴾ (104)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو نبی ﷺ کی مجلس میں ”رَأَيْنَا“ کا لفظ کہنے سے منع فرمایا ہے۔ اس ممانعت کا سبب دراصل یہودی متفقین کی ایک خفیہ شرارت تھی، وہ جب حضور ﷺ کی مجلس میں آئے تو ”رَأَيْنَا“ کے لفظ کو زبان سے توڑ مردڑ کر کھی ”رَأَيْنَا“ (ہمارا چہ وہاں) بنا دیتے اور کبھی ”رَأَيْنَا“ کہتے، جس کے معنی عبرانی زبان میں ”شریر“ کے ہیں۔ اس طرح وہ نبی ﷺ کی شان میں بے ادبی، گستاخی اور توہین کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو حکم دیا کہ وہ ایسے موقع پر ”رَأَيْنَا“ کی جگہ ”انْظُرْنَا“ کہا کریں تاکہ بے ادبی کوئی پہلو باقی نہ رہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی لفظ میں برے معنوں کا استعمال یا امکان ہو تو ایسے لفظ کے استعمال سے بچنا چاہیے۔

پھر فرمایا کہ ”إِسْمَعُوا“ یعنی بات کو غور سے سنا کرو، تاکہ نبی ﷺ کو دوبارہ متوجہ کرنے یا بات دہرانے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ قرآن مجید کو اور نبی ﷺ کے فرمان کو غور سے سنا واجب اور ضروری ہے۔

آخر میں فرمایا کہ کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اس جگہ یہودی متفقین کو کافر کہا گیا ہے، کیونکہ نبی ﷺ کی شان میں گستاخی یا توہین رسالت کرنا کافر اور حرام ہے اور ایسا کرنے والے کافر ہیں، جن کے لیے آخرت میں دوزخ کا عذاب ہے۔

﴿مَا يَوْدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكُونَ أَنْ يُتَرَكَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ
مِنْ رِزْكُمْ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُونَ ۗ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمُ﴾ (105)

فرمایا، یہودی کفار اور مشرکین دونوں یہ نہیں چاہتے کہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کسی خیر، بھلائی یا نعمت سے نوازے۔ (آن چودہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ان کی یہ روشنی نہیں بدی)۔ ان دونوں گروہوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف شدید لغرض اور حسد تھا۔ ان کو یہ بات کھائے جا رہی تھی کہ کیوں مسلمانوں کو قرآن مجیدی عظیم نعمت عطا ہوئی ہے؟ کیوں ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک رسول ﷺ میں کیا مبعوث فرمایا ہے؟ کیوں ان کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے؟ کیوں ان کی طاقت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے؟ کیوں دین اور دنیا کے معاملات پر ہماری گرفت دن بدن کمزور پڑ رہی ہے اور ہماری اجراء داریاں آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہیں۔

لیکن ان حادثہ کو اتنا شعور نہیں تھا کہ اس طرح اصل میں وہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض کر رہے ہیں کہ کیوں اس نے مسلمانوں کو اپنے فضل و رحمت کے لیے چن لیا؟ حالاں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی کی نہیں۔ اس کی رحمت بڑی وسیع اور بے پایا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے جس کو چاہتا ہے خیر و برکت عطا فرماتا اور اپنی نعمتوں سے مالا مال کر دیتا ہے اور اس کو حادثوں کے حسد کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔

﴿مَا نَسْخَحَ مِنْ أَيَّةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مُشِلِّهَا ۖ إِنَّ اللَّهَ تَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ
شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ (106)

یہودی کہتے تھے، جب ان کے ہاں پہلے سے اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی شریعت اور کتاب موجود ہے، تو اللہ تعالیٰ کو کیا پڑی ہے کہ وہ کوئی اور شریعت یا کتاب بھیجے؟ ہم صرف اپنی شریعت اور کتاب کے پابند ہیں۔ اسی کے مانے اور اسی کی پیر وی میں اپنے لیے نجات سمجھتے ہیں۔ کسی اور شریعت یا کتاب کے نہ ہم پابند ہیں اور نہ اس کی پیر وی میں نجات ہو سکتی ہے۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کون کہہ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف ایک ہی شریعت اور کتاب بھیج سکتا تھا اور کوئی دوسری شریعت یا کتاب بھیج پر قادر نہیں ہے؟ یقیناً وہ اس پر قادر ہے کہ پہلی کسی شریعت اور کتاب کی جگہ دوسری کوئی بہتر شریعت اور کتاب نازل فرمادے۔ یا اپنے بندوں کے فائدے اور ان کی مصلحت یا تربیت کی خاطر اپنے کسی حکم کو موقوف (SUSPEND) کر کے اس کی جگہ کوئی یا حکم جاری کر دے۔ یا حالات کی تبدیلی کے سبب سے نئی شریعت نازل کر دے۔ یا طویل عرصہ گزر جانے کے باعث جب لوگ ایک شریعت کو یا اس کے کسی حصے کو بھلا بیٹھیں تو ان کے لیے وہی پہلی شریعت یا اس کی تجدید و اصلاح کر کے نئے احکام بھیج دے جو پہلے سے بہتر یا انہی جیسے ہوں۔ بے شک اللہ تعالیٰ یہ سب کچھ کر سکتا ہے، کیونکہ اس کے قانون میں تجھیں اور ارتقاء ہوتا ہے، تنزل اور جمود نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ خود ہماری شریعت میں بھی نئی واقع ہوا ہے۔ جیسے یہود کی آسانی کے لیے اس کی عدت ایک سال سے کم کر کے چار ماہ وس دن کر دی گئی۔ پہلے یہ حکم تھا کہ:

﴿وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَنْدُوْنَ أَزْوَاجًا وَصَيْهَ لِأَزْوَاجِهِمْ مَتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ عَيْرَ إِخْرَاجٍ﴾ (البقرہ 2:240)

”اور تم میں سے جو لوگ مر نے کے قریب ہوں اور ان کی بیویاں ہوں تو وہ اپنی بیویوں کے لیے وصیت کر جائیں کہ ایک سال تک ان کو گھر میں رکھ کر خرچ دیا جائے۔“
پھر دوسرا یہ حکم آگیا جس نے پہلے حکم کو منسوخ کر دیا کہ:

﴿وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَنْدُوْنَ أَزْوَاجًا يَرْتَبَضُنَ بِأَنفُسِهِنَ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا﴾ (البقرہ 2:234)

”تم میں سے جو لوگ مر جائیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑ جائیں تو ان بیواؤں کو چار میسیہ دن دن کی عدت گزارنی چاہیے۔“

یا جیسے مسلمانوں کے لیے بیت المقدس کی بجائے خانہ کعبہ کو قبلہ قرار دیا گیا۔ (البقرہ 2:142، 149، 150) آیت کا آخری بکرا پہلی بات کی دلیل کے طور پر ہے کہ لوگوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جب اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، تو وہ اپنے بندوں کے مفاد میں بہتر سے بہتر شریعت لانے اور اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے پر بھی قادر ہے۔

﴿الْحُمْ تَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ﴾ (107)

یہ دوسری دلیل ہے اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے فائدے کے لیے اپنی نہ صرف بھیجی ہوئی شریعتوں میں تبدیلی کرتا رہا ہے، بلکہ ان کی ہدایت کے لیے نئی نتاں بھی نازل کرتا رہا ہے اور نئے انبیاء و رسول بھی بھیجا رہا ہے۔ وہ پوری کائنات کا مالک ہے۔ آسمان و زمین کی بادشاہی اسی کی ہے۔ تمام خلوقات اس کی حکوم اور تابع فرمان ہیں۔ سب کو اس کا ہر حکم سننا اور مانا چاہیے۔

آخر میں مسلمانوں سے فرمایا گیا کہ تم یہود کے اس اعتراض کی کوئی پرواہ نہ کرو، جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کوئی نئی شریعت نازل نہیں کر سکتا۔ جو یہ نہیں مانتے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، جو اس کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ پر اتنا رکھا ہے۔ ان یہود کے مقابلے میں اللہ تھہرا حامی و ناصر ہے، وہ تمہیں ان کے شرے سے بچائے گا۔

﴿أَمْ ثُرِيدُونَ أَنْ سَعَلُوا رَسُولَنَا كَمَا سَعَلَ مُوسَىٰ مِنْ قَبْلٍ وَمَنْ يَتَبَدَّلِ الْكُفَّرُ بِإِلَيْسَانٍ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلُ﴾ (108)

اس آیت میں عام مسلمانوں کو نصیحت کی گئی کہ وہ نبی ﷺ سے اس طرح کے فضول سوالات اور مطالبات نہ کریں، جیسے یہود نے موسیٰ علیہ السلام سے کیے تھے۔ مثال کے طور پر انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ ہمیں اللہ و کھادوں:

﴿أَرَنَا اللَّهَ جَهَنَّمَ﴾ (النساء 4:153)

”ہمیں اللہ سامنے لا کر دکھا دے۔“

یا جب ان کو ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تو انہوں نے اس پر فضول سوالات کرنے شروع کر دیے۔ جیسا کہ سورہ البقرہ میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ (البقرہ: 67 تا 71)

مسلمانوں کو اس یہودی ذہنیت اور ان کے غلط روئے سے بچنے کی تائید کی گئی اور ہدایت کی گئی کہ وہ اپنے رسول ﷺ سے بے جا سوالات نہ کیا کریں، بلکہ حضور ﷺ جس کام کے کرنے کا حکم دیں، وہ اسے کر لیا کریں اور جس بات سے روکیں، اس سے بارہا کریں۔ ایمان نہ ہو کہ وہ حضور ﷺ سے فضول سوالات کر کے شریعت کے احکام میں سختی، تنگی اور پیچیدگی پیدا کرنے کا باعث بن جائیں۔

پھر ذرا تنبیہ کے انداز میں ان کو خبردار کیا گیا کہ ایمان کا تقاضا سائبع و طاعت ہے۔ نبی ﷺ سے فضول سوالات کرنا اور تعمیق فی الدین یعنی دین کے احکام میں میکھ اور غیر ضروری باریکیاں نکالنا ایمان کی راہ نہیں ہے، بلکہ ایسا کرنا کفر اور گمراہی ہے۔ اس لیے ان کو چاہیے کہ وہ ایمان کی راہ چھوڑ کر کفر اور گمراہی میں نہ بھکیں۔

اسی سے ملتی جلتی بات سورہ المائدہ میں بھی فرمائی گئی:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنِ آشْيَاءِ إِنْ تُبَدِّلَ كُمْ تَسْوُ كُمْ وَ إِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبَدِّلَ كُمْ عَفَا اللَّهُ عَنْهَا وَ اللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۝ قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا بَهَا كُفَّارِينَ﴾ (المائدہ: 5، 101، 102)

”اے ایمان والو! ایسی باتوں کے متعلق سوال نہ کرو کہ اگر وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں ناگوار گزریں۔ اور اگر تم ان کے متعلق ایسے وقت میں جب قرآن نازل ہو رہا ہے، پوچھو گے تو وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں گی۔ اب تک جو کچھ ہوا، اے اللہ نے معاف کر دیا۔ ویسے اللہ معاف کرنے والا تھا۔ ایسی باتیں تم سے پہلے ایک قوم نے پوچھی تھیں، پھر وہ ان کی وجہ سے کافر ہو گئے۔“

بعض روایات میں ہے کہ بھرت کے بعد ابتدائی دور میں بعض مسلمانوں نے نبی ﷺ سے کچھ فضول قسم کے سوالات بھی کر ڈالے تھے۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ کسی نے اپنی ولدیت کی تحقیق کے لیے بھی سوال کر دیا کہ میرا باپ کون ہے؟ حضور ﷺ نے اس کا جواب تو داتا مگر اس شخص کے اس سوال کو سخت ناپسند فرمایا تھا۔

(صحیح بخاری، رقم: 7291)

اسی طرح ایک اور موقع پر حضور ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! تم پر ج فرض ہو گیا ہے..... اس پر کسی نے بات کاٹتے ہوئے سوال کیا کہ: کیا ہر سال ج فرض ہے؟ اس پر حضور ﷺ نے خاموش رہے۔ اس شخص نے تین بار یہی سوال کیا۔ مگر ہر بار حضور ﷺ نے خاموشی اختیار کی رکھی۔ پھر کچھ وقتنے کے بعد فرمایا:

”ایسے سوالات نہ کیا کرو۔ اگر میں اس وقت ”ہاں“ کہہ دیتا تو تم پر ہر سال ج کرنا فرض ہو جاتا اور پھر تمہارے

لیے مشقت اور تنگی ہوتی۔“ (صحیح مسلم، رقم: 3257۔ ابو داؤد، رقم: 1721۔ نسائی، رقم: 2617) لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ دین کے بارے میں کوئی ضروری سوال نہ کیا جائے، کیونکہ دین کو سمجھنے سمجھانے کے لئے سوال کرنے کی اجازت ہے۔

﴿ وَذَكَرِيَّا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْرِدُونَكُمْ مِنْ بَعْدِ إِيمَانَكُمْ كُفَّارًا ۗ حَسَدًا مِنْ عِنْدِ أَنفُسِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۗ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ ﴾ (109)

یہ عام مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ اکثر اہل کتاب اسی بھاگ دوڑ میں لگے ہوئے ہیں کہ وہ کسی طرح تمہیں اسلام سے بٹا کر کفر کی طرف لے جائیں۔ آیت میں اگرچہ اہل کتاب کا ذکر ہے، مگر اس سے مراد یہود ہیں، جو مختلف حیلوں بہانوں سے مسلمانوں کو دین سے بدظن کرتے اور اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کرتے تھے۔ وہ یہ بات خوب جانتے تھے کہ حضرت محمد ﷺ کے سچے نبی ہیں، قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور مسلمانوں کا دین، اسلام بھی سچا دین ہے۔ یہ سب بتیں ان کو اپنی کتابوں کی پیش گوئیوں سے اچھی طرح معلوم ہو گئی تھیں۔ مگر اس کے باوجود ان کو یہ حسد کھائے جا رہا تھا کہ کیوں مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کے اتنے عظیم انعامات عطا ہو رہے ہیں اور خود وہ کیوں نبوت، افتخار اور مذہبی امامت و پیشوائی کے منصب سے ممزول کر دیے گئے ہیں۔

پھر مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ یہود کی غلطیوں اور شرارتون پر فی الحال غفو و درگز ر سے کام لیں، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں کوئی سخت حکم نازل کر دے۔ غور کیا جائے تو یہ غفو و درگز مسلمانوں کی کمزوری کی علامت نہ تھی، کیونکہ غفو و درگز روہتی کرتا ہے جو طاقت ور ہو۔ اس لیے اس میں ان کی قوت ایمانی پائی جاتی ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی نصرت و حمایت حاصل ہے۔

آخر میں فرمایا، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ چاہے کسی نافرمان قوم کو اس کی بداعمالیوں کی سزا دے کر دنیا میں ذمیل و رسو اکردے اور دوسری طرف چاہے تو ایک عرب جیسی ان پڑھ قوم کو ان کے ایمان کی بدولت دنیا میں امامت و سیادت کے منصب پر فائز کر کے عزت و سرفرازی عطا فرمادے۔

بعد میں جب یہودیوں نے میثاق مدینہ کی خلاف ورزی کر کے بد عہدی کی اور وہ مسلمانوں کے دشمن مشرکین قریش کے ساتھ مل گئے تو پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے مدینے کے تینوں یہودی قبائل کے خلاف سخت کارروائی کی گئی۔ بنو قیقان سے جنگ ہوئی۔ بنو قرظہ کے مردوں کو قتل کیا گیا اور بنو نصیر کو خیربر کی طرف جلاوطن کیا گیا۔ اس طرح اللہ سبحانہ نے مسلمانوں کو یہود پر غلبہ عطا فرمایا اور یہ حقیقت سب پر ظاہر ہو گئی کہ اللہ واقعی ہر چیز پر قادر ہے۔

﴿ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَأَتُو الرِّزْكَوْةَ ۗ وَمَا تُقْدِمُوا لِأَنفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَعْدُوهُ عِنْدَ اللَّهِ ۖ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ ﴾ (110)

ان حالات میں مسلمانوں کو نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی خاص تاکید فرمائی گئی جو کہ بالترتیب بدنبال اور مالی عبادات ہیں۔

دین اسلام میں نماز اور زکوٰۃ کی بڑی اہمیت ہے۔ ایمان لانے کے بعد سب سے زیادہ زور انہی دو پر دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں عام طور پر ان دونوں کا حکم ساتھ ساتھ آیا ہے۔ یہ اسلامی معاشرے کی بنیاد، اس کی پیچان اور پورے دین کے لیے علامت (SYMBOL) بھی ہیں۔ ان کے بغیر اسلامی معاشرے کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ نماز حقوق اللہ کا سب سے بڑا مظہر اور سب سے بڑی عبادت ہے۔ زکوٰۃ سے معاشرے میں خوشحالی آتی ہے۔ ان دونوں سے مسلمانوں میں اجتماعی قوت و شوکت پیدا ہوتی ہے۔ لوگوں کی تربیت اور ان کا ترقیتی نفس ہوتا ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ کی تائید اور نصرت حاصل ہوتی ہے۔ ان پر عمل کے نتیجے میں وہ دنیا اور آخرت میں سرخرو ہو سکتے ہیں۔

آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے چھوٹے بڑے تمام اعمال دیکھ رہا ہے اور ان کے مطابق تمہیں جزا اوسزادے گا۔ اس طرح اس میں ترغیب اور تہذیب دونوں کا پہلو بھی نمایاں ہو گیا۔

**﴿وَقَاتُوا لِنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصْرَىٰ طَلَّاكَ أَمَانِيْهُمْ طَقْلُ
هَاٰتُوا بِرَهَائِهِمْ إِنْ كُنْتُمْ صَدِقِيْنَ﴾ (111)**

فرمایا گیا کہ ان کی غلط فہمیاں اور جھوٹی آرزویں ہیں جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ کسی کے محض یہودی یا عیسائی ہونے سے اسے جنت نہیں ملے گی۔ اس کے لیے سچا ایمان اور عمل صالح ضروری ہے اور وہ ان دونوں سے محروم ہیں۔ اگر یہ لوگ اپنے اس دعوے میں سچے ہیں کہ صرف وہی جنت میں جائیں گے تو اپنے دعوے کے حق میں دلیل پیش کریں۔ بغیر دلیل اور ثبوت کے کوئی دعویٰ کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

افسوں، یہود و نصاریٰ کی طرح آج مسلمانوں کے مختلف گروہ بھی یہی دعویٰ کرتے ہیں۔ ہر گروہ اپنے آپ کو ہدایت یافتہ اور ناجی (نجات پانے والا) سمجھتا اور دوسروں کو گراہ اور جھنپی قرار دیتا ہے۔ فیا للعجب!

**﴿بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرٌ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خُوفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ (112)**

فرمایا، کسی مخصوص مذہبی گروہ میں شامل ہو جانے سے جنت نہیں ملے گی، خواہ وہ کوئی گروہ ہو۔ آخرت کی نجات اور جنت صرف ان کے لیے ہے جو اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے آگے جھکاتے، ایمان لاتے اور نیک اعمال کرتے ہیں۔ یہی لوگ جنت میں جائیں گے، جہاں ان کو نہ کوئی خوف و خطر ہوگا اور نہ کوئی غم ہوگا۔

**﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصْرَىٰ عَلَى شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصْرَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَى شَيْءٍ
وَهُمْ يَتَلَوُنَ الْكِتَابَ طَلَّاكَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ فَإِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ
يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ﴾ (113)**

اب یہود و نصاریٰ کا دعویٰ الگ کر کے بیان کیا گیا ہے کہ یہودی کہتے ہیں، عیسائیوں کا مذہب غلط ہے۔ اسی طرح عیسائی کہتے ہیں، یہودیوں کا مذہب غلط ہے۔ جبکہ دونوں الہ کتاب ہیں۔ دونوں اللہ تعالیٰ کی وہ کتابیں پڑھتے ہیں جو ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں۔ اس کے باوجود وہ اپنی کتابوں کی تعلیم کے برخلاف اس طرح کی باتیں کرتے ہیں۔

فرمایا، صرف ان دونہ بھی گروہوں کا یہ حال نہیں، یہی دعویٰ عرب کے وہ مشرکین بھی کرتے ہیں، جن کے پاس نہ کوئی آسمانی کتاب ہے اور نہ وہی کا علم۔ مگر وہ بھی صرف اپنے مذہب بت پرستی ہی کو صحیح سمجھتے ہیں اور دوسروں کے مذہب کو غلط قرار دیتے ہیں۔

آخر میں فرمایا کہ کس کا مذہب صحیح ہے اور کس کا غلط، اس کا فیصلہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی عدالت میں ہو گا۔ اس میں نبی ﷺ کے لیے تسلی اور اطمینان بھی ہے کہ آپ ﷺ کا مام صرف دعوت و تبلیغ ہے۔ کوئی ایمان لانا ہے یا نہیں، اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔

افسوں، آج قرآن مجید کی موجودگی میں مسلمانوں کے مختلف مذاہک نے بھی الگ الگ فرقوں کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ہر ایک نے اپنی ڈیڑھ ایمنٹ کی مسجد الگ بنانے کا رجسٹر کرا لی ہے۔ اب ہر فرقہ دوسرے کو غلط، مگرہ، ضال و مضل اور کافر بھی کہتا ہے اور قرآن بھی پڑھتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان مذہبی اختلافات کا فیصلہ دنیا میں کیسے ہو؟ یہ تو آخرت ہی میں اللہ تعالیٰ نیصلہ کرے گا کہ کون حق پر تھا اور کون باطل پر؟ آج اگر ایک فرقہ ہی سچا ہے تو وہ کیوں سچا ہے، کیا دوسرے سچے نہیں ہو سکتے؟ اگر سب سچے ہیں تو کوئی بھی سچا نہیں، کیونکہ سب ایک دوسرے کو جھٹا رہے ہیں۔ اگر سب جھوٹے ہیں تو پھر اللہ کا دین کہاں ہے؟ وہ کہیں تو ہونا چاہیے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسْجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا إِسْمُهُ وَسَجَنَ
فِي خَرَابِهَا۝ أُولَئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا۝ إِلَّا خَابِفِينَ۝ لَهُمْ
فِي الدُّنْيَا حُزْنٌ۝ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ۝ وَإِلَهُ الْمَشْرِقِ
وَالْمَغْرِبِ۝ فَإِنَّمَا تُوَلُوا فَتَمَّ وَجْهُ اللَّهِ۝ إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلَيْهِمْ۝
وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا۝ سُبْحَنَهُ۝ بَلْ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ۝

كُلُّ لَهُ قُنْتُونَ ۝ بِدِيْعِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۝ وَإِذَا قَضَى أَمْرًا فَإِنَّمَا^{١٩٤}
 يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝ وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا
 اللَّهُ أَوْ تَأْتِيْنَا آيَةً ۝ كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِثْلُ قَوْلِهِمْ ۝
 تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ ۝ قَدْ بَيَّنَا الْآيَتِ لِقَوْمٍ يُوقَنُونَ ۝ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ^{١٩٥}
 بِالْحَقِّ بَشِيرًا ۝ وَنَذِيرًا ۝ وَلَا تُسْعَلُ عَنِ اصْحَابِ الْجَحِيمِ ۝^{١٩٦}
 وَلَنْ تَرْضِيَ عَنْكَ الْيَهُودُ ۝ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَبَيَّنَ مِلَّتُهُمْ ۝ قُلْ إِنَّ
 هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ ۝ وَلَئِنْ اتَّبَعُتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ
 الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ ۝ وَلَا نَصِيرٍ ۝ أَلَّذِينَ أَتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ^{١٩٧}
 يَتَلَوَّنُهُ حَقًّا تَلَوَّتْهُ ۝ أُولَئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ ۝ وَمَنْ يَكُفُّرُ بِهِ فَأُولَئِكَ^{١٩٨}

هُمُ الْخَسِرُونَ ۝

”اور ان سے بڑا ظالم کون ہو گا جو اللہ کی مسجدوں میں دوسروں کو اللہ کا نام لینے سے روکیں اور خانہ خدا کو اجازہ نہ کی کوشش کریں۔ ان کا حال تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ مسجدوں میں ڈرتے ہوئے داخل ہوتے۔ ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں رسولی اور آخرت میں بڑا عذاب ہے۔ مشرق اور مغرب اللہ کے لیے ہیں۔ تم جس طرف منہ کرو، ادھر اللہ موجود ہے۔ بے شک اللہ بڑی وسعت والاسب کچھ جانے والا ہے۔
 اہل کتاب کہتے ہیں، اللہ بھی اولاد رکھتا ہے، حالاں کہ وہ اس سے پاک ہے۔ بلکہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، اسی کا ہے۔ سب اس کے حکم کے تابع ہیں۔ وہ آسمانوں اور زمین کو بغیر کسی نمونے کے پیدا کرنے والا ہے۔ وہ جب کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو بس یہ فرمادیتا ہے کہ ”ہو جا“ تو وہ ہو جاتا ہے۔

جو لوگ علم نہیں رکھتے، وہ کہتے ہیں: ”اللَّهُ هُمْ سے كَيْوُنْ كَلَامُهُمْ نَيْسَ كَرَتَا، يَا هَمَارَے پَاسِ اسَ كَيْ كُوئِي نَشَانِي كَيْوُنْ نَيْسَ، آتَى؟“ یہی بات وہ لوگ بھی کہتے تھے جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ ان سب کے دل ایک جیسے ہیں۔ البتہ جو لوگ یقین کرنے والے ہیں، ان کے لیے ہم نے بہت سی نشانیاں واضح کر دی ہیں۔ (اے نبی ﷺ) ہم نے

آپ ﷺ کو خوشخبری دینے والا اور خبردار کرنے والا بنایا کر بھیجا ہے۔ جہاں تک دوزخیوں کا معاملہ ہے، آپ ﷺ ان کے بارے میں جواب دنیس ہیں۔

یہودی اور عیسائی تو اس وقت تک تم سے راضی نہ ہوں گے، جب تک تم ان کا نمہب اختیار نہ کرو۔ (اے نبی ﷺ) آپ ﷺ (ان سے) کہیں: اللہ کی ہدایت ہی سچی ہدایت ہے۔ لیکن اگر تم اللہ کی طرف سے صحیح علم آجائے کے بعد بھی ان کی خواہشوں کے پیچھے چلو گے، تو اللہ کے مقابلے میں تمہارا نہ کوئی حمایتی ہو گا اور نہ کوئی مددگار۔

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی، وہ اسے پڑھتے ہیں، جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے، ایسے لوگ ہی اس پر ایمان رکھتے ہیں، مگر جو انکار کرتے ہیں، وہ گھانٹے میں رہیں گے۔ (121-114)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

مَسْجِدُ اللَّهِ:..... اس سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے بنائی گئی عبادت گاہیں اور معابد مراد ہیں۔

قِنْتُونَ:..... یہ قَانِتُ کی جمع ہے، جس کے معنی اطاعت گزار اور فرمائی بردار کے ہیں۔

وَلَدًا:..... اس سے اولاد مراد ہے۔ یہ لفظ واحد، جمع، مذکور اور موٹھ بھی استعمال ہوتا ہے۔

بَيْتِيْعُ:..... یہ بَدْعَ (ک) سے فَعِيلُ کے وزن پر صفت مشہہ ہے اور مُبْدِيْعُ (بَدْاعُ سے اسم فاعل) کے معنوں میں ہے کہ وہ ذات جو ایسی چیز کو عدم سے وجود میں لاتی ہے، جس کی پہلے سے کوئی نظری یا مثال موجود نہ ہو۔ یاد رہے کہ الْبَيْتِيْعُ اللَّهُ تعالیٰ کے اسماءِ حسنی میں سے ہے۔

الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ:..... (جو لوگ علم نہیں رکھتے) اس کی وضاحت آیت 113 میں گزر چکی ہے۔

﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ فَنَّعَ مَسْجِدَ اللَّهِ أَنْ يُؤْذَنَ كَرْ فِيهَا اسْمُهُ وَ سَعْيُ فِي حَرَابِهَا﴾

أُولَئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا حَلَّفُنَّهُ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا حُزْنٌ وَ لَهُمْ

فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ (114)

فرمایا، ایسے لوگوں سے بڑھ کر اور کون ظالم ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت گاہوں اور معبدوں سے دوسروں کو ذکر و عبادت سے روکیں اور ان کو ویران کرنے اور تباہ و بر باد کرنے کے درپے ہوں۔

یہ اشارہ ان تینوں مذہبی گروہوں یہود، نصاریٰ اور مشرکین کی مذہبی تاریخ کی طرف ہے، جن کا ذکر بچھلی آیت 113 میں آچکا ہے۔

یہود و نصاریٰ کی تاریخ گواہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی عبادت گاہوں پر حملے کر کے ان کو ویران کرتے اور ڈھاتے رہے ہیں۔ بیت المقدس اور یہکل سلیمانی کئی بار عیسائی بادشاہوں کے ہاتھوں جاہ ہوتے رہے۔

یکن کا عیسائی حکمران ابرہہ بھی خانہ کعبہ کوڈھانے کے لیے ایک بہت بڑا لشکر، جس میں ہاتھی بھی شامل تھے، لے کر حملہ آور ہوا تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے اپنے گھر کی حفاظت فرمائی تھی، اور پرندوں کے ذریعے اس لشکر کو تباہ کر دیا تھا۔

مشرکین قریش بھی مسلمانوں کو خانہ کعبہ میں نماز پڑھنے سے روکتے تھے۔ انہوں نے نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو عمرہ کرنے سے بھی روکا تھا۔ (لفظ: 48:25)

یہ خدا کے ماننے والے نہ ہی گروہوں کا حال رہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت گاہوں اور معبدوں میں لوگوں کو اس کی عبادت کرنے سے روکتے تھے اور ان کو ویران کرنے اور برباد کرنے سے باز نہیں آتے تھے۔ اس کے باوجود ان کا دعویٰ یہی تھا کہ صرف وہی صحیح دین پر ہیں اور جنت انہی کے لیے مخصوص ہے۔

فرمایا، بھلا اس سے بڑا ظالم اور گناہ کس کا ہو سکتا ہے، جو خدا کے نام لیوا ہوں، مگر خدا کی عبادت گاہوں کو تاخت و تاراج کرتے ہوں۔ میں وجہ ہے کہ اسلام نے جنگ کی حالت میں بھی دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کو گرانے کی احاظت نہیں دی۔

اس آیت میں آج مسلمانوں کے لیے بھی عبرت ہے جو دوسرے مسلکوں کے لوگوں کو اپنی مساجد میں نماز پڑھنے سے روکتے ہیں۔ کبھی دنگا فساد کرتے ہوئے ایک دوسرے کی مسجدوں پر قابض ہوتے اور ان کی حرمت پاہال کرتے ہیں۔ فرمایا، اللہ سبحانہ کی عبادت گاہوں سے دوسروں کو روکنے والوں کے لیے ضروری تو یہ تھا کہ وہ عاجزی اور اکساری کے ساتھ اللہ کے گھروں میں داخل ہوتے، دوسروں کو ذرا نے دھمکانے کی بجائے خود اللہ تعالیٰ سے ڈرتے۔ یا جب کبھی اہل حق کا وہاں پر غلبہ ہوتا تو ایسے لوگوں کو وہاں داخل ہونے کی جرأت نہ ہوتی۔ وہاں جاتے ہوئے ان پر اہل حق کا خوف طاری ہوتا۔ ایسے ظالموں کو اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی ذلت و رسوانی سے دوچار کرے گا اور آخرت میں دوزخ کا بردا عذاب دے گا۔

یاد رہے کہ وہ مشرکین قریش، جنہوں نے حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام کو عمرہ کرنے سے روکا تھا، فتح مکہ کے موقع پر ذلت و رسولی میں بنتا تھے۔

وَإِلَهُ الْمَسْرِقِ وَالْمَغْرِبِ فَإِيَّاكُمْ نَتَوَسَّلُ إِلَيْكُمْ فَنَعْمَلُ وَجْهَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلَيْهِمْ^(١٥)

(115)

یہود و نصاریٰ دونوں کا ایک ہی قبلہ تھا اور وہ بیت المقدس تھا۔ اس کے ایک حصے کی سمت عیسائی اور دوسرے حصے کے قبلے کی سمت یہودی رخ کر کے عبادت کیا کرتے تھے۔ مگر دونوں ایک دوسرے کے قبلے کو غلط ٹھہراتے اور آپس میں جھگڑتے تھے۔ فرمایا، یہ جھگڑا افضل ہے۔ مشرق و مغرب یا شمال و جنوب سب اللہ کے ہیں۔ تم جس طرف رخ کرو، ہر طرف اللہ موجود ہے۔ اصل چیز کسی قبلے کا رخ نہیں ہے، بلکہ وہ عبادت ہے جو پورے اخلاص اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی

کے لیے کی جاتی ہے۔ اللہ کسی عبادت گاہ کی چار دیواری میں محدود نہیں بلکہ وہ بڑی وسعت والا ہے، اس کے احاطہ قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں ہے اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

یہ آیت تحويل قبلہ سے پہلے مدینے میں نازل ہوئی تھی، جب یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس تھا۔ مزید وضاحت انشاء اللہ تحول قبلہ والی آیات (البقرہ: 149، 150) میں آئے گی۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا إِنْ سُبْحَنَهُۚ بَلْ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِۖ كُلُّ لَهُ

قُلْنَتُونَ ﴿١١٦﴾ (116)

یہ قرآن اور عربی زبان کا ایک اسلوب ہے، جس میں فعل ماضی کبھی زمانہ ماضی کے لیے نہیں آتا، بلکہ ماض فعلیت (DOING) کے اظہار کے لیے آتا ہے۔ ایسی صورت میں زمان (TENSE) مراد نہیں ہوتا، بلکہ صرف فعل مراد ہوتا ہے۔ **وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا** کے **قَالُوا** میں یہی اسلوب ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ”اور ان کا کہنا ہے کہ اللہ بھی اولاد رکھتا ہے۔“

اس میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے علاوہ عیسائیوں اور مشرکین عرب کو بھی شامل کر کے فرمایا ہے کہ وہ سب کہتے ہیں کہ اللہ کی بھی اولاد ہے۔

معلوم ہے کہ یہود حضرت عزیز علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دیتے تھے اور عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہا **وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزِيزٌ بْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَرَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ** (التوبۃ: 30:0) ”یہودی کہتے ہیں عزیز علیہ السلام کا بیٹا ہے اور عیسائی کہتے ہیں مسیح علیہ السلام کا بیٹا ہے۔“

اور عرب مشرکین نے فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں بنا کر کھاتھا جیسا کہ سورہ انعام میں ہے:

وَيَجْعَلُونَ لِلَّهِ الْبَنِيتَ سُبْحَنَهُ لَا وَلَهُمْ مَا يَشْتَهُونَ ﴿النحل: 57:16﴾

”اور وہ (مشرکین) فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں حالاں کہ وہ اس سے پاک ہے۔ مگر خود اپنے لیے بیٹیے پسند کرتے ہیں۔“

فرمایا، اللہ تعالیٰ اس سے پاک اور بے نیاز ہے کہ اس کی کوئی اولاد ہو۔ وہ سب کا خالق ہے اور کسی مخلوق کی طرح اولاد کا محتاج نہیں ہے۔ وہ ساری کائنات کا مالک ہے۔ عزیز علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام اور تمام ملائکہ، بلکہ ہر چیز اس کے حکم اور قانون کی پابند اور تابع فرمان ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی اولاد اپنے والدین کے مرتبے تک پہنچ جائے، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی حقوق، خواہ وہ کتنا ہی درجہ اور مرتبہ رکھتی ہو، کبھی خالق کے درجے اور مرتبے تک پہنچ جائے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے سب عاجز بندوں اور غلاموں کی طرح ہیں۔ سورہ مریم میں ہے:

إِنَّ كُلُّ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا أَتَى الرَّحْمَنَ عَبْدًا ﴿مریم: 93:19﴾

”آسمانوں اور زمین میں کوئی ایسا نہیں جو خداۓ رحمان کے آگے غلام بن کر کھڑا رہے ہو۔“

﴿بَدَأْتُ بِنَعْصَمَ السَّبُوتَ وَالْأَرْضَ ۖ وَإِذَا قَضَى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾ (117)

اس آیت میں بھی پہچلی آیت کے مضمون کو واضح کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کو عدم سے وجود میں لا یا ہے اور جس کی کوئی نظری اور مثال پہلے سے موجود نہ تھی۔ اس لیے کوئی مخلوق اتنے بڑے خالق کی ہم جس کیسے ہو سکتی ہے کہ ان میں باپ میٹھے کا رشتہ قائم ہو۔ اس کی قدرت کاملہ کا حال تو یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے، یا کوئی بھی کام کرنا چاہتا ہے تو بن اتنا کہہ دیتا ہے کہ ”ہو جا“ اور ”وہ“ ہو جاتا ہے۔ ”گویا اس کے ارادے کے معا بعده وہ مطلوبہ کام ہو جاتا ہے۔

یہ کُنْ فَيَكُونُ ”ہو جا، تو وہ ہو جاتا ہے۔“ ایک خدائی راز ہے۔ اس کی حقیقت اور گلہ ہم نہیں جانتے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سمجھانے کے لیے یہ تعبیر اور انداز اختیار فرمایا ہے۔

﴿وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يَكْلِمُنَا اللَّهُ أَوْ تَأْتِينَا أَيْةً ۚ كَذِلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۖ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ ۖ قُدْرَ بَيْتَنَا الْأَلْيَتْ لَقَوْمٍ يُؤْقَنُونَ﴾ (118)

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کی توحید کا ذکر تھا اور شرک کی تردید تھی۔ اب یہ تین آیتیں (120, 119, 118) نبی ﷺ کی نبوت و رسالت کے حوالے سے ہیں اور ان لوگوں کے بارے میں ہیں جو آپ ﷺ کو نبی نہیں مانتے تھے۔

فرمایا، عرب کے مشرکین، جن کے پاس نہ کوئی آسمانی کتاب ہے اور نہ وہ وحی کا علم رکھتے ہیں، یہ کہتے ہیں کہ خود اللہ تعالیٰ ہم سے ہم کلام ہو کر کیوں نہیں بتا دیتا کہ میں نے حضرت محمد ﷺ کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ لہذا ان کو نبی مان لیا جائے۔ یا ہمارے پاس کوئی ایسی نشانی یا مجموعہ آجاتا کہ حضور ﷺ واقعی اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں۔ ہم اپنے جیسے ایک انسان کے بارے میں یہ کیسے مان لیں کہ اسے اللہ تعالیٰ نے نبی بنا کر بھیجا ہے۔ اسے ہم پر کوئی فضیلت بھی حاصل نہیں۔

نہ وہ کوئی برا ادوات مند ہے اور نہ کے کا کوئی سردار ہے، آخر ہم کیسے اعتبار کر لیں کہ وہ اللہ کا رسول ہے؟

قرآن نے اُن کے بعض مطالبات کا یوں ذکر کیا ہے:

﴿وَقَالُوا لَنَّ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّى تَفْجِرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنْبُوْعًا ۚ أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةً مِّنْ نَّجِيلٍ ۖ وَعَنْبَ فَتَفَجَّرَ الْأَنْهَرَ خِلْلَهَا تَفْجِيرًا ۚ أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسْفًا ۖ أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةَ قَبِيلَةً ۖ أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ ۖ أَوْ تَرْقَى فِي السَّمَاءِ ۖ وَلَنْ نُؤْمِنَ لِرُقْيَكَ حَتَّى تَنْزِلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرُوْةً ۖ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا﴾ (بنی اسرائیل 17: 90 تا 93)

”اور انہوں (مشرکین) نے کہا: ہم اس وقت تک تمہاری بات کا یقین نہیں کریں گے، جب تک کہ تم ہمارے لیے زمین سے چشمہ جاری نہ کر دو۔ یا تمہاری پاس سکھوروں اور انگوروں کا ایسا باغ پیدا ہو، جس میں تم نہیں جاری کر کے دکھادو۔ یا تم اپنے دعوے کے مطابق آسمان مکڑے مکڑے کر کے ہم پر گراؤ۔ یا

اللہ اور فرشتوں کو لا کر ہمارے سامنے کھڑا کر دو۔ یا تمہارے لیے سونے کا گھر بن جائے۔ یا تم آسمان پر چڑھ دکھاؤ۔ اور ہم تمہارے چڑھنے کو بھی نہیں مانیں گے، جب تک تم وہاں سے کوئی لکھی ہوئی کتاب ہم پر نہ آتا رو، جسے ہم پڑھ کر دیکھیں۔“ آپ کہہ دیجیے: میں صرف ایک بشر ہوں اور اللہ کا رسول ہوں۔“

اور بھی یہ کہتے ہیں:

﴿لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمِلَائِكَةُ أَوْ نَرَى رَبَّنَا طَ﴾ (الفرقان: 25)

”ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں آتے، یا ہمارا رب سامنے کیوں نہیں آتا جسے ہم دیکھے سکیں۔“

اس طرح حضور ﷺ کی نبوت کے انکار کے لیے مشرکین غرور و تکبر کے ساتھ کثی اور بھی عذر بہانے اور مطالبات پیش کرتے، جن کا ذکر قرآن مجید نے کئی مقامات پر کیا ہے۔

لیکن اگر وہ غور کرتے تو صرف قرآن بھی ان کے لے کافی مجرہ تھا۔ فرمایا، حق کو نہ ماننے اور ایمان نہ لانے کے لیے یہ عذر بہانے نہیں ہیں۔ ان سے پہلے بھی بعض لوگ اپنے نبیوں کے بارے میں اسی طرح کے الٹے سیدھے سوالات اور مطالبات کرتے رہے ہیں۔ ان سب کی ذہنیت ایک جیسی ہے۔ ان سب کے ہاں ہشت وھری، گمراہی، غرورو و تکبر اور دین دشمنی مشترکہ (COMMON) ہے، اس لیے ان کی زبانوں پر ایک ہی جیسی فضولیات ہوتی ہیں۔

قرآن نے ان کے بارے میں یہ بھی کہا ہے کہ:

﴿أَتَوَاصُوا بِهِ حَبْلُ هُمْ قَوْمٌ طَاغُونَ ۝﴾ (الذاريات: 51)

”کیا یہ ایک دوسرے کو اس کی وصیت کرتے چلے آئے ہیں؟ بلکہ یہ سب سرکش لوگ ہیں۔“

آخر میں فرمایا، ہم نے ان لوگوں کے لیے جو یقین کرنا چاہیں، ایسی ٹھکلی نشانیاں اور روشن دلیلیں مہیا کر دی ہیں، جن سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت محمد ﷺ واقعی اللہ تعالیٰ کے چچے نبی اور رسول ہیں۔

﴿إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَّ نَذِيرًا وَّ لَا تُسْعَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيلِ﴾ (119)

اب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا کہ مشرکین مانیں یا نہ مانیں، مگر حقیقت ہی ہے کہ ہم نے آپ ﷺ کو ایسا رسول بنا کر بھیجا ہے، جو ایمان لانے والوں کو جنت کی خوش خبری دیتا اور جہلانے والوں کو دوزخ کی آگ کے عذاب سے ڈراتا ہے۔ آپ ﷺ کی ذمہ داری صرف دعوت و تبلیغ کی ہے، ان لوگوں کے ضمول سوالوں اور مجزووں کی فرمائیں پوری کرنا، آپ ﷺ کے ذمے نہیں ہے۔ ہم نے آپ ﷺ کی نبوت پر یقین لانے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں واضح کر دی ہیں اور نہ ماننے والے دوزخیوں کے بارے میں آپ ﷺ جواب دہ نہیں ہیں کہ وہ دوزخ میں کیوں جانے والے ہیں۔

﴿وَ لَنْ تَرْضِيَ عَنْكَ الْيَهُودُ وَ لَا النَّصَارَى حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ مِلَّهُمْ ۝ قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ هُوَ الْهُدَىٰ ۝ وَ كَمِنِ الْبَعْثَةَ أَهُوَءُهُمْ بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۝ مَا لَكُ مِنَ اللَّهِ مِنْ

وَرَبِّ وَلَا نَصِيرٌ ﴿120﴾

اس سے پہلے ان مشرکین کا ذکر تھا جو حضور ﷺ کی نبوت سے انکاری تھے اور آپ ﷺ کو شنگ اور زخم کرنے کے لیے اُلٹے سیدھے سوالات اور مطالبات کرتے تھے۔

اب نبی ﷺ کو خطاب کر کے یہودی و نصاریٰ کے بارے میں آپ کو بتایا گیا کہ یہ لوگ آپ ﷺ سے بھی راضی نہ ہوں گے، جب تک آپ ﷺ (خدانخواست) ان کا نہ ہب اختیار کر کے یہودی یا عیسائی نہ ہو جائیں۔ کیونکہ یہ لوگ بعض اپنی خواہشات کے پیچھے چلتے ہیں اور اپنے سوا کسی کو ہدایت پر نہیں سمجھتے۔ اس لیے جب آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے وحی کا علم عطا فرمایا ہے تو آپ ﷺ کا کام صرف وحی کی پیروی ہے، ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہیں ہے۔ آپ ﷺ ان کو صاف صاف بتادیں کہ حصل ہدایت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہو اور وہ میرے پاس آ جکی۔ لہذا میں وحی کی ہدایت چھوڑ کر تمہاری خواہشوں کی گمراہی کے پیچھے نہیں چل سکتا۔ اگر خدا نخواست میں بھی تمہاری ضلالت کو اختیار کرلوں تو مجھے بھی اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی حامی و ناصر نہیں ملے گا۔

یہ خطاب بظاہر نبی ﷺ سے ہے، مگر اصل میں وہ سب لوگ مخاطب ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی وحی و ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہش کی پیروی کرتے ہیں۔

یہ بھی قرآن مجید کی صداقت اور اس کے مجزہ ہونے کا ایک ثبوت ہے کہ آج بھی یہود و نصاریٰ کی قومیں مسلمانوں سے دوستی کرنے کے دعوے کے باوجود ان سے راضی نہیں ہوتیں بلکہ نت نے مطالبے کرتے اور "DO MORE" کی فرمائشیں کرتے رہتے ہیں۔

﴿الَّذِينَ اتَيْنَهُمُ الْكِتَابَ يَتَوَلَُّونَهُ حَقًّا تِلَاوَتَهُ أُولَئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ وَمَنْ يَكُفُرُ بِهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْخَسِرُونَ ﴾ (121)

اس آیت میں پہلے ان اہل کتاب یہود کا ذکر ہے، جو اپنی کتاب توریت کو پڑھتے اور اس کے پڑھنے کا حق ادا کرتے تھے۔ گویا اسے غور سے پڑھتے، اس پر یقین رکھتے اور اس کے مطابق عمل کرتے تھے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ جب ان کے پاس قرآن اور نبی ﷺ کی دعوت پہنچے گی تو یہ لوگ ایمان لے آئیں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں، جو خواہش پرست نہیں ہیں، بلکہ حق پرست ہیں، جیسے عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور کعب الاحبار رضی اللہ عنہ وغیرہ، جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ مگر جو لوگ وحی کی ہدایت آ جانے کے بعد بھی جان بوجھ کر اس کا انکار کریں گے، تو وہ دنیا اور آخرت کی سعادتوں اور کامیابیوں سے محروم رہیں گے اور قیامت کے دن اللہ کے عذاب کے مستحق ہوں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی تلاوت کا حق اس وقت تک ادا نہیں ہو سکتا جب تک اس کی آیات پر غور و مدبر نہ کیا جائے اور اس کے مطابق عمل نہ کیا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَفَفَالَّهُمْ﴾

(محمد 24:47)

”کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے، یا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں؟“

دوسری جگہ فرمایا:

﴿كَتَبْ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَبْرُوا أَيْتَهُ وَلِيَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابُ ۝﴾ (ص 38:29)

”یہ (قرآن) باہر کتاب ہے جو ہم نے آپ ﷺ کی طرف نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آئینوں پر غور کریں اور عقل والے نصیحت حاصل کریں۔“

آج مسلمانوں کا قرآن مجید سے تعلق بھی محض تلاوت اور حفظ تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اسے سمجھ کر پڑھنا اور اس کے مطابق عمل کرنا مفتود ہو چکا ہے جس کے نتیجے میں وہ زوال کا شکار ہو چکے ہیں۔

يَبَرِّئُنَّ إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِيْ نَعْمَتُ عَلَيْكُمْ وَ اذْنِيْ فَضْلَتُكُمْ عَلَى
الْعَلَمِيْنَ ۝ وَ اتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَ لَا يُقْبَلُ مِنْهَا
عَدْلٌ وَ لَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَ لَا هُمْ يُنْصَرُونَ ۝ وَ اذْ ابْتَلَ إِبْرَاهِيمَ رَبِّهُ
بِكَلِمَاتٍ فَاتَّهَمَنَّ طَقَالَ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا طَقَالَ وَ مِنْ ذُرِّيْتِيْ طَقَالَ
لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّلِمِيْنَ ۝ وَ اذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِلنَّاسِ وَ اُمَّانًا
وَ اتَّخِذُوا مِنْ مَقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلَّى وَ عَهْدُنَا اِلَى إِبْرَاهِيمَ وَ اسْمَاعِيلَ اَنْ
طَهَّرَا بَيْتَنِي لِلظَّالِمِيْنَ وَ الْعَكْفِيْنَ وَ الرُّكْعَعَ السُّجُودَ ۝ وَ اذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ
رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا اِمَانًا وَ ارْزُقْ اَهْلَهُ مِنَ الشَّرَكَتِ مَنْ اَمَنَ مِنْهُمْ
بِاللَّهِ وَ الْيَوْمِ الْاُخْرِ ۝ قَالَ وَ مَنْ كَفَرَ فَامْتَعْهُ قَبِيلًا ثُمَّ اضْطَرَرَهُ اِلَى عَذَابِ النَّارِ
وَ بِئْسَ الْمَصِيرُ ۝ وَ اذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ اسْمَاعِيلُ رَبَّنَا
تَبَقَّلُ مِنَّا طَقَالَ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيِّمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِيْنَ لَكَ وَ
مِنْ ذُرِّيْتِنَا اُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ وَ ارْنَا مَنَّا سَكَنَا وَ تُبَ عَلَيْنَا طَقَالَ اِنَّكَ اَنْتَ

**الْتَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١٨﴾ رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتَلَوَّ عَلَيْهِمْ
عِلْيَهِمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١٩﴾**

”اے بنی اسرائیل! میری نعمتیں یاد کرو، جو میں نے تمہیں عطا کیں۔ خاص طور پر جو میں نے تمہیں دنیا والوں پر فضیلت دی تھی۔ اس دن سے ڈرو جب کوئی کسی کے کام نہ آئے گا، نہ کسی سے معاوضہ لے کر چھوڑا جائے گا، نہ کوئی سفارش چلے گی اور نہ کہیں سے کوئی مدد مل سکے گی۔

یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام کو ان کے رب نے کئی باتوں میں آزمایا تو انہوں نے ان پر عمل کر دکھایا۔ اللہ نے فرمایا: ”میں تم کو سب لوگوں کو پیشوں بناوں گا۔“ ابراہیم نے عرض کیا: ”کیا میری اولاد کو بھی؟“ ارشاد ہوا: ”میرا یہ وعدہ ان کے بارے میں نہیں جو ظالم ہوں گے۔“ ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کا مرکز اور امن کا مقام قرار دیا، اور حکم دیا کہ مقام ابراہیم کو بھی نماز پڑھنے کی جگہ بنا لو۔ ہم نے ابراہیم علیہ السلام اور اسما علیل علیہ السلام دونوں کو تاکید کی کہ وہ میرے گھر کو پاک صاف رکھیں، طواف کرنے والوں کے لیے، اعتکاف کرنے والوں کے لیے، رکوع کرنے والوں کے لیے اور سجدہ کرنے والوں کے لیے۔

اور ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی: ”اے میرے رب! اس جگہ کو امن کا شہر بنادے! یہاں کے رہنے والوں میں سے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھیں، انہیں پھلوں کی روزی عطا فرم۔“ اللہ نے فرمایا: ”اگر کوئی کافر بھی یہاں رہے گا تو میں اسے بھی دنیا میں کچھ مدت کے لیے فائدہ اٹھانے دوں گا۔ پھر اسے بے بس کر کے دوزخ کی آگ کا عذاب دوں گا، جو بہت براٹھکانہ ہے۔

اور یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام اور اسما علیل علیہ السلام بیت اللہ کی دیواریں بنارہے تھے اور کہتے تھے: ”اے ہمارے رب! ہماری اس خدمت کو قبول فرمابے شک تو ہی سننے والا جانے والا ہے۔ اے ہمارے رب! ہمیں اپنا سچا فرمائیں بردار بنائے، ہماری نسل میں سے ایک فرمائیں بردار امت پیدا فرم، ہمیں عبادت کے طریقے بتا اور ہمیں معاف فرمائیں بے شک تو معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اے ہمارے رب! اس امت میں ایسا رسول بھیجن، جو لوگوں کو تیری آئیں سنائے، انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کو پاک کرے۔ بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔“ (122-129)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

إِنْتَلَى:..... (ب ل و) یہ اینقلاءُ باب اتعال سے ہے، جس کے معنی ہیں: کسی شخص کو مشکل کام میں ڈال کر اس کی آزمائش کرنا، جانچنا اور امتحان لینا۔

كَلِيلَتُ:..... یہ کلمہ کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ احکام ہیں جن کے کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو دیا

تحا۔ یہ احکام چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کے ذریعے دیے تھے اس لیے ان کو کلمات کہا گیا ہے۔ جیسے عیسیٰ علیہم کو گلہمۃ اللہ (اللہ کا گلہ) اس لیے کہا گیا (آل عمران: 47, 46, 45: 3) کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کلام سُنْ (ہوجا) سے پیدا ہوئے تھے۔ آتیہن: یہ انتہام باب افعال سے ہے جس کے معنی ”پورا کرنے“ کے ہیں۔

اس جگہ سے مراد یہ ہے کہ ابراہیم علیہم السلام نے اللہ تعالیٰ کے ان احکام پر پورا عمل کر کے دکھا دیا، جن میں ان کی آزمائش کی گئی تھی اور تمام آزمائشوں اور امتحانوں میں پورے اترے اور کامیاب ہوئے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

(وَإِنْ رَهِيمٌ الَّذِي وَفَى) (السُّجُونُ 53: 27)

”اور ابراہیم علیہم السلام جس نے اپنا کام پورا کر دیا۔“

إِنَّمَا: یعنی عربی زبان میں اس کے کئی معنی آتے ہیں۔ اس جگہ اس کے معنی ہیں: ”مثلاً مذهبی رہنمایا پیشوا،“

الْبَيْتُ: اس سے بیت اللہ یعنی خانہ کعبہ مراد ہے۔

مَثَابَةُ: یہ اصل میں مشوَّبة تھا۔ اس کا مادہ (ROOT) ہے (ث و ب)۔ اس کے اصل معنی رجوع کرنے یا لوٹنے کی جگہ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مرچ ایسا مرکز اور جو عبادت کے لیے لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ ہو۔

إِنْمَا: اس سے مرادِ إِنَّمَا یعنی امن کی جگہ ہے۔

مُصَلِّیُ: نماز کی جگہ کو کہتے ہیں۔

الْرَّكْعُ: یہ رَأْكُعُ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں: رکوع کرنے والے۔

الْسُّجُودُ: یہ سَاجِدُ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں: سجدہ کرنے والے۔

ان دونوں کو بغیر واؤ عاطفہ کے لانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ اصل میں ایک ہی عبادت ہے اور وہ نماز ہے، جس میں رکوع بھی ہوتا ہے اور سجدہ بھی۔ اس طرح ان دونوں سے مراد ہے، نماز پڑھنے والے۔

مَقَامُ إِبْرَاهِيمَ: اس سے مراد وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر ابراہیم علیہم السلام نے خانہ کعبہ تعمیر کیا تھا اور جو آج کعبہ کے دروازے کے سامنے ایک مضبوط اور خوبصورت جنگل میں محفوظ ہے۔

الشَّمَرَاتُ: یہ شَمَرَةُ کی جمع ہے جس کے معنی ہر طرح کے کھانے کی چیزیں ہیں جو زمین سے اگتی ہیں۔ اس میں ہر قسم کے پھل، سبزیاں اور انانچ شامل ہیں۔

أَضْطَرَّةُ: اس کا مادہ (ROOT) ض ر اور مصدر اضطرار ہے جس کے معنی لَا تَكُوْنَ أَنْجِينَ ”محبوب کرنے“ کے ہیں۔

الْقَوَاعِدُ: یہ ”الْقَاعِدَةُ“ کی جمع ہے، جس کے معنی کسی عمارت کی بنیاد کے ہیں۔

مَنَاسِكُنا: نسک کے اصل معنی دھونے اور پاک کرنے کے ہیں۔ اس سے مراد گناہوں سے پاک ہونا اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا ہوتا ہے۔ مَنَاسِكُ جمع ہے مَنَسَكُ کی، جس کے معنی قربانی کے ہیں۔ نُسُكُ یا مَنَسَكُ سے چونکہ گناہ دھلتے ہیں، بندہ گناہوں سے پاک ہوتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے، اس لیے یہ قربانی کو کہتے

ہیں جو قُربان کے معنی میں ہوتی ہے، کہ اس سے اللہ تعالیٰ کا تقریب حاصل ہوتا ہے۔ لیکن لفظ 'مناسک' کا زیادہ تر استعمال حج کی عبادت اور اس کے تمام افعال و اعمال کے لیے ہوتا ہے، جیسا کہ

قرآن مجید میں ہے:

﴿فَلَا يَضْيَطُّمْ مَنَّا سِكْنُمْ فَلَذُّكُرُوا اللَّهَ كَنِّيْتُكُمْ أَبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذُكْرًا﴾ (البقرہ: 200)

"پھر جب حج کے اعمال پورے کرو، تو اللہ کو یاد کرو، جس طرح پہلے اپنے باپ دادا کو یاد کرتے تھے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ اللہ کو یاد کرو۔"

آلِکِتبَ:..... اس جگہ اس سے مراد قرآن مجید ہے۔ قانون مراد نہیں ہے۔

آلِحَكْمَةَ:..... اس کے اصل معنی دانائی اور بصیرت کے ہیں۔ لیکن اس سے مراد دینی احکام کے اسرار و رموز اور شریعت کے مقاصد ہوتے ہیں۔

امام شافعی رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس جگہ الحکمة سے مراد حدیث و سنت ہے۔ بعض علماء اس سے ایسی بات مراد لیتے ہیں جو انسان کو نیکی کی طرف لے جاتی، یا اسے برائی سے روکتی ہے۔

يُؤْزِّكِيهِمْ:..... (زک و) یہ تزکیہ باب تفعیل سے ہے۔ اس کے اصل معنی نشوونما دینے، بڑھانے یا پاک کرنے کے ہیں۔ عام طور پر جسمانی اور مادی پاکیزگی کو طہارت کہتے ہیں اور باطنی اور روحانی پاکیزگی کو تزکیہ یا تزکیہ نفس کہتے ہیں، جس میں شرک سمیت ہر قسم کے گناہوں کی آلووگی سے پاک کرنا مراد ہوتا ہے۔

﴿يَلَيْقَنَ إِسْرَاعِيلَ أَذْكُرُوا نِعْمَتَ الرَّبِّ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَآتَيْتُ فَضْلَتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ۚ وَأَنَّقُوا يَوْمًا لَا تَجِزُّ نَفْسٌ عَنْ لَئِنِّي شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ ۚ وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعةٌ ۚ وَلَا هُمْ يُصْرُونَ ۚ﴾ (123, 122)

ان دونوں آیتوں کی تفسیر، ان سے ملتے جلتے مضمون والی آیات 48,47 کے تحت گزر چکی ہے۔ وہاں دیکھ لی جائے۔

﴿وَإِذَا ابْتَلَ إِبْرَاهِيمَ رَبِّهِ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَهُمْ بَطَّالَ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ۖ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي ۖ قَالَ لَا يَنْأِي عَهْدِي الظَّالِمِينَ ۚ﴾ (124)

اس قصہ کو بیان کرنے میں حکمت یہ ہے کہ اہل کتاب کے دونوں گروہوں یہود اور نصاریٰ کو اس پر بڑا ناز اور غرور تھا کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ نبوت و رسالت صرف بنی اسرائیل کا موروٹی حق ہے۔ ان کے باہر کسی اور قوم میں کوئی نبی نہیں آ سکتا۔ ان میں سے ہر ایک کا یہ دعویٰ تھا کہ صرف اسی کا نہ ہب صحیح ہے۔ اس کے پاس جو ہدایت ہے وہی صحیح ہدایت ہے۔ اس لیے آخرت میں نجات بھی صرف وہی پائے گا۔

ان دونوں گروہوں کے دعوئیں کا غیر معقول پہلو تو بالکل واضح ہے کہ جب دونوں کا دعویٰ ایک ہے اور دونوں ہی ابراہیم دین پر ہیں، تو پھر ان میں اختلاف کیوں ہے۔ پھر دونوں کا نہ ہب الگ الگ کیوں ہو گیا ہے۔ پھر دونوں ایک

دوسرے کو گمراہ، ہدایت سے عاری اور نجات سے محروم کیوں سمجھتے ہیں۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے قصہ کا وہ حصہ بیان فرمادیا ہے، جس میں نہ صرف الہ کتاب کے دونوں گروہوں یہود اور نصاریٰ کے مذکورہ بالا غلط دعووں کی تردید ہو جاتی ہے، بلکہ اس میں حضرت محمد ﷺ کی دعوت اور نبوت کی پوری تائید موجود ہے۔ ان دونوں گروہوں سے کہہ دیا گیا ہے کہ تم اپنے سارے جھوٹے دعوے چھوڑ دو۔ تم دونوں اصلی ابراہیمی دین سے ہٹ چکے ہو۔ اصل دین ابراہیمی کے پیروکار اب نبی ﷺ اور آپ ﷺ پر ایمان لانے والے لوگ ہیں۔ تم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ پر اور آخری کتاب الہی قرآن پر ایمان لاو۔ تمہارے لیے ہدایت اور نجات کی اب صرف یہی ایک راہ ہے، اسے اختیار کرو ورنہ کافر ہو جاؤ گے اور آخرت میں دوزخ کا ایندھن ہو گے۔

فرمایا، ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ یاد کرو، جب ان کو اللہ سبحانہ نے بعض آزمائشوں اور امتحانوں میں ڈالا تو وہ ان میں پورے اترے اور کامیاب ٹھہرے۔ ان کو شرک کے خلاف آوازِ الحانے پر اپنے ٹلن سے بھرت کرنی پڑی۔ تو حید کا گلہ بلند کرنے پر ان کو نمرود بادشاہ نے آگ کے الاو میں ڈالا تو وہ اس میں بے دھڑک گود گئے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم پر اپنی یہوی ہاجرہ اور اپنے بیٹے اسماعیل کو کے کی بے آب و گیاہ وادی کی ویران جگہ پر اکیلا چھوڑ آئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو میری راہ میں قربان کر دو تو وہ اسے بھی ذبح کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

ان کڑے امتحانوں اور رُزہرہ گددا آزمائشوں میں کامیاب اور سخرد ہونے کی بدولت اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو لوگوں کے لیے امام بنایا اور دنیا کی امامت و پیشوائیت کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا۔

یاد رہے! انسان پر آزمائشیں اور مصیحتیں دو اسباب سے آتی ہیں۔ ایک اس کے گناہوں کے باعث سزا کے طور پر، دوسرے اس کے درجات و مراتب کو بلند کرنے کے لیے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام چونکہ اللہ تعالیٰ کے نبی تھے اور اس لحاظ سے معصوم عن الخطأ تھے، لہذا ان پر جو آزمائشیں اور مشکلات آئیں، وہ ان کے درجات و مراتب بلند کرنے کے لیے آئیں۔

جب ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی امامت و پیشوائی کا منصب عطا فرمایا، تو قدرتی طور پر ان کے دل میں اپنی اولاد کے لیے بھی اس منصب کی طلب پیدا ہوئی اور انہوں نے عرض کیا کہ کیا ان کی اولاد بھی اس منصب پر فائز ہوگی۔ فرمایا: تمہاری اولاد میں یہ منصب صرف ان کو حاصل ہو گا جو اس کے اہل اور مستحق ہوں گے۔ جو تیرے دین کے پچھے پیروکار اور مدد ابراہیمی کے پابند ہوں گے۔ مگر جو ظالم، شرک اور کافر ہوں گے، ان کو یہ منصب حاصل نہ ہوگا۔

یہ منصب بعد میں آپ کے بیٹوں، اسماعیل اور اسحاق علیہما السلام کو حاصل ہوا۔ پھر بنو اسحاق اور بنی اسرائیل میں طویل عرصے تک قائم رہا۔ پھر جب وہ اس کے اہل نہ رہے تو اللہ تعالیٰ نے امامت و پیشوائی کا یہ منصب بنو اسماعیل میں سے حضرت محمد ﷺ اور آپ ﷺ کی امت مسلمہ کو عطا کر دیا جو اس امت میں قیامت تک موجود رہے گا۔

﴿وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِلنَّاسِ وَأَمْنًا وَاتَّخَذُوا مِنْ مَقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصْلَىٰ وَعَهْدَنَا إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَنْ طَهِرَا بَيْتَنَا لِلظَّاهِرِينَ وَالْغَافِقِينَ وَالرُّكُوعُ السَّجُودُ﴾ (125)

اب مشرکین قریش کو، جو اپنے آپ کو ابراہیم علیہ السلام کی نسل اور ملت ابراہیم کا پیر و کار سمجھتے تھے، خانہ کعبہ کی تاریخ اور اس کی تعمیر کا اصل مقصد بتایا جا رہا ہے کہ یاد کرو جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لیے عبادت کا مرکز و مرجع بنایا اور اسے دارالامان قرار دیا۔ مقام ابراہیم کے پاس بھی نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ ابراہیم علیہ السلام اور اساعلیٰ علیہ السلام دونوں کو اس عهد اور حکم کا پابند کیا کہ وہ ہمارے گھر خانہ کعبہ کو بتوں سمیت ہر قسم کی نجاست اور گندگی سے پاک صاف رکھیں، ان لوگوں کی خاطر جو اس کا طواف کریں، وہاں اعتکاف کریں اور رکوع و وجود والی نمازیں پڑھیں۔

اس میں طواف کا ذکر سب سے پہلے کیا گیا، کیونکہ اس کی خاص اہمیت ہے۔ طواف بھی، جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے، ایک قسم کی نماز ہی ہے، مگر اس میں مناسب بات چیت کرنے کی اجازت ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((الطَّوَافُ حَوْلَ الْبَيْتِ مِثْلُ الصَّلَاةِ إِلَّا أَنْكُمْ تَتَكَلَّمُونَ فِيهِ، فَمَنْ تَكَلَّمَ فِيهِ فَلَا يَتَكَلَّمُ إِلَّا بِخَيْرٍ .)) (ترمذی، رقم: 960۔ نسائی، رقم: 2922)

”بیت اللہ کا طواف بھی نماز جیسی چیز ہے۔ البتہ اس میں ثم بات چیت کر لیتے ہو۔ پھر اس دوران جو شخص کوئی بات کرے تو اسے چاہیے کہ مناسب اور بھلی بات کہے۔“

یہ طواف صرف خانہ کعبہ ہی کا ہو سکتا ہے۔ اور یہ عبادت دنیا میں اور کہیں نہیں ہو سکتی، اس لیے اسے مقدم کر کے بیان فرمایا گیا۔

﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا أَوْنَاً وَأَرْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الشَّرِكَاتِ مَنْ أَمَنَ مِنْهُمْ بِإِلَهِهِ وَإِلَيْهِ الْيَوْمُ الْآخِرُ مَقَالٌ وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَّتُهُ قَلِيلٌ لَمَّا أَضْطَرَّهُ إِلَى عَذَابِ النَّارِ وَإِنَّهُ لِبَصِيرٌ﴾ (126)

اب اس آیت میں وہ واقعہ یاد دلایا جا رہا ہے، جب ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ تعمیر کرنے کے بعد یہ دعا مانگی تھی کہ: ”اے میرے رب! اس سرز میں کو امن کا گوارہ بنادے۔ اس میں رہنے والے اہل ایمان کو پھلوں، ہبزیوں اور انانج کا رزق عطا فرماء۔..... اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: میں امن اور روزی کی نعمت تو اس جگہ رہنے والے تیری نسل کے کافروں کو بھی دوں گا، مگر اس دنیا کی چند روہہ زندگی کے بعد ان کو آخرت میں دوزخ کی آگ کے عذاب میں ڈالوں گا جو بہت براثٹھ کانہ ہے۔

abraہیم علیہ السلام نے دعا میں صرف اہل ایمان کے لیے روزی کی دعا اس لیے کی تھی کہ ان کا خیال تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے میری اولاد میں سے صرف اہل ایمان کے لیے امامت و پیشوائی کا منصب مخصوص کر رکھا ہے تو ہو سکتا ہے، میری نسل

کے ظالم، مشرک اور کافر لوگوں کے لیے اس جگہ کے امن اور بہاں کی بابرکت روزی میں بھی کوئی حصہ نہ ہو۔ اس لیے انہوں نے ان کے حق میں دعائیں فرمائی۔

یاد رہے کہ کسے جیسی بے آب و گیاہ اور غیر ذی زرع وادی میں خانہ کعبہ کو آبادر کھنے اور وہاں حج اور دوسری عبادات کو پوری نیکوئی، دل جمی اور اطمینان سے ادا کرنے کے لیے امن و امان کی حالت اور بافراغت روزی کی خاص ضرورت تھی، جس کے لیے ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی تھی۔

اللّٰهُ تَعَالٰى نے اس ابراہیمی دعا کو قبول فرمایا اور ہزاروں سال سے خانہ کعبہ کو دارالاسکن قرار دے رکھا ہے اور وہاں کے رہنے والوں کو روزی کے بارے میں بھی پریشانی کا سامنا نہیں کرتا پڑا۔ آج بھی وہاں دنیا بھر کے پھل، انانج اور دوسری ضروریات زندگی و افراد مقدار میں میرا ہوتی ہیں۔ تھی کہ حج کے موسم میں جب وہاں لاکھوں افراد باہر سے آموجود ہوتے ہیں، تو ان کے رزق اور دوسری آسانیوں میں کوئی کمی دیکھنے میں نہیں آتی۔ حالاں کہ وادیٰ مکہ میں نہ کھیت ہیں، نہ باغات، نہ وہاں فصلیں اگتی ہیں اور نہ کوئی پھل پیدا ہوتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت اور دعائے ابراہیمی کا اثر دیکھیے کہ وہاں انسانی ضروریات کی ہر چیز مہیا ہے۔ صرف زمرم کے پانی میں اتنی برکت اور اس کی اتنی فراوانی ہے کہ ایک ہی کنوں دنیا کی ساری مسلم برادری کو پانی فراہم کرتا ہے اور اس کے سوتے بھی خلک نہیں ہوتے۔ الحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ

﴿وَإِذْ يَرْفَعُ إِرْهَمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْعِيلُ رَبَّنَا تَقْبَلُ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ
الْعَلِيمُ﴾ (127)

فرمایا، یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام اور ان کے صاحزوں کے حضرت اسماعیل علیہ السلام خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے اور دیواریں تعمیر کر رہے تھے، تو ان کے لبوں پر یہ دعا جاری تھی کہ اے ہمارے رب! ہماری اس خدمت کو قبول فرماء، ہم تیرا گھر بنا رہے ہیں۔ بے شک تو دعا میں سنتا اور دلوں کا حال جانتا ہے۔

اس سے پہلی آیت (126) میں صرف ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا ذکر تھا، اب اس دعا میں ان کے بیٹے اسماعیل علیہ السلام بھی شامل ہو گئے ہیں، جو اپنے باپ کی دعا پر آمین کہتے جاتے تھے۔

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ بیٹی کا کوئی حکم کرنے پر اس کی قبولیت کے لیے بھی دعا کرنی چاہیے۔ یہ سنت ابراہیمی ہے۔

﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَمِنْ ذُرْيَتَنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ
عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَابُ الرَّحِيمُ﴾ (128)

یہ بھی ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کی مشترک (COMMON) دعا تھی کہ: اے ہمارے رب! ہم دونوں کو اپنا سچا فرمان بردار بنالے، تاکہ ہم تیرے حکم پر لبیک کہا کریں۔ ہم دونوں کی اولاد میں سے ایک ایسی امت (امت مسلمہ) پیدا فرملانا ہم تیریکی صحیح فرمائیں اور ہمیں عبادت کا درست طریقہ سکھا دے۔ حج سے متعلق سارے

ارکان و افعال سمجھا دے۔ ہماری توبہ قبول فرما، ہماری لغزشیں معاف فرما۔ ہماری طرف رحمت کے ساتھ متوجہ ہو۔ تو ہی بندوں کی توبہ قبول کرنے والا اور حرم و شفقت کرنے والا ہے۔

﴿رَبَّنَا وَ أَبْعَثْتَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتَلَوَّ عَلَيْهِمْ أَيْتِكَ وَ يَعْلَمُهُمُ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُبَيِّنُ لَهُمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (129)

یہ ابراہیمی دعا کا آخری حصہ ہے کہ ہمارے رب! ہماری اولاد سے پیدا ہونے والی اس امت میں ایسا عظیم الشان رسول بھیجا جو ان کو تیری آئیں اور تیرا کلام پڑھ کر سنائے، تیری کتاب (قرآن مجید) کی تعلیم دے، ان کو حکمت و بصیرت کی باتیں..... حدیث و سنت..... سکھائے اور ان کو کفر و شرک اور ہر قسم کے گناہوں سے پاک کرے۔ بے شک تو غالب اور زبردست قوت والا ہے کہ اپنی قدرت اور اختیار سے جو چاہے کر سکتا ہے۔ اور تو حکیم ہے کہ جو کام بھی کرتا ہے وہ حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

اس طرح ابراہیم ﷺ نے اپنی دعا کو اللہ تعالیٰ کی ایسی صفات پر ختم کیا، جو ان کی معروضات کے مناسب حال تھیں۔ اس دعا میں جس عظیم الشان رسول کا ذکر ہے اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ ہیں۔ اس مقام پر ان کے تین اہم فرائض اور ذمہ داریاں بیان ہوئی ہیں:

1- تلاوت آیات:

یہ کہ نبی ﷺ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیات سنائیں، ان کو قدرتِ الہی کی نشانیاں بتائیں اور ان تک اللہ تعالیٰ کا کلام پہنچائیں۔

2- تعلیم کتاب و حکمت

یہ نبی ﷺ کی نبوت و رسالت کی دوسری ذمہ داری کا ذکر ہے۔ آپ ﷺ لوگوں کو کتاب اللہ کی تعلیم دیں۔ ان کو قرآن سکھائیں۔ اس کے احکام اور تعلیمات کی علمی و عملی تشریع فرمائیں۔ دین اور شریعت کی حکمت سمجھائیں اور ان میں روحاںی بصیرت پیدا کریں جس کا دوسرا نام حدیث و سنت اور اسوہ رسول اکرم ﷺ ہے۔

3- تزکیہ (تزکیۃ نفس)

یہ حضور ﷺ کی تیسرا پیغمبرانہ ذمہ داری کا بیان ہے کہ آپ ﷺ کا کام لوگوں کے اخلاق و عقائد کی اصلاح و درستی، ان کو کفر و شرک کی مجازت سے بچانا اور ان کو ہر قسم کے گناہوں سے پاک کرنا ہے، تاکہ وہ نیک، ہدایت یافتہ اور صالح افراد بن جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم ﷺ کی یہ دعا قبول فرمائی اور بعد میں ابراہیم ﷺ اور اسما علیل ﷺ، دونوں کی نسل سے اپنے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا اور امت مسلمہ برپا کر دی

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا

دعائے خلیل و نوید مسیحا

ہمارے ہاں کے مکرین حدیث کو اس آیت کے مضامین پر غور کرنا چاہیے جو نبی ﷺ کو محض قرآن پہنچانے والا پیغمبر سمجھتے ہیں اور حدیث و سنت کو دین سے خارج قرار دیتے اور اجماع امت کا انکار کرتے ہیں۔ اسی طرح مکرین حدیث کی نئی قسم کے لوگوں کو بھی اس آیت اور اس جیسی اس کی نظری آیات جیسے البقرہ 2:151۔ آل عمران 3:164۔ النساء 4:59۔ الجمعة 6:2 پر فکر و تدبر کرنا چاہیے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بس قرآن پہنچانے اور اس کی چند اصطلاحات جیسے صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم اور حج و عمرہ کی نشاندہی کرنے اور ان کی عملی شکل بنانے کے لیے بھیج گئے تھے۔ اس کے سوا آپ ﷺ کا کوئی حکم نہ جلت ہے اور نہ دین کا حصہ، خواہ وہ صحیح احادیث سے ثابت کیوں نہ ہو اور خواہ اس پر اجماع امت کیوں نہ ہو چکا ہو۔

وَ مَنْ يَرْعَبُ عَنِ الْمِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَّا مَنْ سَفَهَ نَفْسَهُ ۖ وَ لَقَدْ أَصْطَفَيْنَا
فِي الدُّنْيَا ۗ وَ إِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَوْلَى الصَّلِحِينَ ۝ إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ ۛ
قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ وَ وَصَّىٰ بِهَا إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَ يَعْقُوبُ ۝
يَبْيَنِيَ إِنَّ اللَّهَ أَصْطَفَنِي لَكُمُ الْدِّينَ فَلَا تُؤْتُنَ إِلَّا وَ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۝
أَمْ كُنْتُمْ شَهِدَاءً إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ
مِنْ بَعْدِيٍّ ۝ قَالُوا نَعْبُدُ إِلَهَكَ وَ إِلَهَ أَبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَ إِسْمَاعِيلَ وَ إِسْحَاقَ
إِلَهًا وَاحِدًا ۝ وَ نَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۝ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۝ لَهَا مَا
كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ ۝ وَ لَا تُشَدُّونَ عَلَيْاً كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

”ایسا کون ہے جو ابراہیمی دین کو ناپسند کرے؟ سوائے اس کے جس نے اپنے آپ کو بے وقوف بنا لیا ہو۔ ہم نے ابراہیم کو دنیا میں جبن لیا اور وہ آخرت میں نیک لوگوں میں سے ہوں گے۔

یاد کرو جب ان کے رب نے ان سے کہا: ”فرماں برداری اختیار کرو۔“ وہ پکارا تھے۔ ””میں رب العالمین کا فرمائیں بردار ہوں۔“ پھر ابراہیم ﷺ نے اور ان کے بعد یعقوب ﷺ نے اپنی اولاد کو یہی تاکید کی کہ ”اے میرے بیٹو! اللہ نے تمہارے لیے اس دین کو جبن لیا ہے۔ اس لیے مرتبے دم تک اسلام پر قائم رہنا۔“

(اے بنی اسرائیل!) کیا تم اس وقت موجود تھے، جب یعقوب ﷺ کی موت کا وقت قریب آیا اور انہوں نے

اپنے بیٹوں سے پوچھا: ”میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟“ وہ بولے: ہم اس معبود کی عبادت کریں گے، جس کی عبادت آپ اور آپ کے بزرگ ابراہیم ﷺ، اسماعیل ﷺ اور اسحاق ﷺ کرتے آئے ہیں۔ وہی سب کا ایک ہی معبود ہے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔“

یہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی۔ جو کچھ اس نے کمایا، اسے ملے گا، اور جو تم کمائے گے، تمہیں ملے گا۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ ان کے اعمال کیسے تھے؟“ (130:134)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

يَرِغَبُ عَنْ: (وہ ناپسند کرتا ہے): رَغْبَ فِي الشَّيْءِ کے معنی ہیں، کسی چیز کی رغبت کرنا، اسے پسند کرنا۔ لیکن رَغْبَتُ عَنْ کے معنی ہیں کسی چیز کو ناپسند کرنا یا اس سے نفرت کرنا۔

مَلَةُ إِبْرَاهِيمَ: (ابراہیم کا دین): اس سے ابراہیمی دین مراد ہے، جو توحید کا دین ہے۔

سَفَةُ نَفْسَهُ: اس کے معنی ہیں: اس نے اپنے آپ کو بے وقوف بنایا اور ذلیل و رسوا کیا۔ ((آذلہا وَاحْتَقَرَهَا))

إِضْطَفَيْنَا: (صرفی) یہ اصل میں إِضْطَفَيْنَا تھا۔ ’صاد‘ کی وجہ سے تبدل گیا ہے طالیں۔ إِضْطَفَی کے اصل معنی ہیں: کسی چیز کا خالص اور بہتر حصہ لے لینا۔ لیکن اس سے مراد ہوتی ہے کوئی چیز جن لینا، منتخب کر لینا۔

الْصَّالِحِينَ: یہ الْصَّالِحُ (نیک، تدرست) کی جمع ہے۔ اس کے معنی ہیں: نیک لوگ۔ کبھی اس سے مراد

انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی پوری جماعت بھی ہوتی ہے۔ اس مقام پر یہ لفظ پوری جماعت کے لیے آیا ہے، جیسا کہ یوسف ﷺ کی دعا میں بھی الْصَّالِحِينَ سے مراد پوری جماعت ہے:

﴿رَبِّ قَدْ أَتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَمْتَنِي مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ ۚ فَاطَّرَ السَّمَاوَاتِ وَ الْأَرْضَ ۖ أَنْتَ وَلِيٌ فِي الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَ الْحَقْنِي بِالصَّالِحِينَ﴾ (یوسف 12:101)

”اے میرے رب! تو نے مجھے حکومت بخشی۔ با توں کی تہہ تک پہنچنے کا علم عطا فرمایا۔ اے آسمانوں اور زمین کے بنانے والے! تو ہی میرا کار ساز ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ میں جب مروں تو فرماں برداری کی حالت میں اور دوبارہ اٹھوں تو تیرے نیک بندوں کے ساتھ۔“

عام نیک لوگوں کے لیے صالحین کا لفظ اس آیت میں ہے کہ:

﴿هُلُونَ تَكُونُوا صَلِحِينَ فَإِنَّهُ كَانَ لِلَّهِ أَوَّلَيْنَ غَفُورًا﴾ (بنی اسرائیل 17:25) ”اگر تم نیک ہو گے اور توبہ کرنے والے بنو گے تو اللہ معاف کرنے والا ہے۔“

أَسْلِمُهُ:..... یہ آسَلَمٌ يُسْلِمُ إِسْلَامًا سے فعل امر ہے، جس کے معنی ہیں: ”جھک جا“، یا ”فُرمان برداری اختیار کر“،
وَصْنِي:..... یہ توصیہ باب تفعیل سے ہے۔ اس کے معنی ہیں: وصیت کرنا، نصیحت کرنا۔ کسی کی خیر خواہی کرنا، کسی کام
کی تاکید اور تلقین کرنا، خواہ یہ کام کوئی آدمی اپنی روزمرہ زندگی میں کرے، یا مرتبے وقت کرے۔
الْيَتِينَ:..... اس جگہ اس سے مراد دین اسلام ہے، جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام انبیاء کے نزدیک تمام کادین ہے، جیسا کہ
فرمایا گیا۔

(آل عمران 19:3)

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَعْنَدُ اللَّهُ الْإِسْلَامُ﴾

”بے شک اللہ کے نزدیک سچا دین صرف اسلام ہے۔“

ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

﴿وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْغَيْرِينَ ۵۰﴾

(آل عمران 85:3)

”اور جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرتا ہے، اللہ اس کے دین کو ہرگز قبول نہ کرے گا اور وہ شخص
آخرت میں گھاٹے میں رہے گا۔“

شہدَاءُ:..... یہ شاہد اور شہید کی جمع ہے، جس کے معنی حاضر اور گواہ کے ہیں۔

حضرَ... الموتُ:..... موت کے حاضر ہونے کا مطلب ہے: موت کے آثار غافر ہونا یا کسی شخص کا قریب المُرگ ہونا۔

﴿وَمَنْ يَرْعَبُ عَنْ مَلَكَةِ إِرْبَاهِمَ إِلَّا مَنْ سَفَهَ نَفْسَهُ ۚ وَلَقَدْ أَصْطَفَيْنَا فِي الدُّنْيَا ۗ
وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَكُمَّ الْصِّلْبُونَ ۚ﴾ (130)

فرمایا، آج یہود و نصاری اور مشرکین قریش، سب کا دعویٰ ہے کہ وہ ملیٰت ابراہیم ﷺ کے دین پر ہیں، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ ان لوگوں نے اپنے آپ کو ملیٰت ابراہیم سے دور کر لیا ہے۔ وہ ابراہیم ﷺ کے عقیدہ توحید کو یا تو فراموش کر کچے ہیں، یا اسے ناپسند کرتے ہیں۔ پھر یہ دعویٰ کیسے کر سکتے ہیں کہ وہ ابراہیم دین کے پیروکار ہیں۔ ابراہیم دین تو ایسا ہے جس سے پھرنے والا اپنے آپ کو بے وقوف بنتا اور خود کو ذلیل و خوار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم ﷺ کو نبوت کے کام کے لیے جن لیا تھا۔ ان کو دنیا کی امامت و پیشوایت کا مقام و مرتبہ حاصل تھا۔

اللَّهُجَادُونَ نے ان کو اپنا دوست ”ظَلِيلُ اللَّهِ“ قرار دیا تھا جیسا کہ سورہ النساء میں ہے:

﴿وَاتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا ۝﴾ (النساء 4:125)

”اور اللہ نے ابراہیم ﷺ کو اپنا دوست بنالیا تھا۔“

وہ توحید پرست تھے، شرک سے بیزار تھے اور آخرت میں ان کا شمار اللہ کے نیک لوگوں کے زمرے میں ہو گا۔

﴿إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ ۖ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝﴾ (131)

فرمایا، ابراہیم علیہ السلام کے جذبہ اطاعت گزاری کا حال یہ تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی فرمان برداری کا حکم دیا تو انہوں نے اس کے بر حکم کی تعیل کی۔ وہ اپنے رب العالمین کے سچے فرمان بردار اور اطاعت گزار تھے۔ ان کے دین کی پیروی کا دعویٰ کرنے والے یہود، نصاریٰ اور مشرکین قریش میں اللہ تعالیٰ کی وہ فرمان برداری اور اطاعت گزاری کہاں جو ابراہیم علیہ السلام میں تھی۔ بلکہ ان جھوٹے یہود کاروں کا دین کیا ہے؟ سرکشی، نافرمانی، گراہی، شرک، کفر اور بت پرستی۔

﴿وَّ وَصَّلِيْ بِهَا إِبْرَاهِيمَ بَنَيْهُ وَ يَعْقُوبَ طَيْبَنَى إِنَّ اللَّهَ أَصْطَفَ لِكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُؤْتَنَّ إِلَّا وَ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴾ (132)

فرمایا، اہل کتاب کو جن نبیوں ابراہیم علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہونے پر فخر و ناز ہے، ان کا ندھب نہ یہودیت تھا اور نہ نصرانیت۔ نہ وہ یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ وہ دین توحید، اسلام کو مانتے والے تھے۔ وہ خود ساری عمر اس دین پر قائم رہے اور مرتبے وقت انہوں نے اپنی اولاد کو بھی یہ وصیت فرمائی تھی کہ: تمہیں اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اسی دین کے مطابق گزارنا ہے اور جب تمہارا آخری وقت آجائے تو تمہاری حالت یہ ہونی چاہیے کہ تم اسی دین کی یہودی کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان بردار ہو۔

**﴿أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءً إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمُوْتُ إِذْ قَالَ لِيَنِيْهُ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِيْ ﴾
قَاتُوا نَعْبُدُ إِلَهَكُمْ وَإِلَهُنَا إِبْرَاهِيمُ وَإِسْمَاعِيلُ وَإِسْحَاقُ إِلَهًا وَاحِدًا وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴾ (133)**

اب اہل کتاب کو جھنجور کر بتایا گیا کہ کیا یعقوب علیہ السلام نے تمہیں یہودیت یا نصرانیت کی تعلیم دی تھی؟ کیا تم اس موقع پر موجود تھے جب یعقوب علیہ السلام کی موت کا وقت قریب آیا اور انہوں نے اپنے بیٹوں کو پاس بلا کر ان سے پوچھا تھا کہ: میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟، بیٹوں نے جواب دیا تھا: ہم اسی ایک معبود کی عبادت کریں گے جس کی عبادت آپ ساری عمر کرتے رہے اور جس کی عبادت آپ کے آباء و اجداد ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق علیہم السلام کرتے رہے۔ ہم کبھی شرک نہیں کریں گے۔

یاد رہے یہ وصیت آج بھی یہودی مذہبی لشکر پر میں موجود ہے۔

اس جگہ یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے اسماعیل علیہ السلام کو بھی یعقوب علیہ السلام کا باپ کہا ہے، حالاں کہ وہ ان کے پچھا تھے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: پچھا بھی باپ کے برابر ہوتا ہے:

((عَمُ الرَّجُلِ صَنْوُأَبِيهِ)) (صحیح مسلم، رقم: 2277۔ ترمذی، رقم: 3760)

”آدمی کا پچھا اس کے باپ کے برابر ہے۔“

یاد رہے کہ ایک ہی جڑ سے نکلنے والے پوتوں یا درختوں میں سے ہر ایک دوسرے کا صنو کھلاتا ہے۔ (الرعد: 4:13) اس کے علاوہ عرب کے لوگ پچھا کو بھی باپ کہہ دیتے تھے۔

﴿تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ (134)

یہ اہل کتاب بالخصوص یہود سے فرمایا گیا کہ دیکھو، وہ نبیوں کی ایک جماعت تھی، جس میں ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب علیہم السلام شامل تھے۔ وہ لوگ دنیا سے رخصت ہو چکے۔ ان کے اعمال کی جزا اوسرا صرف ان کو ملے گی اور تمہیں اپنے اعمال کی جزا اوسرا ملے گی۔ آخرت میں ان کی کوئی نیکی، یا ان سے نسلی نسبت تمہارے کچھ کام نہ آ سکے گی۔

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَى تَهْتَدُوا طَقْلُ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا طَوْمَا
كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٣٥﴾ قُولُوا أَمْنَا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْ
إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَى وَ
عِيسَى وَمَا أُوتِيَ التَّيِّيُونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَ
نَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿١٣٦﴾ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَإِنْ
تَوَلُّو فَإِنَّهُمْ فِي شِقَاقٍ فَسَيَكْفِيكُمُ اللَّهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٣٧﴾
صِبْغَةَ اللَّهِ وَمَنْ أَحْسَنْ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً وَنَحْنُ لَهُ عِبْدُوْنَ ﴿١٣٨﴾
قُلْ أَتُحَاجِّوْنَا فِي اللَّهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَنَا آعْمَالُنَا وَلَكُمْ آعْمَالُكُمْ
وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُوْنَ ﴿١٣٩﴾ أَمْ تَقُولُوْنَ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَ
يَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا أَوْ نَصَارَى طَقْلُ إِنْتُمْ أَعْلَمُ أَمْ اللَّهُ
وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللَّهِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ
عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿١٤٠﴾ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ طَوْمَا
وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٤١﴾

”اور وہ کہتے ہیں: ”ہدایت چاہیے تو یہودی یا عیسائی ہو جاؤ۔“ (اے نبی ﷺ) آپ ﷺ کہیں: ”نہیں، بلکہ (ہدایت کے لیے) ابراہیم علیہ السلام کا دین اختیار کرو، جو اللہ کی طرف یکسوچھے، مشرک نہ تھے۔“

(مسلمانو) تم کہو ”ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، اس کتاب پر جو ہماری طرف نازل ہوئی اور اس پر جو کچھ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد پر نازل ہوا اور اس پر جو کچھ موسیٰ علیہ اور دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے عطا کیا گیا۔ ہم ان میں سے کسی نبی کا انکار نہیں کرتے اور ہم اللہ کے فرمان بردار ہیں۔“ اگر یہ (اہل کتاب) بھی اسی طرح ایمان لا سیں جس طرح تم ایمان لائے ہو، پھر وہ بھی ہدایت پا گئے۔ لیکن اگر وہ منہ موڑیں تو پھر وہ ضد میں اڑے ہوئے ہیں۔ (اے نبی ﷺ) ان کے مقابلے میں اللہ آپ ﷺ کے لیے کافی ہے۔ جو ہر بات کو سنبھالا اور سب کچھ جانے والا ہے۔

(مسلمانو) تم (اہل کتاب) سے کہو: ”ہم نے اللہ (کے دین) کا رنگ قبول کر لیا۔ اور اللہ کے رنگ سے بہتر کس کا رنگ ہے؟ ہم اسی اللہ کی عبادت کرنے والے ہیں۔“ (اے نبی ﷺ) آپ ﷺ ان سے کہیں: کیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھوٹتے ہو حالاں کہ وہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں۔ اور ہم ہر کام میں صرف اللہ کی رضا چاہتے ہیں۔

(اے اہل کتاب) کیا تم یہ کہتے ہو کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد، یہ سب یہودی یا عیسائی تھے؟ (اے نبی ﷺ) آپ ﷺ ان سے کہیں: ”تم زیادہ جانتے ہو، یا اللہ زیادہ جانتا ہے؟“ اور اس سے بڑا ظالم کون ہو گا جو اس کی گواہی کو چھپا دے، جو اللہ کی طرف سے اس کے پاس آئی ہو! اور (اہل کتاب) جو کچھ تم کر رہے ہو، اللہ اس سے بے خبر نہیں۔ اور وہ تو ایک جماعت تھی جو گزر جکی۔ جو کچھ اس نے کیا، اسے ملے گا اور جو کچھ تم کماو گے تمہیں ملے گا۔ تم سے یہیں پوچھا جائے گا کہ ان کے اعمال کیسے تھے؟“ (135-141)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

حَيْثِيفَا:..... اس کے اصل معنی ”مائل ہونے والا“ یا ”جھکنے والا“ کے ہیں۔ اس سے مراد وہ آدمی ہوتا ہے، جو ہر طرف سے منہ موڑ کر صرف ایک اللہ کا ہو رہے۔

أَسْبَاطُ:..... یہ سبسطی کی جمع ہے۔ اس سے مراد یعقوب علیہ السلام کی وہ اولاد ہے جو بارہ (12) بیٹوں پر مشتمل تھی۔

لَا نُفُرِّقُ بَيْنَ أَهْلِ مِنْهُمْ:..... (ہم ان میں سے کسی ایک کا بھی فرق نہیں کرتے)۔ گویا ہم نبیوں میں کوئی تفریق نہیں کرتے کہ کسی کو نامیں اور کسی کو نہ مانیں۔ بلکہ ان میں سے کسی ایک کی نبوت کا بھی ہم انکار نہیں کرتے۔

قرآن نے اسی بات کو دوسری جگہ یوں بیان فرمایا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِيَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِيَعْضٍ لَا وَيُؤْمِنُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيلًا هُمُ الْكُفَّارُ وَنَحْنُ حَقَّاءٌ وَأَعْتَدْنَا لِلْكُفَّارِ عَذَابًا مُهِينًا﴾ (النساء: 4: 150, 151)

”بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ رسولوں کو چھوڑ کر صرف اللہ کو مانیں اور کہتے ہیں: ”ہم بعض رسولوں کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے“، اور وہ چاہتے ہیں کہ کفر اور اسلام کے درمیان کوئی اور راہ نہ کالیں، ایسے لوگ پکے کافر ہیں، اور ہم نے کافروں کے لیے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔“

یہ تفہیم میں الرسل کیا ہے؟ یہ کہ بعض رسولوں اور نبیوں کو مانا جائے اور بعض کی نبوت و رسالت سے انکار کیا جائے اور یہ چیز کفر ہے۔ بلکہ کسی ایک نبی کا انکار بھی سب کا انکار ہے۔ رہا انبیاء و رسول کے درجات اور فضائل کا معاملہ تو ان میں بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿تَلَكَ الرَّسُولُ فَضَلَّنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ﴾ (البقرہ: 2: 253)

”ہم نے پیغمبروں میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔“

شَفَاقٌ: یہ شفق سے ہے، جس کے معنی پہلو یا کروٹ کے ہیں۔ گویا، وہ لوگ جو ایک دوسرے سے پہلو ہی کرتے، منہ موڑتے اور ایک دوسرے سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے اور آپس میں ضد، نفرت اور دشمنی رکھتے ہیں۔
صِبْغَةُ اللَّهِ: (اللہ کا رنگ)۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا دین اسلام مراد ہے۔ صبغۃ کے منصوب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے کوئی لفظ مخدوف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اس حذف کو کھوں دیا ہے۔

تُحَاجُونَا: (تم ہم سے جھگوتتے ہو)۔ اس کا مادہ حجج ہے۔ اس کا مصدر محااجہ (باب مفاعله) ہے۔ جس کے معنی ہیں: جھجٹ و دلیل کے ساتھ ایک دوسرے سے جھگٹنا اور بحث و مباحثہ کرنا۔

فِي اللَّهِ: اس کے معنی ہیں، اللہ کے بارے میں۔ بعض لوگوں نے اس کا ترجمہ ”فِي سَبِيلِ اللَّهِ“ (اللہ کی راہ میں، اللہ کے واسطے، اللہ کی خاطر کیا ہے) جو عربیت کے خلاف ہے۔

مُخْلِصُونَ: یہ اخلاص سے اسم فاعل ہے۔ اس کے معنی ہیں، توحید کو ماننے والے، ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشودی چاہنے والے۔ اپنے ہر عمل کو خالص لی وجہ اللہ کرنے والے۔

﴿وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَى تَهْتَدُوا قُلْ بَلْ مِلَّةُ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ (135)

فرمایا، یہود کا دعویٰ ہے کہ صرف یہودیت ہی صحیح مذہب ہے اور اسی کو اختیار کرنے سے ہدایت ملتی ہے۔ اسی طرح نصاریٰ کا بھی دعویٰ ہے کہ صرف نصرانیت (عیسائیت) ہی صحیح مذہب ہے اور اسی کو اختیار کرنے سے ہدایت ملتی ہے۔ اللہ

تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ ان دونوں گروہوں سے کہہ دیجیے کہ ہم لوگ تو اس ابراہیم ﷺ کے دین کو مانتے ہیں جو توحید پرست تھے، مشرک نہ تھے۔ تم دونوں گروہوں کو اس سے انکار بھی نہیں کہ ابراہیم ﷺ کا دین ہی صحیح دین تھا اور وہ ہدایت پر تھے۔

اس آیت میں اہل کتاب کے دونوں گروہوں یہود و نصاری کے شرک پر تعریض اور چوت ہے۔ جو ابراہیمی دین کے پیروکار ہونے کا دعویٰ تو کرتے تھے، مگر حالت یہ تھی کہ ایک گروہ نے عزیز ﷺ کو اور دوسرے نے عیسیٰ ﷺ کو اللہ کا بیٹا بنایا تھا، اس وجہ سے ان دونوں نے شرک کا ارتکاب کیا تھا۔ جب کہ ابراہیم ﷺ شرک کے سخت مخالف اور سچے توحید پرست تھے، جنہوں نے بت شکنی کر کے شرک کے خلاف جہاد کیا تھا۔

فرمایا، اب ابراہیمی دین کے اصل پیروکار یہود و نصاری نہیں ہیں، بلکہ نبی ﷺ اور آپ ﷺ پر ایمان لانے والے لوگ ہیں۔

﴿ قُولُوا أَمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ وَمَا أُوتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رِزْقِهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَهَدٍ قِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴾ (136)

اس سے پہلے نبی ﷺ کو خطاب کر کے حکم دیا گیا کہ آپ ﷺ ان یہودیوں اور عیساییوں کو بتا دیں کہ تم ابراہیمی دین پر نہیں ہو بلکہ ہم ابراہیمی دین پر ہیں۔

اب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ بھی اہل کتاب کو بتا دیں کہ دیکھو، ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، ہماری طرف جو قرآن نازل ہوا ہے، ہمارا اس پر بھی ایمان ہے۔ ہم ان سب کتابوں، صحفوں اور اس وحی کو برحق مانتے ہیں، جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب ﷺ اور ان کی اولاد کی طرف بھیجی گئی اور اس کو بھی جو وحی و ہدایت موی، عیسیٰ ﷺ اور دوسرے نبیوں کی طرف بھیجی گئی۔ ہم ان تمام انبیائے کرام کو مانتے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے نبوت عطا فرمائی۔ ہم کسی ایک نبی کا بھی انکار نہیں کرتے اور ہم صرف اللہ تعالیٰ کے فرمائ بردار ہیں۔

اس آیت میں بھی یہود و نصاری پر تعریض ہے، جو اللہ تعالیٰ کے بعض نبیوں کو مانتے اور بعض کا انکار کرتے تھے۔ جیسا کہ یہودیوں نے عیسیٰ ﷺ اور حضرت محمد ﷺ کے نبی ہونے کا انکار کیا اور عیساییوں نے حضرت محمد ﷺ کی نبوت کو تسلیم نہیں کیا۔

﴿ فَإِنْ أَمْنُوا بِمِثْلِ مَا أَمْنَתُهُ بِهِ فَقَرَاهُتْنَ وَإِنْ تَوَلُّوْا فَإِنَّا هُنَّ فِي شَقَاقٍ قَسَيْكُنْفِنْ كَهْمُهُ اللَّهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴾ (137)

یہ بھی اہل ایمان سے کہا گیا کہ تمہاری دعوت پر اگر یہ اہل کتاب بھی یہودیت اور عیساییت چھوڑ کر اسی طرح ایمان لے آئیں جیسے تم ایمان رکھتے ہو۔ وہ اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان لا سکیں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں، کسی کو اللہ

کی اولاد نہ مانیں، اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے تمام نبیوں اور رسولوں پر ایمان لا کیں اور ان کے بتائے ہوئے پچے دین کی پیروی کریں تو پھر وہ ہدایت پا گئے اور آخرت میں محاجات کے حق دار ہوں گے۔ لیکن اگر وہ اس طرح سے سچا ایمان نہ لا کیں تو سمجھو لو، وہ تمہاری مخالفت اور دشمنی پر اڑے ہوئے ہیں۔ پھر ان کے مقابلے میں تمہارے لیے اللہ کافی ہے۔ وہی تمہارا حامی و ناصر ہے، جو ہر بات سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔

بعد میں اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ اس طرح پورا ہوا کہ یہودیوں کی چالوں اور مخالفتوں کے باوجود اللہ سبحانہ نے اپنے نبی ﷺ اور اہل ایمان کی مدد فرمائی۔ وہ یہودیوں اور عیسایوں پر غالب آئے اور پورے جزیرہ العرب میں اسلام کا بول بالا ہو گیا۔

اس آیت سے فقہائے اسلام اور اہل علم نے تعامل صحابہ اور اجماع امت کے جھٹ ہونے پر استدلال کیا ہے، جو بالکل درست ہے۔ کیونکہ اس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ اہل کتاب کا صرف وہی ایمان معتبر سمجھا جائے گا جو وہ صحابہ کرام جیسا ایمان لا کیں گے اور جسے اللہ تعالیٰ کے ہاں قبولیت حاصل ہے۔

﴿صِبْغَةُ اللَّهِ۝ وَ مَنْ أَحْسَنْ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً۝ وَ نَحْنُ لَهُ عِذْدُونَ﴾ (138)

فرمایا، مسلمانوں کو کہہ دینا چاہیے کہ ہم نے اللہ کا رنگ یعنی اس کا دین اسلام قبول کر لیا ہے، جس سے بہتر کوئی دین نہیں ہو سکتا اور ہم صرف اسی اللہ کی عبادت کرنے والے ہیں۔

اس میں صبغۃ (رنگ) کا لفظ یہودیوں اور عیسایوں کی ایک مذہبی رسم پر تعریض اور چوٹ ہے۔

یہودیوں میں یہ رسم تھی کہ جب کوئی شخص ان کا نہ ہب اختیار کرتا تو وہ اسے غسل دیا کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس طرح وہ شخص گناہوں سے بالکل پاک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے نومولود بچوں کو بھی غسل دیا کرتے تھے۔

بعد میں عیسایوں نے بھی اس رسم کو اختیار کر لیا کہ جو شخص عیسائیت میں داخل ہوتا، اسے گناہوں سے پاک کرنے کے لیے زرد رنگ ملے پانی سے غسل دیتے تھے۔ اس کے علاوہ بچوں کو بھی ان کی پیدائش کے بعد اسی رنگ دار پانی سے نہلا کر انہیں پاک عیسائی بناتے تھے۔ یہ رسم ان کے ہاں اصطلاح غایاپتیسم (BAPTISM) کہلاتی تھی۔

﴿قُلْ اتَّحَاجُونَا فِي اللَّهِ وَ هُوَ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ۝ وَ لَنَا آعْمَالُنَا وَ لَكُمْ آعْمَالُكُمْ۝ وَ نَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ﴾ (139)

فرمایا، اے نبی ﷺ! آپ ﷺ ان اہل کتاب سے کہہ دیجیے کہ جہاں تک اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے، وہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ ہم بھی اسی کے بندے ہیں اور تم بھی اسی کے بندے ہو۔ پھر یہ دعویٰ کیوں کرتے ہو کہ وہ اپنے کچھ بندوں کی طرف نبی اور رسول بھیج سکتا ہے اور کچھ کی طرف نہیں بھیج سکتا۔ پھر یہ جھگڑا ہمارے اور تمہارے درمیان نہیں رہتا، بلکہ تمہارے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہو جاتا ہے۔ تم اللہ تعالیٰ سے پوچھو اور اس سے جھگڑا کرو کہ کیوں اس نے تمہارے دعوے کے برابر خلاف بنی اسرائیل کی بجائے بنی اسماعیل میں سے اپنا آخری نبی اور رسول مبعوث کیا ہے؟

اب اللہ تعالیٰ ہی قیامت کے دن ہمیں ہمارے اعمال کا اور تمہیں تمہارے اعمال کا بدلہ دے گا۔ ہم تو عقیدہ توحید پر قائم رہتے ہوئے اپنے تمام اعمال صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں، اس لیے ہم اللہ سبحانہ سے بہتر بدلے کی توقع رکھتے ہیں۔

﴿أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْعَيْلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰۚ
قُلْ إِنَّمَا أَنْتُمْ أَعْلَمُ مَمَّنْ كُنْتُمْ شَهَادَةً عِنْدَكُمْ مِنَ اللَّهُۤ وَمَا اللَّهُۤ
يُغَافِلُ عَمَّا تَعْمَلُونَ﴾ (140)

اہل کتاب کا دعویٰ تھا کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور یعقوب ﷺ کی اولاد سب یہودی یا عیسائی تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ سے فرمایا کہ ان سے پوچھیں: کیا ان بزرگوں کے دین کے بارے میں تم لوگ زیادہ جانتے ہو یا اللہ زیادہ جانتا ہے کہ ان کا دین یہودیت یا عیسائیت تھی، یا کہ اسلام تھا؟ ان بزرگوں کے بہت بعد موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی تھی، جن کی نسبت سے تم لوگوں نے یہودیت یا نصرانیت اختیار کر لی۔ اس لیے ان بزرگوں کا یہودیت یا عیسائیت سے کوئی واسطہ نہ تھا، بلکہ ان کا اپنا دین صرف اسلام تھا، جواب حضرت محمد ﷺ اور آپ ﷺ پر ایمان لانے والوں کا دین ہے۔

پھر فرمایا، یہ اہل کتاب کتنے بڑے ظالم ہیں، جن کے پاس توریت اور انجیل میں حضرت محمد ﷺ کی نبوت کی بشارتیں موجود ہیں، مگر وہ اس کھلی شہادت اور گواہی کو چھپاتے ہیں۔

آخر میں فرمایا کہ اہل کتاب جو کہ مان حق کے مرکب ہیں، حق کو چھپاتے ہیں، اصل حقیقت پر پرده ڈالتے ہیں، وہ لوگوں کو ان پیش گویوں سے بے خبر رکھنا چاہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے بارے میں تھیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ ان کی ایسی حرکتوں اور شرارتوں سے ہرگز بے خبر نہیں ہے اور وہ ان کے جرائم پر ان کو سخت سزا دے گا۔

﴿تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ دَخَلْتُ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ۝ وَ لَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا
يَعْمَلُونَ﴾ (141)

بالکل یہی آیت اور اس کی تفسیر اس سے پہلے آیت 134 کے تحت گزر چکی ہے، وہاں دیکھ لی جائے۔

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا
عَلَيْهَا لَقُلْ لِلَّهِ الْمَشْرُقُ وَالْمَغْرِبُ طَيْهِدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطِ مُسْتَقِيمٍ ۝
وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شَهَادَةً عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ
عَلَيْكُمْ شَهِيدًا وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَبَعِّ
الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقِلِبُ عَلَى عِقْبَيْهِ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ
هَدَى اللَّهُ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيقَ إِيمَانَكُمْ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝

”بے وقوف لوگ کہیں گے، مسلمان اپنے قبلے سے کیوں پھر گئے؟“

(اے نبی ﷺ) آپ ﷺ ان سے کہہ دیں: مشرق اور مغرب اللہ کے ہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے، سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔ (مسلمانوں) ہم نے تمہیں افضل امت بنایا تاکہ تم دوسروں کے لیے دین حق کے گواہ بن جاؤ۔ اور یہ رسول ﷺ ارے لیے دین حق کی گواہی دیں۔

پہلا قبلہ ہم نے اس لیے مقرر کیا تھا تاکہ یہ ظاہر کر دیں، کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اللہ کے پاؤں پھر جاتا ہے؟ بے شک قبلے کی تبدیلی اللہ کے ہدایت یافتہ لوگوں کے سواب پر گراں گز ری ہے۔ اور اللہ تمہارے ایمان یعنی نمازوں کو ضائع نہیں کرے گا۔ یقیناً اللہ اپنے بندوں پر شفقت کرنے والا مہربان ہے۔“ (143-142)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

سُفَهَاءُ: یہ سفیہی کی جمع ہے، جس کے معنی بے وقوف، نادان اور حمق کے ہیں۔

قِبْلَةُ: یہ مقابلۃ سے ہے، جیسے مُوَاجِهَةٌ سے وِجْهَةٌ (طرف، جانب، رخ) ہے۔ قبلہ کے اصل معنی ایسی حالت کے ہیں جب کوئی چیز کسی کے بال مقابل ہوتی ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوتے ہیں۔ بعد میں اس لفظ کے معنی اس جانب یا طرف کے ہو گئے جدھر کوئی شخص نماز کے وقت منہ کرتا ہے۔

أُمَّةٌ وَسَطًا: وَسَطُّ بھی ولد اور بشر کی طرح واحد، جمع، مذکور اور موئث سب کے لیے آتا ہے۔ اس کے اصل معنی کسی چیز کے درمیانی حصے کے ہیں۔ سیمیں سے اس میں ”بہترین“ کے معنی پیدا ہو گئے، کیونکہ عام طور پر کسی چیز کا درمیانی حصہ ہی بہترین ہوتا ہے۔ اس لیے وَسَطُّ، اوَسَطُ اور وُسْطِی کے معنی ”بہترین“ کے ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں باغ والوں کے قصے میں ہے کہ:

﴿قَالَ أَوْسَطُهُمْ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ لَوْلَا تُسْبِحُونَ﴾ (القلم: 68)

”ان میں سے جو بہتر آدمی تھا، اس نے کہا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم لوگ اللہ (کاشکر اور اس) کی تسبیح کیوں نہیں کرتے؟“

صحیح بخاری میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((فَإِذَا سَأَلْتُمُ اللَّهَ فَاسْتَلُوْهُ الْفِرْدَوْسَ فَإِنَّهُ أَوْسَطُ الْجَنَّةِ وَأَعْلَى الْجَنَّةِ))

”جب تم اللہ تعالیٰ سے مانگو تو فردوس مانگو، کیونکہ وہ بہترین اور اعلیٰ جنت ہے۔“

اس حدیث میں اوسط کا لفظ بہترین کے معنوں میں ہے، درمیانی کے معنوں میں نہیں ہے۔

بعض حضرات نے اُمّۃ وَسَطًا کا ترجمہ ”درمیانی امت“ یا ”بین کی امت“ کیا ہے، جو ہمارے نزدیک درست نہیں ہے، کیونکہ امت مسلمہ، جس کا اس مقام پر ذکر ہے، وہ کوئی درمیانی یا بین کی امت نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ﷺ کی آخری امت ہے، جیسا کہ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے شاکر:

((نَحْنُ الْأَخْرُونَ السَّابِقُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ.....))

(صحیح بخاری، رقم: 876۔ صحیح مسلم، رقم: 1978)

”هم آخری امت ہیں، لیکن قیامت کے دن سب سے آگے اور مقدم ہوں گے۔“

لِنَعْلَمْ: یہ عِلْمَ يَعْلَمْ سے ہے۔ اس کے کئی معنی ہیں جیسے: جانتا، متعین اور معلوم کر لینا، اتیاز کرنا اور ظاہر کرنا۔ اس جگہ سے ظاہر کرنے کے معنوں میں آیا ہے تاکہ یہ بات سب لوگوں پر ظاہر ہو جائے۔ ویسے اللہ تعالیٰ کو کسی چیز کے مستقبل کے بارے میں اسی طرح علم ہوتا ہے جیسے اس کو اس کے پاس کا علم ہوتا ہے۔

﴿سَيَقُولُ الْسُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَمْهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا﴾ (142)

رسول اللہ ﷺ ہجرت کے بعد مدینے میں سولہ یا سترہ میہنے تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ اس کے بعد کعبے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم آ گیا۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔ (صحیح بخاری، رقم: 399، 40، 4492، 4486)

قبلے کی اس تبدیلی پر منافقین، مشرکین اور بالخصوص یہودیوں نے اعتراض کیا تو اس کا یہ جواب دیا گیا کہ:

﴿قُلْ إِلَيْهِ الْمَشْرُقُ وَالْمَغْرِبُ مَا يَهْدِي مِنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطِ مُسْتَقِيمٍ﴾ (142)

فرمایا، بے وقوف لوگ قبلے کی تبدیلی پر اعتراض کریں گے مگر وہ یہ بات نہیں جانتے کہ مشرق ہو یا مغرب، ساری مسمیں اللہ تعالیٰ کی ہیں۔ کسی ایک سمت کو کسی دوسرے سمت پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ اللہ سبحانہ جس سمت کی طرف چاہے، اپنے بندوں کو عبادت کے وقت رخ کرنے کا حکم دے۔ اصل مقصود کوئی مخصوص سمت نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے

حکم کی پیروی اور اطاعت مطلوب ہے۔ جو بے وقوف لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام پر اعتراض کرتے ہیں ان کو گمراہی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اس کے بر عکس جو لوگ اللہ تعالیٰ کے حکموں پر چلتے ہیں، وہ ہدایت کی سیدھی راہ پر ہوتے ہیں۔

﴿وَ كَذَلِكَ جَعَلْنَا أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُونُ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا﴾

(143)

اب مسلمانوں سے فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی خاص نعمتوں سے نوازا چاہتا ہے۔ اسی لیے اس نے تم کو ایمان لانے اور اسلام کی سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق دی ہے۔ اس نے تمہیں ”امت وسط“ یعنی افضل اور بہترین است ہونے کا شرف عطا کیا ہے، جیسا کہ فرمایا:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجْتُ لِلنَّاسِ﴾

(آل عمران: 3)

”تم وہ بہترین امت ہو جسے لوگوں کی رہنمائی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔“

یہ انعامات دینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے تم پر کچھ ذمہ داریاں ڈالی ہیں۔ اب تمہیں اس دنیا میں اپنے قول فعل سے حق کی گواہی دینی ہے۔ تم آخری نبی ﷺ کی آخری امت ہو۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم دوسرے تمام انسانوں تک دین اسلام کی دعوت پہنچا دو۔ خود رسول اللہ ﷺ بھی اپنے قول فعل سے شہادت حق کا فریضہ ادا فرمائیں گے۔ معلوم ہے، اسی فریضے کی ادائیگی کا اعلان حضور ﷺ نے جنت الوداع کے موقع پر فرمایا تھا کہ:

(اکاً هَلْ بَلَغْتُ؟ قَالُوا: نَعَمْ) (صحیح بخاری، رقم: 1741)

”کیا میں نے (اللہ کا پیغام تم تک) پہنچا دیا؟ وہ (صحابہ) بولے: جی ہاں۔“

دنیا میں شہادت حق کی ذمہ داری ادا کرنے کے بعد آخرت میں جب دوسرے انبیاء کرام کی اشیاء کے کرام کی اشیاء یہ دعوی کریں گی کہ ان تک نبیوں نے دین کی دعوت نہیں پہنچائی تھی تو نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کی امت مسلمہ کی طرف سے اس بات کی شہادت دی جائے گی کہ واقعی انبیاء علیهم السلام نے اپنی اپنی امت کو دین کی دعوت پہنچائی تھی۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مردی حدیث موجود ہے۔ (صحیح بخاری، رقم: 3339، 4487، 7349)

﴿وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَى عَقْبَيْهِ﴾

وَ إِنْ كَانَتْ لَكَمْبِرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ (143)

قبلے کی تبدیلی یا تحولی قبلہ دوبارہ ہوئی ہے:

پہلی بار بھرت کے فوراً بعد مدینے میں جب خانہ کعبہ کی بجائے بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا گیا۔ دوسری بار اس وقت جب انداز اڑیزہ برس گزر جانے کے بعد بیت المقدس کی بجائے دوبارہ خانہ کعبہ کو قبلہ مقرر کیا گیا۔ اس آیت میں اسی کا ذکر ہے۔

اس طرح پہلے اہل عرب مسلمانوں کی آزمائش ہوئی کہ ان کے لیے وطنی قبلے خانہ کعبہ کی بجائے بیت المقدس کو قبلہ

بنا گیا۔ پھر اہل کتاب مسلمانوں کا امتحان لیا گیا اور ان کے خاتمی اور نسلی قبلہ بیت المقدس کی بجائے خانہ کعبہ کو قبلہ قرار دیا گیا۔ آن آزمائشوں کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ کے سچے پیر و کاروں کو وطنی اور نسلی تعصبات سے پاک کر دیا گیا جو کہ صحیح ہدایت کی راہ ہے۔

﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضْعِفَ إِيمَانَكُمْ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَوَّهُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ (143)

اب تحویل قبلہ کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ جو لوگ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھتے رہے اور اس دوران میں دنیا سے رخصت ہو گئے، تو کیا ان کو ان نمازوں کا ثواب ملے گا جو بیت المقدس کی طرف رخ کر کے پڑھی گئیں؟ صحیح بخاری میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تحویل قبلہ سے پہلے کئی آدمی فوت یا شہید ہو گئے تھے۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ ان کے بارے میں کیا کہیں تو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں نازل فرمادیا کہ:

﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضْعِفَ إِيمَانَكُمْ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَوَّهُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ (صحیح بخاری، رقم: 4486)

اس کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ جو کہ شفقت کرنے والا اور حم وala ہے، اُس کی طرف سے ایسے تمام لوگوں کو ان کی نمازوں کا اجر ملے گا۔ گویا اس جگہ نماز کو ایمان قرار دیا گیا ہے اور کیوں نہ ہونماز ایمان کی عملی نشانی ہے اور ہر صاحب ایمان کی پہچان ہے۔

قُدُّ نَرِیْ تَقْلِبَ وَجْهِکَ فِی السَّبَاءِ فَلَنُولِیْنَکَ قِبْلَةً تَرْضِیْهَا فَوَلِّ وَجْهَکَ شَطَرَ
السَّبِیْدِ الْحَرَامِ وَ حِیْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلِّوْ جُوْهِکُمْ شَطَرَهَا وَ إِنَّ الَّذِینَ أَوْتُوا الْكِتَابَ
لَیَعْلَمُوْنَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ وَ مَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ وَ لَیِّنُ أَتَیْتُ
الَّذِینَ أَوْتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ أَيْتٍ مَا تَبِعُوْ قِبْلَتَکَ وَ مَا أَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ وَ مَا
بَعْضَهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ وَ لَیِّنَ اتَّبَعَتَ أَهْوَاءَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ
مِنَ الْعِلْمِ لَإِنَّكَ إِذَا لَمْ يَعْلَمْ الظَّلَمِيْنَ الَّذِینَ اتَّبَعُنَمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُوْنَهُ كَمَا
يَعْرِفُوْنَ أَبْنَاءَهُمْ وَ إِنَّ فَرِیْقاً مِنْهُمْ لَیَكْتُبُوْنَ الْحَقَّ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ

الْحَقُّ مِنْ رَبِّکَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ

”(اے بنی ﷺ) ہم دیکھ رہے تھے، آپ ﷺ کا چہرہ بار بار آسمان کی طرف اٹھتا تھا۔ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے

کہ آپ ﷺ کو اسی قبلے کی طرف پھیر دیں گے، جسے آپ پسند کرتے ہیں۔ اب آپ ﷺ مسجد حرام کی طرف اپنارخ کر لیں اور مسلمان جہاں بھی ہوں، اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کریں۔ رہے اہل کتاب تو وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ قبلے کی تبدیلی برحق ہے اور ان کے رب کی طرف سے ہے۔ مگر اس کے باوجود جو کچھ وہ کر رہے ہیں، اللہ اس سے بے خبر نہیں۔

(اے نبی ﷺ) آپ ﷺ اہل کتاب کے سامنے جتنی دلیلیں پیش کریں، وہ آپ ﷺ کے قبلے کو نہیں مانیں گے۔ آپ ﷺ خود بھی ان کے قبلے کی پیروی نہیں کر سکتے۔ اور نہ وہ خود ایک دوسرے کے قبلے کو مانتے ہیں۔ لیکن مسلمانو! اگر تم اس علم کے آجائے کے بعد جو تمہارے پاس آچکا ہے، ان لوگوں کی خواہشوں کے پیچھے چلو گے تو تم بھی ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔

اہل کتاب تو اس حکم کو اس طرح جانتے پہچانتے ہیں، جیسے اپنے بیٹوں کو جانتے پہچانتے ہیں، لیکن ان کا ایک گروہ جان بوجھ کر حق بات چھپاتا ہے۔ قبلے کے بارے میں جو حکم آنا تھا، آگیا۔ اب اس بارے میں کسی کوشک نہیں ہونا چاہیے۔“ (144-147)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

نَرَى: یہ رُویَّۃ سے ہے، جس کے معنی دیکھنے کے ہیں۔ اس سے پہلے کُنَا مذوف ہو گیا ہے۔ اصل میں یہ **كُنَّا نَرَى** ”ہم دیکھتے تھے“ ہے۔ فعل مضارع سے پہلے فعل ناقص کے حذف ہونے کی مثالیں موجود ہیں، جیسے ارشاد ہوا کہ:

﴿وَكَذِيلَكُنْرِيَ إِبْرَهِيمَ مَلْكُوتَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَيَكُونَ مِنَ الْمُوْقِيْنَ ۝﴾ (الانعام: 6) (75:6)

”اور اسی طرح ہم ابراہیم ﷺ کو (اپنی) بادشاہی (کے جلوے) دکھاتے تھے، تاکہ وہ کامل یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔“

شَطَرُ: اس جگہ یہ لفظ ”طرف، جانب اور رخ“ (DIRECTION) کے معنوں میں آیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے معنی کسی چیز کے آدھے یا کچھ حصے کے بھی ہوتے ہیں، جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے:

((الظَّهُورُ شَطْرُ الْإِيمَانِ)) (صحیح مسلم، رقم: 534۔ ترمذی، رقم: 3517)

”پاکیزگی ایمان کا نصف یا کچھ حصہ ہے۔“

مُمْتَرِيْنَ: یہ مردیٰ اور امیرات اُسے ہے جس کے معنی عک کرنے کے ہیں۔

﴿قَدْ نَرَى تَنَقْبَبَ وَجْهَكَ فِي السَّمَاءِ فَلَنُوْلِيْنَكَ قِبْلَةً تَرْضَهَا فَوَلِ وَجْهَكَ شَطْرَ السَّجِيدَ الْعَرَابِ وَ حِيْثُمَا لَنْتَهُ فَوَلَوْ جَوَهْلَمْ شَطْرَهَا ۝﴾ (144)

نبی ﷺ کو خانہ کعبہ کے قبلہ مقرر کیے جانے کا انتظار تھا۔ اسی شوق میں چہرہ مبارک بھی بھی آسمان کی طرف پھر جاتا کہ کب جریل ﷺ یہ حکم لے کر نازل ہوتے ہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ کو معلوم تھا کہ بنی اسرائیل کی امامت و پیشوائیت کا زمانہ گزر چکا ہے، اور اس کے ساتھ ہی بیت المقدس کی مرکزیت ختم ہونے والی ہے اور اصل ابراہیمی مرکز خانہ کعبہ کا دور شروع ہونے والا ہے۔ آخر وہ گھڑی آگی جس کا انتظار تھا اور حضور ﷺ کو امت مسلمہ سمیت یہ حکم ہوا کہ اب بیت المقدس کی بجائے مسجد حرام یعنی خانہ کعبہ کو قبلہ مقرر کیا گیا ہے۔ لہذا آئینہ ہر مقام پر نماز کے وقت صرف کعبے کی طرف رخ کیا جائے۔ جب یہ حکم نازل ہوا تو اس وقت آپ ﷺ ظہر یا عصر کی نماز پڑھار ہے تھے۔ نماز کے دوران میں آپ ﷺ نے قبلہ تبدیل کیا اور آپ ﷺ کے پیچھے صحابہ کرام نے بھی اپنا منہ کعبے کی طرف کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی جگہ پر آج کل مدینے کی مسجد قبصہ میں واقع ہے۔

﴿وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْمَلُونَ أَنَّهُ الْحُقُوقُ مِنْ رَبِّهِمْ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَنِ الْعَمَلِ﴾ (144)

اہل کتاب بالخصوص یہود اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ مسلمانوں کے لیے خانہ کعبہ کا قبلہ ہونا بالکل حق اور درست بات ہے۔ مگر وہ حسد اور دشمنی کے باعث تحولیں قبلہ کے اس واقعے پر اعتراض کرتے تھے اور عام مسلمانوں کو بہکانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو تنبیہ کے طور پر فرمایا کہ وہ حق بات کو چھپانے اور مسلمانوں کو بہکانے کی جو حرکتیں کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان سے بے خوبیں ہے بلکہ وہ ان کو ان کے ان گناہوں کی سزا دے گا۔

﴿وَلَئِنْ أَتَيْتَ النَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ أَيَّةٍ مَا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ وَمَا أَنْتَ بِتَائِبٍ قَبْلَتَهُمْ وَمَا

بَعْضُهُمُ بِتَائِبٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ﴾ (145)

فرمایا، خانہ کعبہ کے قبلہ ہونے پر اہل کتاب کے سامنے جو دلیل بھی پیش کی جائے گی، وہ اسے نہیں مانیں گے اور نہ کبھی اس کو اپنا قبلہ بنانے کے لیے تیار ہوں گے، کیونکہ وہ ضد، ہٹ وھری اور انہیں تقلید پر ہیں۔ ان کا اپنا حال یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے قبلے کو نہیں مانتے، بھلا وہ مسلمانوں کے قبلے..... خانہ کعبہ کو کیسے مانیں گے۔

یاد رہے کہ یہودیوں کا قبلہ صحرہ بیت المقدس ہے جو مغرب کی طرف ہے اور عیسایوں کا قبلہ بیت الحرم ہے، جو بیت المقدس کے مشرق میں ہے۔ اس طرح ایک کا قبلہ مغرب کی جانب اور دوسرے کا مشرق کی جانب ہے۔ دونوں کے رخ الگ الگ ہیں۔

رہا خانہ کعبہ کا قبلہ ہونا تو یہ سب سے قدیم عبادات گاہ اور سیدنا ابراہیم ﷺ کا قبلہ ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی قبلہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے نبی ﷺ کے لیے بھی یہی مستقل قبلہ ہے جسے آپ ﷺ چھوڑنہیں سکتے۔

﴿وَلَئِنْ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ إِنَّكَ إِذَا الْمَيْنَ الظَّالِمِينَ ﴾ (145)

یہ نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے ذریعے اہل اسلام سے فرمایا گیا کہ قبلے کے معاملے میں صحیح علم اور وحی آجائے کے بعد اگر تم لوگ اہل کتاب کی خواہشات کی پیروی کرو گے، تو تمہارا شمار ظالموں میں ہو گا، جن کا انجام اچھا نہیں ہے۔

آیت میں خطاب اگرچہ نبی ﷺ سے ہے، مگر اس کے اصل مخاطب عام مومنین ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دوسروں کی خواہشوں کے پیچھے چنانکوئی دین داری نہیں، بلکہ یہ ظلم اور بُداگناہ ہے۔ اسی طرح خود اپنی خواہشات نفس کی پیرودی بھی ظلم اور بُداگناہ ہے۔

اس میں ان نام نہاد علمائے دین کے لیے بھی ختم وعید ہے جو عوام الناس کی خواہشات اور بدعاۃ پر مصلحت کو شیعی اور مدعاۃ سے کام لیتے ہوئے امر بالمعروف اور نہیں عن المنکر کا فریضہ انجام نہیں دیتے بلکہ عوای خرافات کی بالواسطہ اور بلا واسطہ تائید و حمایت کے مرتكب ہوتے ہیں۔

﴿الَّذِينَ أَتَيْنَهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَ أَنَّهَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْۖ وَإِنَّ قَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُبُونَ الْحَقَّ۝ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ (146)

فرمایا کہ سچے اہل کتاب تو حضرت محمد ﷺ کو نبی کے طور پر ایسے پیچانتے ہیں، جیسے اپنے بیٹوں کو پیچانتے ہیں، کیونکہ ان کی نہیں کتابوں میں اس حوالے سے پیش گویاں اور بشارتیں موجود ہیں۔

ایک موقع پر عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے، جو اسلام لانے سے پہلے ایک یہودی عالم تھے، یہ کہا تھا کہ میں اس نبی ﷺ کو اپنے بیٹے سے بڑھ کر جانتا پیچانتا ہوں۔ اس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا: وہ کیسے؟ انہوں نے جواب دیا: مجھے حضرت محمد ﷺ کے نبی ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، جب کہ میرے بیٹے کے بارے میں مجھے شک ہو سکتا ہے کہ شاید اس کی ماں نے مجھ سے خیانت کی ہو۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کا سر چوم لیا۔

پھر فرمایا، اہل کتاب کا ایک گروہ ایسا ہے جو حق کو چھپاتا ہے۔ جسے معلوم ہے کہ حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی ہیں اور خانہ کعبہ ہی مسلمانوں کا اصل قبلہ ہے، مگر وہ جان بوجھ کر لوگوں سے حق بات کو چھپا رہا ہے۔

﴿الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونُونَ مِنَ الْمُمْتَنَّينَ﴾ (147)

اب نبی ﷺ سے فرمایا گیا کہ قبلہ کے بارے میں حق آچکا ہے اور وحی کے ذریعے آپ ﷺ کو بتا دیا گیا ہے کہ اب خانہ کعبہ ہی آپ ﷺ اور آپ ﷺ کی امت کا قبلہ ہے۔ الہذا وحی کے اس حکم کی پیرودی کی جائے۔ اس معاملے میں کسی قسم کے شک میں مبتلا نہ ہوں اور مخالفوں کے بے جا اور فضول اعترافوں کی پرواہ کی جائے۔

آیت میں اگرچہ خطاب حضور ﷺ سے ہے، مگر اس کے اصل مخاطب وہ مسلمان ہیں، جن کا ایمان ابھی پختہ نہ تھا۔

وَلِكُلٍّ وَجْهَةٌ هُوَ مُوْلِيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ۝ أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللَّهُ جَيْعَانًا ۝ إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۝ وَإِنَّهُ لِلْحَقِّ مِنْ رَبِّكَ ۝ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْعَرَافِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوْلُوا
وَجُوهُكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ
فَلَا تَخْشُوهُمْ وَأَخْشُونِي وَلَا تُمْرِنُ عَنِّيْكُمْ وَلَعْلَكُمْ تَهْتَدُونَ ۖ ۚ كَمَا
أَرْسَلْنَا فِيهِكُمْ رَسُولًا مِنْكُمْ يَتَلَوَّ عَلَيْكُمْ أَيْتَنَا وَيَرْكِيْكُمْ وَيَعْلَمُكُمْ الْكِتَابَ
وَالْحِكْمَةَ وَيَعْلَمُكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ۖ ۖ فَإِذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَأَشْكُرُوا إِلَيْ

وَلَا تَكْفُرُونَ ۖ ۖ

”(مسلمانو) ہر گروہ کا اپنا قبلہ ہے، جس کی طرف منہ کر کے وہ عبادت کرتا ہے۔ اصل کام یہ ہے، تم نیکی کی راہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ تم جہاں بھی ہو گے، اللہ سب کو جمع کر لے گا۔ بے شک اللہ سب پکھ کر سکتا ہے۔

اب تم جہاں بھی ہو، نماز کے لیے مسجد حرام کی طرف اپنا رخ کیا کرو، یہی تمہارے رب کا سچا حکم ہے۔ (یاد رکھو) تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ اس سے بے خبر نہیں۔ اب تم جہاں کہیں بھی ہو، نماز کے لیے مسجد حرام کی طرف اپنا رخ کیا کرو، اور تم جس جگہ بھی ہو، اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔ تاکہ اہل کتاب کے پاس تمہارے خلاف کوئی دلیل باقی نہ رہے۔ اگرچہ ان میں سے بے الصاف لوگوں کی زبانیں پھر بھی بندہ ہوں گی، لیکن تمہیں ان سے نہیں، مجھ سے ڈرنا چاہیے تاکہ میں تمہیں اپنی ساری نعمتیں عطا کر دوں اور تم ہدایت پا جاؤ۔

جیسا کہ ہم نے تمہارے درمیان ایک رسول بھیجا جو تمہیں ہماری آئینیں پڑھ کر سناتا ہے، تمہیں پاک کرتا ہے، کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور ایسی با میں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔ تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ میری نعمتوں کا شکر ادا کرو، میری ناشکری نہ کرو۔“ (148-152)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

لِكُلٍّ: (سب کے لیے، ہر ایک کے لیے) لفظ کل اگرچہ عام اور سب کے لیے آتا ہے، لیکن کبھی اس سے مخصوص افراد بھی مراد ہوتے ہیں، اس وقت اس کے معنی ہوتے ہیں: ”یہ سب“ لیکن اس کے لیے کوئی قرینہ ہونا چاہیے۔ اس جگہ اس کا قرینہ موجود ہے۔ اس لیے اس سے مراد صرف اہل کتاب یعنی یہود و نصاری ہیں۔ اس لفظ کے اس استعمال کی مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں، جیسے سورہ الانبیاء میں ارشاد ہوا ہے کہ:

﴿وَإِسْمَاعِيلَ وَإِدْرِيسَ وَذَا الْكَفْلَ طَ كُلُّ مِنَ الصَّابِرِينَ ۝﴾ (الأنبياء 85:21)

”اور اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفل ﷺ کو (ہم نے رحمت سے نوازا)۔ یہ سب صابر لگوں میں سے تھے۔“

وجہہ:..... اس کے اصل معنی طرف، جانب اور رخ کے ہیں، مگر اس جگہ اس سے مراد قبلہ ہے۔

﴿وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوْلَيْهَا فَاسْتَقِوْا الْخَيْرَاتِ ۝﴾ (148)

فرمایا، ہرامت کے لیے ایک قبلہ ہے، جس کی طرف رخ کر کے وہ نماز پڑھتے ہیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے بھی الگ الگ قبلے ہیں اور مسلمانوں کا بھی ایک قبلہ ہے جو کہ خانہ کعبہ ہے۔ کوئی گروہ بھی اپنا قبلہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔ اب مسلمانوں کو یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ تمہارے لیے بھی وحی کے ذریعے ایک قبلہ مقرر کر دیا گیا ہے۔ اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔ دین اسلام میں اصل اہمیت کسی سمت کی نہیں ہے بلکہ دین کی اصل روح نبکیوں میں آگے بڑھنا ہے۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت ہے۔ مگر اہل کتاب ان دونوں سے محروم ہیں۔ آگے چل کر آیت ہر (آیت نمبر 177) میں نبکیوں کی تفصیل آرہی ہے۔

﴿أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَاتِيْكُمُ اللَّهُ جِيْعَانٌ إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝﴾ (148)

فرمایا، تم جہاں کہیں بھی دنیا میں رہو گے، ایک دن اللہ تعالیٰ سب کو جمع کر کے ان سے حساب لے گا۔ اصل چیز مقامات اور جہات نہیں ہیں۔ ہر جگہ اور ہر سمت میں کی گئی یہی اصل شے ہے جو آخرت میں تمہارے کام آسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ تمہیں دنیا کے کونے کونے سے اکٹھا کر کے میدانِ محشر میں لے آئے اور تمہاری ہر یہی بدی کا حساب لے۔ اس کے لیے سب انسانوں کو موت کے بعد دوبارہ پیدا کرنا اور ان سے ان کے اعمال کا حساب لینا کچھ مشکل نہیں۔

﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْعَرَامِ وَإِنَّهُ لِلْحَقِّ مِنْ رَّبِّكَ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝﴾ (149)

اب یہ دوسری مرتبہ نبی ﷺ کو مخاطب کر کے تاکید کے لیے فرمایا گیا کہ آپ ﷺ جب مدینے میں ہوں یا مدینے سے باہر کہیں بھی ہوں اور کسی مقام پر بھی ہوں، نماز کے وقت اپنا منہ مسجد حرام یعنی خانہ کعبہ کی طرف کر لیں، کیونکہ یہی آپ ﷺ کے لیے قبلہ برحق ہے۔

آخر میں اہل ایمان کو خطاب کر کے فرمایا کہ تم جو اعمال بھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت میں کرو گے، اللہ تعالیٰ تمہارے ان اعمال سے بے خبر نہیں ہے، بلکہ وہ سب کچھ جانتا ہے اور تم کو تمہارے اعمال کی پوری جزادے گا۔

﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْعَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فُلُوْا وَجُوهُكُمْ شَطْرَهُ لِكُلًا يَكُونُ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حِجَّةٌ ۝﴾ (150)

اب تیسرا مرتبہ تاکید کے لیے نبی ﷺ سے فرمایا گیا کہ آپ ﷺ سفر میں ہوں، یا مقیم ہوں، ہر جگہ نماز کے

وقت خانہ کعبہ کی طرف رخ کریں، جو کہ آپ ﷺ کا قبلہ ہے۔ پھر مسلمانوں سے فرمایا گیا کہ وہ بھی دنیا میں جہاں کہیں ہوں، نماز کے وقت اپنا منہ کعبہ کی طرف رکھیں، کیونکہ ان کے لیے اب یہی مستقل قبلہ ہے۔

تین مرتبہ خانہ کعبہ کی طرف قبلہ رو ہونے کا تاکیدی حکم دینے میں کئی مصلحتیں پوشیدہ تھیں، جن میں سے ایک مصلحت یہ تھی کہ اس طرح اہل کتاب، مشرکین اور منافقین کو تحویل قبلہ پر اعتراض کرنے کے لیے کوئی دلیل ہاتھ نہیں آسکتی تھی۔

اہل کتاب اپنی مذہبی کتابوں کے ذریعے جانتے تھے کہ آنے والا نبی ضرور اسماعیل علیہ السلام کی نسل میں سے ہو گا جن کا قبلہ خانہ کعبہ تھا۔ اس لیے حضرت محمد ﷺ کے لیے بیت المقدس کا مستقل طور پر قبلہ ہونا، اہل کتاب کے حق میں اس بات کی دلیل بن جاتی کہ آنے والا نبی وہ نہیں ہے جس کے پیش کوئی ان کی کتابوں میں تھی۔

دوسری طرف مشرکین مکہ جانتے تھے کہ حضرت محمد ﷺ ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں سے ہیں اور انہی کے دین و ملت کی تجدید کے لیے آئے ہیں، اس لیے ان کا مستقل قبلہ صرف وہی ہو سکتا ہے جو ان کے جد احمد ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کا بنیا ہوا کعبہ ہے۔

پھر جب ان دونوں گروہوں کے ہاتھ میں اعتراض کے لیے کوئی دلیل نہ رہی تو منافقین بھلا اپنے اعتراض کے حق پر کہاں سے کوئی دلیل لا سکتے تھے؟

﴿إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَحْشُوْهُمْ وَ احْشُوْنِي﴾ (150)

پھر مسلمانوں سے فرمایا گیا کہ تحویل قبلہ میں دوسری مصلحت یہ ہے کہ اب اس پر اعتراض کرنے والوں میں صرف وہی لوگ رہ جائیں گے جو حسد اور دشمنی میں گرفتار ہیں اور بحث برائے بحث کے قائل ہیں، تو ان سے ڈرنے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے لوگ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ تمہارے دل میں صرف اللہ تعالیٰ کا خوف ہونا چاہیے اور تمہیں اُس کے احکام کی اطاعت کر کے دنیا اور آخرت میں کامیابی حاصل کرنی چاہیے۔

﴿وَ لَا تَحْرَجْ رَعْتَيْ عَلَيْكُمْ وَ لَعْلُكُمْ تَهْتَدُونَ﴾ (150)

یہ تحویل قبلہ کے حکم میں تیری مصلحت ہے کہ خانہ کعبہ کی مرکزیت قائم ہونے کا مطلب ہے کہ اب بیت المقدس کی مرکزیت ختم ہو گئی ہے۔ نبوت و رسالت اور امامت و پیشوائی اب نبی اسرائیل کے گھرانے سے نکال کر نبی اسماعیل کے خاندان کی طرف منتقل کر دی گئی ہے۔ امت مسلمہ کے لیے خانہ کعبہ کا قبلہ اور دینی مرکز ہوتا، اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے، جس میں امت کے لیے بے شمار مادی اور روحانی فائدے رکھے گئے ہیں۔ یہ ان عظیم نعمتوں، برکتوں اور سعادتوں میں سے ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے اس امت کو نوازا ہے۔ یہ امت کے اتحاد کی علامت اور ان کے لیے ہدایت کا مرکز ہے۔ پھر اسی امت پر دین و شریعت کی تکمیل ہوئی جو اس کے لیے دنیا اور آخرت کی کامیابیوں اور سعادتوں کی امین اور ضامن ہے۔

﴿كَمَا أَرْسَلْنَا فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتَلَوَّ عَلَيْهِمْ أَيْتَنَا وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعْلِمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعْلِمُهُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴾ (151)

اب مسلمانوں سے فرمایا گیا کہ خانہ کعبہ کا قبلہ ہونا، تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کا اسی طرح کا انعام ہے جیسے اس نے تمہارے درمیان اپنا عظیم الشان آخری رسول بھیجا ہے، جو تمہیں قرآن کی آیتیں سناتا، گناہوں سے پاک کرتا اور اللہ کی کتاب اور حکمت و دانائی سکھاتا ہے اور تمہیں اسی باتوں کی تعلیم دیتا ہے جو تم اس سے پہلے نہیں جانتے تھے۔

اس آیت کی تفسیر کے لیے سورۃ بقرہ کی آیت 129 کی تفسیر بھی دیکھی جائے۔

بالکل اسی مضمون کی درج ذیل دو آیتیں بھی ہیں، جوان کی نظریں ہیں:

پہلی آیت آل عمران میں ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتَلَوَّ عَلَيْهِمْ أَيْتَهُ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعْلِمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴾ (آل عمران: 3)

”بے شک اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ انہی میں سے ان کے پاس ایک رسول بھیجا، جو انہیں اللہ کی آیتیں سناتا، ان کو پاک کرتا اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے، جب کہ اس کی بعثت سے پہلے وہ کھلی گرا ہی میں تھے۔“

اسی مضمون کی دوسری آیت سورۃ الجمعد میں اس طرح آئی ہے۔

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمَمِ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتَلَوَّ عَلَيْهِمْ أَيْتَهُ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعْلِمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴾ (الجمعہ: 2)

”وہی ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا، جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا، انہیں پاک کرتا اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ حالاں کہ وہ اس سے پہلے کھلی گرا ہی میں تھے۔“

﴿فَإِذْ كُرُونَى أَذْكُرْهُ وَأَشْكُرُوا لِي وَلَا تَكُونُونَ ﴾ (152)

اب مسلمانوں سے اللہ تعالیٰ یہ وعدہ فرمارہا ہے کہ اگر تم مجھے یاد رکھو گے تو میں بھی تمہیں یاد رکھوں گا۔ اس کا مطلب ہے کہ اگر تم دل و جان سے میری کچی اطاعت کرو گے تو میں اس کے بد لے میں تمہیں دنیا اور آخرت میں سر بلندی اور کامیابی عطا کروں گا۔

یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں زبان سے اس کی حمد و تسبیح، دل میں اس کی یاد، قرآن مجید کی تلاوت، کائنات میں غور و فکر اور نماز سمیت ہر قسم کی عبادت و اطاعت شامل ہے۔

ایک تفہیق علیہ حدث قدسی ہے، جس میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ:

((آتا عِنْدَكُنَّ عَبْدِيْ بِيْ - وَآتَا مَعَهُ إِذَا ذَكَرْنِي فِي نَفْسِهِ ذَكْرُهُ فِي نَفْسِي ، وَإِنْ ذَكَرْنِي فِي مَلَأٍ ، ذَكْرُهُ فِي مَلَأْهُمْ حَيْرٌ مِنْهُمْ ، وَإِنْ تَقَرَّبَ مِنِّي شَبِرًا ، تَقْرِبَتِهِ إِلَيْهِ ذَرَاعًا ، وَإِنْ تَقَرَّبَ إِلَيَّ ذَرَاعًا ، تَقْرِبَتِ مِنْهُ بَاعًا ، وَإِنْ آتَانِي يَمْشِيَ أَتَيْهُ هَرَوْلَةً))

(صحیح بخاری، رقم: 7505 - صحیح مسلم، رقم: 6829)

”میں ویسا ہی کرتا ہوں، جیسا میرا بندہ میرے بارے میں گمان رکھتا ہے۔ وہ جب مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ جب وہ مجھے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے دل میں یاد کرتا ہوں۔ جب وہ دوسروں کے سامنے مجھے یاد کرتا ہے تو میں اسے ایسی جماعت کے سامنے یاد کرتا ہوں جو اس کی جماعت سے بہتر ہے۔ اگر وہ ایک باشت میرے قریب آتا ہے تو میں دو ہاتھ اس کے قریب ہو جاتا ہوں اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔“

اس کے بعد فرمایا کہ میرا شکر ادا کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔ کیونکہ نعمت ملنے پر اللہ تعالیٰ کاشکر کرنے سے نہ صرف یہ کہ اس کا حق ادا ہو جاتا ہے بلکہ اس سے مزید نعمتیں ملتی ہیں اور ناشکری کی صورت میں نہ صرف نعمت چھن جاتی ہے بلکہ کفران نعمت کی سزا بھی ملتی ہے۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَإِذْ تَأْذَنَ رَبُّكُمْ لَيْسُ شَكْرُتُمْ لَا زِيْدَنَكُمْ وَلَيْسُ كَفْرُتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ﴾^{۵۰}

(ابراهیم ۱۴: 7)

”اور یاد کرو جب تمہارے رب نے اعلان فرمایا کہ ”اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں اور زیادہ دلوں گا۔ لیکن اگر تم ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بڑا سخت ہے۔“

اس آیت میں مسلمانوں کو نصیحت کی گئی ہے کہ وہ ہمیں امتوں کی طرح کبھی نعمتوں کی ناشکری نہ کریں، ورنہ وہ نہ صرف اللہ تعالیٰ کی عطاکی ہوئی نعمتوں سے محروم ہو جائیں گے۔ بلکہ خدائی قہر و غصب کا شکار ہو کر دنیا میں ذلت و غلامی اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے عذاب کا نشانہ بنیں گے۔

تاریخ اسلامی گواہ ہے کہ مسلمان جب تک اللہ تعالیٰ کے احکام کے پابند رہے اور اس کی عطا کردہ نعمتوں کا شکر ادا کرتے رہے اُس وقت تک وہ دنیا میں سر بلند اور غالب رہے اور جب انہوں نے احکامِ الہی سے منہ موڑا، نافرمانی اور ناشکری کا رویہ اختیار کیا تو ذلت و رسولی اور زوال و انحطاط ان کا مقدر بنا۔

يَا يٰهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُو بِالصَّابِرِ وَالصَّلُوةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝ وَ لَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ طَبْكُ أَحْيَاءٌ وَ الْكُنْ لَا تَشْعُونَ ۝
وَ لَنْبُوْنَكُمْ بِشَئِيْعٍ مِنَ الْخُوفِ وَ الْجُوعِ وَ نَفْقِيْشِ مِنَ الْأَمْوَالِ وَ الْأَنْفُسِ
وَ الْثَّمَرَاتِ وَ بَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا
لِلَّهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَجُوْنَ ۝ أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ وَ

أُولَئِكَ هُمُ الْمُهَتَّدُونَ ۝

”اے ایمان والو! ہر مشکل میں صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو۔ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور جو اللہ کی راہ میں شہید ہو جائیں ان کو مردہ نہ کہو، وہ زندہ ہیں مگر تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں۔ ہم تمہیں بعض آزمائشوں میں ضرور بہلا کریں گے، جیسے دشمن کا خوف و خطرہ، فاقہ کا ڈر، مال و جان کا نقصان اور قحط سائی۔ پھر خوشخبری دینیجیے، صبر کرنے والوں کو، جن پر مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں: ”ہم اللہ کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔“ یہی لوگ ہیں جن کے لیے ان کے رب کی طرف سے بخشش اور رحمت ہے اور یہی لوگ ہدایت یافتے ہیں۔“ (153-157)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

الْأَمْوَالِ: یہ مال کی جمع ہے۔ اس سے مراد مویشی جانور ہیں، کیونکہ عربوں کا زیادہ تر مال ان کے مویشی جانوری تھے۔ جیسے اوت، گائے، بکری اور بھیڑ وغیرہ۔ پنجابی زبان میں بھی مویشی جانوروں کو ”مال ڈنگر“ کہتے ہیں۔ اموال کے بعد ثرات کا الگ سے ذکر بھی اسی مفہوم کی تائید کرتا ہے ورنہ وہ بھی اموال میں شامل تھے۔

صَلَوَاتُ: یہ صَلَاتٌ کی جمع ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو تو اس سے انسانوں کے درجات کی بلندی مراد ہے۔ فرشتوں کی طرف سے ہو تو استغفار اور بندوں کی طرف سے ہو تو دعا ہوتی ہے۔

﴿يَا يٰهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُو بِالصَّابِرِ وَالصَّلُوةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝﴾ (153)
تحویل قبلہ کے بعد مسلمانوں کو امامت اور اقامتِ دین کا جو عظیم الشان کام سونپا گیا، اس کی راہ میں آنے والی مشکلات و مصائب کا مقابلہ کرنے کے لیے دو چیزوں سے مدد لینے کا حکم دیا گیا۔ ایک صبر اور دوسرا نماز۔
صبر انسان کے باطنی اعمال میں سب سے مشکل چیز ہے اور نماز اس کے ظاہری اعمال میں سب سے زیادہ مشکل

کام ہے۔ اس لیے صرف انہی دو سے مدد طلب کرنے پر اکتفا کیا گیا۔

ہر اہم کام میں صبر کی ضرورت ہوتی ہے اور دین کے علم برداروں کے لیے یہ نہایت ضروری ہے۔ صبر سے مراد بے بسی اور بے چارگی یا رو دھوکر چپ ہو جانا نہیں ہے بلکہ اس میں ثابت قدمی، استقامت اور ناخشونی کی خواص حالات میں اپنے موقف پر ڈالنے رہنے کا مفہوم ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کی مد فرماتا ہے۔

اس طرح نماز بھی وہی مطلوب ہے جو محض رسی نہ ہو بلکہ اپنے تمام آداب و شرائط اور خشوع و خضوع سے ادا ہونے والی نماز مراد ہے۔ ایسی نماز ہی انسان کو نہ صرف برائیوں سے روکتی بلکہ مصیبت میں گھبرا نے سے بھی باز رکھتی ہے۔ فرض نماز کے علاوہ نفلی نمازوں کا اہتمام بھی ہوتا چاہیے۔ اسی سے ایک مؤمن کا اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط ہوتا ہے اور اسے روحانی غذا ملتی رہتی ہے جس سے اس کا حوصلہ بلدرہتا ہے۔

﴿وَلَا تَقُولُوا لِيَسْنَ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللهِ أَهْوَاتٌ بَلْ أَحْياءٌ وَّ لِكِنْ لَا تَشْعُرونَ﴾ (154)

اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ جب غزوہ بدر میں چودہ (14) مسلمان شہید ہو گئے تو کچھ لوگوں نے ان کے بارے میں کہہ دیا کہ وہ تو مرکھپ گئے ہیں اور دنیا کے عیش آرام سے محروم ہو چکے ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی اور فرمایا کہ میری راہ میں جان دینے والوں کو مردہ نہ کہو۔ وہ عالم بزرخ میں زندہ ہیں اور ان کو ایک ایسی راحت و آرام والی زندگی میسر ہے جس کا تمہیں شعور نہیں ہو سکتا۔

سورہ آل عمران کی ایک آیت میں، جو اس آیت کی نظریہ ہے، یہاں تک فرمایا کہ عالم بزرخ میں شہید نہ صرف زندہ ہوتے ہیں، بلکہ ان کو وہ روزی بھی ملتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے انعامات ملنے پر خوش بھی ہوتے ہیں:

**﴿وَلَا تَحْسَبَنَ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ أَهْوَاتٌ بَلْ أَحْياءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ
فَرَجِيئُنَ بِهَا أَتْهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ لَا وَيَسْتَبِيرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ
إِلَّا خُوفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَعْزَزُونَ﴾ (آل عمران: 169، 170)**

”اور ان لوگوں کو جو اللہ کی راہ میں شہید ہو جائیں، مردہ نہ سمجھو۔ وہ اپنے رب کے ہاں زندہ ہیں اور انہیں روزی ملتی ہے۔ وہ اس پر خوش ہیں جو اللہ نے ان پر فضل فرمایا۔ اور جو لوگ ان کے چیچے دنیا میں ہیں اور ابھی تک ان سے ملنے ہیں، ان کے بھی یہ خیال کر کے خوش ہوتے ہیں کہ ان کے لیے نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔“

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((أَرَوَاهُمْ فِي جَوْفِ طَيْرٍ خُضْرٍ، لَهَا قَنَادِيلُ مُعَلَّقةٌ بِالْعَرْشِ، تَسْرَحُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ شَاءَتْ.....)) (صحیح مسلم، رقم: 4885)

”آن (شہیدوں) کی رو جیں بزرگ کے پرندوں کے پیٹ میں ہوتی ہیں۔ ان کی قندلیں عرش کے

ساتھ لگی ہوئی ہیں۔ وہ جنت (کے پھلوں) سے جہاں سے چاہتے ہیں، کھاتے ہیں۔“

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو یہ ہرگز پسند نہیں اور اس کی غیرت یہ گوارا نہیں کرتی کہ جو اس کی راہ میں اس کے دین کی سر بلندی کے لیے شہید ہو، اسے عام مرنے والوں کی طرح کامردہ کہہ کر پکارا جائے۔

﴿وَلَكُلُونَكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخُوفِ وَالْجُوعِ وَنَفْصِ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ﴾

(155)

اس آیت میں ان آزمائشوں کا تفصیل ذکر ہے جو راح عن میں اہل ایمان کو پیش آسکتی ہیں اور جن کی طرف آیت 153 میں ہلاکا سما اشارہ کیا گیا تھا کہ مشکل حالات میں صبر اور نماز سے مدد لینی چاہیے۔

سب سے پہلے ڈھنوں کے خوف کی آزمائش بیان ہوئی، پھر بھوک اور قحط سماں، پھر مال و دولت میں کمی اور نقصان، پھر اپنی اور اپنے عزیز واقارب کی جانوں کی قربانی اور آخر میں پھلوں، فصلوں اور زرعی پیداوار میں کمی کا ذکر ہوا۔ اس طرح انسان کے لیے دنیا میں جس قدر آزمائش ہو سکتی تھیں، ان سب کو چند الفاظ میں سمیٹ کر بیان کر دیا گیا۔

اس آیت سے یہ اشارہ بھی لکھتا ہے کہ ایمان لانے کے بعد ضروری نہیں کہ ایک مسلمان کو دنیا میں خوشحالی اور امن و چین کی زندگی ملے گی۔ ایمان لانا اس بات کی ضمانت نہیں ہے کہ یہ دنیا مومن کے لیے پھلوں کی سیع بن جائے۔ بلکہ تاکید اور حصر کے ساتھ فرمایا کہ اہل ایمان کو یہ آزمائشیں ضرور پیش آئیں گی۔ اس لیے اس کا نتوں بھری راہ پر قدم رکھنے سے پہلے وہ اچھی طرح سوچ سمجھ لیں۔

یہ سوادِ کوئے جاناں ، یہ قدم قدم بلائیں
جنہیں زندگی ہو پیاری ، وہ بیہیں سے لوٹ جائیں
شاعر مشرق بھی اس راز کو سمجھ کر کہتا ہے:

چوں می گوئی مسلمانم برزم
کہ داغ مشکلاتِ لا إله را

”جب میں اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہوں تو کاپ جاتا ہوں، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ لا إله یعنی کلمہ طیبہ پڑھنے کے بعد کیا کیا مشکلات پیش آسکتی ہیں۔“

انبیاء کرام ﷺ سے بڑھ کر کس کا درجہ اور مقام ہو سکتا ہے مگر معلوم ہے کہ ان حضرات کو بھی سخت آزمائشوں اور کڑے امتحانوں سے گزرننا پڑا۔

صحیح حدیث میں ہے کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے پوچھا کہ کتنے لوگوں پر سب سے زیادہ آزمائش آتی ہیں؟ تو حضرة ﷺ نے فرمایا: ((الآنِيَاءُ ثُمَّ الصَّالِحُونَ)) ”کہ نبیوں پر اور ان کے بعد نیک

لوگوں پر۔” (الصحیحه، رقم: 144۔ ابن ماجہ، رقم: 4024۔ مستدرک حاکم: 307/4) البتہ ایسے حالات میں صبر و استقامت سے کام لینا چاہیے۔ اسی میں ہمارے لیے اجر و ثواب اور آخرت میں کامیابی ہے۔ آیت کی نظیر اور وضاحت کے لیے اگر قرآن مجید کے درج ذیل مقامات بھی پیش نظر رکھے جائیں تو اس مضمون کی پوری حقیقت سامنے آجائے گی۔

۱. ﴿أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثْلُ النَّبِيِّنَ خَلَوَاهُمْ قَبْلَكُمْ طَمَسْتُهُمُ الْبَاسَاءُ وَالضَّرَاءُ وَزُلُولُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَّىٰ نَصْرُ اللَّهِ طَالِا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ﴾ (آل عمران: 142)

”کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ تم آرام سے جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالاں کہ ابھی تم پر وہ حالات نہیں گزرے، جو پہلے لوگوں کو پیش آئے تھے۔ وہ مالی پریشانیوں میں مبتلا ہوئے، انہیں جسمانی تکلیفیں دی گئیں اور خوف و ہراس نے ان کو چھبھوڑ کر رکھ دیا۔ یہاں تک کہ وقت کا رسول اور اس کے ایمان والے ساتھی کہنے لگے، اللہ کی مدد کب آئے گی؟“ جان لو کہ اللہ کی مدد قریب ہے۔“

۲. ﴿أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتَرَكُوا أَنْ يَقُولُوا أَمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكُفَّارِ ۝﴾ (العنکبوت: 29)

”کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کو ان کے یہ کہنے پر چھوڑ دیا جائے گا کہ ”ہم ایمان لائے۔“ اور ان کی آزمائش نہ ہوگی؟ ہم نے ان کو بھی آزمایا جوان سے پہلے ہو گزرے۔ اس طرح اللہ ان لوگوں کو ظاہر کر دے گا جو سچے ایمان والے ہیں اور ان کو بھی جو جھوٹے ہیں۔“

اس موقع پر حدیث خباب (رضی اللہ عنہ) کو بھی سامنے رکھنا چاہیے جو کہ صحیح بخاری میں ہے کہ:

”حضرت خباب بن ارت تھیں (رضی اللہ عنہ) روایت کرتے ہیں کہ: ہم نے نبی ﷺ سے مشرکین مکہ کی زیادتوں کی شکایت کی۔ اس وقت آپ ﷺ خانہ کعبہ کے سامنے میں ایک دھاری دار چادر کا سرہانا بنا کے تشریف فرماتھے۔ ہم نے عرض کیا: آپ ﷺ اس بارے میں اللہ تعالیٰ سے دعا کریں؟ یہ سناتو آپ ﷺ اٹھ کر پیٹھے گئے۔ چہرہ مبارک سرخ ہو گیا اور آپ ﷺ نے فرمایا:

تم سے پہلے ایسے لوگ بھی ہو گزرے ہیں کہ ان میں سے کسی کے لیے زمین میں گڑھا کھودا جاتا۔ پھر آرہ لا کر اس کے سر پر رکھ دیا جاتا، جس سے اس کے جسم کے دوٹکڑے کر دیے جاتے۔ مگر یہ ظلم و تم بھی اس کو اس کے دین سے نہ ہٹا سکتا۔ کبھی کسی کے جسم کے گوشت، ہڈیوں اور پھپوں میں لو ہے کی کنگھے دھنڈا دیے جاتے۔ مگر یہ چیز بھی اسے اس کے دین سے ہٹانے نکلے۔

اللہ کی قسم! یہ دین مکمل ہو کر رہے گا، یہاں تک کہ ایک سوار صنعا (یمن) سے حضرموت تک سفر کرے گا۔ اسے

اللہ کے خوف کے سوارستے میں کسی چیز کا خوف نہ ہوگا۔ البتہ بکریوں کے لیے بھیڑیے کا ذرر ہے گا۔ لیکن تم لوگ جلدی کرتے ہو۔” (صحیح بخاری، رقم: 3612۔ مسند احمد، رقم: 27759۔ مشکوہ، رقم: 5858)

﴿وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝ ۵ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُّصِيبَةٌ قَالُوا آتَانَا اللَّهُ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَجِعُونَ ۝ ۵﴾

(156, 155)

فرمایا، مشکل حالات میں صبر کرنے والے مومنین کے لیے خوش خبری ہے، جو ہر قسم کی آزمائش میں پورے اترتے اور ہر امتحان کے وقت ثابت قدم رہتے ہیں۔ ایسے موقع پر ان کی زبان سے صرف یہی الفاظ ادا ہوتے ہیں کہ: ﴿إِنَّا إِلَيْهِ فَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ مطلب یہ ہے کہ ہم اللہ کے بندے اور اسی کی ملکیت ہیں۔ اس فانی دنیا کے بعد آخرت کی دائیٰ زندگی میں اللہ سبحانہ کے سامنے پیش ہونے والے ہیں اور اسی سے اجر و ثواب کی امید رکھتے ہیں۔ اصطلاح میں ان الفاظ کو ”استرجاع“ کہا جاتا ہے۔

صحیح مسلم میں ائمۃ المؤمنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی مرفوع روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ:

((مَا مِنْ عَبْدٍ تُصْبِيْهُ مُصِيْبَةٌ فَيَقُولُ مَا أَمْرَهُ اللَّهُ: إِنَّا إِلَيْهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ، اللَّهُمَّ اجْرُنِنِي فِي مُصِيْبَتِي وَأَخْلِفْ لِنِي خَيْرًا مِنْهَا..... إِلَّا أَخْلَفَ اللَّهُ لَهُ خَيْرًا مِنْهَا))

(صحیح مسلم، رقم: 2126)

”جب کسی بندے پر کوئی مصیبت آتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق یہ کہتا ہے کہ ﴿إِنَّا إِلَيْهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ اے اللہ! میری اس مصیبت پر (صبر کرنے کا) مجھے اجر عطا کر، اس کا مجھے نعم البدل عطا فرماء۔ تو اللہ تعالیٰ اسے بہتر بدل عطا فرمائے گا۔“

اسلام میں ہر مصیبت پر ﴿إِنَّا إِلَيْهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ کہنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ الفاظ صرف کسی شخص کی وفات پر ہی کہنے کے لیے مخصوص نہیں ہیں، بلکہ اگر کسی کو معنوی کائنات بھی چھپے، یا وہ راہ چلتے ہوئے کہیں بھسل جائے، تو بھی اسے یہ کلمات کہنے چاہئیں۔

یاد رہے کہ کسی بڑے صدمے کے وقت، یا کسی عزیز کی وفات کے موقع پر آنکھوں سے آنسو جاری ہو جانا صبر کے خلاف نہیں ہیں، کیونکہ ایسا ہونا رحمت اور ایک فطری و قدرتی بات ہے۔ البتہ ایسی حالت میں واویا، میں اور جزع فزع کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ خود نبی کریم ﷺ کے صاحبو اوسے ابراہیم رضی اللہ عنہ جب فوت ہوئے تو آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے اور فرمایا:

((إِنَّ الْعَيْنَ تَدْمَحُ، وَالْقَلْبُ يَحْزَنُ، وَلَا تَقُولُ إِلَّا مَا يَرْضِي رَبُّنَا، وَإِنَّا بِفَرَاقِكَ يَا

(صحیح بخاری، رقم: 1303)

إِبْرَاهِيمُ لَمَحْزُونُونَ

”آنکھ آنسو بہاتی ہے، ول غلمن ہے، لیکن ہم زبان سے وہی بات کہتے ہیں جسے ہمارا رب پسند فرماتا ہے۔ اور اے ابراہیم! ہم تیری جدائی سے غم زدہ ہیں۔“

﴿أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُهَتَّدُونَ﴾ (157)

ارشاد فرمایا کہ آزمائشوں پر صبر کرنے والے اہل ایمان کے لیے ان کے رب کی طرف سے دنیا اور آخرت میں العلامات، عنایات اور حمتیں نازل ہوں گی، کیونکہ وہ ہدایت یافت ہوتے ہیں اور ہر امتحان میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے اچھی امید رکھتے ہیں اور کبھی مایوس اور بددل نہیں ہوتے۔

اہل ایمان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ عنایت و رحمت اس طرح ہوتی ہے کہ وہ سخت مشکل حالات میں بھی صبر کا دامن نہیں چھوڑتے، اللہ سبحانہ پر بھروسہ رکھتے ہیں اور کبھی حوصلہ (MORALE) نہیں ہارتے۔ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی مشیئت پر راضی رہتے ہیں۔

اس کے بر عکس کافروں جو ایمان سے خالی ہوتے ہیں۔ وہ صدمے اور مصیبت کے وقت مایوسی کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بے صبری کی حالت میں اپنے حواس کو بیٹھتے ہیں، بے فائدہ واڈیلا کرتے رہتے ہیں اور کبھی خود کشی (SUICIDE) کر کے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتے ہیں۔

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَابِ اللَّهِ فَمَنْ حَجَّ إِلَيْهِمْ فَأُعْتَمِرَ فَلَا جُنَاحَ

عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا طَوَّافُ خَيْرًا لَا قِنَانَ اللَّهُ شَاكِرٌ عَلَيْهِمْ ⑤

”بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ اس لیے جو شخص بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی حرج نہیں کہ وہ ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان سعی کے چکر لگا لے۔ اور جو کوئی شوق سے کوئی نیکی کرے تو اللہ قادر ان ہے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔“ (158)

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی تفسیر:

شَعَابَيْرِ: یہ شعیرہ کی جمع ہے جس کے معنی علامت (SYMBOL) یا نشانی کے ہیں۔

شعیرہ کو مشعر اور شاعر کو مشاعر بھی کہا جاتا ہے۔ اس سے حج کے مقامات، قربانی اور مساجد وغیرہ مراد ہوتے ہیں۔

حَجَّ:..... حج کے لفظی معنی قصد کرنے کے ہیں۔ اصطلاح میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ خانہ کعبہ جانے کا ارادہ کرنا۔

إِعْتَمَرَ:..... (عمرہ کرے) عمرہ کے معنی زیارت کرنے کے ہیں، اصطلاح میں اس سے مراد ہے، خانہ کعبہ کی زیارت

کرنا اور دوسرے مناسک ادا کرنا۔

جُنَاحٌ:..... (حرج، ننگی، گناہ) اس کے لفظی معنی جھکنے کے اور مائل ہونے کے ہیں۔ اس جگہ اس سے مراد ”گناہ کی طرف جھکنے“ کے ہیں۔ لا جُنَاحَ کے معنی ہوں گے، وہ گناہ کی طرف مائل نہیں ہوا۔ گویا اس کو کوئی گناہ نہ ہو گا۔ جیسا کہ ارشاد ہوا۔

﴿وَإِنْ جَنَحُوا إِلَيْنَا مُفَاجِئَةً لَهَا وَتَوَكّلُ عَلَى اللَّهِ﴾ (الانفال: 8)

”اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں، تو آپ ﷺ بھی اس کے لیے جھک جائیں اور اللہ پر بھروسار ہیں۔“

بَطَّوْفٌ:..... (وہ پھیرے گائے)۔ یہ اصل میں یَتَطَوَّفَ تھا۔ ”تا“ کہ ”ظاہر“ میں ادغام ہوا ہے۔ اس طوف سے سمجھی مراد ہے جو کہ حج اور عمرہ کے مناسک میں سے ہے۔

تَطَوَّعٌ:..... (وہ خوشی سے کرے) یہ طوّع سے ہے جس کے معنی ہیں، کوئی کام اپنی خوشی اور مرضی سے کرنا۔ لیکن اس لفظ کا اطلاق عام طور پر نیکی کے اس کام کو برضا و رغبت کرنے کے آتے ہیں، جس کا کرنا شریعت میں فرض یا واجب نہ ہو بلکہ نفل یا مستحب ہو۔

شَارِكُ:..... یہ شکر سے اسم فاعل ہے۔ اس کی نسبت بندے کی طرف ہو تو اس کے معنی ہیں شکر کرنے والا۔ لیکن جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی جانب ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں۔ قدر دان یا نیکی پر اچھا بدلہ دینے والا۔

یہ لفظ بھی ان الفاظ میں سے ہے جن کے معنی نسبت تبدیل ہونے سے بدل جاتے ہیں، جیسے صلاۃ اور توبہ وغیرہ۔

﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَابِ اللَّهِ﴾ (158)

تحویل قبلہ اور خانہ کعبہ کے ذکر کی مناسبت سے اب صفا اور مروہ کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے جو خانہ کعبہ کے قریب دو پہاڑیاں تھیں اور جن کے نشانات آج بھی موجود ہیں۔ فرمایا صفا اور مروہ کی یہ دونوں پہاڑیاں شعابِ اللہ میں سے ہیں۔ شعابِ اللہ سے مراد دین کی وہ ظاہری نشانیاں اور علامتیں (SYMBOLS) ہیں جن میں اس کی خاص تحقیقتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ خانہ کعبہ سمیت حج و عمرہ کے تمام مناسک اور ان کے مقامات شعابِ اللہ ہیں۔ اسی طرح اذان، نماز اور قربانی بھی شعابِ اللہ میں سے ہیں۔ تمام شعابِ اللہ کا احترام اور ان کی تعظیم ضروری ہے۔ یہ شریعت میں مقرر اور منصوص ہیں ان میں قیاس و اجتہاد کا خل نہیں اور نہ اس کے ذریعے ان کو بدلا جاسکتا ہے۔

﴿فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوْ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَبَطَّوْفَ بِهِمَاٰ﴾ (158)

دور جاہلیت میں مشرکین نے صفا اور مروہ پر دو بت اساف اور نابلہ رکھ دیئے تھے اور وہ انہی کے احترام میں سعی کرتے تھے۔ وہ یہ بھول چکے تھے کہ اصل میں صفا اور مروہ کے درمیان سمجھی کا تعلق مناسک حج و عمرہ سے ہے پھر جب مسلمانوں کو ان دونوں مقامات کے درمیان سمجھی کا حکم ہوا تو ان کو تردید ہوا کہ کہیں وہ بتوں کی موجودگی میں سعی کر کے شرک کا ارتکاب نہ کر پہنچیں اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابھی ان بتوں کی موجودگی میں بھی سعی کر لینے میں کوئی حرج یا گناہ نہیں ہے۔

بظاہر قرآن کے الفاظ سے یہ مطلب لکھتا ہے کہ سعی کرنے یا نہ کرنے، دونوں کی اجازت ہے۔ مگر جب نبی ﷺ

نے عمرے اور حج میں سعی فرمائی اور اسے بھی مناسک میں شمار کیا تو پھر یہ سعی بھی ایک لازمی حکم بن گیا جو امام مالک رضی اللہ عنہ اور امام شافعی رضی اللہ عنہ کے ہاں فرض اور احتجاف کے نزدیک واجب ہے۔ بعض لوگ جو دین میں حدیث و سنت کی اہمیت کے قالب نہیں ہیں اور اسے دین کا حصہ تصور نہیں کرتے وہ قرآنی عبارت ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن يَطْوَّقَ بِهَا﴾ کے مفہوم کو سمجھتے تھاں کر مجبوراً اسی کے اندر سے سعی کا واجب حکم کشید کرتے ہیں۔ حالانکہ اس واجب حکم کی بنیاد اور مأخذ حدیث و سنت ہے نہ کہ قرآن۔ کیونکہ قرآن سے تو سعی کا صرف مباح اور جائز ہونا ہی ثابت ہوتا ہے۔

اسی طرح بعض لوگ منی کی بجائے مرودہ کو اصل قربان گاہ سمجھتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ سیدنا اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کا واقعہ یہیں پیش آیا تھا۔ مگر کتاب و سنت یا اجماع امت سے ان کے اس دعوے کی کوئی دلیل نہیں ملتی۔ صفا اور مرودہ کے درمیان کا پس منظرو ہی ہے جو حضرت ہاجرہ نے اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کے لیے پانی کی تلاش میں ان دونوں مقامات کے درمیان چکر لگائے تھے۔ حج اور عمرے میں سعی کرنے کا حکم اسی واقعہ کی یادگار کے طور پر ہے۔

﴿وَ مَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلَيْهِ ﴾ (158)

فرمایا: شریعت کے احکام میں فرائض و اجابت کے علاوہ نفلی کام بھی ہوتے ہیں اور ان پر بھی ثواب ملتا ہے۔ جو شخص خوش ولی سے کوئی نفلی کام جیسے نفلی حج، نفلی عمرہ، نفلی صدقہ یا نفلی نماز وغیرہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی اس نیکی کو جانتا ہے، اس کی قدر کرتا ہے اور اس پر اجر و ثواب دیتا ہے۔

گویا اس مقام پر قرآن مجید نے نفل اور مستحب کاموں کے کرنے کی ترغیب دی ہے۔ احادیث میں بھی نفلی عبادت پر ثواب ملنے کا ثبوت ملتا ہے اور اسے تقرب الی اللہ کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔

صحیح بخاری میں حدیث قدسی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(مَنْ عَادَى لِنِي وَلِيَا فَقَدْ آذَنَنِي بِالْحَرْبِ، وَمَا تَقْرَبَ إِلَيَّ عَبْدِيْ يُشَنِّءُ أَحَبَّ إِلَيَّ وَمَا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ. وَمَا يَرَأُ عَبْدِيْ يَتَقْرَبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّى أَجِبَهُ فَإِذَا أَحَبْتَهُ كُنْتُ سَمِعُهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ وَيَصْرِهُ الَّذِي يُبَصِّرُ بِهِ وَيَدِهُ الَّتِي يَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِي يَمْشِي بِهَا وَإِنْ سَالَنِي لِأَعْطِيَنَهُ وَلَئِنْ اسْتَعَاذَنِي لِأُعْذِنَهُ وَمَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَنِّئِ أَنَا فَاعْلَمُ تَرَدِّدِي عَنْ نَفْسِ الْمُؤْمِنِ يَكْرَهُ الْمَوْتَ وَأَنَا أَكْرَهُ مَسَاتَّهُ) (صحیح بخاری، رقم: 6502)

”جو شخص میرے کسی ولی (دوسٹ) سے دشمنی کرتا ہے تو میں اس کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہوں۔ میرا کوئی بندہ صرف فرائض کے ذریعے مجھ سے زیادہ قریب نہیں ہو جاتا بلکہ نوافل کے ذریعے بھی میرا قرب حاصل کرتا ہے، یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کا وہ کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس

سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے۔ وہ اگر مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں اسے دیتا ہوں وہ اگر میرے ذریعے سے کسی چیز سے پناہ مانگتا ہے تو میں اسے پناہ دیتا ہوں۔ میں جو کچھ کرتا ہوں اس کے کرنے میں مجھے اتنا تردی نہیں ہوتا جتنا مجھے اس مومن بندے کی جان کے بارے میں تردہ ہوتا ہے۔ وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں اسے تکلیف دیئے کو ناپسند کرتا ہوں۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَنَا
لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ لَا أُولَئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَ يَلْعَنُهُمُ اللَّعْنُونَ ﴿١٦٩﴾ إِلَّا
الَّذِينَ تَابُوا وَ أَصْلَحُوا وَ بَيَّنُوا فَأُولَئِكَ آتُوْبُ عَلَيْهِمْ وَ إِنَّا التَّوَّابُ
الرَّحِيمُ ﴿١٧٠﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَ مَا تَوَّا وَ هُمْ كُفَّارٌ أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ
اللَّهِ وَ أَنْبَلِكَةٍ وَ النَّاسِ أَجَمِيعُونَ ﴿١٧١﴾ خَلِدِيْنَ فِيهَا لَا يُخَفَّ عَنْهُمْ

العَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ﴿١٧٢﴾

”جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی نشانیوں اور ہماری بدایت کو چھپاتے ہیں، جب کہ ہم نے ان لوگوں کی رہنمائی کے لیے اپنی کتاب میں کھول کر بیان کر دیا ہے تو اللہ ایسے لوگوں پر لعنت بھیجتا ہے اور دوسرے لعنت کرنے والے بھی لعنت بھیجتے ہیں۔ البته جو لوگ توبہ کر لیں، اپنی اصلاح کر لیں اور حق بات کو بیان کر دیں تو میں انھیں معاف کر دوں گا۔ کیونکہ میں معاف کرنے والا اور مہربان ہوں۔“

مگر جو لوگ کافر ہو گئے اور اسی حال میں مر گئے، ان پر اللہ کی، اس کے فرشتوں کی اور سب انسانوں کی لعنت ہے۔ وہ ہمیشہ اسی لعنت میں گرفتار رہیں گے نہ ان کے عذاب میں کمی کی جائے گی اور نہ انھیں ڈھیل دی جائے گی۔“

(162-159)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

يَكْتُمُونَ:..... یہ کتمان سے ہے جس کے معنی چھپانے کے ہیں۔ یہ چھپانا دو طرح سے ہے۔ ایک یہ کہ کسی چیز کو پوشیدہ رکھا جائے اور اسے دوسروں پر ظاہرنہ کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ اصل چیز کو کسی غلطی چیز سے بدل دیا جائے تاکہ اصلی چیز کا پتہ نہ چل سکے۔ گویا کچھ کا کچھ بنا دیا جائے۔

یہودی علماء ان دونوں قسموں کا کتمان (چھپانا) کرتے تھے۔ انہوں نے زنا پر رجم (سنگ ساری) کی سزا کو عام لوگوں

سے چھپا رکھا تھا۔ حالانکہ یہ سزا توریت میں موجود تھی۔ اسی طرح انہوں نے حضرت محمد ﷺ کے اسم گرامی کو اور آپ ﷺ کے بارے میں بہت سی پیش گوئیوں اور نشانیوں کو دوسرے جعلی ناموں سے اس طرح بدلتے دیا کہ اصل حقیقت نظر وہ سے اوچھل ہو گئی۔

الیکتب :.....اس سے مراد تمام آسمانی اور الہامی کتابیں ہیں۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُبُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَهُ لِلنَّاسِ

فِي الْكِتَابِ أُولَئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّعْنُونَ ﴾ (159)

اسی آیت کے الفاظ اگرچہ عام ہیں مگر اس سے بالخصوص اہل کتاب کے وہ علماء مراد ہیں جن کو حکم توید دیا گیا تھا کہ وہ کتاب اللہ کی باتوں کو لوگوں کے سامنے کھول کر بیان کریں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِذَا أَخَذَ اللَّهُ مِيقَاتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتَعَبَّرُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ فَفَنِيدُونُهُ

وَرَأَءَ ظُهُورِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا طَفِيفًا مَا يَشْتَرُونَ ﴾ (آل عمران: 3: 187)

”اور جب اللہ نے اہل کتاب سے اس بات کا عہد دیا کہ لوگوں کے سامنے اللہ کی کتاب کو ٹھیک ٹھیک بیان کرنا اور اس کی کوئی بات نہ چھپانا۔ مگر انہوں نے اس حکم کو پس پشت ڈال دیا اور اس کے بد لے میں دنیا کا حقیر مال حاصل کرنے لگے۔ کیسی بری چیز ہے جو انہوں نے خریدی۔“

لیکن اس عہد و بیان کے باوجود وہ توریت و تجھیل میں اللہ تعالیٰ کی فرمائی ہوئی ان واضح نشانیوں اور پیش گوئیوں کو عام لوگوں سے چھپاتے تھے جو آخری نبی حضرت محمد ﷺ کے بارے میں تھیں۔ اپنے اسی جرم اور گناہ و عظیم کی وجہ سے وہ دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی اور اس کی دوسرا مخلوقات کی لعنت کے حق دار رہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ عام لوگوں اور بالخصوص علمائے دین کے لیے حق بات یا علم و حی کو چھپانا بہت بڑا گناہ ہے۔

صحیح حدیث میں ہے کہ

((مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ فَكَتَمَهُ الْجَمَهُ اللَّهُ يُلْجَأُ إِلَيْهِ مِنْ نَارٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ))

(ابوداؤد، رقم: 3658 - ترمذی، رقم: 2649)

”جس سے کوئی علم کی بات پوچھی گئی مگر اس نے اسے جانتے بو جھتے چھپایا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے آگ کی لگام پہنائیں گا۔“

اس آیت سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ امر بالمعروف اور نبی عن انہنکر کافر یا ضرر حال میں انجام دینا چاہیے اور اس بارے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ وَأَنَا التَّوَابُ الرَّحِيمُ﴾ (۱۶۰)

(160)

اس آیت میں اہل کتاب کے اُن علماء کا ذکر ہے جنھوں نے توریت و انجیل کی پیش گوئیوں کو چھپانے سے توبہ کر لی، اپنی اصلاح کر لی، کھل کر حق بیان کیا اور نبی کریم ﷺ پر ایمان لے آئے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ان کی توبہ قبول کرتا ہوں کیونکہ میں توبہ قبول کرنے والا، درگز رکنے والا اور حم و کرم کرنے والا ہوں۔

دوسرا مقام پر فرمایا کہ ان لوگوں کو ان کے اعمال کا دوہرائی اجر ملے گا:

(القصص 28:54) ﴿أُولَئِكَ يُوَتُونَ أَجْرًا هُمْ مَرْتَبُّينَ بِمَا صَبَرُوا﴾

”یہی لوگ ہیں جن کو ان کے صبر کے بدلتے میں دوہرائی اجر ملے گا۔“

اس آیت میں توبہ کرنے کی ترغیب یائی جاتی ہے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَا تُؤْمِنُوا هُمْ كُفَّارٌ أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْبَلِيلَكَةُ وَالثَّالِثُ اسْجَعِينَ ﴾ (161)

”فرمایا: کہ حق کو چھپانے والے اور مرتبے دم تک توبہ نہ کرنے والے کافروں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیشہ کی لعنت ہے۔“

اس کے علاوہ ان پر مزید ذلت اسی وقت مسلط ہوگی جب قیامت کے دن ان پر فرشتے اور تمام انسان ہی لعنت کریں گے۔ وہاں ان کو اپنے لیے اللہ سبحانہ کی گرفت سے بچانے والا کوئی حمایت نہیں ملے گا۔ ویسے تو اللہ تعالیٰ کی لعنت ہی ان کے لیے کافی تھی مگر ایسے لوگوں کا جرم اور گناہ ہی کچھ ایسا ہے کہ خلوقات میں سے جزوی شعور بھی ان کی حرکتوں سے آگاہ ہو گا وہ ان پر لعنت بھیجے گا۔

﴿خَلِيلِينَ فِيهَا لَا يُخَفِّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ﴾ (162)

ارشاد ہوا کہ حق کو چھپانے والے کفار ہمیشہ لعنت میں گرفتار رہیں گے۔ ان کو داعی عذاب ہو گا۔ وہ مسلسل عذاب میں رہیں گے۔ نہ اس میں کوئی کمی کی جائے گی اور نہ کسی موقع پر ان کے لیے آرام کا کوئی وقفہ ہو گا۔ اب ان کو نہ توبہ فائدہ سے سکتی ہے اور نہ کسی نیکی کے کرنے کا کوئی امکان باقی ہے۔

وَ إِلَهُكُمْ إِلَهٌ وَاحِدٌ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ ۝ إِنَّ فِي خَلْقِهِ
السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْخِلَافِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالْفُلْكُ الَّتِي تَجْرِي فِي
الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَآءٍ فَأَخْيَا
بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَ تَصْرِيفٍ

الرِّيحُ وَ السَّحَابُ الْمُسَخَّرُ بَيْنَ السَّمَاءِ وَ الْأَرْضِ لَا يَلِتْ لِقَوْمٍ
يَعْقِلُونَ ۝ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنَّادًا يُجْبِنُهُمْ
كَحْبُ اللَّهِ وَ الَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُ حُبًا لِّلَّهِ ۖ وَ لَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ
يَرُونَ الْعَذَابَ لَا كَمَلَ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جِمِيعًا ۗ وَ أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ ۝ إِذْ تَبَرَّأَ
الَّذِينَ اتَّبَعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَ رَأَوْا الْعَذَابَ وَ تَقْطَعَتْ بِهِمْ
الْأَسْبَابُ ۝ وَ قَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأُ مِنْهُمْ كَمَا
نَتَبَرَّءُ وَ مِنَّا ۗ كَذَلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ ۖ وَ مَا هُمْ
بِخُرْجِينَ مِنَ النَّارِ ۝

”اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے اس کے سوا کوئی عبادت کے لا کتنیں۔ وہ براہماں اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔

بے شک آسمانوں اور زمین کا پیدا ہونا، دن رات کا بدلنا، سمندر میں کشتیوں اور جہازوں کا تیرنا اور ان سے لوگوں کا فائدہ اٹھانا، آسمان سے بارش برسنا اور اس کے ذریعے مردہ زمین کا زندہ ہو جانا، روئے زمین پر طرح طرح کے جانوروں کا پایا جانا، ہواوں کا چلتا اور زمین و آسمان کے درمیان بادلوں کا حکم کے تابع ہونا، یہ ان لوگوں کے لیے اللہ کی (قدرت کی) محلی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

مگر کئی لوگ اللہ کے شریک بناتے ہیں۔ ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے رکھنی چاہیے حالانکہ ایمان والے سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔

اور اگر یہ ظالم دیکھ پاتے جب کہ عذاب کے دن دیکھیں گے کہ سارے اختیارات کا مالک صرف اللہ ہے اور وہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ وہاں جب شرک کے پچاریوں سے ان کے پیشوایزاری ظاہر کریں گے۔ عذاب ان کے سامنے ہو گا اور ان کے سامنے سہارے ٹوٹ جائیں گے۔ اس وقت وہ مشرک کہیں گے کاش ہمیں دنیا میں دوبارہ جانا نصیب ہو، پھر تم بھی ان سے اسی طرح بے زاری ظاہر کریں گے جس طرح انہوں نے ہم سے کی ہے۔ اس طرح اللہ ان کے مشرکانہ اعمال کو ان کے لیے حسرت اور پیشامی بنا کر دکھائے گا۔ ان کے لیے دوزخ

کی آگ ہوگی جس سے بچ نکلنے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔“ (163-167)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

إِخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ..... اختلاف سے اس مقام پر یہ مراد ہے کہ رات اور دن کا ایک دوسرے کے پیچھے آتا۔ ایک کی جگہ دوسرے کا آ جانا۔ سورہ الفرقان 62:25 میں اسی کو خلفۃ کہا گیا ہے۔

﴿وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يَذَّكَّرَ أَوْ أَرَادَ شُكُورًا﴾

(الفرقان 62:25)

”اور وہی (الله) ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے بعد آنے والا بنایا تاکہ لوگ غور کریں اور شکر گزار بینیں۔“

الْفُلُكُ: کشتی یا سفینہ یہ لفظ واحد، جمع، مذکور اور مونث کے لیے آتا ہے۔

دَابَّةٌ: اس کی جمع دواب ہے۔ عربی زبان میں یہ لفظ کئی معنوں میں آتا ہے:

1۔ سواری کے جانوروں کے لیے۔

2۔ زمین پر چلنے پھرنے یا رینگنے والے جانوروں کے لیے۔

3۔ ہر جاندار کے لیے جس میں کٹرے مکٹرے، مویشی، پالتو جانور، درندے، سواری کے جانور، پرندے، تمام حیوانات، اور انسان سب شامل ہیں۔

اس آیت میں یہ لفظ اپنے آخری معنوں میں استعمال ہوا ہے اور اس سے ہر قسم کی جاندار (LIVING) چیزیں مراد ہیں۔

الْمُسَعَّرُ: یہ سَخَّرَ تَسْخِيرٌ سے اسم مفعول ہے۔ تسخیر کا مطلب ہے: کسی چیز کو تابع ہنا کہ اس کو کسی کی بلا معاوضہ خدمت پر لگا دینا۔ بادل اس لحاظ سے مسخر ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے تابع ہنا رکھا ہے اور ان سے جب اور جیسے چاہتا ہے، کام لے لیتا ہے۔ انسان کے لیے سورج، چاند، ہوا اور بادل وغیرہ ان معنوں میں مسخر ہیں ہیں کہ وہ اس کے تابع اور قابو میں ہیں اور ان سے وہ جیسے چاہے کام لے سکتا ہے بلکہ ان سب کو اللہ تعالیٰ نے اپنے تابع رکھ کر انسان کی خدمت کرنے اور اسے فائدہ پہنچانے پر لگا دیا ہے۔

اور یہ انسان سے اپنی خدمت کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں یہ نہیں آتا کہ انسانوں نے ان کو مسخر کیا ہے بلکہ یوں آتا ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے تمہاری خاطر مسخر کر رکھا ہے۔ گویا سَخَّرَ کا فاعل ہمیشہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جیسے ارشاد ہوا:

﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآءِبَّينَ﴾

(ابراهیم: 14:33)

”اور اس (اللہ) نے تمہارے لیے سورج اور چاند کو تمہاری خدمت پر لگا دیا یہ دونوں برابر حرکت کر رہے ہیں۔“

اَنَّدَادًا :..... یہ نِدٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں: شریک، ہمسر، ساجھی، برابر، مثیل۔

تَبَرَّعَ :..... اس کے معنی ہیں سخت پزاری کا اظہار کرنا۔ شدید غفرت کرنا۔

الْآسِبَابُ :..... یہ سبب کی جمع ہے جس کے اصل معنی ہیں: رسی یا رسے۔

پھر یہ تعلق ذریعے اور واسطے کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا۔ یہاں تک کہ آخر میں اس میں کسی چیز کے تمام پہلوؤں کو شامل کر لیا گیا اور یہ ساز و سامان اور وسائل کے معنوں میں لیا جانے لگا۔

كَرَّةً :..... اس کے معنی ہیں: دنیا میں واپس لوٹنا، دوبارہ آنا۔

حَسَرَتٍ :..... یہ حَسَرَةٌ کی جمع ہے جس کے معنی سخت پشیمانی اور شدید ندامت کے ہیں۔

﴿وَاللَّهُمَّ إِلَهُ وَاحِدٌ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ ﴾ (163)

فرمایا تمہارا اصل معبد صرف ایک ہے اس کے سوا کسی اور کی عبادت جائز نہیں۔ کیونکہ جب خالق ایک ہے تو معبد بھی ایک ہی ہونا چاہئے۔ جو خالق نہیں ہے وہ معبد نہیں ہو سکتا۔ اکیلا خالق ہی اس لائق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اللہ تعالیٰ کی ذات میں، صفات میں اور اختیار و تصرف میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں۔ یہی توحید ہے جس کی طرف قرآن دعوت دیتا ہے۔

﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ﴾ (1)

”کہہ دیجئے، حقیقت یہ ہے کہ اللہ ایک ہے جو وسیع رحمت والا اور ہمیشہ رحمت کرنے والا ہے۔“

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْخِلَافِ الْيَلِلُ وَالنَّهَارُ وَالْفُلُكُ الَّتِي تَجْرِيُ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيْفُ الرِّيحِ وَالسَّحَابُ الْمُسَخَّرُ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَا يَلِيقُ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴾ (164)

توحید کا ذکر کرنے کے بعد اس کے دلائل بیان ہوئے ہیں کہ اس کائنات کا پورا نظام اور کارخانہ اللہ سبحانہ کے وجود (EXISTENCE) اور اس کی وحدانیت (ONENESS) پر گواہی دے رہا ہے۔ یہ آسمانوں اور زمین کا پیدا ہونا، دن رات کا بدلتا اور ان کا گھٹنا بڑھنا، قانونِ الہی کے تحت دریاؤں اور سمندروں میں کشتوں اور جہازوں کا تیرنا اور ان کے ذریعے انسانوں کے بے شمار فائد حاصل کرنا۔ بارش کا برنسا اور برف کا گرنا۔ پانی سے زمین کی نباتات کا اگنا، درختوں، پودوں، بچلوں اور فصلوں کا پیدا ہونا۔ روئے زمین پر قسم قسم کے جانوروں اور پرندوں کا بکثرت موجود ہونا، ہواویں کا چلتا اور ان سے درجہ حرارت میں کمی میشی اور موسویں کا بدلتا، فضا میں بادلوں کا معلق ہونا۔ یہ سب کچھ ایک

خلق، ایک رب، ایک رحمان و رحیم اور ایک ہی قادر مطلق ہستی کے واضح دلائل اور کھلی نشانیاں ہیں، مگر ان کو سمجھنے کے لیے بھی عقل و شعور کی ضرورت ہے۔

وَ فِي كُلِّ شَيْءٍ لَهُ آيَةٌ
تَدْلُّ عَلَىٰ أَنَّهُ وَاحِدٌ

”اور ہر شے میں اس (اللہ) کی نشانی موجود ہے جو زبان حال سے پکار رہی ہے کہ وہ اکیلا ہی ہے۔“

بعض نکوت شناس علماء کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دو کتابیں ہیں: ایک کائنات اور دوسرا قرآن، اور ان دونوں کو پڑھنے سمجھنے سے ہدایت ملتی ہے، ورنہ گمراہی کے سوا کچھ نہیں۔

اس کائنات میں موجود نظم (PURPOSENESS) اور مقصودیت (DISCIPLINE) ظاہر کرتی ہے کہ اس کا خلق صرف اور صرف ایک ہی ہے جو بڑا حکیم و دانا ہے۔

یاد رہے کہ توحید کی تعلیم ہی دین اسلام کا سب سے بڑا امتیاز ہے جب کہ دوسرے مذاہب اس اعزاز سے محروم ہیں۔

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْدَادًا يُجْبِونَهُمْ كُحْتَ اللَّهِ﴾ (165)

فرمایا کہ زمین و آسمان میں ہر جگہ پھیلی ہوئی توحید کی کھلی نشانیاں دیکھنے کے باوجود نادان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے شریک ہمار کھے ہیں۔ وہ ان کی پوجا کرتے ہیں۔ ان سے ایسی عقیدت و محبت کا اظہار کرتے ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے خصوص ہونی چاہیے۔ وہ مخلوق کو خالق کے حقوق میں حصہ دار بنا دیتے ہیں۔ فرشتوں، نبیوں، بزرگوں، جنوں، دیوی دیوتاؤں کی پوجا پاٹ کرتے، ان سے دعا میں مالکتے، ان کو فریاد رس سمجھتے، مصیبت میں ان کو مشکل کشا سمجھ کر پکارتے، اور ان کے نام کی نذریں نیازیں چڑھاتے ہیں۔ وہ شرک کے حق میں ایسی باطل اور بودی دلیلیں لاتے ہیں جو حق کے دلائل کے سامنے نہیں ٹھہر سکتیں۔

﴿وَ الَّذِينَ أَمْنَوْا أَشَدُ حُبَّاً لِّلَّهِ﴾ (165)

مراد یہ ہے کہ بت پرستوں اور غیر اللہ کی پوجا کرنے والوں کو جتنی محبت اپنے ہوں یا غیر اللہ سے ہوتی ہے، ان کے مقابلے میں اہل ایمان کہیں بڑھ کر اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مشرکین کے بہت سے بے بن معبدوں کے محبوب ہوتے ہیں اس طرح ایک ہی دل میں کئی محبتیں جمع ہونے کے بعد باہم تقسیم ہو جاتی ہیں۔ جب کہ اللہ والوں کا دل ایک ہی کار ساز اور صاحب قدرت معبدوں کی محبت میں دھڑکتا رہتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک مومن کو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ اللہ تعالیٰ ہی محبوب ہوتا ہے۔ وہ اگر کسی مخلوق سے بھی پیار کرتا ہے تو اس کا وہ پیار بھی اللہ کی محبت کے تابع ہوتا ہے اور جب کبھی مخلوق کے پیار اور اللہ کی محبت میں تصادم (CLASH) واقع ہو جائے تو ہر صاحب ایمان شخص ہمیشہ اللہ کی محبت کو مخلوق کے پیار پر ترجیح دیتا ہے۔

﴿وَ لَوْ بَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرُونَ الْعَذَابَ أَنَّ الْفُؤَادَ لِلَّهِ جَمِيعًا وَ أَنَّ اللَّهَ

شَدِيدُ الْعَذَابِ ﴿165﴾

فرمایا آج دنیا میں ان مشرکوں اور کافروں کو توحید کی حقیقت بھجوئیں نہیں آتی اور یہ شرک میں غرق ہیں، مگر جب قیامت کے دن سارے جواب اٹھاویے جائیں گے تو یہی ظالم لوگ اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ اللہ تعالیٰ اکیلا ہے، قادر مطلق ہے، صاحب قدرت و اختیار ہے، اور ان کے بنائے سب جھوٹے معبودوں کے آگے عاجز اور بے بس ہیں اور اس کے محتاج ہیں۔ وہاں ان کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ان جیسے سب لوگوں کو خنت عذاب دینے والا ہے جو دنیا میں کفر و شرک میں بیٹھا رہے اور اسی حالت میں بغیر توبہ کیے مر گئے تھے۔

﴿إِذْ تَبَرَّاَ النَّذِينَ اتَّبَعُوا مِنَ النَّذِينَ اتَّبَعُوا وَ رَأَوْا الْعَذَابَ وَ تَقْطَعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ﴽ166﴾

ارشاد ہوا کہ آخرت میں مشرک لوگوں سے ان کے جھوٹے معبود پیزاری کا اظہار کریں گے کیونکہ وہ ان کی کوئی مدد نہ کر سکیں گے۔ پھر بتوں اور ان کے پیجاریوں، سب کو دوزخ کا عذاب نظر آجائے گا۔ اور ان کا وہ باہمی تعلق اور رابطہ جو دنیا میں ہوا کرتا تھا یک قلم ثوٹ جائے گا۔ ان کی باہم عقیدت والفت ایک دوسرے سے نفرت اور بے زاری میں تبدیل ہو جائے گی۔

اسی مضمون کو ایک اور مقام پر اس طرح فرمایا گیا ہے کہ:

﴿وَمَنْ أَضَلُّ مِنْ يَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ مَنْ لَا يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَائِهِمْ غَافِلُونَ ۝ وَإِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوا لَهُمْ أَعْدَاءٌ وَكَانُوا يُعَبَّدُونَهُ كُفَّارِيْنَ ۝﴾
(الاحقاف: 46)

”اور ان لوگوں سے زیادہ گمراہ کون ہو گا جو اللہ کو چھوڑ کر ایسے معبودوں کو پکاریں جو قیامت تک انھیں جواب نہ دے سکیں۔ بلکہ ان کی پکار سے بھی بے خبر رہیں۔ جب آخرت میں سب لوگ اکھنے کیے جائیں گے تو یہی جھوٹے معبود اپنے پکارنے والوں کے دشمن ہوں گے اور ان کی پوچھائی انجکار کر دیں گے۔“

﴿وَقَالَ النَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاً مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَنَا ۝ كَذَلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْبَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ ۝ وَمَا هُمْ بِخَرِيجِيْنَ مِنَ النَّارِ ۝﴾
(167)

فرمایا: آخرت میں بتوں کے پیروکار اور غیر اللہ کے پیجاری یہ کہیں گے کہ اگر ہمیں دنیا میں دوبارہ جانے کی مہلت مل جائے تو ہم تو ہم توحید کا عقیدہ اختیار کر لیں گے، نیک اعمال کرنے لگ جائیں گے اور اپنے جھوٹے معبودوں سے اسی طرح پیزاری اور نفرت کا اظہار کریں گے جیسے آج وہ ہمارے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہیں۔

اس طرح مشرکوں اور کافروں کے برے اعمال ان کے لیے پیشیاں، شرمندگی اور نہادت کا باعث ہوں گے۔ ان کو جہنم کی آگ کے گڑھے میں ڈالا جائے گا جہاں سے نجح کرو، کبھی باہر نہیں آسکیں گے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُّوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَّاً طَيِّباً ۚ وَ لَا تَتَّبِعُوا خُطُوطَ
الشَّيْطَنِ ۖ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ^(۱) إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوْءِ وَالْفَحْشَاءِ وَ أَنْ
تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ^(۲) وَ إِذَا قِيلَ لَهُمْ اتَّبِعُوا مَا أُنزَلَ
اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ أَبَاءُنَا ۖ أَوَلَوْ كَانَ أَبَاؤُهُمْ لَا
يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَ لَا يَهْتَدُونَ^(۳) وَ مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمِثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ
بِهَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَ نِدَاءً طُوْمَ وَ كُمْ بِكُمْ عُمَىٰ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ^(۴)

”اے لوگو! زمین کی چیزوں میں سے جو حلال اور پاکیزہ ہیں وہ کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اس کا کام یہی ہے کہ تمہیں برائی اور بے حیائی کے کاموں پر اکسائے اور اللہ کے بارے میں تمہاری طرف سے ایسی باتیں منسوب کرائے جن کے بارے میں تمہیں خود بھی علم نہ ہو۔

اور جب ان (مشرکین) سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو ہدایت نازل کی ہے، اس پر چلو تو جواب دیتے ہیں: ہم تو اسی راہ پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو چلتے دیکھا۔ تو کیا اس اس صورت میں بھی جب ان کے باپ دادا نہ عقل سے کام لیتے ہوں اور نہ سیدھی راہ جانتے ہوں؟

کافروں کی مثال (بھیڑ بکریوں) جیسی ہے جنہیں کوئی چڑواہا چلا رہا ہو اور وہ بلا نے اور پکارنے کی آوازوں کے سوا کچھ نہ سمجھتی ہوں۔ یہ لوگ بہرے، گونگے اور انہی ہیں، کچھ نہیں سمجھتے۔“⁽¹⁷¹⁻¹⁶⁸⁾

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

خطوٹ: یہ ٹھوٹہ کی جمع ہے جس کے معنی قدم (FOOT) کے ہیں۔ جب کوئی شخص چل رہا ہوتا ہے تو اس کے دو قدموں کے درمیان جو فاصلہ پیدا ہوتا ہے اسے خطوٹہ کہا جاتا ہے۔ اتَّبَعَ خُطُوطَهُ کے معنی ہیں اس نے اس کی پیروی کی۔ یا وہ اس کے طریقے پر چلا۔

مبین: اس کے معنی ہیں کھلا، ظاہر، مراد یہ ہے کہ سمجھدار آدمی پر شیطان کا دشمن ہونا بالکل واضح ہے۔

يَأْمُرُ: یہ امر کا مضارع ہے۔ امر کے کئی معنی ہیں: حکم دینا، مشورہ دینا، کوئی بات سمجھانا اور وسوسہ ڈالنا، اس جگہ یہ لفظ بات سمجھانے اور وسوسہ ڈالنے کے معنوں میں آیا ہے۔

www.KitaboSunnat.com

السُّوْءُ: اس سے ہر برائی مراد ہے۔

الفحشاء: اس سے تمام بڑے گناہ اور کھلی بے حیائی کے کام مراد ہیں۔

الْفَيْعَا: اس کے معنی ہیں وَجَدْنَا (ہم نے پایا)

يَنْعِقُ: یہ نَعَقَ سے فعل مضارع ہے۔ اس کے معنی ہیں: چیننا، چلانا، پکارنا اور آواز دینا۔ نَعَقَ الرَّاعِيُ الْبَهَائِمَ چرواد ہے نے جانوروں کو پکارا۔

دُعَاءً وَّ نِدَاءً: ان دونوں کے معنی پکارنے اور آواز دینے کے ہیں لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ ”دعا“ قریب کے لیے ہوتی ہے اور ”نداء“ دور کے لیے۔

﴿ يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُّوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَّا طَيِّبًا وَ لَا تَتَّبِعُوا خُطُوطَ الشَّيْطَنِ ۝

إِنَّكُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴾۱۶۸﴾

اس آیت میں عام لوگوں کو خطاب کر کے ان کو حلال چیزیں کھانے کا حکم دیا گیا ہے اور اس بارے میں شیطان کی پیروی سے روکا گیا ہے کیونکہ وہ انسان کا کھلا دشمن ہے۔ فرمایا کہ ہر حلال اور پاکیزہ چیز کھاپی سکتے ہو۔ حلال وہ ہے جو شریعت میں جائز ہے اور جسے حرام قرار نہیں دیا گیا۔ اسی طرح طیب وہ پاکیزہ، صاف ستری اور مفید ہے، جو گندی، گلی سڑی، بدبودار اور ناپاک نہیں ہے۔

بشرکین کے ہاں حلال و حرام کے بارے میں بہت افراط و تفریط پائی جاتی تھی جس میں وہم پرستی اور غلط رسم و رواج کا داخل تھا۔ قرآن نے اس بارے میں اصلاح کی ہے اور حلال و حرام میں بے اعتدالی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ ظاہر ہے شیطان انسانوں کا کھلا دشمن ہے اور ہر وقت ان کو گمراہ کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔

اسلام میں حلال و حرام کا ضابطہ یہ ہے:

1۔ ہر شے حلال ہے جب تک اس کے حرام ہونے کی شرعی دلیل موجود نہ ہو۔ کیونکہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ **الاصلُ فِي الأَشْيَاءِ الْأَبَاحَةِ أَصْلُ مِنْ هُرَبِّ مِبَاحٍ**۔ اس قاعدے کی دلیل یہ آیت ہے:

﴿ هُوَ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۝

(البقرہ 2: 29)

”وہی ہے جس نے تمہارے (فائدے کے) لیے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے۔“

2۔ کسی چیز کو حلال یا حرام ٹھہرانا اصلًا صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿ أَمْ لَهُمْ شُرَكٌ أَعْلَمُ بِمِنَ الْبَيْنِ مَا لَهُمْ يَأْذَنُونَ بِهِ اللَّهُ ۝

(الشوری 42: 21)

”کیا ان مشکروں نے کچھ ایسے شریک بنا رکھے ہیں جنہوں نے ان کے لیے ایسا دین مقرر کیا ہے جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔“

3۔ بندوں کا از خود کسی چیز کو حلال یا حرام ٹھہرانا شرک اور کفر ہے:

﴿ مَا جَعَلَ اللَّهُ مِنْ مَبِحِيرَةٍ وَ لَا سَآئِبَةٍ وَ لَا وَصِيلَةٍ وَ لَا حَامِرٍ وَ لِكَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا

يَفَتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذَبَ وَأَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿١٠٣﴾ (المائدہ 5: 103)

”اللہ نے (بتوں کے نام پر چھوڑے ہوئے جانوروں) بکیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام کو مقرر نہیں کیا۔ مگر جن لوگوں نے کفر کیا، وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔“

4۔ اسلامی شریعت میں صرف وہی شے حرام ہے جس میں بندوں کے لیے کوئی نقصان، مضرت یا خرابی کا پہلو موجود ہے، یادو چیز دیتے ہیں گندی اور ناپاک ہے۔ ارشاد ہوا کہ:

﴿يَسْأَلُونَكَ مَذَا أَحِلَّ لَهُمْ قُلْ أَحِلَّ لِكُمُ الظَّيْبَاتُ﴾ (المائدہ 5: 4)

”وہ آپ ﷺ سے پوچھتے ہیں کیا چیزان کے لیے حلال کی گئی ہے؟ کہہ دیجئے، تمہارے لیے تمام پاکیزہ اور سترہی چیزیں حلال ہیں۔“

درسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَيُعَلِّمُ لَهُمُ الظَّيْبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْغَبَائِثِ﴾ (الاعراف 7: 157)

”وہ (رسول ﷺ) ان کے لیے پاکیزہ چیزان حلال تھہرا تا ہے اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے۔“

5۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حرام چیزوں سے بچانے کے لیے حلال چیزیں مہیا فرمائی ہیں۔

6۔ جو شے کسی حرام چیز کا ذریعہ بنے وہ بھی حرام ہوتی ہے۔ جیسے کسی اجنبی مرد کا کسی عورت سے تہائی میں ملنا حرام ہے کیونکہ یہ حرام کام کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

7۔ حرام کو حلال کرنے کے لیے حیلہ سازی حرام ہے جیسا کہ یہودیوں نے بخت کے دن مچھلیوں کے شکار نہ کرنے کے حکم کے بارے میں حیلہ کیا تھا، جس کا تفصیلی ذکر سورہ الاعراف آیات 163 تا 165 میں آیا ہے۔

8۔ نیک نیت سے بھی حرام حلال نہیں ہو سکتا۔ جیسے اگر کوئی شخص نیک نیت سے حرام چیز کھائے گا تو بھی گناہ گار ہو گا۔

9۔ جس چیز میں حرام ہونے کا شہبہ ہو، اس سے بچنا تقویٰ ہے۔

10۔ ہر حرام چیز کمکمل طور پر حرام ہوتی ہے جیسے شراب کی زیادہ مقدار بھی حرام ہے جس سے نشہ پیدا ہوتا ہے اور اس کی کم مقدار بھی حرام ہے اور اگرچہ اس سے نشہ نہ پیدا ہوتا ہو۔

11۔ مجبوری اور اضطرار کی حالت میں حرام بھی بقدر ضرورت عارضی طور پر حلال ہو جاتا ہے جیسا کہ اگلی آیت میں ہے کہ:

﴿فَإِنِ اضْطُرْرَ غَيْرَ بَاغِ وَلَا عَادِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ﴾ (البقرہ 2: 173)

”پھر اگر کوئی مجبور ہو کہ حرام چیز کھا پی لے تو اس پر کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ وہ حکم توڑنے والا اور حد سے بڑھنے والا نہ ہو۔“

12۔ کھانے پینے کی حرام اشیاء کے علاوہ سود، جوئے، بدکاری، رشت، چوری، ذاکہ زنی اور خیانت وغیرہ سے حاصل کی ہوئی کمائی بھی حرام ہے۔

آخر میں شیطان کے بارے میں فرمایا کہ وہ انسان کا کھلادشن ہے جو اسے برے کاموں کی طرف بلاتا اور نیکی کے کاموں سے روکتا ہے حرام کو حلال اور حلال کو حرام بتاتا ہے۔

دوسرے مقام پر یہی بات فرمائی گئی ہے کہ:

(یوسف 12:5)

﴿إِنَّ الشَّيْطَنَ لِإِلَّا سَلَّٰٰ عَدُوٌ مُّبِينٌ﴾

”بے شک شیطان انسان کا کھلادشن ہے۔“

﴿إِنَّمَا يَأْمُرُكُم بِالسُّوْءَ وَالْفَحْشَاءِ وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ (۱۶۹)
فرمایا کہ شیطان تمہارے دلوں میں یہی وسوسہ ڈالتا ہے کہ تم براہی اور بے حیائی کے کام کرو جس سے تمہاری دنیا بھی برپا ہو اور آخرت بھی تباہ ہو۔ وہ چاہتا ہے کہ تم اللہ کے بارے میں جاہل اور مشرکا نہ باقیں اور حرکتیں کرو۔ دین کی واضح تعلیمات اور محکم احکامات کو چھوڑ کر تشبیہات اور اوہام (SUPERSTITION) کے پیچے پڑو۔ اپنی خواہش نفس سے حلال کو حرام اور حرام کو حلال سمجھو۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں گمراہ کن عقائد و نظریات اختیار کر لومشا لیے کہو کہ اللہ تعالیٰ ہم گناہ گاروں کی دعا قبول نہیں کرتا جب تک ہم کسی فوت شدہ بزرگ یا ولی کے وسیلے اور واسطے سے دعا نہ کریں۔ حالانکہ اللہ سبحانہ نے قرآن میں اعلان کر رکھا ہے کہ:

(المؤمن 40:60)

﴿وَقَالَ رَبُّكُمْ أَذْعُونُنِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾

”اور تمہارے رب نے فرمادیا ہے کہ ”مجھے پکارو“ میں تمہاری پکار کو سنوں گا۔“

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَتَيْعُونَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا إِلَّا نَتَبَيَّنُ مَا أَفْنَيْنَا عَلَيْهِ أَبَاءَنَا﴾ (۱۷۰)

”ارشاد ہوا کہ جب ان مشرکوں سے کہا جاتا ہے کہ ہر معاملہ میں صرف اللہ سبحانہ کی نازل کردہ شریعت کی پیروی کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اپنے باپ دادا کے طریقے پر چلیں گے۔“
گویا عقل و شعور اور علم و دلیل سے کام لینے کی بجائے وہ اپنے آباؤ اجداد کی انہی تقلید کرتے رہیں گے اور اپنے خود ساختہ رسم و رواج کے تحت حلال کو حرام اور حرام کو حلال سمجھتے رہیں گے۔ ظاہر ہے یہ بالکل گراہی ہے۔

﴿أَوَ كُوَّكَانَ أَبَاوُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْغًا وَ لَا يَهْتَدُونَ﴾ (۱۷۰)

فرمایا کیا یہ مشرک لوگ ہربات میں اپنے باپ دادا کے طریقے پر چلیں گے جن کے عقائد و اعمال نہ تو صحیح دین کے مطابق تھے اور نہ عقل و دلیل کے لحاظ سے درست تھے؟
اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص خود اجتہاد کر سکتا ہو اس کے لیے دوسروں کی تقلید جائز نہیں۔ رہا عام آدمی تو اسے کسی

بھی صاحب علم سے مسئلہ پوچھ کر اس کے مطابق عمل کرنا چاہیے جیسا کہ ارشاد ہوا:

(الحل 16: 43) ﴿فَاسْتَعْلُوا أَهْلَ الَّذِي كُرِّرَ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْمَلُونَ﴾

”اگر تمہیں معلوم نہ ہو تو اہل علم سے پوچھ لو۔“

البتہ جس تقیید کی بنیاد عقل و فہم اور شعور و دلیل پر ہو وہ بالکل جائز اور درست ہے جیسا کہ یوسف علیہم السلام کی بات کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ:

(یوسف 12: 38) ﴿وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ أَبَاءِي إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ﴾

”میں نے اپنے بزرگوں ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کے دین کی پیروی کی ہے۔“

(171) ﴿وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْتَعِنُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَّنَدَاءً﴾

اس آیت میں باپ دادا کی اندری تقیید کرنے والے کفار و مشرکین کی حالت کو ایک مثال کے ذریعے بیان کیا گیا ہے کہ ان کا حال ان جانوروں کا سا ہے جس کو کوئی شخص پکار رہا ہو مگر وہ اس پکار کی صدا اور آواز کو سننے تو ہیں مگر اس کا مطلب نہیں سمجھتے۔ یہی حالت ان کافروں اور مشرکوں کی ہے جن کو نبی ﷺ دین کی دعوت دیتے ہیں مگر وہ جانوروں کی طرح اسے سننے سمجھنے سے عاری ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ عقل و شعور کے بغیر کسی اور کی پیروی یا تقیید درست نہیں ہے۔

(صَدِّيقٌ بِكُمْ عُمَّى فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ) (171)

فرمایا، یہ کفار و مشرکین بیک وقت بہرے، گونے اور اندھے ہیں۔ اور عقل سے کام نہیں لیتے۔ یہ جانوروں کی طرح سوچنے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اس لیے گمراہ لوگوں کی اندری پیروی کر کے گمراہی میں بتلا ہیں۔

يَا يَا هَا الَّذِينَ امْنَوْا كُلُّا مِنْ طِبِّبِتِ مَا رَزَقْنَكُمْ وَ اشْكُرُوا لِلَّهِ إِنْ
كُنْتُمْ رَايَا هُ تَعْبُدُوْنَ (۱۷) إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمُبَيْتَةَ وَ الدَّمَرَ وَ لَحْمَ
الْخِنْزِيرِ وَ مَا أُهْلَكَ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ فِيمَنِ اضْطَرَّ عَيْرَ بَاعِ وَ لَا عَادِ فَلَا إِثْمَ
عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۱۸) إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ
الْكِتَبِ وَ يَشْتَرُوْنَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا

النَّارَ وَلَا يُكْلِمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ^{۱۰}
 اُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُ الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ فَإِنَّ
 أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ^{۱۱} ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ الَّذِينَ
 اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ كَفَى شَرَاقِ بَعِيدٍ^{۱۲}

”اے ایمان والو! ہماری دی ہوئی پاکیزہ روزی کھانا اور اللہ کا شکر ادا کرو کیونکہ بندگی کا حق اسی طرح ادا ہو سکتا ہے۔ اللہ نے جو چیزیں تمہارے لیے حرام کی ہیں وہ مردار ہے، خون ہے، سوڑا گوشت ہے۔ ان کے علاوہ ہر وہ جانور حرام ہے جس پر اللہ کے سوا کسی کا نام لیا گیا ہو۔ لیکن اگر کوئی مجبور ہو کر حرام کھائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ اس کی نیت جان بچانے کے لیے کچھ کھانے کی ہو، نہ کہ حکم کی مخالفت کرنے کی۔ بے شک اللہ بخشش والا مہربان ہے۔

جو لوگ اللہ کی انتاری ہوئی کتاب کے احکام اور اس کی تعلیمات کو چھپاتے ہیں اور اس کے عوض میں دنیا کا حقر مال حاصل کرتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں دوزخ کی آگ بھرتے ہیں۔ قیامت کے دن اللہ ان سے کلام نہیں کرے گا، نہ انھیں گناہوں سے پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہو گا۔ یہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کی بجائے گمراہی خریدی اور بخشش کی بجائے عذاب خریدا۔ کیا ان کو دوزخ کی آگ کا ڈر نہیں! ان کی یہ حالت اس لیے ہوئی کہ اللہ نے تو کتاب ٹھیک ٹھیک انتاری تھی مگر انہوں نے اس کے بارے میں اختلافات پیدا کر لیے اور ایک دوسرے کے سخت خالف بن گئے۔“ (172-176)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

اُهُلُّ بِهِ : اهْلَالٍ کے اصل معنی ”پکارنے“ کے ہیں۔ مگر یہ ”ذَنْعَ“ کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ اس مقام پر یہ ”ذَنْعَ“ کے لیے آیا ہے۔
 جاہلیت کے دور میں مشرکین اپنے بتوں کے نام پر جانور قربان کرتے تھے جب کوئی جانور ذَنْعَ کیا جاتا اس پر اس بت کا نام بلند آواز سے پکارا جاتا تھا جس کے نام پر اسے ذَنْعَ کیا جاتا تھا۔ جیسے یا سُنْ الَّاَلَاتِ (الات کے نام سے) یا یا سُنْ الْعَزْىِ (عزی کے نام سے)۔ پھر ہر ذَنْعَ کرنے والے کو مُمْهُلٌ کہنے لگے خواہ وہ ذَنْعَ کے وقت کوئی نام پکارے یا نہ پکارے۔ جس طرح احرام باندھنے کو بھی إِعْلَالٌ کہتے ہیں کیونکہ اس میں تلبیہ پکارا جاتا ہے، اگرچہ کسی شخص نے اس حالت میں تلبیہ نہ بھی پکارا ہو۔

اضطرر :..... اس کے معنی انگریزی "مجبور کیا گیا" کے ہیں۔ یہ ضریبِ پرس سے باب افعال ہے اور اس کا مصدر اضطرار ہے۔ ضاد کی وجہ سے تاکا حرف طاسے بدل گیا ہے۔

غیر باغ :..... باغِ اصل میں باغی تھا۔ اضافت کی وجہ سے باغ ہو گیا۔ باغی بیٹھی کے معنی بغاوت اور سرکشی کے بھی ہیں اور چاہئے یا طلب کرنے کے بھی اس جگہ یہ دوسرے معنی مراد ہیں۔ غیر باغ کے معنی ہیں غیر طالب (نہ چاہئے والا، نہ رغبت کرنے والا) مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص ضرورت سے زیادہ چاہئے اور کھانے والا نہ ہو، یا محض لذت کے لیے کھانے والا نہ ہو۔

غیر عاد :..... عادِ اصل میں عادی تھا۔ اضافت کی وجہ سے عاد ہو گیا۔ اس کی جمع عادُونَ ہے۔ جیسا کہ سورۃ المؤمنون میں ہے:

(المؤمنون: 7: 23)

﴿فَأُولَئِكَ هُمُ الْعُدُونَ﴾

"تو وہ حد سے گزرنے والے ہیں"

غیر عاد کے معنی ہیں: حد سے بڑھنے والا نہ ہو، ضرورت یا حاجت سے تجاوز کرنے والا نہ ہو، جیسا کہ ارشاد ہوا:

(الکھف: 18: 28)

﴿وَلَا تَعُدُّ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ﴾

"اور آپ ﷺ کی نظر کرم ان سے ہٹنے پائے۔"

مطلوب یہ ہے کہ آپ ﷺ کی آنکھیں ان سے ادھر ادھر نہ ہٹ جائیں، تجاوز نہ ہوں۔ ان سے آنکھیں نہ پڑائیں اور ان سے صرف نظر نہ کریں۔

ما أصْبَرَهُمْ :..... یہ فعلِ تعجب کا صیغہ ہے۔ اس کے بعد علی النَّارِ میں علی کے صلک کی وجہ سے یہ روزمرہ بھی ہے۔ اس کے معنی ہیں: تعجب ہے کہ ان کو وزن کا درہ نہیں ہے۔ گویا ان کی دیدہ دلیری پر تعجب آتا ہے۔

شَقَاقٌ مُّبِينٌ :..... اس کے معنی ہیں انتہائی ضد اور مخالفت۔ مراد یہ ہے کہ وہ لوگ حق کی راہ سے بہت دور جا پڑے ہیں۔ اب وہ سیدھی راہ کی طرف نہیں آتے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُّوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَ اشْكُرُوا لِلَّهِ إِنْ كُنْتُمْ رَّاكِبِ الْعَبْدُونَ ﴾ (172)

اس آیت میں اہل ایمان کو حلال اور پاکیزہ چیزیں کھانے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اسے ایک عبادت شمار کیا گیا ہے۔

کھانا پینا انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ اسی پر اس کی زندگی کی حفاظت اور بقا کا انحصار ہے۔ لیکن ایک مسلمان ہر چیز کھانہ نہیں سکتا۔ اسے بہر حال حلال و حرام اور جائز و ناجائز میں تمیز کرنی ہے۔ اس کے لیے اس کے رب نے حلال و حرام کا ضابطہ مقرر کر دیا ہے۔ اسے حلال چیز کھانے اور حرام شے سے نچھے کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر وہ حرام اشیاء کھائے گا تو

تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے گا اور گناہ کمائے گا۔

انسان کے لیے اللہ نے صرف وہی چیزیں حرام کی ہیں جو جسمانی یا روحانی طور پر اس کے لیے مضر اور نقصان وہ ہیں۔

جیسا کہ فرمایا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کا کام یہ بھی ہے کہ وہ وہی الہی کے مطابق پاکیزہ چیزوں کو حلال اور ناپاک اشیاء کو حرام قرار دیں:

﴿وَيُحَلُّ لِهِمُ الطَّيِّبَاتُ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْغَبَيْثَ﴾ (الاعراف 7: 157)

”اور وہ (رسول اللہ ﷺ) ان کے لیے پاک چیزیں حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے۔“

زیر نظر آیت کی نظیر یہ آیت بھی ہے کہ:

﴿فَكُلُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمُ اللَّهُ حَلَّلَ طَيِّبَاتٍ وَ اشْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيمَانًا تَعْبُدُونَ﴾

(الحل 16: 114)

”اللہ نے تمہیں جو حلال اور پاکیزہ چیزیں عطا کی ہیں، ان میں سے کھاؤ اور اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرو کیونکہ بندگی کا حق اسی طرح ادا ہو سکتا ہے۔“

﴿إِنَّمَا حَرَمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَاتَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَ مَا أُهْلَكَ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ﴾ (173)

اس آیت میں چار قسم کی چیزیں حرام قرار دی گئی ہیں: مردار، خون، سور کا گوشت اور وہ جانور جس پر ذبح کے وقت اللہ سبحانہ کے سوا کسی اور کا نام لیا جائے۔

1۔ اس میں پہلی حرام چیز مردار ہے۔ اس سے مراد ہر قسم کا وہ مردہ جانور ہے جو مرنے سے پہلے حلال تھا مگر کسی سبب سے مرجانے کے بعد اب حرام ہو گیا ہے۔ اس کی تفصیل سورہ مائدہ میں اس طرح آتی ہے:

﴿وَالْمُنْخِنَقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْبُتَّرِيَّةُ وَالنَّطِيْحَةُ﴾ (المائدہ: 3: 5)

”اور وہ جو گلا گھونٹ سے مر گیا ہو، یا چوت لگنے سے، یا اوپر سے گر کر مر ہو، یا سینگ مارنے سے مر ہو۔“

گویا جو حلال جانور بھی طبعی یا حادثاتی طور پر، یا کسی بیماری کے باعث مرجانے وہ میتہ یعنی مردار ہے اور اس کا کھانا حرام ہے۔

2۔ دم یعنی خون حرام ہے۔ اس سے مراد وہ خون ہے جو ذبح کے وقت جانور کی رگوں سے باہر نکلتا ہے۔ دوسرے مقام پر اسے دمًا مَسْفُوْحًا یعنی بہایا ہوا خون کہہ کر اس کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ جیسا کہ سورہ الانعام آیت 145 میں ہے۔

﴿قُلْ لَاَ أَجُدُ فِيْ مَا أُوْحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَى طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا أَنْ يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا

مَسْفُوْحًا أَوْ لَحْمَ خِنْزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ أَوْ فِسْقًا أَهْلَ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ﴾ (الانعام 6: 145)

”کہہ دیجیے! مجھ پر جو وحی آئی ہے، میں اس میں کوئی ایسی چیز نہیں پاتا جو کسی کھانے والے پر حرام ہو ساوائے

اُس کے جو مردار ہو، یا بھایا ہوا خون ہو، یا سور کا گوشت ہو، کیونکہ وہ ناپاک ہے، یا ناجائز ذیج ہے جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا گیا ہو۔“

البتہ جو معمولی خون گوشت کے ساتھ لگا رہے اس میں کوئی حرج نہیں۔

3۔ سور کا گوشت حرام ہے کیونکہ یہ طبی لحاظ سے انسانی صحت کے لیے مضر ہے۔ اس کے علاوہ یہ ایک بے حیا جانور ہے جس کے کھانے والوں میں بے حیائی عام ہوتی ہے جو کہ اخلاقی طور پر ایک براثر ہے۔ سور کا صرف گوشت ہی حرام نہیں ہے بلکہ یہ ایک بخس الحسین (پورے طور پر ناپاک) جانور ہے جس کی کھال اور چربی وغیرہ کا استعمال بھی حرام ہے۔

4۔ وہ جانور بھی حرام ہے جس پر ذبح کے وقت اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا جائے۔ اس کے علاوہ اس سے ایسی قربانی اور نذر و نیاز بھی مراد ہے جو غیر اللہ کے نام سے کی گئی ہو جیسے دیوی دیوتاؤں کی نذریں، مزاروں کے چڑھاوے، گیارہوں اور کوٹلے وغیرہ، یہ سب حرام ہیں۔

یاد رہے کہ شریعت میں صرف بھی چار چیزوں حرام نہیں ہیں بلکہ ان کے علاوہ اور بھی کئی چیزوں حرام ہیں جیسے کہ اور پالتو گدھے کا گوشت جسے سنت نے حرام قرار دیا ہے۔ اسی طرح تمام درندے اور شکاری جانور بھی شریعت میں حرام ہیں۔ کیونکہ اس آیت میں تمام حلال و حرام چیزوں کی تفصیل پیش نہیں کی گئی بلکہ مشرکین کے اس عقیدے کی تردید ہے جو بعض حلال چوپائیوں کو بھی حرام قرار دیتے تھے۔

ہمارے ہاں کے منکرین حدیث اور نیچروں کا خیال یہ ہے کہ جس طرح شریعت نے بعض چیزوں کو حلال یا حرام قرار دیا ہے اسی طرح انسان کی فطرت (جسے وہ بیان فطرت کہتے ہیں) بھی کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دیتی ہے۔ ان لوگوں کے ہاں اشیاء کی حلت و حرمت کے دو دائرے ہیں۔ ایک دائرة شریعت کا ہے اور اس میں صرف وہی چار چیزوں حرام ہیں جن کا ذکر قرآن نے اس آیت میں کیا ہے اور دوسرا دائرة انسان کی فطرت کا ہے اور یہ دونوں دائروں کے الگ حیثیت سے چیزوں کی حلت و حرمت کا تعین کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے سوال کیا جاسکتا ہے کہ وہ فطرت انسانی کے ڈانوں ڈول پیانے سے پالتو گدھے کو حرام اور اونٹ کو حلال کیسے سمجھیں گے؟ اور کیا یہ انسان کی فطرت کے بس میں ہے کہ وہ کبوتر کو حلال اور جیل کو حرام سمجھ سکے؟

اس بارے میں ان لوگوں کی اصل گمراہی یہ ہے کہ یہ لوگ فطرت کو وحی و شریعت کا بدل اور قائم مقام بناتے اور اسے حلال و حرام اور طیب و خبیث اشیاء کا تعین کرنے کے لیے حکم اور حجج بناتے ہیں۔ حالانکہ یہ اختیار صرف اللہ سبحانہ کی شریعت کو حاصل ہے کہ وہ کسی چیز کے حلال یا حرام ہونے کا تعین اور فیصلہ کرے۔ اشیاء کی حلت و حرمت کے معاملے میں انسانی فطرت کو شارع سبحانہ صرف کھلی گمراہی ہے بلکہ شرک ہے۔

﴿فَمَنِ اضطُرَّ عَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ عَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴾ (173)

مطلوب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بھوک یا بیماری کے ہاتھوں مجبور ہو کر حرام چیز کھا لے تو اس کی اجازت ہے۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس کی نیت اللہ سبحانہ کے حکم کی خلاف ورزی نہ ہو اور صرف اتنا کھائے جس سے اُس کی جان نجٹ جائے۔ لیکن اگر اندازے میں غلطی سے کچھ زیادہ کھا پی لے تو بھی اللہ تعالیٰ معاف کر دے گا کیونکہ وہ بخشش والا اور تم فرمانے والا ہے کہ اپنے بندوں کو تنگی سے رہائی دیتا ہے۔ البتہ اس ضمن میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جس طرح عام حالات میں شریعت کی دلی ہوئی رخصتوں پر عمل کرنا درست ہے اسی طرح خاص حالات میں عزیمت پر عمل کرنا بہتر ہے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا إِنَّكُمْ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا الظَّارِفَةُ وَلَا يُكْلِمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَلَا يُزَكِّيُهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (۱۷۴)

یہ گویا آیت 79 کی مزید وضاحت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بعض لوگ دنیا کے حقیر مفاد کی خاطر اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب کی تعلیمات و احکامات کو چھپاتے ہیں۔

اس سے یہود و نصاریٰ کے وہ علماء بھی مراد ہیں جو نبی کریم ﷺ کے بارے میں آمدہ پیش گوئیوں کو اپنے دینی فائدے کی خاطر چھپاتے تھے اور حلال کو حرام کو حلال بتاتے تھے۔ جو لوگوں کی خواہشوں کے مطابق فتوے لکھ کر بیچتے تھے۔

افسوں ہماری امت کے دنیا پرست علمائے سوء بھی دین کے بارے میں غلط تاویلیوں کے ذریعے صدیوں سے دین فروشی کا یہی کام کرتے چلے آ رہے ہیں۔

دنیا کے مال کو ”ثمناً قلیلًا“، اس لیے کہا کیونکہ ساری دنیا کا مال و دولت بھی آخرت کی نعمتوں کے مقابلے میں بہت تھوڑا ہے جیسا کہ فرمایا:

﴿فَهَا مَنَاعَ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ﴾ (التوبہ 9: 38)

”تو آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کا سامان بہت ہی تھوڑا ہے۔“

فرمایا: ایسے مذہبی پیشواؤں کو جو کتمان حق یعنی حق چھپانے جیسا کبیرہ گناہ کر کے اپنے پیوں میں آگ بھر رہے ہیں، آخرت میں یہ سزا ملے گی کہ قیامت کے دن اللہ سبحانہ ان سے کلام نہیں فرمائے گا، ان کو گناہوں سے پاک نہیں کرے گا اور ان کو درناک عذاب دے گا۔

﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُ الْصَّلَةَ بِالْهُدَى وَالْعَدَابَ بِالْغَفْرَةِ فَهَا أَصْبَرُهُمْ عَلَى النَّارِ﴾ (175)

فرمایا: دین کے ان جھوٹے رہنماؤں اور پیشواؤں نے ہدایت کے بد لے گمراہی خریدی اور بخشش کی بجائے عذاب خرید لیا۔ تجھب ہے ان دین فروشوں پر جن کو دوزخ کی آگ سے ڈرایا جاتا ہے مگر یہ اتنے کوڑھ مغراحق ہیں کہ ایسی

ہولناک سزا بھگتے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔

﴿ذَلِكَ يَا أَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شَقَاقٍ بَعِيْدٍ﴾ (176)

ارشاد ہوا کہ اہل کتاب کے دینا پرست مذہبی پیشواؤں کو جو دوزخ کا عذاب ہو گا وہ ان کو حق چھپانے کی سزا کے طور پر ہو گا۔ اور اب جب کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا قرآن نازل کر دیا ہے جو سراپا حق ہے اور اختلافات ختم کرنے کے لیے قول فصل ہے، جو لوگوں کو ایک ہی صراطِ مستقیم پر چلنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس لیے اہل کتاب کے لیے بھی اب مذہبی اختلافات رکھنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہا۔

﴿وَأَنَّ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ﴾ (الانعام: 153)

”اور (اے نبی ﷺ کہہ دیجئے) کہ یہی میری سیدھی شاہراہ ہے اسی پر چلو اور دوسرا پگڈنڈیوں پر نہ چلو، ورنہ وہ تمہیں اللہ کے صحیح راستے سے جدا کر دیں گی۔“

اس لیے اب کتابِ الہی کے ماننے والوں کے لیے اس بات کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی کہ وہ مختلف فرقے بنا کر ایک دوسرے کی مخالف را ہوں پر چلیں۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ فَرَقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا أَشِيَّعًا لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ﴾ (الانعام: 159)

”بے شک جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور کئی فرقے بن گئے۔ (اے نبی ﷺ) آپ ﷺ کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ وہی ان کو بتائے گا کہ جو کچھ وہ کرتے تھے۔“

ابتداً اگر کتابِ الہی کو سمجھنے اور اس کے فہم میں کوئی اختلاف رائے پیدا ہو جو کہ بالکل فطری امر ہے تو اس اختلاف کو دور کرنے کا طریقہ کار بھی کتابِ اللہ نے بتا دیا ہے کہ:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولَئِكُمْ أَمْرُ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ طَذِلَّكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا﴾ (النساء: 4: 59)

”پھر اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول ﷺ کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو، یہی طریقہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اس کا انجام بہت اچھا ہے۔“

مطلوب ہے کہ پھر یہ دیکھا جائے کہ کس کی رائے قرآن و سنت کے مطابق ہے اور جس کی رائے قرآن و سنت

کے مطابق ہو، اسے سب اختیار کر لیں۔

لہذا آج مسلمانوں کے لیے بھی دینی اختلاف کی بنیاد پر گروہ بنندی اور تحریب کے لیے کوئی عذر باقی نہیں ہے کیونکہ اللہ سبحانہ نے ان کے باہمی اختلاف کا حل بتایا ہے اور اختلاف رائے کو باہمی مخالفت کا ذریعہ بننے سے روکا ہے۔ اب اہل علم پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنی اختلافی آراء کو غیر جانبدارانہ طور پر قرآن و سنت کی روشنی میں جانچیں، پڑھیں اور پھر امت کے وسیع تر مفاد کو لمحوڑ رکھتے ہوئے کسی ایک قول کو راجح قرار دے کر اس پر متفق ہو جائیں جیسا کہ خود فقہ حنفی کے علماء اپنے فقہاء اختلاف کے مختلف فیہ مسائل میں کسی ایک قول کو ترجیح دے کر مفتی یہ قول کو اختیار کر لیتے ہیں۔ اسی طریق کار (Methodology) کو اختیار کر کے موجودہ دور کے اہل علم اپنے فقہی و کلامی اختلافات ختم کر کے امت واحدہ بن سکتے ہیں۔

**لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُؤْلَوْا وَجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ
مَنْ أَمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلِكَةَ وَالْكِتَبِ وَالنَّبِيِّنَ وَأَنَّى
الْبَالَّ عَلَى حُصْنِهِ ذُوِّي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسِكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ
وَالسَّاَبِلِينَ وَفِي الرِّيقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَأَنَّ الزَّكُوَةَ وَالْمُؤْمِنُونَ
يَعْهِدُهُمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبُشَارَةِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ
الْبَاسِ أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۝**

”نیکی نہیں کہ تم نے (عبادت کے وقت) اپنا منہ مشرق کی طرف کر لیا یا مغرب کی طرف۔ اصل نیکی یہ ہے کہ لوگ ایمان لا کیں اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر، اللہ کی کتابوں پر اور اس کے نبیوں پر۔ جو اللہ کی رضا کے لیے اپنا مال خرچ کریں رشتہ داروں پر، تینیوں پر، محتاجوں پر، مسافروں پر، مانگنے والوں پر اور غلاموں کو آزاد کرنے پر، جو نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ اور جب وعدہ کریں تو پورا کریں۔ کوئی مالی پریشانی یا جسمانی تکلیف ہو تو صبر کریں اور جہاد میں ثابت قدم رہیں۔ ایسے لوگ ہی سچے اور پرہیز گار ہیں۔“ (177)

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی کی تفسیر:

آل بِرٌّ :..... (نیکی، تقویٰ، دینداری، وقارداری، اطاعت) اس کے لغوی معنی ہیں: التَّوَسُّعُ فِي الْخَيْرِ نیکی میں وسعت ہونا، وسیع تر بھائی، اس کی اصل بَرٌّ (خشکی، زمین) ہے جو بَحْرُ (تری، دریا، سمندر) کی ضد ہے۔ چونکہ عربی

زبان میں زمین کے وسیع ہونے کا تصور پایا جاتا ہے۔

(الزمر: ۱۰)

﴿وَأَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةٌ﴾

”اور اللہ کی زمین بڑی وسیع ہے۔“

اس لیے شریعت کی اصطلاح میں بزرگ سے صحیح ایمان، نیک اعمال اور اچھے اخلاق جیسے وہ تمام امور مراد ہوتے ہیں جن کے ذریعے انسان کو اللہ سبحانہ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔

عَلَىٰ حُبِّهِ اس سے مراد علیٰ حُبِّ الْمَالِ (مال کی محبت کے باوجود) ہے۔ ”ہ“ کی ضمیر اپنے قریب کے مرجع ”مال“ کی طرف لوٹی ہے۔

جیسا کہ ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

﴿وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مُسْكِينًا وَيَتِيمًا وَآسِيرًا﴾ (الدھر: 8)

”اوروہ کھانے کی چاہت کے باوجود اسے مسکین، یتیم اور قیدی کو کھلاتے تھے۔“

ابنُ السَّبِيلِ اس کے معنی ہیں راستے کا بیٹا مسافر۔ عربی زبان میں ”ابن“ بیٹا اور ”ابو“ باپ کے الفاظ کسی چیز سے تعلق یا نسبت کی وجہ سے بھی آتا ہے۔ جیسے ابوتراب۔ اردو زبان میں بھی ”ابن الوقت“ کی ترکیب اسی مفہوم کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

چونکہ مسافر اپنے گھر یا اور رشتہ دار و احباب سے دور ہونے کی وجہ سے امداد کا محتاج ہوتا ہے اس لیے اُس کو صدقہ اور رکوڈہ بھی دی جا سکتی ہے۔

فِي الرِّقَابِ یہ اصل میں فِي فَلَكِ الرِّقَابِ یا فِي تَحْرِيرِ الرِّقَابِ ہے جس کے معنی ہیں غلام آزاد کرنا۔
الصَّابِرِيُّونَ عام عربی قاعدے کے لحاظ سے الْمُؤْفُونَ کے بعد الصَّابِرُونَ آنا چاہیے تھا لیکن اس کو مرفوع کی جگہ منصوب لانا بھی عربیت کا ایک اسلوب ہے جسے علی سیمیل المدح یا علی سیمیل الاخصال کہا جاتا ہے۔ اس میں مخاطب کو کسی بات کی اہمیت کے پیش نظر خصوصی طور پر متوجہ کیا جاتا ہے۔ عربی ادب کے علاوہ خود قرآن مجید میں اس اسلوب کی مثالیں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر سورۃ النساء میں ہے۔

﴿وَالْمُؤْمِنُونَ يُوْمَنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقْيَمِينَ الصَّلُوةَ وَ

الْمُوْتُونَ الزَّكُوَةَ﴾ (النساء: 4: 162)

”اور اہل ایمان اُس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو آپ ﷺ پر نازل ہوئی اور ان کتابوں پر جو آپ ﷺ سے پہلے نازل ہوئیں۔ وہ نماز کے پابند ہیں اور زکوہ ادا کرتے ہیں۔“
اس جگہ بھی المومنوں کے بعد الْمُقْيَمِينَ کی جگہ الْمُقْيَمِينَ اسی اسلوب کی وجہ سے آیا ہے حالانکہ اس کے بعد وَالْمُوْتُونَ الْيَكُوَةَ معرفت آیا ہے۔

الْبَأْسَاءُ: یہ بُوس سے ہے جس کے معنی تختی، مبتا جی اور تنگ دستی کے ہیں۔

الضَّرَّاءُ: یہ ضرر سے ہے اور اس سے مراد جسمانی اور روحانی تکلیف یا پریشانی ہے جیسے بیماری اور غم وغیرہ۔

الَّذِينَ صَدَقُوا: اس سے یہ مراد ہے کہ وہ اپنے ایمان کے دعوے میں یقے ہیں اور وفا شعار ہیں۔

﴿لَيْسَ الْبَرَّ أَنْ تُؤْتُوا وِجُوهَكُمْ قَبْلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾ (177)

فرمایا کہ عبادت کے وقت مشرق یا مغرب یا شمال یا جنوب کی طرف منہ کر لینا بجائے خود کوئی نیکی نہیں ہے اور نہ یہ دین کا کوئی مقصد ہے کہ اس پر کوئی اختلاف یا جھگڑا پیدا کیا جائے۔ شریعت میں قبلہ صرف اس لیے مقرر کیا گیا ہے تاکہ نمازی کو یہ احساس دلا جائے کہ وہ ہر طرف سے منہ موڑ کر صرف ایک اللہ کی طرف متوجہ ہے اور اس سے سرگوشی کر رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہرامت کے لیے اس کا قبلہ ایک دینی شعار ہے جو لوگوں کے فکر و عمل میں یک جہتی اور اتفاق و اتحاد کا ذریعہ بتتا ہے۔ اس سلسلے میں ولچپ بات یہ ہے کہ ایک ہی قبلے کو ماننے والوں میں نماز کے وقت کسی کارخ مشرق کی طرف ہوتا ہے، کسی کا مغرب کی طرف، کسی کا شمال کی طرف اور کسی کا جنوب کی طرف۔ جیسا کہ خانہ کعبہ میں نماز کے دوران میں ہوتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دین کا اصل مقصد اور نیکی کسی خاص سمت کی طرف رکھ کرنا نہیں ہے ورنہ ایک ہی قبلہ والوں میں بھی اطراف و جوانب کا جھگڑا شروع ہو جاتا۔

﴿وَلِكُنَّ الْبَرَّ مَنْ أَمَنَ بِإِلَهِهِ وَأَيُّوهُرُ الْأُخْرَ وَالْبَلِلَكَةَ وَالْكَثِبَ وَالنَّبِيْنَ﴾ (177)

ارشاد ہوا کہ اصل نیکی اور دین کی بنیاد ایمان ہے۔ جو شخص اللہ پر، آخرت پر، فرشتوں پر، الہامی کتابوں پر اور نبیوں

پر صحیح ایمان رکھتا ہے وہ نیکو کار اور دین دار ہے۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس بات پر یقین کیا جائے کہ وہ موجود ہے، اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، وہی سب کا خالق، مالک، رازق اور حاکم ہے۔ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا۔ اس کے سوا کوئی مجبور نہیں۔ وہ قادر مطلق ہے، تمام اعلیٰ صفات کا مالک اور ہر عیب و نقص سے پاک ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ آخرت کے دن پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا ایک دن قتا ہو جائے گی اللہ تعالیٰ لوگوں کو دوبارہ زندہ کر کے اُن سے اُن کے اعمال کا حساب لے گا۔ پھر نیک لوگوں کو ہمیشہ کی نعمت بھری جنت عطا کرے گا اور برے لوگوں کو دوزخ کا عذاب دے گا۔

فرشتوں پر ایمان لانے کا مطلب ہے کہ یہ یقین کیا جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ایک طاقت ور، معصوم اور غیبی مخلوق ہے جو انسان کی خلیقی سے پہلے نور سے پیدا ہوئی ہے۔ فرشتہ اللہ کے حکم سے کائنات کا نظام چلاتے ہیں۔ ان کی مختلف ذمہ داریاں ہیں جو وہ اللہ سبحانہ کے حکم سے سرانجام دیتے ہیں۔

کتابوں پر ایمان لانے سے مراد وہ تمام الہامی یا آسمانی کتابیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے ہر زمانے میں اپنے رسولوں پر نازل فرمائیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کا کلام تھا جو لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے اتنا را گیا جیسے توریت،

زبور، نجیل، صحائف اور قرآن مجید۔ ان میں سے اب صرف آخری کتاب محفوظ ہے باقی کوئی الہامی کتاب اب اصل حالت میں دنیا میں موجود نہیں ہے۔

نبیوں اور رسولوں پر ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے انسانوں کی بہایت و راہنمائی کے لیے انہی میں بعض پاکیزہ ہستیوں کو ہر زمانے میں مسیوٹ فرمایا۔ آخر میں حضرت محمد ﷺ کو بھیجا گیا۔

﴿وَ أَنِي الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَ الْيَتَامَىٰ وَ الْمَسَاكِينَ وَ ابْنَ السَّبِيلِ وَ السَّاَلِيْلِينَ وَ فِي الرِّقَابِ﴾ (۱۷۷)

پھر فرمایا کہ ایمان لانے کے بعد نیک اعمال ضروری ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ بندہ اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے اُس کی رضا کے لیے رشتہ داروں، تیموں، محتاجوں، مسافروں، سوالیوں اور غلاموں (یا قیدیوں) پر بھی خرچ کرے۔ جیسا کہ ایک اور مقام پر ارشاد ہوا کہ:

﴿وَ يُطِيمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مُسْكِينًا وَ يَتِيمًا وَ أَسِيرًا ۵ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا تُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَ لَا شُكُورًا﴾ (الدھر: ۹، ۸)

”اور وہ (نیک لوگ) مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں یہ کہتے ہوئے کہ ہم صرف اللہ کی رضا کے لیے تمہیں کھلاتے ہیں۔ تم سے کوئی بدل نہیں چاہتے، نہ شکریہ مانگتے ہیں۔“

مطلوب یہ ہے کہ ایمان لانے کے بعد نیکی کے کام کیے جائیں۔ اتفاق فی سبیل اللہ کیا جائے۔ مال کو خود اپنے اوپر خرچ کرنے کے علاوہ اسے دوسرے محتاجوں پر بھی خرچ کیا جائے۔ زکوٰۃ، عشر اور صدقہ و خیرات کے ذریعے دوسرے حق داروں کا حق ادا کیا جائے۔ مال و دولت کو فضول خرچی اور اسراف و تبذیر کی نذر نہ کیا جائے بلکہ اس کو اس کے صحیح مصارف میں خرچ کیا جائے۔ یہ بڑی اور اصلی نیکی ہے۔

﴿وَ أَقَامَ الصَّلَاةَ وَ أَنِي الزَّكُوٰةَ﴾ (۱۷۷)

پھر فرمایا کہ نیک اور دین دار ہونے کے لیے نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔ فرض نمازوں کے علاوہ نوافل کا بھی اہتمام کیا جائے۔ اسی طرح زکوٰۃ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ صدقہ و خیرات بھی کرتے رہنا چاہیے۔

اب چہاں تک نماز کا تعلق ہے یہ اسلام کے بنیادی اركان میں سے ایک اہم رکن ہے۔ یہہ ستون ہے جس کے بغیر اسلام کی عمارت کھڑی نہیں رہ سکتی۔ نماز سب سے بڑی عبادت ہے جو بھی امتوں پر بھی فرض تھی۔ ہر عاقل و بالغ مرد اور عورت پر نماز فرض ہے۔ دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں: فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء۔

زکوٰۃ بھی اسلام کے بنیادی اركان میں سے ہے۔ قرآن مجید کے اکثر مقامات پر نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ساتھ ساتھ آیا ہے۔ زکوٰۃ کی فرضیت قرآن، سنت اور اجماع امت سے ثابت ہے۔ زکوٰۃ کے لفظی معنی ”بڑھنے“ اور ”پاک ہونے“ کے ہیں۔ اسلامی شریعت میں زکوٰۃ وہ مال ہے جسے کوئی مسلمان اپنے رب کے دیے ہوئے مال میں سے ہر سال اس

کے حق داروں کے لیے نکالتا ہے۔

اس مقامات پر نماز اور زکوٰۃ کا ذکر کر کے تمام اسلامی عبادات مراد لے لی گئی ہیں۔

﴿وَالْمُؤْمِنُونَ يَعْهِدُونَ هُمْ إِذَا عَاهَدُوا﴾ (177)

ایمان اور چند نیک اعمال کے ذکر کے بعد اخلاق کو بیان کیا گیا۔ اس ضمن میں پہلے۔ ایفائے عہد کو بڑی نیکی اور دین داری قرار دیا گیا اور اس کے بعد صبر کا ذکر آئے گا۔

عہد و معاهدے اور قول و اقرار کی پابندی اسلامی اخلاقیات میں سے ہیں اور اسے پورا کرنے پر بہت زور دیا گیا ہے۔ قرآن و سنت میں ایفائے عہد کی تاکید کی گئی ہے۔ اسی مضمون کو قرآن مجید نے کئی مقامات پر بیان فرمایا ہے اور اسے مومن کی ایک صفت قرار دیا گیا ہے۔ جیسے ارشاد ہوا:

﴿وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا﴾

”اور عہد کو پورا کرو۔ بے شک عہد کی پوچھ ہو گی۔“

﴿وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ إِذَا عَاهَدْتُمْ﴾

”اور جب تم اللہ کے نام سے کوئی وعدہ کرو تو اسے پورا کرو۔“

﴿وَالَّذِينَ هُمْ لَا مُنْتَهُمْ وَعَاهَدُوهُمْ رَعْوَنَ﴾

”اور جو اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کا خیال رکھتے ہیں۔ (وہی سچے مومن ہیں)“

قرآن نے کئی مقامات پر وعدہ خلافی کو نفاق سے تعبیر کیا ہے۔ اور صحیح حدیث میں بعد عہدی اور عہد شکنی کو منافقت کہا گیا ہے اور اسے منافق کی ایک ثانی منافقی قرار دیا گیا ہے۔

(صحیح بخاری، رقم: 34، صحیح مسلم، رقم: 210، ابو داؤد، رقم: 4688)

﴿وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَاسَاءِ وَالصَّرَاءِ وَ حَيْثَ الْبَأْسَاطُ﴾

عہد کی پابندی کے بعد صبر کا ذکر ہوا کہ نیکی اور دین داری کا تقاضا یہ بھی ہے کہ بندہ ہر مشکل صورت حال میں صبر کا دامن تھا سے رکھے۔ خاص طور پر جب ایسی حالت ہو کہ تنگ دستی ہو، یا یماری ہو یا جہاد کا موقع ہو تو ان حالات میں صبر کرنا اگرچہ زیادہ مشکل ہے مگر یہ بڑی نیکی اور دین داری کا کام ہے۔

قرآن و حدیث میں صبر کی بڑی فضیلت آئی ہے اور اس پر بڑا اجر بتایا گیا ہے۔ اس مقام پر قرآن نے ایفائے عہد اور صبر کا ذکر کر کے ساری اخلاقیات کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ تمام اخلاقی قدریں نیکی کے کام ہیں۔

﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾ (177)

آخر میں فرمایا کہ صرف وہی لوگ سچے مومن ہیں جو ایمان، نیک اعمال اور اچھے اخلاق رکھتے ہیں اور ایسے لوگ ہی پرہیز گار، نیکوکار اور دین دار ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس آیت بر میں پورے اسلام کی تعلیمِ جمل طور پر موجود ہے اور اس میں ایمان و عمل کے اعلیٰ معیار اور بلند ترین درجے کو بیان کر دیا گیا ہے۔

**يَا يَا هَا الَّذِينَ أَمْنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْفَتْلِ ۖ الْحُرُمُ بِالْحُرُمِ
وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثِي بِالْأُنْثِي فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعُ
بِالْمَعْرُوفِ وَإِذَا أَذَأَ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ذَلِكَ تَحْفِيفٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فِيمَنْ
اعْتَدَى بَعْدَ ذَلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۗ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ**

يَا وَلِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝

”اے ایمان والو! مقتول کے خون کا بدلہ لینا تم پر فرض ہے۔ قاتل آزاد ہو تو اس آزاد کو، غلام ہو تو اس غلام کو، اور عورت ہو تو اس عورت کو قصاص میں قتل کیا جائے۔ اگر کسی قاتل کو اس کا وہ بھائی جو مقتول کا وارث ہے خون معاف کر دے تو دستور کے مطابق خون بھائی سکتا ہے اور قاتل کو چاہیے کہ وہ صحیح طریقے سے پورا خون بھا ادا کرے۔ یہ حکم تمہارے رب کی طرف سے ایک آسانی اور مہربانی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص خون بھائی سکتا ہے کہ بعد بھی زیادتی کرے تو اللہ کے ہاں اسے وردناک عذاب ہو گا۔ اور اے عقل والو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔ لہذا اس حکم کی خلاف ورزی سے نفع جاؤ۔“ (178-179)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

كُتِبَ : كُتِبَ يَكْتُبُ كِتَابَةً كَمْ مِنْيْنَ ”لَكُنْ“ كَمْ بَسْنَ جَبْ اسْ كَمْ بَعْدَ عَلَىْ كَمْ صَلَدْ (PREPOSITION) آجائے تو کتابیہ کے طور پر اس کے معنی فرض کرنے اور لازم قرار دینے کے ہو جاتے ہیں۔ اس جگہ یہی معنی مراد ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہوا:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ (البقرہ 2: 183)

”تم پر روزہ رکھنا فرض کر دیا گیا ہے۔“

الْقِصَاصُ : اس کے اصل معنی ہیں: کسی کے پاؤں کے نشانات کے پیچھے چلانا۔ ہونج لگانا۔ جیسے کہ ارشاد ہوا:

﴿فَارْتَدَ عَلَىِ اثْلَارِهِمَا قَصَاصًا﴾ (الکھف 18: 64)

”پھر دونوں اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے واپس لوئے۔“

لیکن شریعت کی اصطلاح میں قصاص سے مراد قاتل کو قتل کرنا ہے۔

آلاب: یہ ب کی جمع ہے جس کے معنی "عقل" کے ہیں۔ اولو الائیب کا مطلب ہے: عقل والے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتُبَ عَلَيْكُمُ الْقِصاصُ فِي الْفَتْنَىٰ إِنَّ الْحُرُّ بِالْحُرُّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثُى بِالْأُنْثُى فِيمَنْ عَفَ لَهُ مِنْ أَخْيَهُ شَيْءٌ فَإِثْبَاعُهُ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءُ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ذَلِكَ تَحْفِيفٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ مِّنْ أَعْتَدَ لَكُمْ فَلَمَّا عَذَابُ أَكْلِيمٌ﴾ (178)

یہ آیت قصاص اور دیت کے بارے میں ہے۔ عربوں میں قصاص کے معاملے میں بڑی بے اعتدالیاں پائی جاتی تھیں۔ وہ غلام قاتل کے بجائے کسی آزاد کو قتل کر دیتے تھے۔ قاتل عورت کی بجائے کسی مرد کو قصاص میں قتل کیا جاتا تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ایک مقتول کے بدے میں کئی انسانوں کو قتل کر دیا جاتا۔

جب قرآن نازل ہوا تو اس نے حکم دیا کہ صرف قاتل ہی کو قصاص میں قتل کیا جاسکتا ہے، خواہ وہ قاتل غلام ہو، آزاد ہو، عورت ہو، مرد ہو، بہر صورت صرف قاتل ہی سے قصاص لیا جائے گا۔ البتہ اگر مقتول کے ورثاء قصاص نہ لینا چاہیں اور اس کے بجائے دیت (خون بہا BLOOD MONEY) لینے پر راضی ہو جائیں، یادیت لیے بغیر یہ معاف کر دیں تو یہ دونوں صورتیں جائز ہیں۔ البتہ دیت پر رضا مند ہونے کے بعد اس کی ادائیگی ٹھیک طریقے سے ہونی چاہیے اور دیت کے معابرے کے بعد اس کی خلاف ورزی کر کے قصاص نہیں لیا جاسکتا۔ ایسا کرنا صریح زیادتی ہو گی۔ قتل عمد میں دیت کی یہ اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک رحمت اور رعایت ہے کیونکہ اس سے پہلے کی شریعتوں میں، جیسا کہ یہودیوں کے قانون میں یہ سختی تھی کہ قتل کے معاملے میں صرف قصاص لیا جاسکتا تھا، دیت اور معافی کی اجازت نہ تھی۔

پوئنکہ اسلام ایک عالمگیر دین ہے اور دنیا میں کامل اصلاح اور دین کی تکمیل کے لیے آیا ہے اس لیے امت مسلمہ کی شریعت میں یہ گنجائش رکھ دی گئی کہ قصاص کے بجائے دیت بھی لی جاسکتی ہے اور دیتے معاف بھی کیا جاسکتا ہے۔ یاد رہے کہ قتل عمد میں قصاص کی بجائے جودیت ہوتی ہے وہ اس دیت سے مختلف ہوتی ہے جو قتل خطا کی دیت ہے۔ کیونکہ پہلی کی مقدار مقرر نہیں ہے۔ باہمی رضا مندی سے کچھ بھی طے ہو سکتی ہے جب کہ دوسرا کی مقدار سو اونٹ یا ان کی قیمت مقرر ہے جو کہ سنت سے ثابت ہے۔

جب ہمارے نزدیک کافر کے قصاص میں کسی مسلمان کو قتل نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہی سنت ثابت ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ:

﴿وَأَنَّ لَا يُقْتَلَ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ﴾ (صحیح بخاری، رقم: 6903، ترمذی رقم: 1412، نسائی، رقم: 4748) مگر احضاف اس بات کے قائل ہیں کہ مسلمان کو بھی کافر کے قصاص میں قتل کیا جائے گا۔ اس معاملے میں وہ قرآن

کے عام حکم میں سنت کی تخصیص کو نہیں مانتے۔

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ دیت کی رقم یک مشت بھی ادا کی جاسکتی ہے اور قسطوں میں بھی اس کی ادا ممکن ہے جو تین برسوں کے اندر اندر عاقلہ (خاندان یا کمپنی) کی طرف سے ادا ہوں گی۔

یاد رہے قصاص کا قانون جس طرح جان کے بد لے میں ہے اسی طرح انسانی اعضاء کے بارے میں بھی ہے۔ جیسا کہ سورہ المائدہ کی آیت 45 میں ہے کہ آنکھ کے بد لے آنکھ، کان کے بد لہ میں کان، دانت کے بد لے دانت اور اسی طرح ہر خم کا برابر بد لہ لیا جائے گا۔ البتہ اس میں بھی قصاص کے عوض دیت لی جاسکتی ہے جسے اصطلاح میں ”ارش“ کہا جاتا ہے، یا پھر ویسے ہی معاف کیا جاسکتا ہے۔

﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيْثُ شَاءُوا إِذَا أَلْتَكَابَ لَعْلَمْ تَتَّقُونَ﴾ (179)

یہ آیت بھی قرآن حکیم کی مجرمانہ فصاحت و بلاغت کی مظہر ہے۔ چند بیغ الفاظ میں ایک وسیع مضمون ادا کیا گیا ہے۔ گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ فرمایا، تم قاتل کی جان لے کر پورے معاشرے کی جانیں محفوظ کر سکتے ہو۔ اس میں اہل بصیرت اور دانشوروں سے خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ قصاص کے قانون میں خواہ وہ جان کے بد لے جان ہو، یا اعضاء کے بد لے اعضاء ہوں انسانوں کے لیے زندگی اور امن و سکون کا یغایم ہے۔ کیونکہ جب کسی شخص کو یہ معلوم ہوگا کہ کسی اور کی آنکھ پھوڑنے کے بعد اس کی اپنی آنکھ بھی پھوڑی جائے گی تو وہ دوسرے کی آنکھ پھوڑنے کا ارادہ ترک کر دے گا۔ بہر حال دونوں صورتوں میں معاشرہ امن و امان کا گھوارہ بن جائے گا اور سب کی جانیں محفوظ و مامون رہیں گی۔

انسوں ہمارے ہاں کے بعض مغرب زدہ ناعاقبت اندیش لوگ قصاص کے اس قرآنی قانون کو قید کی سزا میں بدلتے کی تاپاک جسارت کرتے ہیں۔ آخر میں فرمایا: **لَعْلَكُمْ تَتَّقُونَ** اس سے مراد یہ ہے تاکہ تم قصاص کے ذرے ایک دوسرے کی جان لینے سے بازہ ہو اور آخرت میں عذاب سے نجٹ جاؤ۔

**كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدُكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا إِلَوْصِيَّةُ
لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿١٨﴾ فَمَنْ بَدَلَهُ
بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهُ ﴿١٩﴾ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ
عَلَيْهِمْ ﴿٢٠﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُؤْسِى جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا
عَلَيْهِمْ ﴿٢١﴾**

إِثْمٌ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢٢﴾

”جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آجائے اور وہ اپنے پیچے مال چھوڑ رہا ہو تو ضروری ہے کہ وہ اپنے

والدین اور رشتہ داروں کے لیے دستور کے مطابق وصیت کر جائے۔ یہ ایک ذمہ داری ہے اللہ سے ڈرنے والوں کی۔ پھر جو وصیت سننے کے بعد اسے بدل ڈالے تو وہ گناہ گار ہو گا۔ بے شک اللہ سننے والا جانے والا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ محسوس کرے کہ وصیت کرنے والے نے غلطی سے یا جان بوجھ کر کسی کی حق تلفی کی ہے اور پھر وہ وارثوں میں صلح صفائی کرادے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔“

(182-180)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

خَيْرٌ:..... قرآن مجید میں یہ لفظ تین مختلف معنوں میں آیا ہے:

1۔ نیکی یا بھلائی کے معنوں میں جیسے:

(البقرہ 2: 197) **﴿وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمُهُ اللَّهُ﴾**
”اور جو نیکی تم کرتے ہو اللہ اسے جانتا ہے۔“

2۔ بہتر (BETTER) کے معنوں میں جیسے:

(البقرہ 2: 221) **﴿وَلَعَبَدُ مُؤْمِنُ خَيْرٍ مِنْ مُشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ﴾**
”اور آزاد مشرک مرد خواہ تمہیں کتنا ہی پسند ہو اس سے مسلمان غلام بہتر ہے۔“

3۔ مال کے معنوں میں جیسے:

(البقرہ 2: 272) **﴿وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا فِسْكُمُ﴾**
”اور جو مال تم (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو گے، اپنے لیے کرو گے۔“

اس جگہ یہ لفظ اپنے تیرے معنوں یعنی ”مال“ کے لیے استعمال ہوا ہے۔

خَافٌ:..... خوف کے معنی ڈرنے کے علاوہ اندیشہ ہونے یا علم ہونے کے بھی آتے ہیں اور اس جگہ یہی مراد ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں حضرت زکریاءؑ کے بارے میں ہے کہ:

(مریم 5: 19) **﴿وَإِنِّي خَفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَرَآئِي﴾**
”اور مجھے اپنے رشتہ داروں کے بارے میں اندیشہ ہے کہ وہ میرے بعد دین میں خرابی پیدا نہ کر دیں۔“

مُؤْصٌ:..... یہ اصل میں موصیٰ تھا۔ اس کے معنی ہیں وصیت کرنے والا۔

جَنَفَاً:..... اس کے اصل معنی مائل ہونے کے ہیں۔ مگر یہ زیادہ تر نیکی کی بجائے برائی کی طرف مائل ہونے کے لیے آتا ہے۔ آیت میں اس کے معنی جانب داری اور ناصافی کے ہیں۔

إِنْهُ:..... اس کے معنی گناہ اور حق تلفی کے ہیں۔

﴿كُتُبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَهْدَكُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكْ خَيْرًا إِلَوْصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبَيْنَ إِلَيْكُمْ مَعْرُوفٌ حَقًا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴾ (180)

فرمایا جب کوئی شخص قریب المرگ ہوا وہ مال دار ہوتے چاہیے کہ مرنے سے پہلے اپنے والدین اور دوسرے قریبی رشتہ داروں کے حق میں اپنی وارثت کے بارے میں وصیت لکھ دے اور یہ فرض کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر وصیت کا یہ فرض حکم ابتدائی دور کے لیے تھا۔ بعد میں جب سورہ النساء کی آیات مواریث (وہ آیتیں جن میں وارثت کے بارے میں احکام دیئے گئے ہیں) نازل ہو گئیں اور میت کے ترکے کے تمام وارثوں کے حصے مقرر کر دیئے گئے تو یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ لیکن غیر وارث کے حق میں وصیت کی اجازت سنت سے ثابت ہے اور اس کے لیے زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مال کی وصیت کی جاسکتی ہے۔

(صحیح بخاری، رقم: 2742، صحیح مسلم، رقم: 4209، ترمذی، رقم: 2116، نسائی، رقم: 3665) اور اس کی حیثیت ایک منتخب کام کی ہے۔ البتہ وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہے جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے کہ لا وَصِيَّةً لَوَارِثٍ وَارثٍ كَهْ حق میں وصیت نہیں کی جاسکتی۔

(ابوداؤد، رقم: 2870، ترمذی، رقم: 2120، نسائی، رقم: 3671)

بعض اہل علم مخصوص حالات میں وارث کے حق میں بھی وصیت کے قائل ہیں۔

اس آیت سے پہلے قصاص کا حکم بیان ہوا تھا جو اصل میں موت ہی سے متعلق تھا۔ اب موت ہی کے حوالے سے وصیت کا مضمون آگیا۔

یاد رہے کہ وصیت تحریر کر لینی چاہیے اور اس پر دو معتر آدمیوں کو گواہ بنالینا چاہیے۔

﴿فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِشْمَاعُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴾ (181)

فرمایا اگر گواہ یا وصی یعنی جس کے حق میں وصیت کی گئی ہو، وصیت کو بد لیں گے تو ان کو اس کا گناہ ہو گا۔ موصی یعنی وصیت کرنے والا بے قصور ہو گا بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اسے وصیت کرنے کا اجر ملے گا۔

آخر میں تنبیہ کے انداز میں فرمایا کہ ﴿إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ کہ اللہ تعالیٰ سب کی باتیں سنتا اور ہر ایک کی نیت کو جانتا ہے کہ اگر جھوٹ یا کسی اور غلط طریقے سے وصیت کو بدلا جائے گا تو وصیت کو بدلنے والے یاد رکھیں اللہ سبحانہ ان کی حرکتوں سے واقف ہے اور ان کو سزادے گا۔

﴿فَمَنْ خَافَ مِنْ مُؤْسِى جَنَفًا أَوْ إِنْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴾ (182)

فرمایا اگر یہ پختہ حل جائے کہ وصیت کرنے والے نے جان بوجھ کر، یا بے جانے بوجھے اپنی وصیت میں کسی کی حق

تلغی کی ہے، یا ناجائز جانب داری سے کام لیا ہے تو ایسی وصیت کی اصلاح کر دینی چاہیے۔ جو شخص کسی ایسی غلط وصیت کی اصلاح کر کے لوگوں کا جھگڑا ختم کرے گا اسے کوئی گناہ نہ ہوگا۔

پھر آخر میں فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ الرَّحِيمُ﴾ کہ جو کوئی غلط وصیت کی اصلاح کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ بخشنے کا اور اپنی رحمت سے اس نیک کام پر اجر و ثواب بھی دے گا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى النَّذِينَ
مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقَوْنَ ﴿١٧﴾ أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ
مَّرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخْرَى وَ عَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ
فِدْيَةٌ طَعَامٌ مُسِكِينٌ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ وَ أَنْ تَصُومُوا
خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١٨﴾ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ
الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَ بَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَ الْفُرْقَانِ فَمَنْ
شَهَدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلَيَصُمِّهُ وَ مَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ
مِّنْ أَيَّامٍ أُخْرَى يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَ لِتُكِمِلُوا
الْعِدَّةَ وَ لِتُنْكِرُوا اللَّهَ عَلَى مَا هَذِلُكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشَكُّرُونَ ﴿١٩﴾ وَ إِذَا
سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أَجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ
فَلَيَسْتَجِيبُوا لِي وَ لَيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشَدُونَ ﴿٢٠﴾ أَحِلَّ لَكُمْ
لِيَلَّةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَاءِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَ أَنْتُمْ
لِبَاسٌ لَهُنَّ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ
عَلَيْكُمْ وَ عَفَّا عَنْكُمْ فَإِنَّمَا بَاشِرُوهُنَّ وَ ابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ

وَكُلُوا وَاشْرُبُوا حَتّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبِيسُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ
مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتَمُّوا الصِّيَامَ إِلَى الَّيْلِ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ
وَأَنْتُمْ عَكِيفُونَ لِفِي الْمَسْجِدِ طَتْلَكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرُبُوهَا
كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ أَيْتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ^(۱۶)

”اے ایمان والو! تم پر روزہ رکھنا فرض ہے جیسے پہلے لوگوں پر فرض تھا تاکہ تم پر ہیز گار بن جاؤ۔ یہ روزے کتنی کے چند دن ہیں۔ لیکن اگر کوئی بیمار ہو، یا مسافر ہو، تو وہ اور دونوں میں قضاۓ کے روزے رکھ کر تعداد پوری کر لے۔ جس کے لیے کسی اور عذر کی وجہ سے روزہ رکھنا مشکل ہو، وہ ایک روزے کے بد لے ایک مسکین کو کھانا دے۔ جو کوئی اپنی خوشی سے کچھ زیادہ دیدے تو اس کے لیے بہتر ہے۔ البتہ روزہ رکھنا تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے، اگر تم جانو۔

رمضان کے میئین میں قرآن نازل ہوا جو لوگوں کے لیے ہدایت ہے، جس میں سیدھی راہ کی کھلی نشانیاں ہیں اور جو حق و باطل کا فرق بتانے والا ہے۔ (مسلمانو) جب رمضان کا مہینہ آئے اور تم مقیم ہو تو روزے رکھو۔ لیکن بیمار اور مسافر دوسرے دنوں میں قضا روزے رکھ کر تعداد پوری کر لیں۔ اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے، وہ تم پر بخشی کرنا نہیں چاہتا، تاکہ اس طرح تم روزوں کی تعداد پوری کر لو، اللہ کی بڑائی بیان کرو، جس نے تمہیں ہدایت بخشی اور اس کی شکرگزاری کرو۔ (اے نبی ﷺ) جب میرے بندے میرے بارے میں پوچھیں تو آپ ﷺ ان سے کہیں: میں ان کے بہت قریب ہوں۔ ہر پکارنے والے کی پکارستا اور اس کا جواب دیتا ہوں۔ انہیں چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر یقین رکھیں تاکہ ہدایت پائیں۔

(مسلمانو) روزے کی رات میں اپنی بیویوں کے پاس جا سکتے ہو۔ وہ تمہارے لیے لباس ہیں، تم ان کے لیے لباس ہو۔ اللہ کو معلوم ہے تم اس سے پہلے اپنے ساتھ خیانت کرتے رہے۔ مگر اللہ نے مہربانی کی اور تمہاری خطا معاف کی۔ اب تم روزے کی رات میں اپنی بیویوں سے ہم بستری کر سکتے ہو اور جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے حاصل کر سکتے ہو۔ اس کے علاوہ رات کو اس وقت تک کھا پی سکتے ہو جب صبح کی سفید دھاری، کالی دھاری سے الگ ظاہر ہو جائے۔ اس کے بعد رات تک روزہ پورا کرو۔ لیکن جب مسجد میں اعتکاف کی حالت میں ہو تو پھر رات کو گھر میں آ کر اپنی بیویوں سے صحبت نہیں کر سکتے۔ یہ حدیث نے قائم کی ہیں، ان کے قریب نہ جاؤ۔ اللہ

اپنی آئیتیں لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔” (183-187)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

الصَّيَامُ: صیام یا صوم (روزہ رکنا) مصدر ہے جس کے اصل معنی کسی چیز سے روکنے کے ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں روزے کی یہ تعریف کی گئی ہے:

”اللَّهُ تَعَالَى سَعَى ثَوَابَ حَالِصَّ مَكْرُونَ كَنْتَ نِيَّتَكَ سَاحَةَ نَبْرَسَ لَكَ مَغْرِبَ تَكَاهَنَ پَيْنَى اُورَ
ازدواجی تعلق سے رکے رہنا۔“

﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔

أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ: اس سے رمضان المبارک کے فرض روزے مراد ہیں۔

بُطْنِيَفُونَةٌ: یہ اطاقۃ طاقت سے اور طوق سے بنائے ہے۔ عربی زبان میں وُسْعَ کا لفظ ایسی قوت اور استطاعت کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے کوئی کام آسانی اور سہولت سے کیا جاسکے۔ اس کے برعکس طاقت اور اطاقۃ ایسی قوت اور استطاعت کے لیے استعمال ہوتا ہے جس سے کوئی کام سخت محنت، تنگی اور مشقت ہی سے کیا جاسکے:

الْأَطَاقَةُ: القدرة على الشيء مع تحمل المشقة الشديدة (تفسیر مراғی)

”گویا طاقت کسی کام کے کرنے کی صلاحیت کام سے کم درجہ ہے اور اس کے بعد بے بسی اور بعزم ہے۔“

غور کیجئے تو ان دونوں کا فرق قرآن مجید میں ان کے استعمالات ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے وُسْعَ کے بارے میں اللہ

تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾

”اللَّهُ كَسَى جَانَ پَرْ أَسَ کَی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔“

مطلوب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ذمہ داریوں کا اتنا ہی بوجھ ڈالتا ہے جتنا وہ آسانی اور سہولت سے اٹھا سکتے ہیں۔

اسی طرح طاقت کا لفظ قرآن مجید میں صرف دو جگہ آیا ہے:

﴿قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ﴾

”وہ بولے آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکروں سے لڑنے کی طاقت اور ہمت نہیں۔“

مراد یہ ہے کہ لڑنا تو ہم جانتے ہیں مگر اس جگہ میں جتنی سخت محنت اور مشقت درکار ہے وہ ہم سے نہیں ہو سکتی۔

دوسری جگہ دعا میں آیا ہے کہ:

﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ﴾

(البقرہ 2: 286)

”اے ہمارے رب! ہم سے وہ بوجھ نہ اٹھو جس کی ہم میں طاقت اور ہمت نہیں۔“

مطلوب یہ ہے کہ ہمیں ایسے مشکل احکامات کا پابند نہ کرنا جن کی وجہ سے ہمیں تنگی اور دشواری پیش آجائے اور ہم سخت محنت اور مشقت میں پڑ جائیں۔

اس لیے ہماری رائے میں لفظ **يُطِيقُونَ** کے معنی ہی یہ ہیں جیسا کہ عبداللہ بن عباس رض کا قول ہے کہ جو لوگ مشکل اور دشواری سے روزہ رکھ سکتے ہوں ان کے لیے یہ رخصت ہے کہ وہ ہر روزے کے بد لے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ یہی کافی ہے۔ اس طرح ان پر روزے کی قضا بھی لازم نہ آئے گی۔ جیسے دائیٰ مریض، بہت زیادہ بوڑھے، حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتیں۔

عَاكِفُونَ یہ **عَاكِفٌ** کی جمع ہے جو عَكْفَ يَعْكِفُ سے اسم فاعل ہے۔ عَكْفَ کے معنی ہیں اس نے روکا، اس نے ٹھہرایا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَالْهَدَى مَعْكُوفًا﴾ (الفتح: 25) اور قربانی کے جانوروں کو روکا گیا ہے۔

عَكْفَ عَلَى الشَّيْءِ کے معنی ہیں کسی چیز پر جمے بیٹھے رہنا، جیسا کہ بنی اسرائیل کے واقعہ میں ہے کہ ان کا گزر ایک بت پرست قوم پر ہوا جو اپنے بتوں پر جمے بیٹھے تھے:

﴿وَجَوَزَنَا بِيَتْنِي إِسْرَارًا عِيلَ الْبَحْرِ فَأَتَوْا عَلَى قَوْمٍ يَعْكُفُونَ عَلَى أَصْنَامِ لَهُمْ﴾

(الاعراف: 7)

”اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر پار کر دیا۔ پھر ان کا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جو اپنے بتوں پر جمی بیٹھی تھی۔“

اسی سے اعتکاف کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ہیں: اپنے آپ کو کسی چیز سے وابستہ کرنا اور روکنے کے رکھنا، خواہ وہ چیز اچھی ہو یا بُری۔“

مگر شریعت کی اصطلاح میں اس سے مراد ہے:

”ثواب کی نیت سے مسجد میں رکارہنا۔“

شرعی اعتکاف کا ذکر اس سے پہلے بھی سورۃ البقرہ میں آچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل صلی الله علیہ وسلم کو حکم دیا تھا کہ:

﴿أَنْ طَهِرَا بَيْتَنِي لِلَّطَّافِيفِينَ وَالْعَكِيفِينَ وَالرُّكْعَ السُّجُودَ﴾ (البقرہ: 2)

”کہ وہ میرے گھر کو پاک رکھیں طواف کرنے والوں کے لیے، اعتکاف کرنے والوں کے لیے، رکوع کرنے والوں کے لیے اور سجدة کرنے والوں کے لیے۔“

الْخَيْطُ الْأَبَيْضُ: (سفید دھاگہ) اس سے صحن کی سفید دھاری مراد ہے۔

الْخَيْطُ الْأَسْوَدِ: (سیاہ دھاگہ) اس سے رات کی سیاہ دھاری مراد ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتُبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتُبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقَوْنَ ﴾ (183)

اس آیت میں مسلمانوں کو رمضان المبارک کے روزے فرض ہونے کا حکم سنایا گیا ہے۔ ارشاد ہوا کہ اہل ایمان پر روزہ فرض ہے۔ یہی حکم پہلی امتوں کے لیے بھی تھا۔ اس کا مقصد تقوے کا حصول ہے جو تمام نبیوں کی بنیاد ہے۔

انسانی طبیعت کا یہ خاصا ہے کہ اگر کوئی مشکل ایسی ہو جو اجتماعی شکل میں ہو تو وہ آسان محسوس ہوتی ہے۔ اس آیت میں روزے کا حکم دیتے وقت جو پہلی قوموں کا ذکر کیا گیا تو اس میں یہی حکمت کا فرمایا ہے تاکہ اس حکم کی دشواری کا احساس کم کر دیا جائے۔ کیونکہ انسانی فطرت پابندیوں سے گھبراتی ہے اور جب کوئی پابندی عام ہو جائے تو پھر اسے قبول کرنے لگتی ہے۔

اس آیت میں روزے کا مقصد اور فائدہ یہ بتایا گیا ہے کہ اس سے تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو گا۔

تقوے کی حقیقت کیا ہے؟ یہ دل کی ایسی کیفیت کا نام ہے جو اللہ سبحانہ کے خوف سے پیدا ہوتی ہے اور اس کے اثر سے نیکی کرنا اور برائی سے بچنا آسان ہو جاتا ہے۔ ایک نیک، متقی اور پرہیز گار شخص، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے انجام سے ڈر کر کسی برائی یا گناہ کے قریب نہیں جاتا بلکہ اس سے بچ جا کر نیکی کی راہ پر چلتا رہتا ہے۔

روزہ اسلام کے پانچ بنیادی اركان میں سے ایک رکن ہے۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے:

(صحیح بخاری، رقم: 8، صحیح مسلم، رقم: 113، ترمذی، رقم: 2609، نسائی، رقم: 5051)

﴿أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ ﴾ (184)

”گنتی کے چند دن۔“ اس سے مراد رمضان المبارک کا مہینہ ہے جو 29 یا 30 دن کا ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے ایک ماہ جلد ہی گزر جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پورے بارہ مہینوں میں صرف ایک مہینے کے روزے فرض کیے ہیں تاکہ اس کے بندے آسانی اور سہولت سے روزے رکھ سکیں۔ یہ اللہ سبحانہ کی اپنے بندوں پر بڑی رحمت، شفقت، اور رحمایت ہے، ورنہ وہ چاہتا تو کمی مہینوں کے روزے فرض کر دیتا جس سے لوگ مشقت اور تنگی میں پڑ جاتے۔

﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مُهْرِيًّا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعَدَّةٌ مِنْ أَيَّامِ أُخْرَى ﴾ (184)

اس سے پہلے یہ رحمایت اور سہولت دی گئی کہ بارہ مہینوں میں سے صرف ایک ماہ کے روزے فرض کیے گئے کیونکہ دین اسلام میں آسانی ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ:

((إِنَّ الَّذِينَ يُسْرُ)) (صحیح بخاری، رقم: 39، نسائی، رقم: 5034)

دین آسانی کا نام ہے۔

پھر چونکہ بیمار اور مسافر کے لیے بعض حالات میں روزہ رکھنا ناممکن تھا یا اس میں ان کے لیے بڑی تنگی اور مشقت

تحتی۔ اس لیے ان دونوں کے لیے روزے قضا کرنے اور ان کو بعد میں ادا کرنے کی اجازت دی گئی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (الحج 22: 78)

”اور اس (اللہ) نے دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔“

اسی طرح احادیث میں حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت کو بھی روزہ چھوڑنے کی اجازت دی گئی ہے اور وہ اپنے قضائشہ روزے بعد میں رکھیں گی۔

﴿وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةً طَعَامٌ مُسْكِنٌ﴾ (184)

یہ ان لوگوں کے لیے رخصت دی گئی ہے جن کے جن کے لیے روزہ رکھنے میں حد درجہ مشقت اور تنگی تھی۔ جیسے داعی مریض یا بہت بوڑھے لوگ، کہ وہ ہر روزے کے بد لے کسی مسکین یا محتاج کو ایک دن دو وقت کا کھانا کھلا دیں یا اس کی قیمت کے برابر رقم دے دیں۔ اور یہ ایک روزے کا فدیہ ہے۔

﴿فَنَّ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ﴾ (184)

پھر فرمایا کہ ہر روزے کے بد لے جو ضروری فدیہ دینے کا حکم دیا گیا ہے تو اس میں اگر کوئی شخص اپنی مرضی سے زیادہ دے گا اور کسی محتاج پر زیادہ خرچ کرے گا تو اسے اسی نسبت سے زیادہ اجر ملے گا۔ گویا وہ واجب حکم ادا کرنے کے ساتھ ساتھ نظری صدقے کا ثواب بھی پائے گا۔

نفل اور مستحب کاموں پر اجر و ثواب کے حوالے سے مزید وضاحت آیت 158 کی تفسیر میں دیکھ لیجیے۔

﴿وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ (184)

فرمایا اگر تمہیں علم ہو کہ روزہ رکھنے کا کتنا اجر و ثواب ہے تو تم اس کا فدیہ دینے کی بجائے روزہ رکھنے کو ترجیح دو گے۔ کیونکہ فدیہ تو رخصت ہے۔ وہ روزے کا صحیح نعم المبدل نہیں ہے۔ اس لیے تم یہ بھی کر سکتے ہو کہ فدیہ بھی دے دو اور جتنے روزے ممکن ہوں وہ بھی رکھو تاکہ زیادہ سے زیادہ ثواب پاؤ۔

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلْمُتَّسِّرِينَ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدْيٰ وَالْفُرْقَانِ﴾ (185)

فرمایا رمضان المبارک وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل ہونا شروع ہوا اور قریباً تیسیں 23 برس میں اس کا نزول مکمل ہوا۔ یہ قرآن تمام لوگوں کے لے سراپا ہدایت ہے۔ اس میں ہر قسم کی رہنمائی اور اس کے واضح دلائل موجود ہیں۔ یہ حق اور باطل میں فرق کرنے والی کتاب ہے۔ اس کی واضح آیات سے گمراہی کے اندر ہیرے مختصر اور ہدایت کی شاہراہ روشن ہوتی ہے۔ ایسی ہدایت کتاب میں انسانوں کے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائی اور سرفرازی ہے۔ اس مبارک کتاب کے نازل ہونے پر رمضان المبارک کے روزے فرض کیے گئے ہیں تاکہ اس نعمت کا صحیح طور پر شکر ادا کیا جاسکے۔

﴿فَمَنْ شَهَدَ مِنْكُمُ الشَّهَدَ فَلَيَصُمِّهُ﴾ (185)

ارشاد ہوا کہ جو شخص مقیم ہو اور وہ مسافر نہ ہو تو اس پر لازم ہے کہ رمضان المبارک کے روزے رکھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسافر کے لیے روزہ رکھنا لازم نہیں ہے بلکہ وہ بعد میں اپنے چھوڑے ہوئے روزوں کی قضاپوری کرے گا۔ آیت کے اس فقرے سے بھی روزے کا فرض ہونا ثابت ہوتا ہے جیسا کہ آیت 183 سے اس کا فرض ہونا ثابت ہوا ہے۔

﴿وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعَدَهُ مِنْ أَيَّامٍ أُخْرَىٰ﴾ (185)

یہ فقرہ دوبارہ آیا ہے کہ مریض اور مسافر پر روزہ رکھنا لازم نہیں ہے بلکہ وہ مرض کے دور ہونے اور سفر کے ختم ہونے پر رمضان المبارک کے بعد قضا شدہ روزے رکھیں گے۔ مزید وضاحت کے لیے آیت 184 میں اسی فقرے کی تفسیر دیکھ لی جائے۔

﴿يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (185)

یہ اللہ سبحانہ کی رحمت و شفقت کا انہصار ہے کہ وہ اپنے بندوں کے لیے آسانی چاہتا ہے دشواری نہیں چاہتا۔ وہ لوگوں کو سہولت دینا چاہتا ہے ان کو تنگی میں بٹانا نہیں کرتا چاہتا۔ وہ ان کو آسان احکام دیتا ہے اور ان کے ساتھ رخصت بھی دیتا ہے۔

یہی مضمون کئی اور مقامات پر بھی بیان ہوا ہے جیسے:

(المائدہ 5:6)

﴿مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ﴾

”اللَّهُنَّا نِعَمْ صَاحِبُكَ وَهُنَّمَنْ صَاحِبُكَ“

(الحج 22:78)

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾

”اور اس (اللہ) نے دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔“

(البقرہ 2:286)

﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾

”اللہ کی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔“

(النساء 4:28)

﴿يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُغَيِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا﴾

”اللہ چاہتا ہے کہ تم پر سے پاندیوں کا بوجھ ہلاکا کر دے کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔“

﴿وَلَيَتَكُمُّلُوا الْعِدَّةَ﴾ (185)

فرمایا کہ قضا شدہ روزے رکھنے کا مقصد رمضان المبارک کے روزوں کی تعداد پوری کرنا ہے تاکہ اس طریقے سے پورا پورا اثواب حاصل کیا جاسکے اور اجر و برکت میں کوئی کمی باقی نہ رہے۔

﴿وَلَيُتَكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَلَكُمْ﴾ (185)

فرمایا، اللہ سبحانہ نے تمہیں دین کی جو ہدایت و رہنمائی فرمائی ہے اور دین کے ایسے احکام دیئے ہیں جن میں

تمہارے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے، تو اس پر تم اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو اور ذکر و تسبیح کرو کہ اس نے تمہاری فلاج و بہبود کے لیے عمدہ احکام دیے ہیں اور ان کے ساتھ رخصتیں بھی عطا کی ہیں۔

﴿وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ (185)

آخر میں فرمایا کہ اللہ سبحانہ کی تمام نعمتوں کا شکر ادا کرو۔ اس کے دیے ہوئے احکام پر عزیمت کے ساتھ عمل بھی کرو اور ضرورت کے وقت اس کی رخصتوں سے بھی فائدہ اٹھاسکتے ہو۔ اسی طریقے سے تمہارا ایمان کامل ہو گا اور تمہارا رب بھی تم سے راضی ہو جائے گا۔

گویا اس جگہ قرآن حکیم کے نزول کی نعمت پر اور رمضان المبارک کے روزوں کی برکات حاصل ہونے پر خصوصی شکر ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

﴿وَ إِذَا سَأَلَكَ عِبَادٌ مُّعَنِّيَ فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعَوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ﴾ (186)

تفسیر طبری میں اس آیت کا شانِ نزول یہ بیان کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک دیہاتی آیا اور اس نے سوال کیا کہ کیا ہمارا رب قریب ہے کہ ہم اسے آہستہ سے پکاریں، یا وہ دور ہے کہ ہم اسے بلند آواز سے پکاریں، اس پر حضور ﷺ خاموش رہے تو اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔

ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک غزوہ (غالباً غزوہ خیبر) کے موقع پر بعض صحابہ کرام کو دیکھا کہ وہ بلند آواز سے تہلیل و تکمیر کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو پکار رہے ہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: لوگو! اپنے آپ میں رہو۔ تم کسی بھرے یا غائب خدا کو نہیں پکار رہے ہو، بلکہ تم ایسے خدا کو پکار رہے ہو جو ہربات ستا اور قریب ہے۔

(صحیح بخاری، رقم: 2992، ابو داؤد، رقم: 1526)

البته بعض حالات میں شریعت نے اجازت دی ہے کہ اللہ سبحانہ کا نام بلند آواز سے پکارا جائے جیسے حج اور عمرہ میں تلبیہ کہنا، عیدین کی تکبیرات یا دورانِ جنگ اللہ اکبر کا نعرہ لکانا وغیرہ۔

اس سے پہلے روزوں کا اور پھر اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرنے کا ذکر ہوا۔ اب دعا کے وقت پکارنے کا طریقہ بتایا گیا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ اے نبی ﷺ! اجب میرے بارے میں لوگ پوچھیں تو آپ ﷺ کہیں کہ اللہ تمہارے بالکل قریب ہے۔ وہ ہر دعا کرنے والے کی دعا براہ راست خود سنتا ہے۔ اس کے اور بندوں کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہے اور کوئی رکاوٹ موجود نہیں ہے۔ درمیان میں کوئی ایسا سفارشی بھی موجود نہیں ہے جو ان کی دعا کی عرضیاں ان کے رب تک پہنچاتا ہو، یا جس کی سفارش سے ان کی دعا کیں قبول ہوتی ہوں۔

اس مضمون کی تفسیر کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے قریب ہے، یہ آیت ہے کہ:

﴿وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ﴾ (ق 50: 16)

”اور ہم اس کی شرگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔“

﴿فَلَيَسْتَعِجِبُوا لِنِّي وَلَيُؤْمِنُوا لِنِّي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴾ (186)

فرمایا: دعا سے پہلے بندوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ پورے اخلاص کے ساتھ میرے احکام پر چلتے ہوئے صرف مجھ سے دعا کریں۔ مجھ پر ایمان رکھیں اور بھروسا کریں تاکہ میں ان کی دعا نئیں قبول کروں۔ جب وہ حالت ایمان کے ساتھ میری اطاعت کریں گے تو میں ان کی دعا ضرور قبول کروں گا۔ آخر میں فرمایا: ﴿لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ﴾ کہ یہی طریقہ ہے ہدایت پانے اور بامراہ ہونے کا، کہ بندے اپنے رب پر ایمان لائیں، اس کے احکام کی اطاعت کریں اور پھر اپنی حاجات پوری کرنے کے لیے اور اپنی مشکلات حل کرنے کے لیے صرف اسی سے دعا نئیں مانگیں۔ صرف اسی طریقے سے ان کو دنیا اور آخرت کی بھلائی اور فلاح و کامرانی حاصل ہو سکتی ہے۔ دعا کے بارے میں تفصیل ان شاء اللہ سورۃ المؤمن (40) کی آیت 60 کی تفسیر میں ملے گی۔

﴿أَحَلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّقْمُ إِلَى نِسَاءِ لَكُمْ﴾ (187)

ارشاد ہوا کہ تمہیں رمضان المبارک کی راتوں کو یوں یوں سے ہم بستری کی اجازت دی جاتی ہے مگر دن کے وقت روزے کی حالت میں ایسا کرنا بالکل جائز نہیں ہے۔

﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ (187)

فرمایا تمہاری یوں یاں تمہارے لیے لباس کی طرح ہیں اور تم اپنی یوں یوں کے لیے لباس کی مانند ہو۔ میاں یوں کے باہمی ربط و تعلق کو ایک دوسرے کا لباس قرار دینا نہایت بلیغ استعارہ ہے۔ اسی جسمانی قربت و مصاجبت کی بنا پر چونکہ بعض طبائع کے لیے مہینہ بھر کا صبر دشوار ہو سکتا تھا۔ لہذا اس تنگی اور حرجن کو دور کرتے ہوئے ملاقات کی رخصت دے دی گئی جو شریعت کے عام قاعدے کے مطابق بھی ہے کہ جہاں تنگی ہوگی وہاں رخصت دی جائے گی۔

﴿عَلَمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ﴾ (187)

مطلوب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمہاری اس حرکت کا علم تھا کہ تم میں سے کچھ لوگوں نے ایک کام کو ناجائز بھتھتے ہوئے بھی اس کا ارتکاب کیا۔ گویا تم نے اپنے آپ سے خیانت کی۔ پھر چونکہ اس بارے میں ابھی تک کوئی واضح شرعی حکم موجود نہ تھا اس لیے تمہاری اس خطا پر اللہ سبحانہ نے کوئی گرفت نہیں فرمائی اور اپنی کمال مہربانی سے تمہیں معاف کر دیا۔

﴿فَإِذْنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ﴾ (187)

فرمایا: اب تمہیں ایک واضح حکم کے ذریعے اجازت دی جاتی ہے کہ روزوں کی راتوں میں تم اپنی یوں یوں کے قریب جا سکتے ہو اور جو کچھ اللہ سبحانہ نے تمہاری قسمت میں لکھا ہے وہ حاصل کر سکتے ہو، یعنی اولاد اور ایک دوسرے کے لیے

پاک دامنی اور صدقہ کرنے کا اجر بھی، جیسا کہ صحیح حدیث میں آیا ہے۔

(صحیح مسلم، رقم: 2329، مسنند احمد، رقم: 21805)

﴿وَكُلُوا وَاشْرِبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجَرِ﴾

(187)

اب فرمایا کہ روزوں کی راتوں میں کھانے پینے اور بیویوں سے ملنے کی عام اجازت ہے اس وقت تک کے لیے جب صحیح کی سفیدی رات کی سیاہی سے الگ ظاہر ہو جائے، گویا جب رات ختم ہونے اور صحیح طلوع ہونے کے آثار پیدا ہو جائیں۔ اسی کو صحیح صادق کہا جاتا ہے۔ اس سے یہ باریک اشارہ بھی لکھتا ہے کہ بعض اوقات جنابت کی حالت میں بھی روزہ رکھ کر بعد میں غسل کیا جا سکتا ہے۔

﴿ثُمَّ أَتَمُوا الصَّيَامَ إِلَى الظَّلَلِ﴾ (187)

ارشاد ہوا کہ صحیح صادق سے لے کر سورج غروب ہونے تک روزے کی حالت ہے جس میں کھانا پینا وغیرہ منع ہے۔

پھر جب سورج ڈوب گیا تو اب روزہ کھولنے میں درنیں ہونی چاہیے۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں یہ وضاحت موجود ہے کہ:

((إِذَا أَفَلَ اللَّيْلُ مِنْ هَاهُنَا، وَ أَدْبَرَ النَّهَارُ مِنْ هَاهُنَا، وَغَرَبَتِ الشَّمْسُ فَقَدْ أُفْطِرَ الصَّائِمُ))

(صحیح بخاری، رقم: 1954، صحیح مسلم، رقم: 2558)

”جب رات اس طرف سے آجائے اور دن اس طرف پلٹ جائے اور سورج غروب ہو جائے تو روزے دار کو چاہیے کہ وہ افطار کر لے۔“

اور متفق علیہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ:

﴿لَا يَزَالُ النَّاسُ يَخْيِرُ مَا عَجَلُوا الْفِطْرَ﴾

”لوگ جب تک افطاری کرنے میں جلدی کرتے رہیں گے، وہ خیر اور بھلائی پر رہیں گے۔“

بعض لوگ إلى الليل (رات تک) کے الفاظ سے رات کے اندر ہیرے کا چھا جانا مراد لیتے ہیں جو کہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اول تو صحیح احادیث کے خلاف ہے۔ دوسرا سیدھی بات یہ ہے کہ دن کا اختتام ہی رات کا آغاز ہوتا ہے اس لیے سورج کے چھپ جانے کے فوراً بعد ہی روزہ افطار کر لینا قرآن و سنت دونوں ہی کے میں مطابق ہے۔

﴿وَ لَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَ أَنْتُمْ غُرَفُونَ لِفِي الْمَسْجِدِ﴾ (187)

اس سے پہلے چونکہ روزوں کی راتوں میں کھانے پینے کے علاوہ بیویوں کے قریب جانے کی عام اجازت دی گئی جیسا کہ فرمایا گیا: **﴿أُحِلَّ لَكُمْ لَيَلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَاءِكُمْ﴾**

اس سے یہ غلط فہمی ہو سکتی تھی کہ شاید مسجد میں رمضان المبارک کے اعتکاف کے دوران بھی بیویوں کے پاس جایا جا سکتا ہے تو اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ اس کی بالکل اجازت نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے اعتکاف باطل ہو

جاتا ہے جیسے دن کے وقت کھانے پینے سے روزہ ختم ہو جاتا ہے۔

اس سے بعض اہل علم نے یہ سمجھا ہے کہ جس طرح مردوں کے اعتکاف کے لیے ضروری شرط ہے کہ وہ مسجد ہی میں ہواںی طرح عورتوں کے اعتکاف کے لیے بھی مسجد کا ہونا شرط ہے۔ لیکن آیت کے الفاظ اس بارے میں صریح یا قاطعی نہیں ہیں۔ تبکی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہؓ کے زدیک عورت کے اعتکاف کے لیے مسجد کا ہونا ضروری شرط نہیں ہے بلکہ وہ اپنے گھر کے مصلیٰ وغیرہ میں اعتکاف کرے گی اور فتنے کے اس دور میں ہم اسی رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جب شریعت نے کسی فرض عبادت کے لیے عورت کو مسجد میں حاضری کے لیے پابند نہیں کیا تو کسی سنت یا فعل عبادت کے لیے اسے مسجد میں آنے کے لیے کیوں پابند کیا جائے؟

﴿تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرُبُوهَا﴾ (187)

ارشاد ہوا کہ ابھی جو حکامات دیے گئے ہیں، جن میں بعض فرض ہیں، بعض حرام اور کچھ مباح ہیں مگر یہ سب حدود اللہ ہیں، یعنی اللہ سبحانہ کی قائم کی ہوئی حدیں ہیں جن کو پھلانگنا تو درکار، ان کے قریب بھی نہ پھلنگنا۔

ظاہر ہے اس فقرے میں جوختی اور عید ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے جس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ:

﴿تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا﴾ (البقرہ 2: 229)

”یہ اللہ کی حدیں ہیں ان سے باہر نہ نکلو۔“

اس کے علاوہ قرآن کے اور مقامات جہاں پر لا تقربوا کہہ کر خبردار کیا گیا ہے کہ کبھی ان چیزوں کے قریب نہ جاؤ، وہ یہ ہیں:

1- شیئم کا مال کھانا:

﴿وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتَيمِ إِلَّا بِالْتِنِّي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّى يَبْلُغَ أَشُدَّهُ﴾ (الانعام: 6: 152)

”اور شیئم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو بہتر ہو۔ یہاں تک کہ وہ شیئم اپنی جوانی کو پہنچ جائے۔“

2- زنا:

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَةَ سَبِيلًا﴾ (بنی اسرائیل 17: 32)

”اور زنا کے قریب نہ جاؤ، وہ بے حیائی ہے اور بر اراستہ ہے۔“

اسی مضمون کو ایک متفق علیہ حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

((أَلَا! وَإِنَّ لِكُلِّ مَلْكٍ حَمْيٌ ، أَلَا! وَإِنَّ حَمَىَ اللَّهُ مَحَارِمٌ))

(صحیح بخاری، رقم: 52، صحیح مسلم، رقم: 4094)

”خمردار! ہر بادشاہ کی ایک محفوظ چراغاہ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی زمین پر اس کی محفوظ چراغاہ اس کی حرام کی ہوئی چیزیں ہیں۔“

مطلوب یہ ہے کہ عام طور پر بادشاہ اپنی ایک خاص محفوظ چراغاً رکھتا ہے جو دوسروں کے لیے منوع ہوتی ہے۔ اسی طرح اللہ سبحانہ کی محفوظ اور منوع چراغاً اس کی حرام کی ہوئی چیزیں ہیں جن سے بچنا ضروری ہے اور ان کی خلاف ورزی جائز نہیں ہے۔

﴿كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ أَيْتَهُ لِلنَّاسِ لَعَنَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴾ (187)

مراد یہ ہے کہ قرآن حکیم نے روزے سے متعلق تفصیلی احکام دیے ہیں اس میں غربت و رخصت کے پہلوؤں کو واضح کیا ہے اور روزے کی حکمت اور مقصد بیان کیا ہے تاکہ اہل ایمان خواہش پرستی سے فیکر تقوے اور پرہیز گاری کی زندگی اختیار کر سکیں۔

وَ لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فِرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَ أَنْتُمْ

تَعْلَمُونَ ﴿١٨﴾

”اور ایک دوسرے کامال ناجائز طور پر نہ کھاؤ، رشوٹ کو حاکموں تک رسائی کا ذریعہ نہ بناؤ کہ اس طرح جان بوجھ پر کر دوسروں کامال ہڑپ کر جاؤ۔“ (188)

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی تفسیر:

وَلَا تَأْكُلُوا :..... اس سے صرف کھانا مراد نہیں ہے بلکہ ناجائز مال حاصل کر کے اسے اپنے استعمال اور تصرف میں لانا مراد ہے۔ **تُدْلُوْا بِهَا :**..... یہ اصل میں لَا تُدْلُوْا بِهَا ہے۔ اس کا لَا (لائے نبی) حذف ہو گیا ہے کیونکہ اس جملے کا عطف پہلے جملے پر ہے اور وہاں لَا موجود ہے جو اس پر اثر انداز ہوا ہے۔ ادْلُیْ یُدْلُیْ اِدْلَاءُ ا کے اصل معنی إِلْقاء الدَّلْوِ لِالْخَرَاجِ النَّاءِ کے ہیں، یعنی پانی حاصل کرنے کے لیے کوئی میں ڈول ڈالنا، جیسا کہ سورہ یوسف میں ہے:

﴿وَجَاءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ فَادْلَى دَلْوَةٍ﴾ (یوسف 12:19)

”اور ایک قافلہ آیا۔ انہوں نے اپنا پانی بھرنے والا بھیجا۔ تو اس نے اپنا ڈول لٹکایا۔“

پھر اسی سے اس میں رسائی اور قرب تعلق کا مفہوم پیدا ہو گیا۔ جس طرح رسی کے ذریعے سے ڈول پانی تک پہنچتا ہے اسی طرح رشوٹ کامال حرام خور حاکموں تک رسائی کا ذریعہ بتاتا ہے۔

فَرِيقًا :..... اس سے مراد سارا یا بہت زیادہ مال ہے۔

بِالْإِثْمِ :..... إِثْمٌ میں گناہ اور حق تلقی دونوں شامل ہیں

﴿وَ لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْتَنَّكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ (188)

اس سے پہلے یہ بتایا گیا کہ روزے کی حالت میں کھانا پینا منع ہے۔ حالانکہ کھانے پینے کی چیزیں اپنا ہی مال ہوتا ہے۔ اب یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ دوسروں کا مال **بِالْبَاطِلِ** یعنی نا حق اور ناجائز طور پر نہ کھاؤ۔ اس میں ہر قسم کی حرام کمائی آگئی۔ گویا اس حکم کے ذریعے تمام حرام طریقوں جیسے نُود، رشوت، ہوا، خیانت، سُنَّۃ، چوری، غصب، ڈاکہ، فریب کاری اور کرپشن وغیرہ سے حاصل کیا ہوا دوسروں کا مال کھانے سے روک دیا گیا ہے۔

پھر دوسروں کے مال کو **أَمْوَالَكُمْ** (تمہارے مال) کہا گیا۔ یہی اسلوب ہے جیسے بتی اسرائیل کو حکم دیا گیا تھا کہ:

﴿فَإِذَا أَخَذْنَا مِثْقَالَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دَمَاءً كُمْ وَ لَا تُخْرِجُونَ أَنْفُسَكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ﴾

(البقرہ: 84)

”اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ اپنے خون نہ بہانا اور اپنے لوگوں کو ان کے گھروں سے نہ نکالنا۔“

اس میں **دَمَاءُ كُمْ** (تمہارے خون)، **أَنْفُسَكُمْ** (اپنے آپ کو) اور **دِيَارِ كُمْ** (اپنے گھروں) کے الفاظ بھی اسی طرح آئے ہیں جیسے اس آیت میں **أَمْوَالَكُمْ** (تمہارے مال) آیا ہے۔

اس سے یہ اشارہ بھی لکھتا ہے کہ امت مسلمہ ایک اکائی اور وحدت ہے۔ وہ ایک جسم کی طرح ہے جس کے ایک عضو کا نقصان سارے جسم کا نقصان ہے گویا دوسروں کا نقصان بھی اپنا نقصان ہے۔

﴿وَ تُدْلُوْا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ﴾ (188)

مطلوب یہ ہے کہ مال کو حاکموں تک رسائی کا ذریعہ نہ بناو۔ اس سے رشوت مراد ہے جس سے روکا گیا ہے۔ اسلامی شریعت میں رشوت کا مال کھانا حرام ہے۔

﴿لَتَأْكُلُوا فِرِيقًا مِنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ أَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١٨٨﴾ (188)

مراد یہ ہے کہ دوسروں کا مال اور جائیداد جان بوجھ کر جھوٹے مقدموں، جھوٹی گواہیوں اور رشوت کے ذریعے نہ ہٹھیا لو، یہ سراسر گناہ اور حرام ہے۔

يَسْعَلُونَكَ عَنِ الْأَهْلَةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجَّ وَ لَيْسَ الْبِرُّ بِإِنْ تَأْتُوا بِبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَ لِكِنَّ الْبِرَّ مِنِ اتِّقْيَاجِ وَ اتِّوَا الْبُيُوتَ مِنْ آبَوَابِهَا وَ اتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۱۸۹ وَ قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَ لَا

تَعْتَدُوا ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِلِينَ ۝ وَ اقْتُلُوهُمْ حَيْثُ شَفِقْتُمُوهُمْ وَ أَخْرِجُوهُمْ مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَ الْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَ لَا تُقْتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّىٰ يُقْتَلُوكُمْ فِيهِ ۝ فَإِنْ قَتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ كُلُّ ذِكْرٍ جَزَاءُ الْكُفَّارِ ۝ فَإِنْ انتَهُوا فَإِنَّ اللَّهَ عَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ وَ قَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ ۝ وَ يَكُونُ الرِّءُوفُ بِاللَّهِ ۝ فَإِنْ انتَهُوا فَلَا عُذْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ ۝ أَلَّا يَهُوَ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَ الْحُرْمَةُ قِصَاصٌ ۝ فَمَنْ اعْتَدَى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا وَ عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَى عَلَيْكُمْ وَ اتَّقُوا اللَّهَ وَ اعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ۝ وَ أَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَ لَا تُلْقُوا بِأَيْدِيهِ بِكُمْ إِلَى التَّهْلِكَةِ ۝ وَ أَحْسِنُوا ۝ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝ وَ أَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ بِاللَّهِ ۝ فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا أَسْتَيْسِرَ مِنَ الْهُدَىٰ ۝ وَ لَا تَحْلِقُوا رُؤوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهُدَىٰ مَحِلَّهُ ۝ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ بِهِ أَذْيَى مِنْ رَأْسِهِ فَفَدِيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ فَإِذَا أَمْنَتُمْ وَقْتَهُ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجَّ فَمَا أَسْتَيْسِرَ مِنَ الْهُدَىٰ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصَيَامًا ثَلَاثَةً أَيَّامٍ فِي الْحَجَّ وَ سَبْعَةً إِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةً كَامِلَةً ۝ ذَلِكَ لِمَنْ لَمْ يَكُنْ أَهْلَهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۝ وَ اتَّقُوا

اللَّهُ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝

”(اے نبی ﷺ) لوگ آپ سے چاند کے گھنے بڑھنے کے بارے میں پوچھتے ہیں آپ ﷺ کہیں کہ اس سے لوگوں کو وقت کا حساب معلوم ہوتا ہے اور حج کے دنوں کا پتہ چل جاتا ہے۔ اور نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے گھروں میں چھٹ پر سے آؤ۔ اصل نیکی اللہ سے ڈرتا ہے۔ لہذا اپنے گھروں میں داخل ہونے کے لیے ان کے دروازوں سے آیا کرو۔ اور اللہ سے ڈروتا کر تم فلاح پاؤ۔

(مسلمانو) اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں لیکن زیادتی نہ کرو۔ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ وہ جہاں بھی تمہارے مقابلے میں آئیں ان کو قتل کرو۔ جس شہر سے انہوں نے تمہیں نکالا، تم بھی وہاں سے ان کو نکال باہر کرو، کیونکہ (حرم میں کفر اور شرک کا) قتل سے بھی بڑا جرم ہے۔ لیکن مسجد حرام میں تم ان سے نہ لڑو جب تک وہ نہ لڑیں۔ اگر وہاں بھی وہ جنگ چھیڑ دیں تو انہیں قتل کرو۔ ایسے کافروں کی بھی سزا ہے۔ پھر اگر وہ باز آ جائیں تو اللہ بخششے والا مہربان ہے۔

اور ان سے جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ (کفر و شرک کا) فتنہ باقی نہ رہے اور اللہ کا دین غالب ہو جائے۔ پھر اگر وہ باز آ جائیں تو ظالموں کے سوا کسی اور پرختی نہ کی جائے۔

جنگ میں محترم ہیئے کی حرمت کا خیال صرف اس صورت میں رکھا جائے گا جب دمکن بھی اس کی حرمت کا خیال رکھے۔ اسی طرح دوسری تمام حرمت والی چیزوں میں بھی ادلے کا بدله ہے۔ لہذا (اے مسلمانو) جو لوگ تم سے زیادتی کریں، تم بھی ان کی زیادتی کے برابر جوابی کارروائی کر سکتے ہو۔ لیکن ہر حال میں اللہ سے ڈرتے رہو، اور یقین رکھو اللہ پر ہیز گاروں کے ساتھ ہے۔

اور اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے مال خرچ کرو ورنہ اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالو گے۔ ہر حال میں بھلائی کرو۔ اللہ بھلائی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اور اللہ کے لیے حج اور عمرے کو (تمام آداب و شرائط کے ساتھ) پورا کرو۔ اگر راستے میں بد امنی کی وجہ سے مجبوراً رکنا پڑے تو جو قربانی کا جانور میسر ہو اس کی قربانی کرو، اور اس وقت تک سر کے بال نہ منڈوا و اجنب تک قربانی اپنے ٹھکانے نہ پہنچ جائے۔ پھر اگر کوئی بیمار ہو، یا اس کے سر میں تکلیف ہو، (اور عذر کی وجہ سے اپنا سر منڈوا لے) تو اسے چاہیے کہ کفارے کے طور پر کچھ روزے رکھے، یا صدقہ کرے، یا قربانی کرے۔ لیکن جب امن کی حالت میں ہو اور کوئی شخص حج سے پہلے عمرہ بھی کرنا چاہے تو جو قربانی کا جانور میسر ہو، اس کی قربانی کرے۔ قربانی نہ کر سکتا ہو تو تین روزے حج کے دوران میں رکھے اور سات روزے حج کے بعد گھر واپس آ کر رکھے۔ یہ پورے دس روزے ہوئے۔ مگر اس طرح عمرہ کرنے کی اجازت ایسے شخص کے لیے ہے جس کے اہل و عیال کے میں نہ رہتے ہوں۔ ہر حال میں اللہ سے ڈرو، اور یاد رکھو کہ اللہ

عذاب دینے میں برا سخت ہے۔“

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

الْأَهْلَةُ: یہ **ہلال** کی جمع ہے جس سے پہلی، دوسری یا تیسرا رات کا چاند مراد ہوتا ہے۔ **آہل** اور **اسْتَهَلَ** کے معنی ہیں آواز بلند کرنا۔ جب بچہ پیدا ہونے کے بعد روتا چلتا ہے تو کہا جاتا ہے **إِسْتَهَلَ الصَّصِّيُّ**۔ اسی طرح **آہلَ الْقَوْمُ** یا **الْحَجَّ** کے معنی ہیں لوگوں نے حج کے لیے تلبیہ پکارا۔ جو نکل لوگ نیا چاند دیکھ کر اس کی اطلاع دینے کے لیے بلند آواز سے پکارتے تھے اس لیے نئے چاند کا نام ہلال پڑ گیا۔ بعض لوگ ہلال سے پہلے پورا مہینہ مراد لیتے ہیں اور پھر اس سے حرمت والے مہینے مراد لے لیتے ہیں جو کہ صحیح نہیں ہے۔

مَوَاقِيْتُ: یہ میقات کی جمع ہے۔ اس سے مراد اوقات (TIMINGS) ہیں۔

ظُهُورٍ: یہ ظہر کی جمع ہے جس کے معنی پیچھے کے ہیں۔ اس جگہ اس سے مکان کا پھکواڑہ (پیچھے کی طرف کا حصہ) مراد ہے۔

الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ: (قتل سے بڑھ کر ہے) اس میں **الْفِتْنَةُ** سے مراد ہے کسی کو نہ بہ بدلنے کے لیے مجبور کرنا۔ جسے انگلش میں (PERSECUTION) کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید کے درج ذیل مقامات پر بھی یہ لفظ اپنے انہی معنوں میں آیا ہے:

۱۔ سورۃ النحل میں ہے:

﴿ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ هَاجَرُوا مِنْهُمْ بَعْدِ مَا فُتَنُوا ثُمَّ جَهَدُوا وَ صَبَرُوا لَا إِنَّ رَبَّكَ مِنْهُمْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾
(الحل 16: 110)

”پھر جن لوگوں نے سخت آزمائشوں میں پڑنے کے بعد اللہ کی راہ میں ہجرت کی، جہاد کیا اور ثابت قدم رہے، تو ان کے ان اعمال کی بدولت آپ ﷺ کا رب انہیں ضرور بخشنے والا مہربان ہے۔“
اسی طرح سورۃ البروج میں ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابٌ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ﴾
(البروج 85: 10)

”بے شک جن لوگوں نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ستایا اور توبہ نہ کی، ان کے لیے دوزخ میں جلنے کا عذاب ہے۔“

فتَنَ کے اصلی معنی ہیں کسی چیز کو آگ پر پانा۔ پھر اس کا استعمال ہر آزمائش، امتحان، سختی، جبرا اور تشدد کے لیے ہونے لگا۔

الْمَسْجِدُ الْحَرَامُ : اس کا واحد حرمہ ہے جس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کا احترام اور پابندی لازم ہو۔ جیسے رمضان المبارک کا مہینہ۔

الْتَّهْلِكَةُ : اس کے معنی ہلاکت و بربادی کے ہیں مگر اس جگہ اس سے مراد ہے جہاد کے لیے مال خرچ نہ کرنا اور جہاد چھوڑ دینا۔

الْعُبْرَةُ : عمرہ کے لفظی اور لغوی معنی بھی (حج کی طرح) کسی جگہ کا قصد و ارادہ کرنے کے ہیں لیکن اس کے اصطلاحی یا شرعی معنی خانہ کعبہ کا قصد و ارادہ کرنے کے ہیں۔ حج کے دن تو مقرر ہیں مگر عمرہ سال کے کسی بھی حصے میں کیا جا سکتا ہے۔ عمرہ کو بعض نے فرض قرار دیا ہے اور بعض اسے سنت مانتے ہیں جیسا کہ فقہ حنفی میں ہے۔

أَخْصِرُ تُمُ : یہ حصار سے ہے جس کے معنی الْجَسْسُ وَالْتَّضِيقُ یعنی روکنے اور تنگ کرنے کے ہیں۔

الْهَذْلُ : (قربانی کا جانور) یہ واحد اور جمع دونوں کے لیے آتا ہے۔ اس سے حج میں قربانی کے جانور مراد ہیں۔

مَعْلَةُ : (اس کا ٹھکانہ) محل کے معنی اترنے یا ٹھہرنا کی جگہ کے ہیں۔ یہ حلَّ يَحْلُّ سے اسم ظرف ہے۔

حَلَاضِرِي السَّسْجِدَ الْحَرَامُ : اس سے اہل کم مراد ہیں۔ اس کے علاوہ اس سے الٰہ حرم بلکہ اہل حن جل بھی مراد ہیں جو میقاتوں کے اندر رہتے ہیں۔

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَهْلَةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجَّ﴾ (189)

اس سے پہلے رمضان المبارک اور اس کے روزوں کا ذکر تھا۔ اب اسی مناسبت سے چاند کا ذکر آگیا۔ کیونکہ رمضان المبارک کے شروع اور ختم ہونے کا سارا انحصار صرف رویت ہال یعنی چاند دیکھنے پر ہے جیسا کہ ایک متفق علیہ حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((صُومُوا إِلَرْوَيْهِ وَأَفْطِرُوا إِلَرْوَيْهِ)) (صحیح بخاری، رقم: 1909، صحیح مسلم، رقم: 2515)

”(رمضان کا) چاند دیکھنے پر روزہ رکھو اور (شوال کا) چاند دیکھنے پر روزہ رکھنا ختم کر دو۔“

ذکورہ آیت کا شان نزول وہ روایت ہے جسے ابو قیم اور ابن عساکر نے ابو صالح کے حوالے سے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ حضرت معاذ بن جبل اور عقبہ بن غنمہ رضی اللہ عنہما (دو انصاری صحابہ) نے نبی کریم ﷺ سے چاند کے بارے میں سوال کیا تھا تو اس پر یہ آیت اتری تھی۔

ہر ماہ چاند کے گھنے بڑھنے سے متعلق اہل ایمان کی طرف سے یہ سوال بالکل اسی نوعیت اور اسلوب کا ہے جو ہمیں قرآن میں جا بجا ملتا ہے۔

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَمِ﴾ (البقرہ 2: 220)

”اے نبی ﷺ! لوگ آپ سے قیموں کے بارے میں پوچھتے ہیں۔“

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَعِيضِ﴾ (البقرہ 2: 222)

”اے نبی ﷺ! لوگ آپ سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں۔“

(البقرہ 2: 219) **﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْعَمَرِ وَالْمَيْسِرِ﴾**

”اے نبی ﷺ! لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔“

ان سوالوں میں یہ نہیں پوچھا گیا تھا کہ تمیم کیا ہوتا ہے اور کیا کام کرتا ہے۔ یا عورتوں کو حیض کیوں آتا ہے۔ اس کا رنگ کیسا ہوتا ہے۔ یا شراب کیا چیز ہوتی ہے اور وہ کیسے بنائی جاتی اور پی جاتی ہے اور انسانی صحت پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یا چوڑا کیا شے ہے۔ وہ کیوں اور کیسے کھلایا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

بلکہ ان سوالوں کے پوچھنے کی غرض یہ تھی کہ ان چیزوں کے بارے میں شریعت کیا کہتی ہے اور دین کیا تعلیم دیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ لوگوں نے ان باتوں سے متعلق یہ پوچھا تھا کہ ان کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟ بالکل یہی اسلوب اس مقام پر چاند کے بارے میں پوچھنے کا ہے کہ اس کے نکلنے اور گھٹنے بڑھنے کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے اور دین کی تعلیم کیا ہے۔

جو لوگ قرآن مجید کے اس اسلوب سے واقف نہ تھے انھیں اس مقام کی تفسیر میں بڑی سمجھن پیش آئی۔ انہوں نے پہلو تو اے ایک سائنسی اور فلکیات (SPACE SCIENCE) کا سوال سمجھا۔ پھر کہنے لگے کہ اگر اس سوال کا جواب سائنسی انداز میں دیا جاتا تو عام لوگ اس کی پیچیدہ حقیقت کو سمجھنہ پاتے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس سوال کا سیدھا جواب دینے کے بجائے اس کا رخ شریعت کی طرف موڑ کر اس کا جواب دے دیا۔

اسی طرح کچھ اور لوگوں نے یہ خیال کیا کہ اس طرح کا سائنسی سوال کرنا عربیوں کے مزاج ہی کے خلاف تھا۔ اس لیے ان کی طرف سے ایسا کوئی سوال نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر آگے بڑھ کر انہوں نے اس کی یہ تاویل اختیار کر لی کہ یہ سوال ”ash-harām“ یعنی حرمت والے مہینوں سے متعلق تھا اور چاند سے مراد مہینہ ہے۔ پھر اپنی طرف سے ایک مصنوعی اور دور از کار سیاق و سبق گھٹ کر اس سے حرمت والے مہینے مراد لے لیے۔ جب کہ ان کا ذکر الگ سے آیت 194 میں آیا ہے اور یہاں ان کو بیان کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی۔

اسی آیت میں قمری مہینوں کی شرعی حیثیت کے بارے میں فرمایا گیا کہ گویا یہ ایک قدرتی جنتی اور کیلندر ہے جسے خاص و عام سب سمجھ سکتے ہیں۔ جب کہ دوسرے کیلندروں مثلاً عیسوی یا بکری کیلندر کو صرف پڑھے لکھے لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اسلامی کیلندر سے سب لوگوں کو اپنے معاملات کے لیے اوقات کا پتہ چل جاتا ہے اور خاص طور پر اس سے حج کے دنوں کا ٹھیک تعین ہو سکتا ہے۔

یاد رہے کہ اسلام میں دن رات کے چوپیں 24 گھنٹوں کے نظام الاوقات کا تعلق سورج کے طلوع و غروب سے ہے جیسے روزانہ کی پانچ نمازوں اور سحری و افطاری کے اوقات وغیرہ۔ مگر دنوں، مہینوں اور برسوں کی تکمیل کا تعلق ہر ماہ چاند کے گھنٹے بڑھنے سے ہے جیسے زکوٰۃ کے لیے سالانہ مدت، بیوہ اور مطلقہ عورت کی عدت، حمل اور بچے کی رضاعت، اور

بالخصوص حج کے مہینوں ماہ شوال، ماہ ذی قعده اور ذوالحجہ کے ابتدائی دس دن۔ کیونکہ اگر چاند ہمیشہ ایک ہی حالت پر رہتا تو ان تمام شرعی احکام کا تین نہایت مشکل ہو جاتا ہے جن کا تعلق چاند کے اتار چڑھاؤ سے ہے۔

یہی مضمون قرآن مجید کی درج ذیل آیات میں بھی آیا ہے:

(الرَّحْمَنُ ۖ ۵۵:)

﴿الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ يَحْسَبَاٰنِ﴾

”سورج اور چاند ایک حساب کے ساتھ چلتے ہیں۔“

2. ﴿وَالْقَمَرَ قَدْرُ نَاهٍ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعَرْجُونَ الْقَدِيمٌ ۝ لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُنْدَرَكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارَ طَوْكُلٌ فِي فَلَكٍ يَسْبِحُونَ ۝﴾ (یس 36: 39، 40) ”اور (ایک نشانی) چاند ہے جس کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کیں، یہاں تک کہ وہ آخر میں ایسا رہ جاتا ہے جیسے کھجور کی پرانی ٹہنی، نہ سورج کی مجال ہے وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات کے بس میں ہے کہ وہ دن کی جگہ لے۔ سب اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔“

3. ﴿هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَّ الْقَمَرَ نُورًا وَّ قَدْرَةً مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السَّيِّنِينَ وَالْحِسَابَ ۝﴾ (یونس 10: 5)

”اسی (اللہ) نے سورج کو روشن بنایا، چاند کو چمک دار بنایا، اور اسی کی منزلیں مقرر کر دیں تا کہ تم ان کے ذریعے رسول کی گئی اور حساب معلوم کرو۔“

﴿وَلَيْسَ الْبَرُّ بِإِنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا﴾ (189)

اسی جگہ جاہلیت کے دور کی ایک بدعت اور غلط مذہبی طریقے کی اصلاح کی گئی ہے۔ اہل عرب جب احرام باندھ لیتے اور کسی ضرورت سے ان کو گھر میں داخل ہونا پڑتا، یا جب وہ حج سے واپس آتے تو گھر کے دروازے سے داخل نہ ہوتے بلکہ اس کے پچھواڑے سے داخل ہوتے اور اپنی اس حرکت کو بڑی نیکی، تقویٰ اور دین داری خیال کرتے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ اور مسدرک حاکم میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی روایات سے ظاہر ہے۔

﴿وَلَكِنَّ الْبَرَّ مِنِ اتَّقِيٍّ وَأُتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبُوئِهَا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝﴾ (189)

قرآن نے ان کے اس غلط مذہبی رواج کی اصلاح فرمائی اور حکم دیا کہ احرام کی حالت ہو یا حج سے واہی، دونوں صورتوں میں اپنے گھروں کے دروازوں ہی سے داخل ہوا کرو۔ اور یہ قرار دیا کہ اصل نیکی اور دین داری گھروں کے پچھواڑے چلا گئنا نہیں ہے بلکہ تقویٰ یہ ہے کہ بنده اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے احکام کی پیروی کرے اور اس کی نافرمانی سے بچے تا کہ اسے دنیا اور آخرت کی فلاج و کامیابی حاصل ہو سکے۔

﴿وَقَاتَلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ

لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِلِينَ ﴿١٩٠﴾

اس سے پہلے چاند، قمری مہینوں اور حج کا ذکر ہوا۔ پھر درمیان میں حج کے حوالے سے عربوں کے ایک غلط نہیں طریقے کی اصلاح کی گئی۔ اب مسلمانوں کو مشرکین قریش کے خلاف دفاعی جنگ لڑنے کی اجازت دی گئی، خواہ یہ مدافعتی جنگ حج یا عمرے کے موقع پر، یا حرمت والے مہینوں میں، یا پھر حرم کی حدود میں کیوں نہ لڑنی پڑے جہاں پر ابھی تک مشرکین کا قبضہ تھا اور وہ مسلمانوں کو حج اور عمرہ کرنے سے زبردستی روکتے تھے۔

اس آیت کے شان نزول کے بارے میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ صلح حدیبیہ جو ذوالقعدہ 6 ہجری (مارچ 628ء) میں ہوئی تھی کے بعد والے سال میں نازل ہوئی، جب رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ عمرۃ القضا کی تیاری کر رہے تھے اور مشرکین قریش کی طرف سے خطہ تھا کہ وہ کہیں ان سے جنگ نہ چھیڑ دیں۔ کیونکہ مسلمانوں کو حدود حرم میں اور حرمت والے مہینوں میں جنگ کرنے سے تامل تھا خواہ وہ جنگ دفاعی ہی کیوں نہ ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

ارشاد ہوا کہ مسلمانوں کو حج کے دوران میں بھی اپنے دفاع کے لیے دشمن کے خلاف لڑائی کی اجازت ہے۔ لیکن اس میں بھی وہ اپنی طرف سے پہلی نہیں کر سکتے۔ وہ صرف اتنی ہی کارروائی کر سکتے ہیں جتنی دفاعی نظر نظر سے ضروری ہو اس میں بھی بچوں، عورتوں، بڑھوں اور مددوروں پر ہاتھ اٹھانا جائز نہیں۔ ان کی طرف سے کسی حال میں کوئی زیادتی نہیں ہوئی چاہیے کیونکہ اللہ سبحانہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ دوسرے، جہاد کا مقصد قتل و غارت گری یا مفاد پرستی نہیں ہے بلکہ اس سے اللہ کے دین کا تحفظ اور اس کے کلے کی سر بلندی مقصود ہے۔

﴿وَ اُقْتُلُوهُمْ حَيْثُ شَقَقُوكُوهُمْ﴾ ﴿191﴾

مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ دفاعی جنگ میں دشمن کے لوگ جہاں بھی مقابلے پر آئیں وہاں ان کو قتل کر دخواہ وہ حرم کی حدود میں پائے جائیں، یا کہیں اور جگہ پر ہوں، ان کو زندہ نہ چھوڑو، اس سلسلے میں اس کی کوئی پرواہ نہ کرو کہ تم احرام کی حالت میں ہو، یا کوئی حرمت والا مہینہ ہے، یا حرم کی سرزی میں ہے۔

﴿وَ أَخْرِجُوهُمْ مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ﴾ ﴿191﴾

اس مقام پر مسلمانوں کو اجازت دی گئی کہ وہ ان مشرکین قریش کو کسی کی حدود سے نکال باہر کریں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام کو تکفیر پہنچائیں، اذیتیں دیں اور ان کے گھروں سے نکال کر مدینے ہجرت کر جانے پر مجرور کیا اور جواب مسلمانوں کو حج و عمرہ سے روکتے اور معابدے توڑتے ہیں۔

﴿وَ الْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقُتْلِ﴾ ﴿191﴾

فرمایا ان مشرکین سے حرم میں بھی دفاعی جنگ لڑنے کی اجازت اس لیے ہے کہ یہ لوگ قشنہ پر ور ہیں۔ اور قشنہ قتل سے برا جرم اور گناہ ہے۔ اس جگہ قشنہ سے مراد ظلم و ستم کی وہ حالت ہے جس میں

مشرکین قریش مسلمانوں کو حرم میں عبادت سے روکتے تھے۔ ان کو دین اسلام سے ہٹانے کے لیے ان پر شدہ (TORTURE) کرتے تھے۔ ان کو ان کے گھروں سے نکال کر بھرت پر مجبور کرتے تھے۔ یہ کفر و شرک کے غلبے کی صورت حال تھی جس میں اسلام لانے والوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا جاتا تھا۔ ایسی حالت کو قتل سے بڑھ کر گناہ اور جرم قرار دیا گیا۔

**وَلَا تُفْتِنُهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْعَرَامِ حَتَّىٰ يُقْتَلُوكُمْ فِي هَذِهِ قَاتِلُوكُمْ
فَاقْتُلُوهُمْ كَذَلِكَ جَزَاءُ الظَّالِمِينَ ﴿١٩١﴾**

پہلے فرمایا تھا کہ مسلمانوں کو مشرکین قریش سے دفاعی جنگ کی اجازت ہے۔ اب خاص مسجد حرام یعنی خانہ کعبہ کی مسجد کے باارے میں فرمایا کہ وہاں کفار سے لڑنے میں پہلی نہ کی جائے اگر وہ وہاں بھی جنگ چھیڑ دیں تو پھر تم بھی ان سے لڑو۔ ایسی صورت میں تم بے قصور ہو گے اور سارا گناہ کفار کے کھاتے میں جائے گا۔ کیونکہ ابتدا ان کی طرف سے ہو گی اور وہ کبھی کی حرمت کو پاہل کریں گے جس کی سزا وہ دنیا میں مسلمانوں کے ہاتھوں پائیں گے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ ان کو عذاب دے گا۔

فَإِنِ انتَهُوا فَإِنَّ اللَّهَ عَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٩٢﴾

پھر ارشاد ہوا کہ اگر وہ باز آ جائیں تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ وہ لڑنے سے باز آ جائیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ کفر و شرک سے باز آ جائیں اور توبہ تائب ہو کر اسلام قبول کر لیں تو اللہ تعالیٰ ان کے تمام گناہ معاف کر دے گا۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا گیا:

قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ يَتَتَّهُوا يُغْفَرُ لَهُمْ مَا قَدْ سَلَّفَ ﴿الانفال: 38﴾

”کفروں سے کہہ دیجئے اگر وہ کفر سے باز آ جائیں تو جو کچھ ہو چکا، انہیں معاف کر دیا جائے گا۔“

**وَقْتُهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةً وَّ يَكُونُ الدِّينُ لِلَّهِ فَإِنِ انتَهُوا فَلَا عُدُوانَ
إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿١٩٣﴾**

اب مزید وضاحت کر دی گئی کہ مشرکین قریش کے خلاف جہاد اس وقت تک جاری رکھا جائے جب تک حرم کی اس سر زمین سے کفر و شرک کا فتنہ ختم نہیں ہو جاتا اور اللہ تعالیٰ کا دین غالب نہیں آ جاتا۔ آخر میں فرمایا کہ اگر مشرکین مکہ کفر و شرک اور ظلم و زیادتی سے باز آ جاتے ہیں تو ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔

اس جگہ ”عدوان“ کا لفظ ظلم و زیادتی کے معنوں میں نہیں آیا ہے بلکہ اس سے مراد جوابی کارروائی ہے جو کہ جائز ہے جیسا کہ ایک مقام پر فرمایا:

وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ﴿الشوری: 40﴾

تو اس میں دوسری سیئت سے مراد برائی نہیں بلکہ برائی کا بدلہ اور اس کا ازالہ ہے۔

﴿الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرْمَتُ قَصَاصٌ﴾ (194)

حرمت والے مہینے چار ہیں: رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور حرم۔

اہل عرب ان مہینوں کا احترام کرتے اور ان میں لاٹائی سے باز رہتے۔ اب مسلمانوں کو سمجھایا جا رہا ہے کہ کسی حرمت والے مہینے کا احترام تھی ہے کہ اس میں کسی پر ظلم اور زیادتی نہ کی جائے۔ لیکن اس احترام کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دشمن اس مہینے میں تم پر حملہ کر دے اور تمہیں قتل کرنے لگے تو تم اپنا دفاع نہیں کر سکتے۔

بلکہ تمہیں اپنے دفاع کا پورا حق حاصل ہے۔ اگر مشرکین مکہ کسی محترم مہینے کی حرمت پامال کرتے ہوئے تم پر حملہ آور ہو جاتے ہیں تو تم اپنے تحفظ کی خاطر ان سے جنگ کر سکتے ہو۔ یہ تو ادله کا بدلہ ہے۔ اگر کفار محترم مہینوں میں یا حرم کی حدود میں تم سے جنگ چھیڑ دیتے ہیں تو تمہیں اپنے دفاع میں ان سے لڑنے کی اجازت ہے۔ اس طرح بد لے اور قصاص کا یہ اصول ہر قسم کی حرمتوں کے بارے میں ہے۔ اگر دشمن ان کا احترام کرے تو تم بھی کرو۔ اگر وہ بے حرمتی کریں اور جنگ کریں تو ان کے خلاف کارروائی کرنے کا تمہیں پورا حق ہے۔

﴿فَمَنْ أَعْتَدَى عَلَيْكُمْ فَأَعْتَدُ وَأَعْلَمُهُ يُوَثِّلُ مَا أَعْتَدَى عَلَيْكُمْ﴾ (194)

کیونکہ جو لوگ کسی محترم چیز کی حرمت کا خیال نہیں رکھتے بلکہ اسے پامال کرتے ہیں تو دراصل وہ اپنے لیے بھی حرمت کا حق کھو دیتے ہیں۔ اس لیے ان کے خلاف اقدام بجا ہے۔ جیسے کسی کو ناقص قتل کر کے اس کی جان لینے والا بھی اپنی جان کے احترام کا حق کھو دیتا ہے اور واجب القتل ہو جاتا ہے۔ اس لیے جو گروہ جس قدر زیادتی کرے وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کے ساتھ بھی اتنی زیادتی کی جائے تاکہ حساب برابر ہو اور آئندہ کسی کو زیادتی کرنے کی جرأت نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہل ایمان کا یہی طریقہ ہے کہ وہ اپنے ساتھ ہونے والے ظلم و تم کا پورا بدلہ لیتے ہیں۔ لیکن بدلہ لینے میں حصے نہیں بڑھتے جیسا کفر میا:

﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابُوهُمُ الْبُغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُونَ﴾

(الشوری 42:39) "اور جب ان پر کوئی زیادتی ہوتی ہے تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔"

﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿١٩٤﴾﴾ (194)

آخر میں مسلمانوں سے فرمایا کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ اس کی نافرمانی سے بچو۔ ہمیشہ یاد رکھو کہ اللہ سبحانہ تقوے والوں کے ساتھ ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کا مدد و گار اور حامی و ناصر ہے۔ اس لیے ان کو کفار کی کثرت و طاقت سے ہرگز مروعہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی مدد پر بھروسہ کریں گے تو فتح و کامرانی ان کے قدم پوئے گی۔ تاریخ اس بات کی صداقت پر ہمیشہ گواہ رہی ہے۔

﴿وَأَنْفَقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيهِنَّمُ إِلَى التَّهْلِكَةِ ﴿١٩٥﴾﴾ (195)

جہاد کے بعد اب انفاق فی سبیل اللہ یعنی اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا حکم دیا گیا۔

اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد نہ کرنے اور اس سے جی چرانے اور بخل کرنے کو ہلاکت قرار دیا گیا۔ یہی

مضمون سورۃ التوبہ میں منافقوں کے حوالے سے آیا ہے:

فَلَوْ كَانَ عَرَضاً قَرِيبًا وَ سَفَرًا فَأَصِدًا لَا تَبَعُوكَ وَ لِكُنْ^۱ بَعْدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّفَقَةُ وَ سَيَعِلِفُونَ بِاللَّهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَغَرَجَنَا مَعْكُمْ يُهْلِكُونَ أَنفُسَهُمْ وَ اللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ لَكُنْيَبُونَ (۴۲: ۹)

”(اے نبی ﷺ) اگر ان منافقوں کو کوئی فوری فائدہ نظر آتا اور سفر ہلکا ہوتا تو وہ بھی جہاد کے لیے آپ ﷺ کے ساتھ چلتے۔ لیکن انھیں یہ منزل مشکل اور کٹھن نظر آئی۔ اب وہ اللہ کی فتنیں کھا کر کہیں گے۔ اگر ہم سے ہو سکتا ہم ضرور تمہارے ساتھ چلتے۔ دراصل وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں۔ اللہ جانتا ہے وہ بالکل جھوٹے ہیں۔“

مطلوب یہ ہے کہ جہاد کی تیاری کے لیے جان کے ساتھ مال بھی خرچ کرو۔ دشمن سے مقابلے کے لیے ہر قدرم کا جدید اسلحہ اور سامان جنگ بھی فراہم کرو۔ اگر اس بارے میں بخیل اور بزدلی سے کام لو گے تو اپنے آپ کو ہلاکت و بر بادی میں ڈالو گے اور خود اپنے ہاتھوں سے مارے جاؤ گے۔ کیونکہ کفار کے پاس زیادہ جنگی وسائل ہیں۔ تمہیں ان سے مقابلے کے لیے مال خرچ کر کے سامان جنگ فراہم کرنا ہو گا۔ ورنہ تم ہلاک و بر باد ہو جاؤ گے۔

حضرت ابوالیوب النصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہ آیت انصار کے کچھ لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جس میں انھوں نے اسلام کا غلبہ ہو جانے کے بعد جہاد میں مال خرچ کرنے سے باหدر و کیلینے کا ارادہ کیا تھا۔ ان کو بتاریا گیا کہ کسی مرحلے پر بھی جہاد چھوڑنے کا انجام ہلاکت کے سوا کچھ نہیں۔ اس لیے ہر حال میں جنگی تیاریاں جاری رکھنی چاہئیں۔ (ترمذی، رقم: 2972)

جہاد کی تیاری کے لیے دوسرے مقام پر ارشاد ہوا کہ:

وَ أَعْدُوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَ مِنْ رِبَاطِ الْغَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَ اللَّهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ أَخْرَيْنَ مِنْ دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمْ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ (الانفال 8: 60)

”مسلمانو! جس قدرم سے ہو سکے فوجی قوت اور گھوڑے تیار رکھو جس سے اللہ کے دشمنوں پر، تمہارے دشمنوں پر اور ان لوگوں پر تمہارا رب ہے جنھیں تم نہیں جانتے لیکن اللہ جانتا ہے۔“

بعض لوگ اس آیت کے الفاظ **وَ لَا تُلْقُوا بِأَيْدِيهِنَّكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ** سے فدائی حملے کے ناجائز ہونے پر استدلال کرتے ہیں۔ مگر ایسا کرنا قرآن کے سیاقی کلام اور صحیح حدیث دونوں کے خلاف ہے۔ البتہ قرآن و حدیث کے دوسرے دلائل سے خود کشی کا حرام ہونا ثابت ہے اور مخصوص حالات میں شہادتی حملہ یعنی خود کش فدائی حملہ نہ صرف جائز

ہے بلکہ ایسا اقدام کرنے والا شہید ہے۔

﴿وَ أَحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴾ (195)

فرمایا: بھلائی کرو اور احسان کے درجے کی بھلائی اور نیکی کرو۔ اچھے طریقے سے نیکی اور بھلائی کرنے والوں کو اللہ سبحانہ، پسند کرتا ہے۔

سیاق کلام (CONTEXT) سے ظاہر ہے کہ اس مقام پر احسان اور بھلائی سے مراد جہاد میں مال خرچ کرنا ہے۔ مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ بخل سے کام نہ لیں اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں دل کھول کر مال خرچ کیا کریں۔ یہ چیز اللہ سبحانہ کو بہت پسند ہے اور وہ اس پر بڑا اجر و ثواب عطا فرمائے گا۔

﴿وَ أَتَيْعُوا الْحَجَّ وَ الْعُدْرَةَ بِلِلَّهِ ﴾ (196)

اس سے بعض اہل علم نے عمرہ کے فرض یا واجب ہونے پر استدلال کیا ہے جو کہ صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ بات صحیح احادیث کے خلاف ہے۔

فرمایا: حج یا عمرہ کی نیت کر لینے، احرام باندھ لینے اور تلبیہ کہنے کے بعد ان کو پورا اور مکمل کیا جائے۔ ان کے تمام مناسک صحیح طریقے سے ادا کیے جائیں۔ اخلاص کے ساتھ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی نیت سے حج یا عمرہ کی جائے۔ یہ عبادت کا کام محض کاروبار، یا سیر سپاٹے، ریا کاری، دکھاوے یا "المخان" کھلانے کی نیت سے نہ کیا جائے۔ ورنہ حج کا ثواب ضائع ہو جائے گا۔ اسی طرح حرام مال سے کیسے ہوئے حج پر بھی کوئی اجر نہیں ملے گا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص حج کے مناسک سے بے خبر ہے اور صرف مدینے میں روضہ رسول ﷺ کی زیارت ہی کوچ سمجھتا ہے تو اس کا حج بھی معترض اور مقبول نہیں ہے۔

البہت حج کے دوران میں اگر ضمنی طور پر کوئی شخص تجارت یا خرید و فروخت کر لے تو اس کی اجازت ہے جیسا کہ فرمایا:

﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَبِّكُمْ ﴾ (البقرہ 2: 198)

"اور اگر تم (حج کے دوران میں) اپنے رب کا فضل تلاش کرتے ہوئے کوئی کاروبار کر لو، تو اس میں کوئی گناہ نہیں۔"

حج اسلام کا بنیادی رکن اور فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَ لِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مِنْ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ﴾ (آل عمران 3: 97)

"اور اللہ کی طرف سے لوگوں پر فرض ہے کہ جو اس گھر (خانہ کعبہ) تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو، وہ اس کا حج کرے۔"

حج کے بارے میں مزید تفصیل انشاء اللہ آل عمران کی اسی آیت کی تفسیر میں آئے گی۔

﴿فَإِنْ أُحِصْرُتُمْ فَمَا أَسْتَيْسَرَ مِنَ الْهُدَىٰ ﴾ (196)

مطلوب یہ ہے کہ جب تم احرام کی حالت میں حج یا عمرے کے سفر پر ہوا و کسی مجبوری یا بیماری کی وجہ سے تمہیں رکنا پڑے اور آگے نہ جاسکو تو جہاں رکے ہو، وہیں ایک جانور کی قربانی کرو اور احرام کھول دو۔ اس صورت میں حرم میں جا کر قربانی کرنا لازم نہیں ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر حرام مکہ سے باہر جائیں میں قربانی کر کے احرام کھول دیا تھا۔

﴿وَلَا تَحْلُقُوا رِءُومَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحْلَهُ﴾ (196)

فرمایا، عام حالات میں مکہ مکرہ پہنچنے کے بعد جب تک قربانی اپنے صحیح ٹھکانے پر نہ پہنچ جائے اس وقت تک حلق یا تصر کرنا یعنی سر منڈانا یا سر کے بال کٹوانا اور احرام کھولنا منع ہے۔ دوسرے مقام پر قربانی کے اصل ٹھکانے کے بارے میں فرمایا گیا:

﴿هَذِهِمْ بِالْعَجْبَةِ﴾ (المائدہ 5: 95)

”(کفارے کا) جانور حرم کعبہ تک پہنچایا جائے۔“

﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مُّرِيضاً أَوْ يَهُ أَذْغَى مِنْ رَّأْسِهِ فَفَدِيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ﴾ (196)

پھر جو شخص کسی بیماری یا سر میں تکلیف کے سبب سے قربانی سے پہلے حلق یا قصر کر ابیٹھے اور احرام کھول دے تو اسے چاہیے کہ فدیے کے طور پر تین دن کے روزے رکھے۔ یا چھ (6) مسکینوں کو کھانا کھلانے، یا ایک بکرے کی قربانی کرے (ذم دے) جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

”(صُومُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ، أَوْ تَصَدَّقُ بِفَرَقٍ بَيْنَ سِتَّةٍ، أَوْ نُسُكٍ مِّمَّا تَيَسَّرَ)“

(صحیح بخاری، رقم: 1816: 1817)

﴿فَإِذَا أَمْنَتُمْ فَمَنْ تَمَسَّكَ بِالْعُبَرَةِ إِلَى الْحَجَّ فَهَا أُسْتَبِّسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾ (196)

پھر جب دشمن کا خطرہ نہ رہے اور اس نے نصیب ہو جائے، یا بیماری کے بعد شفافیں جائے تو حج یا عمرہ پورا کرنا چاہیے۔ پھر جو حج تھی، یا حج قرآن میں حج کے ساتھ پہلے عمرے کی سعادت حاصل کرنا چاہیے تو اس پر واجب ہے کہ وہ ایک جانور کی قربانی کرے، جو حاصل میں اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر ادا کرنا ہے کہ اس نے حج کے علاوہ عمرے کی سعادت بھی بخشی۔

﴿فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجَّ وَسَبْعَةٌ إِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةً كَامِلَةً﴾ (196)

ارشاد ہوا جو شخص حج تھی (یا حج قرآن) کر رہا ہوا اور قربانی نہ کر سکتا ہو تو وہ احرام کی حالت میں یوم نحر (دشی الحجر) تک تین دنوں کے روزے رکھ لے اور سات روزے حج سے واپسی پر گھر پہنچ کر رکھے۔ اس طرح اس کے یہ

پورے دس (10) دنوں کے روزے ہو جائیں گے جو کہ قربانی نہ کر سکنے کا کفارہ ہے۔ اس میں تین کے بعد سات کو جمع کر کے پورے دس دنوں کا ذکر اہل عرب جیسی ان پڑھ قوم کے حسب حال اور رواج کے مطابق ہوا ہے، جو الگ الگ عدد کو بیان کرنے کے بعد ان کو جمع کر کے بتاتے تھے تاکہ صحیح تعداد کے بارے میں کسی طرح کا شک و شبہ باقی نہ رہے۔ خود ہمارے ہاں بھی لین دین کی بعض مستاویات (Documents) میں اصل رقم لکھ کر اس کا نصف لکھنے کا رواج اسی مقصد کے لیے ہوتا ہے۔

﴿ذُلِكَ لِمَنْ لَمْ يَكُنْ أَهْلَهُ حَاجَةً ضَرِبَتِ الْمَسْجِدُونَ الْحَرَامُ﴾ (196)

ارشاد ہوا کہ حج کے ساتھ عمرہ کرنے کی رخصت اور سہولت صرف باہر سے آنے والے آفی حجاجوں کے لیے ہے کہ ان کو حج اور عمرے کے لیے الگ الگ سفر کرنے کی زحمت اور مشقت سے بچایا جائے اور وہ سفر حج کے ساتھ ہی عمرہ کرنے کی سعادت بھی حاصل کر لیں۔ اس لیے ان کو حج قرآن اور حج تمتع دنوں میں حج کے ساتھ عمرہ کرنے کی بھی اجازت دی گئی، جب کہ اہل حرم یعنی اہل مکہ کو اس رخصت اور سہولت کی ضرورت نہ تھی وہ آسانی کے ساتھ حج کے موقع کے بغیر بھی جب چاہیں عمرہ کر سکتے ہیں۔ اس لیے ان کو صرف حج افراد (یا مفرد) کرنے کا حکم ہے جس کے ساتھ عمرہ شامل نہیں ہوتا۔

﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴾ (196)

آخر میں فرمایا کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اس کے دیے ہوئے احکام کی نافرمانی سے بچو اور یاد رکھو، جو کوئی اس کے احکامات کی خلاف ورزی کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے سخت سزادے گا۔

**الْحَجَّ أَشْهُرٌ مَعْلُومٌ حَجَّ فِيْهِنَ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقٌ
وَلَا جِدَالٌ فِي الْحَجَّ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمُهُ اللَّهُ وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ
خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ وَاتَّقُونَ يَا وَلِي الْأَلْبَابِ ⑯ لَيْسَ عَلَيْكُمْ
جُنَاحٌ أَنْ تَبِتَّغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ فَإِذَا آتَيْتُمْ مِنْ عَرَفَتٍ
فَآذِكُرُوا اللَّهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَآذِكُرُوهُ كَمَا هَذِهِكُمْ حَوْلَانِ
كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ لِمَنِ الصَّالِيْنَ ⑯ ثُمَّ أَفْيِضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ**

النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ عَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ فَإِذَا قَضَيْتُمْ
 مَّنَاسِكُكُمْ فَإِذَا كُرُوَ اللَّهَ كَنِزْ كُرِكُمْ أَبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذُكْرًا فِينَ
 النَّاسِ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا أَتَنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ
 مِنْ خَلَاقٍ ۝ وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا أَتَنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً
 فَوَّ فِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ أُولَئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ
 مِّمَّا كَسَبُوا ۝ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝ وَإِذْ كُرُوَ اللَّهَ فِي آيَاتِ
 مَعْدُودَاتِ ۝ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۝ وَمَنْ
 تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ اتَّقَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ

إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ۝

”حج کے میں مقرر ہیں۔ جو کوئی ان میں حج کی نیت سے احرام باندھ لے پھر اسے حج کے دوران میں نہ خش بات کرنی ہے، نہ گناہ کی اور نہ لڑائی جھگڑے کی، اور جو نیک کام تم کرتے ہو، اللہ اسے جانتا ہے۔ اور (حج پر روانہ ہونے سے پہلے) زادروہ لے لیا کرو۔ اگرچہ اصل زادروہ تقویٰ ہے۔ اور اے عقل والو! صرف مجھ سے ڈرو۔ اور اگر تم حج کے دوران میں اپنے رب کا فضل تلاش (کرتے ہوئے کوئی کار و بار) کر لو تو اس میں کوئی گناہ۔ نہیں پھر جب تم لوگ عرفات سے واپس آ کر مشعر حرام یعنی مژدلفہ میں قیام کرو تو یہ وقت اللہ کی یاد میں گزارو۔ اور اللہ کو ایسے یاد کرو جیسے اس نے تھیں بتایا ورنہ اس سے پہلے تم را بھلکے ہوئے تھے۔ پھر جہاں سے اور لوگ واپس ہوں تم بھی وہاں سے واپس ہو اور اللہ سے بخشش مانگو۔ بے شک اللہ معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

اور جب حج کے اعمال پورے کر لو تو اللہ کو یاد کرو جس طرح پہلے اپنے باپ دادا کو یاد کرتے تھے، بلکہ اس سے بھی زیادہ اللہ کو یاد کرو۔ پھر بعض لوگ یہ دعا مانگتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں سب کچھ دیدے۔ ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور بعض یہ دعا کرتے ہیں۔ اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور دوزخ کی آگ سے بچانا۔ ایسے لوگوں کو ان کی نیکیوں کا صدر ملے گا اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

حج کے چند نوں میں اللہ کو خوب یاد کرو۔ پھر جو شخص جلدی کر کے دو دنوں میں (مکہ وابس) آجائے اس پر کوئی گناہ نہیں، اور جو تھہر جائے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ (دونوں طرح کی) یہ اجازت ایسے شخص کے لیے ہے جو اللہ سے ڈرے۔ ویسے تم سب اللہ سے ڈرو، اور یاد رکھو تمہیں ایک دن اس کے سامنے پیش ہونا ہے۔“ (203-197)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

الحج :..... اس سے صرف حج مراد ہے۔ بعض لوگوں نے اس سے عمرہ مراد لیا ہے مگر وہ صحیح نہیں ہے کیونکہ عمرے کے لیے مخصوص معینے نہیں ہیں بلکہ وہ کسی وقت بھی ہو سکتا ہے۔

أشہر :..... یہ جمع ہے شہر کی جس کے معنی ہیں مہینہ۔ اس کی ایک اور جمع شہور بھی قرآن مجید میں آئی ہے۔

﴿إِنَّ عِدَّةَ الشَّهُورِ عِنْدَ اللَّهِ أَثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتْبِ اللَّهِ﴾ (التوبہ 9:36)

”بے شک اللہ کے نزدیک مہینوں کی گنتی بارہ معینے ہے۔“

مَعْلُومَاتُ :..... اس کے معنی ہیں معروفات یعنی جانے پہچانے۔ یہ مَعْلُومَةٌ کی جمع ہے اشہر مَعْلُومَاتُ کا مطلب یہ ہے کہ لوگ ان کو اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں۔ عبداللہ بن عباس رض اور جمہور علماء کے نزدیک اس سے شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے پہلے دن مراد ہیں۔

فَرَضَ :..... اس کے معنی ہیں: اپنے اوپر لازم کر لیا۔

رَفَثَ :..... اس کے اصل معنی فحش بات کے ہیں مگر اس جگہ اس سے مراد جماع ہے۔

فُسُوقُ :..... اس سے ہر قسم کا گناہ اور غیر شرعی کام مراد ہے۔

جَدَالُ :..... یہ جدل سے ہے اور اس کا مطلب ہے اڑائی جھکڑا کرنا۔

تَرَوَدُوا :..... یہ زود سے ہے۔ اس کے معنی ہیں زادراہ لینا۔ سفر خرچ لینا۔

فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ :..... اس جگہ اس سے مراد تجارتی اور معاشی فائدہ ہے۔ قرآن میں کئی مقامات پر یہی معنی مراد ہیں جیسے سورہ نبی اسرائیل 12:17، المزمل 20:73، فاطر 35:12، الحج 62:10۔

أَفَضْتُمْ :..... یہ افاضہ سے ہے جس کے معنی ہیں زیادہ تعداد میں نکل کر روانہ ہونا۔

عَرَفَتِ :..... اس سے عرفات کا میدان مراد ہے جہاں ۹ ذوالحجہ کو حاجی لوگ وقوف کرتے (ٹھہرتے) ہیں۔ یہ عرفہ کا دن کہلاتا ہے۔ عرفات کو عرفات اس لیے کہتے ہیں کہ وہاں لوگوں کو ایک دوسرے سے تعارف حاصل ہوتا ہے۔

الْمَشْعَرُ الْعَرَامِ :..... اس سے مزدلفہ کا مقام مراد ہے۔ یہ بھی حج کا مشعر یعنی عبادت کی جگہ ہے اور الحرام کے معنی محترم کے ہیں۔ یاد رہے کہ مشاعر اور شعائر ایک دوسرے کے ہم معنی اور مترادف (SYNONYMOUS) الفاظ ہیں۔

گُوياج کے مشاعر اور حج کے شعائر ایک ہی چیز ہے۔

إِنْ كُتُمْ إِنْ كَأْرَفَ إِنْ (بے شک) کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ جو دراصل إِنْ کا حکف ہوتا ہے۔ اس
جگہ اس سے بھی متمن مراد ہیں۔ اس کی بہت سی شالیں قرآن میں موجود ہیں جیسے۔ سورۃ الانعام میں ہے:

﴿وَإِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغَافِلُونَ﴾ (الانعام 6: 156)

”اور بے شک ہم اس کے پڑھنے پڑھانے سے غافل تھے۔“

بلکہ اس جگہ إِنْ کا حرف إِنْ بلکہ إِنَّا کے معنوں میں ہے۔

﴿الْحَجَّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومٌ﴾ (197)

مطلوب یہ ہے کہ حج کا فریضہ ادا کرنے کے لیے جو ممینے مقرر ہیں، وہ شروع سے معلوم و معروف چلے آ رہے ہیں اور وہ یہ ہیں: شوال، ذوالقعدہ، اور ذوالحجہ (کے ابتدائی دس دن)

یہی تفسیر عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے کی ہے اور اسی کو امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہم نے اختیار کیا ہے۔ ان مہینوں کے سوا دوسرے مہینوں میں احرام تو باندھا جا سکتا ہے مگر حج کے مناسک صرف انہی تین مہینوں میں ادا کیے جاسکتے ہیں۔

﴿فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقٌ وَلَا چِدَالٌ فِي الْحَجَّ﴾ (197)

فرمایا جو شخص ان مہینوں میں حج کا ارادہ کر لے اور احرام باندھ لے تو اس حالت میں اس کے لیے تین چیزیں بالکل منع ہیں:

1۔ رفت: اس سے مراد شہواني باتیں اور جماع ہے۔

2۔ فسوق: اس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور ہر قسم کا غیر شرعی کام۔

3۔ چدال: اس سے مراد آپس میں لڑائی بھگڑا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حج کے حوالے سے یہ ایک جامع نصیحت اور حکم ہے جس سے اس اجتماعی عبادت کے لیے پاکیزگی، پاک دائمی اور امن و امان کا وہ بے مثال ماحول فراہم ہو جاتا ہے جس کی کوئی مثال دنیا کی دوسری قوموں کے نہیں اجتماعات میں نہیں پائی جاتی۔

﴿وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمُهُ اللَّهُ﴾ (197)

ارشاد ہوا تم جو نیک کام بھی حج کے دوران میں کرو گے جیسے صدقہ کرنا، کسی کو کھانا کھلا دینا، یا دوسرے حاجیوں کی خدمت وغیرہ، تو اللہ سبحانہ تمہارے اس طرح کے ہر نیک کام کو جانتا ہے اور تمہیں اس کا اجر دے گا۔

﴿وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الرَّازِدِ التَّنْقُوِيَّ﴾ (197)

بھر فرمایا کہ سفر حج کے لیے زادراہ لے کر نکلو اور بہترین زادراہ تقویٰ ہے۔

اس حکم کا پس منظر (BACK GROUND) یہ ہے کہ دور جاہلیت میں عرب کے بعض قبیلے سفر حج کے لیے

زاد راہ لے کر نہیں جاتے تھے۔ وہ اس چیز کو تقوے اور توکل کا نام دیتے تھے۔ پھر زاد راہ نہ ہونے کی وجہ سے خود بھی پریشان ہوتے تھے اور دوسروں کے لیے بھی بوجھ اور پریشانی کا باعث بنتے تھے۔ اس پر اللہ سبحانہ نے حکم دیا کہ جب حج کے سفر پر نکلو تو اپنے ساتھ زاد راہ ضرور لے کر نکلا کرو۔ یہ ایک تھاری مادی اور جسمانی ضرورت ہے مگر یاد رکھو ج کا سفر سیر پاٹے، پنک یا میلے کا نام نہیں ہے۔ اس کے لیے بہترین زاد راہ تقویٰ ہے، وہ ضرور ساتھ لے چلو تاکہ تمہیں حج کے روحانی فائدے اور اس کی برکتیں نصیب ہو سکیں۔

گویا ظاہری زاد راہ سے بڑھ کر باطنی زاد راہ تقویٰ ضروری ہے اور ایک دن جب تم آخرت کے سفر پر روانہ ہو گے تو اس کے لیے تقوے کے سوا کوئی زاد راہ نہ ہو گا۔

یہ قرآن مجید کا وہ اسلوب ہے جو اس نے مثال کے طور پر لباس کے بارے میں اختیار فرمایا ہے۔

﴿يَبْيَنِي أَدَمَ قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِيَابَاسًا يُوَارِي سَوْاْتُكُمْ وَ رِيشًا وَ لِيَابَاسُ التَّقْوَىٰ ذَلِكَ خَيْرٌ ذَلِكَ مِنْ أَيْتِ اللَّهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ﴾ (الاعراف 7: 26)

”اے بنی آدم! ہم نے ایسا لباس پیدا کیا جو تمہارے جسم کی ستر پوشی کرتا ہے اور زینت بھی ہے۔ لیکن پہیز گاری کا لباس سب سے بہتر ہے اور یہ لباس کا ہونا اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے تاکہ لوگ غور کریں۔“

مطلوب یہ ہے کہ انسان کے لیے اللہ تعالیٰ نے کپڑوں کا مادی لباس پیدا فرمایا ہے جو پردہ پوشی کے علاوہ زیب و زینت بھی ہے۔ لیکن تقوے کا روحانی لباس اس سے بھی بہتر ہے جو ایمان، شرم و حیا اور نیک عملی سے عبارت ہے۔ جس کے ذریعے انسان کو قرب الہی حاصل ہوتا ہے اور دنیا و آخرت کی فلاح نصیب ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس روحانی لباس سے محروم ہے تو اس کے لیے مادی لباس بھی بے کار ہے اور اللہ سبحانہ کے ہاں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

بعض لوگ جو تفسیر میں حدیث و سنت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور اپنا یہ اصول بتاتے ہیں کہ قرآنی الفاظ کے صرف معروف معنی ہی لیے جاسکتے ہیں، انہوں نے اس مقام پر لفظ تَزَوَّدُوا (زاد راہ لے لیا کرو) کے معروف معنی اختیار نہ کر کے خود اپنے اصول کا خون کیا ہے۔

﴿وَ اتَّقُونَ يَأُولِي الْأَلْبَابِ﴾ (197)

آخر میں اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر عقل مندوں کو خطاب کر کے تقوے کی تاکید فرمائی، حالانکہ تقوے کی ضرورت سب کو ہے۔ یہ بھی قرآن حکیم کا ایک خاص اسلوب ہے جس میں وہ بالخصوص اہل عقل و دانش کو خطاب کر کے اپنی دعوت اور احکام دیتا ہے۔

اس اسلوب کی چند مثالیں یہ ہیں:

(1)- **﴿وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيْوَةٌ يَأُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ (البقرہ 2: 179)**

- ”اور اے عقل والو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے تاکہ تم اس حکم کی خلاف ورزی سے بچو۔“
- (2). ﴿قُلْ لَا يَسْتَوِي الْخَبِيرُ وَالظَّيْبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كُفْرَةُ الْغَبِيْرِ﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ يَأْوِلِي الْأَلْبَابَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ (المائدہ 5: 100)
- ”آپ ﷺ کہہ دیں کہ ناپاک اور پاک برابر نہیں ہو سکتے، اگرچہ ناپاک کی کثرت تمہیں اچھی لگے۔ اس لیے اے عقل والو! اللہ سے ڈرو تو کہ تم فلاح پاؤ۔“
- (3). ﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ يَأْوِلِي الْأَلْبَابَ﴾ (الطلاق 65: 10)
- ”پس اے عقل والو! تم اللہ سے ڈرو۔“
- (4). ﴿فَاعْتَبِرُوا يَأْوِلِي الْأَبْصَارِ﴾ (الحشر 59: 2)
- ”پس اے آنکھوں والو! تم عبرت حاصل کرو۔“
- (5). ﴿فَإِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِيْتٌ لَأَوْلِي النَّهَى﴾ (طہ 20: 128)
- ”بے شک اس میں عقل مندوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔“

اس اسلوب سے تقصید یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ عقل و دلش کا تقاضا ہی ہے کہ قرآن حکیم کی ہربات کو سمجھ کر مانا جائے اور اس کے مطابق عمل کیا جائے اور ہر دلش مند کا یہی طرز عمل ہونا چاہیے ورنہ وہ دلش مند کہلانے کا سختق نہیں ہے۔

﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ﴾ (198) ”فرمایا، حج کے دنوں میں تمہیں تجارت کرنے اور روزی کمانے کی بھی اجازت ہے۔ کیونکہ یہ چیز تمہارے رب کا فضل ہے اور رب کا فضل تلاش کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ تاہم اصل ارادہ اور مقصد حج کی عبادت ہی ہونی چاہیے۔ وہاں زیادہ وقت مناسک حج کی ادائیگی میں صرف کرنا چاہیے اور دنیا کے کاموں سے فارغ ہو کر پوری یکسوئی سے ذکر و عبادت میں مشغول رہنا چاہیے۔“

قرآن مجید نے کئی مقامات پر تجارت اور رزق کے حصول کو اللہ کا فضل قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا:

﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَإِنْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ﴾ (الجمعہ 10: 62)

”پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔“

﴿فَإِذَا أَفَضَّلْتُمْ مِنْ عَرَفَتِ فَإِذَا كُرُوا اللَّهُ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ﴾ (198)

ارشاد ہوا پھر جب عرفات سے واپس مزادغہ پہنچو تو وہاں بھی رات کے اوقات میں اللہ تعالیٰ کو خوب یاد کرو۔ دعا، تلبیہ اور ذکر و سُبُّحَۃ میں مشغول رہو۔ کیونکہ ابھی تم احرام کی حالت میں ہو اور حج کے مناسک ابھی ختم نہیں ہوئے۔ کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھو کہ ووفی عرفات یعنی عرفات میں حاضری کے بعد حج مکمل ہو گیا ہے۔

یاد رہے کہ حاجی کے لیے مزادغہ میں رات گزارنا واجب ہے۔

﴿وَإِذْ كُرُودُهُ كَمَا هَدَلُكُمْ ﴾ (198)

فرمایا، اللہ سبحانہ کو اس طریقے سے یاد کرو جو طریقہ اس نے تمہیں سمجھایا ہے۔ جس میں عاجزی، گریہ زاری اور ثواب حاصل کرنے کی نیت ہو۔ دعا صرف اللہ سبحانہ ہی سے مانگی جائے۔ چونکہ مشرکین عرب تلبیہ کے الفاظ میں شرک کرتے تھے۔ اس لیے ان کو ایسے تلبیہ سے روکا گیا۔ اس کے علاوہ وہ بتوں کے وسیلے سے بھی دعائیں مانگتے تھے لہذا ان کو ایسی دعاؤں سے بھی روکا گیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کا ذکر کرنے کا صرف وہی طریقہ صحیح ہے جو قرآن و حدیث سے ثابت ہے اور جس کی شریعت نے اجازت دی ہے۔ رہے وہ اذکار و وظائف جو لوگوں نے شریعت کے خلاف بنا رکھے ہیں تو وہ سب ناجائز ہیں۔

﴿وَإِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الصَّابِرِينَ ﴾ (198)

مطلوب یہ ہے کہ قرآن کے نزول اور رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے دور جاہلیت میں تم لوگ گمراہ تھے، عقائد و اعمال مشرکانہ تھے، اب اللہ تعالیٰ نے تمہیں ذکر الہی کا صحیح طریقہ اور ہدایت کا راستہ بتا دیا ہے۔ تمہارے مشرکانہ عقائد و اعمال کی اصلاح کردی ہے۔ یہی مضمون سورہ آل عمران (3) آیت 164 میں اور سورہ الجمعہ (62) آیت 2 میں بھی موجود ہے۔

﴿ثُمَّ أَفْيَضُوا مِنْ حَيْثُ مَعْلُومٌ أَفَأَصَرَّ النَّاسُ ﴾ (199)

دور جاہلیت میں قریش نے اپنے لیے ایک خاص امتیاز اور تفاخر پیدا کر لیا تھا کہ وہ حج میں مزدلفہ جا کر رکھر جاتے اور عرفات تک نہیں جاتے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ اہل حرم ہیں اور ان کے لیے اس موقع پر حرم کی حدود سے باہر نکلنا ان کی شان کے خلاف ہے جیسا کہ ایک مفتون علیہ حدیث میں ہے۔

(صحیح بخاری، رقم: 4520، صحیح مسلم، رقم: 2955)

قرآن نے ان کے اس جھوٹے امتیاز اور ووی آئی پی کلچر کا خاتمه کرتے ہوئے حکم دیا کہ حج میں قریش سمیت سب حاجی لوگ پہلے عرفات جا کر وقوف کریں اور واپسی پر مزدلفہ رات گزاریں۔ اسلام رنگِ نسل اور زبان و قومیت وغیرہ جھوٹے امتیازات کا قائل نہیں ہے۔ اس کے نزدیک تقوے کے سوا کوئی اور امتیاز نہیں۔

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ إِنَّدِ اللَّهَ أَتَقْكُمْ ﴾ (الحجرات 49: 13)

”بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔“

﴿وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴾ (199)

پھر فرمایا، ان تمام بدعتات اور مشرکانہ اعمال سے توبہ استغفار کرو جو دور جاہلیت میں تم نے حج کے کاموں میں شامل کر رکھے تھے اور اب حج کے تمام مناسک شریعت کے احکام کے مطابق ادا کیا کرو۔ پھر جب تم سچے دل کے ساتھ اپنے

گناہوں سے توبہ کرو گے تو اللہ سبحانہ تمہارے سارے گناہ معاف کر دے گا۔ کیونکہ وہ بخششے والا مہربان ہے۔

﴿فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَمَاتِسَكُمْ فَإِذَا كُرُوا اللَّهُ كَنِّيْتُمْ أَبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ دُكْرًا﴾

(200)

مطلوب یہ ہے کہ حج کے مناسک سے فارغ ہونے کے بعد اللہ سبحانہ کو اس طرح یاد کرو جیسے تم اپنے باپ دادا کو یاد کرتے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرو۔

دورِ جاہلیت میں لوگ حج سے فراغت کے بعد منی میں محفوظین جانتے اور بعض دوسرے مقامات پر میلے لگاتے تھے

- پھر ان میں اپنے باپ دادا اور اپنے قبیلوں کے کارناموں پر بڑے جوش و خروش کے ساتھ فخر کا اظہار کرتے تھے۔

قرآن نے ان کی اس جاہلائی سماجی برائی کی اصلاح فرمائی۔ ان کو اس برعے رسم و رواج سے روکا اور حکم دیا کہ جتنے جوش اور جذبے کے ساتھ اپنے بڑوں پر فخر کرتے ہو اس سے بڑھ کر اللہ سبحانہ کا ذکر کیا کرو۔

﴿فَيَنِّ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا أَتَنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ﴾

(200)

دنیا پرست لوگ سمجھتے ہیں چونکہ حج کے موقع پر ان کی دعائیں زیادہ قبول ہوتی ہیں اس لیے وہاں بھی وہ صرف ایسی دعائیں مانگتے ہیں جن سے ان کو دنیا کی مرادوں حاصل ہوں۔ بعض تو حج کا سفر کرتے ہیں اس لیے ہیں کہ اس طرح ان کی کوئی دنیوی مراد پوری ہو جائے گی۔ وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ دنیا کی عارضی زندگی سے زیادہ آخرت کی دائیٰ زندگی کی فکر کرنی چاہیے۔ مگر ایسے لوگوں کا حال قرآن نے اس طرح بتایا ہے کہ:

﴿بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَى﴾ (الاعلیٰ 87:16، 17)

”مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، حالانکہ آخرت اس سے بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔“

فرمایا ایسے خواہش پرستوں کو دنیا کی کوئی سہولت تو ملتی ہے مگر آخرت میں جنت کی نعمتوں میں ان کے لیے کوئی

حد نہیں۔

﴿وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا أَتَنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً﴾

﴿وَقَنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ (201)

لیکن حج میں ایسے چے ایمان والے بھی ہوتے ہیں جو اپنی دعاؤں میں اللہ رب العالمین سے دنیا اور آخرت دونوں کی بھلانکی اور نعمتوں مانگتے ہیں۔ وہ اپنی دنیا کی زندگی کے لیے حال روزی، امن و عافیت اور یہوی بچوں کے لیے خیر و برکت کی دعائیں کرتے ہیں اور آخرت کی زندگی کے لیے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور جنت حاصل ہونے کی دعا کرتے ہیں۔ دوزخ کی آگ سے پناہ مانگتے ہیں۔ یہی لوگ اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں۔

﴿أُولَئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا﴾ (202)

مطلوب یہ ہے کہ یہ دوسرا گروہ جو دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی چاہتا ہے، وہ ضرور اپنے اپنے اعمال کی کمائی کا حصہ پائے گا۔ ان لوگوں کے اعمال قبول ہوں گے۔ ان کی نیکیوں پر ان کو بڑا جو دُثُاب ملے گا۔

﴿وَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ﴾ (202)

پھر اہل ایمان کی تسلی اور اطمینان کے لیے ارشاد ہوا کہ اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

اس کے دو معنی ہیں اور دونوں ہی درست ہیں۔ ایک یہ کہ قیامت کے حساب کتاب میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ اور انسان کی زندگی کا چراغ بجا اور ادھر قیامت کی صبح طلوع ہو گئی۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ان انوں کے اعمال کا حساب لینے میں ذرا در نہیں لگے گی۔ وہ بہت کم وقت میں اپنے سب بندوں کے اعمال کا حساب لے لے گا۔

﴿وَأَذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودٍ﴾ (203)

حج کے چند دنوں میں اللہ تعالیٰ کو خوب یاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ان چند دنوں سے مراد ”ایامِ منی“ یا ”ایام تشریق“ ہیں جو حاجی لوگ منی میں گزارتے ہیں اور وہ ہیں 11، 12، 13 ذوالحجہ۔ ان دنوں میں ہر نماز کے بعد عکسیریں کہنے کا حکم ہے لیکن غیر حاجیوں کے لیے ان عکسیرات تشریق کا حکم 13 ذوالحجہ کی نمازِ فجر سے لے کر 13 ذوالحجہ کی نمازِ عصر تک ہے۔ ان عکسیروں کے الفاظ یہ ہیں:-

اللَّهُ أَكْبَرُ ، اللَّهُ أَكْبَرُ ، اللَّهُ أَكْبَرُ كَبِيرًا .

اور ان کے الفاظ بھی ثابت ہیں:

اللَّهُ أَكْبَرُ اللَّهُ أَكْبَرُ ، لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ ، اللَّهُ أَكْبَرُ ، وَلِلَّهِ الْحَمْدُ .

﴿فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ اتَّقَى﴾ (203)

فرمایا، جن حاجی لوگوں کو کوئی جلدی ہو، ان کو کوئی گناہ نہیں ہو گا اگر وہ ایام تشریق کے پہلے دو دن گزار کر 13 ذوالحجہ ہی کو منی چھوڑ دیں اور حج سے واپسی کی راہ لیں۔ اسی طرح جو حاجی 13 ذوالحجہ تک منی ہی میں پھرے رہیں، ان کو بھی کوئی گناہ نہ ہو گا۔

مطلوب یہ ہے کہ یہ دونوں صورتیں جائز ہیں لیکن افضل اور مسنون طریقہ یہی ہے کہ 13 ذوالحجہ تک منی ہی میں قیام کیا جائے۔ پھر فرمایا یہ دونوں جائز صورتیں ان نیک لوگوں کے لیے رکھی گئی ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے اور اس کی نافرمانی سے بچتے ہیں اور بچے حاجیوں کی بھی صفت ہوتی ہے۔

﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ لَآتِيُّهُ تُحْشَرُونَ﴾ (203)

آخر میں فرمایا کہ حج کے مناسک ہوں، یا شریعت کے دوسرے احکام ہوں، سب پر عمل کرتے ہوئے اللہ سبحانہ کی نافرمانی سے بچو۔ ہر حال میں تقویٰ اختیار کرو اور یقین رکھو کہ ایک دن اسی کی عدالت میں اعمال کی جزا اوسرا کے لیے جمع

کیے جاؤ گے۔ پھر آخرت کے عقیدے پر جتنا پختہ یقین ہو گا اتنا ہی زیادہ تقویٰ حاصل ہو گا۔ جس کے نتیجے میں نیکی کرنا اور برائی سے پچنا آسان ہو جائے گا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعِجِّلُكَ قَوْلَهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ يُشَهِّدُ اللَّهَ عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ وَ هُوَ أَلَدُ الْخَصَامِ ۝ وَ إِذَا تَوَلَّ سَعْيَ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ ۝ وَ اللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝ وَ إِذَا قِيلَ لَهُ أَتَقْ اللَّهَ أَخْذَتْهُ الْعِزَّةُ بِإِلَاثِمِ فَحَسِبَهُ جَهَنَّمُ وَ لَيْسَ الْمِهَادُ ۝ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَسْرِي نَفْسَهُ أَبْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ ۝

وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ ۝

”لوگوں میں کوئی (منافق) ہے جو دنیوی زندگی کے بارے میں بات کرتا ہے تو تمہیں اس کی گفتگو بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کے لیے اللہ کی قسمیں کھاتا ہے۔ حقیقت میں وہ سخت جھگڑا لو ہے۔ جب تمہاری مجلس سے اٹھ کر کہیں جاتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ فساد پھیلائے، فصلیں اجاڑے اور جانیں تلف کرے، حالانکہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ اگر اسے کہا جائے اللہ سے ذر، تو اس کا جھوٹا وقار اسے اور زیادہ گناہ پر ابھارتا ہے۔ ایسے شخص کے لیے دوزخ کافی ہے جو بہت برالمٹھانہ ہے۔“
لوگوں میں (ملخص مسلمان) بھی ہے جو اللہ کی خوشنودی کے لیے اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے اور اللہ اپنے بندوں پر نہایت محربان ہے۔“ (204-207)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

يُشَهِّدُ اللَّهُ :.....(وَهُوَ اللَّهُ كَوَاهْ بِنَاتَهُ) اس سے مراد تم کھاتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ المنافقون میں ہے:
 ﴿إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشَهِدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللَّهِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ وَاللَّهُ يَشَهِدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ﴾ (المنافقون 2:63)

”(اے نبی ﷺ!) جب منافق لوگ آپ ﷺ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم گواہی دیتے ہیں آپ ﷺ بے شک اللہ کے رسول ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے بے شک آپ ﷺ اس کے رسول ہیں۔ مگر اللہ گواہی دیتا ہے یہ منافقین جھوٹے ہیں۔ انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور وہ اللہ کی راہ سے

دوسروں کو بھی روکتے ہیں۔“

اللَّهُ: یہ اس صفت ہے اور اس کے معنی ہیں شدیدُ الْخُصُومَةٌ یعنی سخت جھگڑا کرنے والا۔

الْخَصَامِ: بعض کے نزدیک یہ خَصْمُ (مخالف) کی تجھ ہے۔ بعض اسے خَاصَمَ سے مصدر سائی قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کا مضاف حذف ہو گیا ہے اور اصل کلام یوں ہے: أَشَدُ ذُو الْخَصَامِ یعنی سخت جھگڑا کرنے والا، بہت جھگڑا لو۔

تَوْلِي: اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں: وہ والبیں مرتاتا ہے۔ یادہ غلبہ اور اختیار پاتا ہے۔

الْعِزَّةُ: اس کے اصل معنی عزت و اقبال کے ہیں مگر اس جگہ مجازی طور پر یہ جھوٹی عزت، انانیت اور جھوٹے وقار کے معنوں میں ہے۔

بِعْسَ الْبَهَادُ: اس کے معنی ”بُری آرامگاہ“ کے ہیں۔

يَشْرِئِي: یہ بَيْسُ کے معنوں میں ہے یعنی وہ بیچتا ہے، خرچ کرتا ہے۔

إِبْغَاعَةُ: اس کے معنی چاہئے یا دھونڈنے کے ہیں۔

﴿وَمَنِ النَّاسِ مَنْ يُعِجِّلُكَ قُولُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ يُشَهِّدُ اللَّهَ عَلَى مَا فِي قُلُوبِهِ﴾ (204)

اس سے پہلے یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ ہر عبادت کا مقصد تقوے کا حصول ہے اور اللہ تعالیٰ سے دینا اور آخرت دونوں جہان کی بھلائی مانگنا اس کے خلاف نہیں ہے۔ پھر چونکہ تقوے کا مقام زبان نہیں بلکہ دل ہے اس لیے ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو زبان سے بہت اچھی باتیں کرتے ہیں مگر ان کے دل تقوے سے خالی ہوتے ہیں۔ یہی لوگ منافق ہوتے ہیں۔

اس کے بر عکس جن کے دلوں میں تقویٰ اور اخلاص ہوتا ہے وہ ہر کام اللہ سبحانہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے کرتے ہیں اور اس کے حصول میں اپنی جان بھی قربان کر دیتے ہیں۔

اس آیت میں نبی ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا کہ بعض لوگ ایسے چوب زبان ہوتے ہیں جو بڑی میٹھی باتیں کرتے ہیں۔ وہ گفتار کے غازی ہوتے ہیں۔ اپنی نیکی اور پارسائی کا چرچا کرتے پھرتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں وہ منافق ہوتے ہیں۔ ہر بات پر قسمیں کھاتے ہیں کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں، دل سے کہہ رہے ہیں تاکہ دوسرے ان کی جھوٹی باتوں کو سچ سمجھ کر ان پر اعتبار کر لیں۔

یاد رہے کہ جوبات اللہ لوگاہ بنا کر کہی جائے وہ بھی قسم ہوتی ہے۔

﴿وَهُوَ أَكْلُ الْخَصَامِ ﴿۲۰۴﴾

ارشاد ہوا کہ ایسے منافق لوگ سخت جھگڑا لو ہوتے ہیں۔ بظاہر درستی کا دم بھرتے ہیں مگر اپنے مفاد کے لیے جھگڑے

اور گالی گلوچ پر اتر آتے ہیں۔

اس مقام پر منافقین کی صرف تین نشانیاں بیان ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ چوب زبان اور باتوںی ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ بار بار قسمیں کھاتے ہیں۔ تیسرا یہ کہ وہ جھگڑا لو ہوتے ہیں۔ ان تین نشانیوں کے علاوہ بھی قرآن و حدیث میں منافقین کی کچھ اور نشانیاں بیان ہوئی ہیں۔ جیسے جھوٹ بولنا، وعدہ خلافی، امانت میں خیانت، نماز میں سستی اور جہاد نہ کرنا وغیرہ۔

﴿وَإِذَا تَوَلَّ سُعْيٍ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْعَرْثَ وَالسَّلْطَنَةَ وَاللهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ﴾ (205)

فرمایا یہ منافق لوگ اپنے مفاد کے لیے جہاں بھی ان کا بس چلے فتنہ و فساد برپا کر دیتے ہیں۔ اصلاح کے نام پر بگاڑ پیدا کرتے ہیں۔ دوسروں پر ظلم و زیادتی کرتے، ان کی فصلیں اجائزتے اور ان کو جانی و مالی نقصان پہنچاتے رہتے ہیں۔ اپنے اقتدار کے لیے ہر حرب آزماتے، غداری کرتے اور ملک تباہ کرتے ہیں۔ جب کہ اللہ سبحانہ کسی قسم کے فتنہ و فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ وہ منافقوں کی ظاہری حالت نہیں دیکھتا بلکہ ان کے باطن کا حال جانتا ہے۔ اس لیے ان سے نفرت کرتا ہے۔

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُ أَتَقْ أَنَّ اللَّهَ أَخْذَنَهُ الْعَزَّةَ بِالْإِثْمِ﴾ (206)

جب ایسے منافقین کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور سیدھی را اختیار کرنے کی بصیرت کی جائے کہ منافقانہ حرکتیں نہ کرو اور برے کام چھوڑ کر نیک انسان بن جاؤ تو یہ لوگ تکبر، غور، رعونت اور انانیت کی وجہ سے نہ کسی کی بات مانتے ہیں اور نہ کوئی بصیرت قبول کرتے ہیں۔ ہمیشہ گمراہی اور گناہ میں مبتلا رہتے ہیں۔

﴿فَحَسِبُهُمْ جَهَنَّمُ وَلَيَعْسُ الْوَهَادُ﴾ (206)

ارشاد ہوا ایسے بدبنتوں کے لیے جہنم کی آگ کافی ہے ان کا یہی علاج ہے کہ ان کو ایسی ہی بری جگہ پر رکھ کر عذاب دیا جائے۔

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِمُ نَفْسَهُ أَبْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ﴾ (207)

اب فرمایا، منافقین کے بر عکس مخلصین کا نیک گروہ بھی موجود ہے جو اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اپنی جان بھی قربان کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے احکام پر عمل کرتا ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ

جان دی ، دی ہوئی اُسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس سے یہ اشارہ بھی لکھتا ہے کہ بعض حالات میں باطل قولوں کے خلاف فدائی حملہ بھی جائز ہوتا ہے جس کے نتیجے

میں مجاہد کو شہادت کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔

﴿وَاللهُ رَءُوفٌ بِالْعَبَادِ﴾ (207)

آخر میں فرمایا اللہ سبحانہ، اپنے نیک بندوں پر شفقت فرماتا ہے۔ وہ ان کے تھوڑے اعمال پر بھی ان کو بہت بڑے اجر سے نوازے گا۔ وہ ان کی طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ نہیں ڈالتا۔ وہ ایک نیکی کے بد لے میں کئی گناہ ثواب دیتا ہے۔ جب کہ ایک براہی کو صرف ایک ہی شمار کرتا ہے۔ وہ بھی ان کو مال دے کر ان سے فرماتا ہے کہ اس میں سے کچھ میری راہ میں بھی خرچ کرو۔ وہ جان عطا کر کے پھر اسے خریدتا ہے کہ اس کی راہ میں اسے قربان کر دو تو تاکہ تمہیں اس کے بد لے میں ہمیشہ کی جنت اور اس کی دائمی نعمتیں حاصل ہوں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السَّلَمِ كَافَةً ۚ وَ لَا تَتَّبِعُوا
خُطُوطَ الشَّيْطَنِ ۖ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝ فَإِنْ زَلَّتُمْ مِّنْ بَعْدِ
مَا جَاءَتُكُمُ الْبَيِّنَاتُ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ هَلْ يَنْظُرُونَ
إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلْلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلِكَةُ وَ قُضَىٰ
الْأَمْرُ ۝ وَ إِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ۝

۱۵

”اے ایمان والو! اسلام میں پورے طور پر داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ لیکن اگر واضح ہدایات آجائے کے بعد تم بچسل گئے تو یاد رکھو! اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ کیا کافر لوگ اس انتظار میں ہیں کہ اللہ ان کے سامنے بادل کے سامبانوں میں ظاہر ہو، فرشتے بھی آ جائیں اور معاملے کا فیصلہ کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ سارے معاملات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔“ (210-208)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

السَّلَمُ: یہ مصدر ہے اور اس کے اصل معنی **الْتَسْلِيمُ وَالْأَنْفِيَادُ** یعنی اطاعت کے ہیں اور اس جگہ اس سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت مراد ہے۔ لیکن یہ لفظ کئی دوسرے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے صلح، سلامتی اور دین اسلام۔ غور سے دیکھا جائے تو اس کے تمام مختلف معانی ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ کردیتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت ہی کا دوسرا نام اسلام ہے اور اسلام وہ دین ہے جس پر عمل کرنے سے امن، صلح اور سلامتی حاصل ہو سکتی ہے۔

كَافَةً: یہ بھی مصدر ہے اور واحد ہی استعمال ہوتا ہے۔ اس کا تثنیہ یا جمع نہیں ہے۔ اس کے معنی جماعت یا مجموع کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سب مل کر پورے اسلام کو اختیار کرو۔

رَلَّتُمْ: (تم پھسل گئے) زَلَّ کے اصل معنی ہیں پاؤں کا پھسلنا۔ لیکن یہ راہق چھوڑ دینے کے معنوں میں بھی آتا ہے اور اس جگہ بھی معنی مراد ہیں۔

الْبَيِّنُ: (روشن دلیل) اس سے وہ حق کے عقلی اور نقلی دلائل مراد ہیں۔

يَنْظُرُونَ: (وہ انتظار کرتے ہیں) نَظَرَ کے ایک معنی دیکھنے کے ہیں اور دوسرے انتظار کرنے کے۔ اس جگہ بھی دوسرے معنی مراد ہیں۔

ظُلُلٌ: یہ ظُلَّہ کی جمع ہے جس کے معنی پھتری یا سامبان کے ہیں۔

الْعَوَامُ: اس سے وہ بادل مراد ہوتا ہے جو ہاکا اور سفید ہو۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أَمْنُوا ادْخُلُوا فِي الِّسْلَمِ كَافَةً﴾ (208)

اسلام ایک کامل دین اور مکمل ضابطہ حیات (Code of Life) ہے۔ یہ ایک اکائی (Unit) ہے جس کے حصے بخوبی نہیں کیے جاسکتے اور نہ اس میں کوئی کمی بیشی کی جاسکتی ہے۔ یہ ایک ایسا مجموع (Package) ہے جسے پورے طور پر مانا ہوتا ہے یا پورے طور پر نہیں مانا ہوتا۔ پہلی صورت میں یہ اسلام اور دوسری صورت میں کفر ہے۔

یہ بات ایک مثال سے سمجھی جاسکتی ہے:

وہیں اسلام میں تمام انبیاء کرام علیهم السلام پر ایمان لانا مسلمان ہونے کے لیے ایک ضروری شرط ہے۔ کسی ایسے شخص کا ایمان مکمل نہیں ہوتا جو سارے نبیوں پر ایمان نہ لائے۔ اگر کوئی آدمی یہ کہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سواباتی تمام انبیاء کرام علیهم السلام پر ایمان رکھتا ہے تو اس کا ایمان کامل نہیں۔ بلکہ وہ سرے سے مسلمان ہی نہیں ہے اور اس کے لیے آخرت میں نجات بھی نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کوئی دوسرਾ شخص حضرت محمد ﷺ کے بعد کسی اور کی نبوت تسلیم کرے گا تو وہ بھی دائرۃ الاسلام سے خارج ہو جائے گا۔ گویا رسالت کے عقیدے میں کسی ایک نبی کو نہ مانا، یا کسی نئے مدعا نبوت کو مانا لینا دونوں ہی اسلام کے خلاف ہیں اور ایسا شخص نہ مسلمان ہے اور نہ نجات کا مستحق۔ اس مسئلے پر تمام علمائے اسلام متفق ہیں۔

اسی طرح فرض نمازوں کی رکعتوں میں کمی بیشی کرنے سے بھی نماز ادا نہیں ہوتی۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کے عقائد و اعمال میں کسی قسم کی کمی بیشی کرنا جائز نہیں اور جو شخص ایسا کرے وہ مسلمان نہیں رہتا۔

زیر نظر آیت میں اہل ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ پورے کے پورے اسلام میں داخل ہوں۔ آدھے یا ایک تہائی یا دو تہائی اسلام کو قبول نہ کریں بلکہ مکمل اسلام کو اختیار کریں۔ اسلام نے زندگی کے ہر شعبے میں جو احکام دیئے ہیں ان پر پورا پورا عمل کیا جائے۔ نہ کسی نیکی کو چھوڑا جائے اور نہ کسی برائی کو اختیار کیا جائے۔ اسلام کے تمام عقائد و اعمال کی پابندی کی جائے۔

آج مسلمانوں کو جس ذلت، غلامی اور بربادی کا سامنا ہے، اس کا واحد سبب یہی ہے کہ انہوں نے اسلام کی بعض من پسند تعلیمات کو لے لیا ہے اور اس کے بعض دوسرے عقائد و اعمال کو چھوڑ رکھا ہے۔ ان کی اس منافقت، دوسری اور عملی کفر کا انجام سب کے سامنے ہے۔

﴿وَ لَا تَتَّبِعُوا حُطُوتَ الشَّيْطَنِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴾ (208)

دین اسلام کی مکمل پابندی کرنے کے حکم کے بعد فرمایا کہ شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص اپنے دین کے جتنے حصے کو چھوڑتا ہے وہ اتنے حصے کو شیطان کے حوالے کر دیتا ہے اور اس کے پیچے چلتا ہے، خواہ اس کا تعلق عقیدے سے ہو ایمل سے۔ گویا دین اسلام سے بہت کر جو کام بھی کیا جائے گا وہ شیطان کی پیروی کھلانے گا۔

﴿فَإِنْ زَلَّتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَاءَتُكُمُ الْبَيِّنَاتُ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴾ (209)

اس آیت میں سخت تنبیہ (Warning) کی گئی ہے کہ اگر لوگ دین کے واضح احکام اور ہدایات آجائے کے بعد بھی ان میں تبدیلی یا کمی پیشی کریں گے، اور اگر راہ حق پر چلتے ہوئے ان کے قدم ڈگکا گئے تو وہ جان لیں کہ اللہ تعالیٰ غالب اور حکمت والا ہے اور اس کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ جو لوگ دین اسلام کی سچائی اور حقانیت واضح ہو جانے کے بعد بھی اس سے منہ موڑیں گے اور شیطان کے پیچے چلیں گے تو وہ یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ایسا زبردست ہے کہ وہ ان کو ان کی سرکشی پر ضرور سزا دے گا۔ وہ بدلہ لینے پر پوری طرح قادر ہے اور اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

﴿هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلْمٍ مِّنَ الْغَمَادِ وَالْمَلِكَةُ

وَ قُضَى الْأَمْرُ وَ إِلَى اللَّهِ تُرْجَحُ الْأُمُورُ ﴾ (210)

اس آیت میں تنبیہ اور عید کے انداز میں فرمایا کہ اب جب کہ نبی ﷺ کی صداقت ظاہر ہو جکی اور دین اسلام کا سچا دین ہونا واضح ہو گیا تو یہ لوگ جلدی سے مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے؟ کیا یہ اس بات کے منتظر ہیں کہ خود اللہ سبحانہ اور اس کے فرشتے آسمان کے بادلوں سے اچانک نمودار ہو کر ان سرکشوں پر عذاب نازل کر دیں اور ان کا قصہ تمام ہو جائے۔

اس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ بندے کو اپنے گناہوں سے جلد توبہ کر لینی چاہیے اس سے پہلے کہ توبہ کا موقع ہی نہ ملے۔

آخر میں فرمایا کہ دنیا اور آخرت کے تمام معاملات کا حتیٰ اور آخری فیصلہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جو چاہے فیصلہ صادر فرمادے کوئی اسے روکنے والانہیں۔

سَلْ بَنِي إِسْرَائِيلَ كَمَا أَتَيْنَاهُم مِنْ آيَاتِنَا بَيْنَهُ طَوْ وَمَنْ يُبَدِّلُ نِعْمَةَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝ زُيْنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمُ الْقِيَمَةِ طَوْ وَاللَّهُ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّنَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحُكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ طَوْ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ طَوْ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطِ مُسْتَقِيمٍ ۝

”بنی اسرائیل سے پوچھو، ہم نے انھیں ہدایت کی کتنی کھلی نشانیاں دیں! مگر جو لوگ اللہ کی ان نعمتوں کو محکرا دیں جو ان کے پاس آچکی ہوں تو یاد رکھیں کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ کافروں کی نظر میں دنیا کی زندگی خوش نما کر دی گئی ہے اور وہ ایمان والوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں وہ قیامت کے دن کافروں کے مقابلے میں اوپر چلے اور بلند مرتبہ ہوں گے۔ اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا ہے۔

شروع میں لوگوں کی ایک ہی امت تھی پھر جب انھوں نے اختلاف پیدا کر لیا تو اللہ نے ان کی طرف نبی سیحؐ جو لوگوں کو خوش خبری سناتے اور (نافرمانی کے برے انجام سے) ڈراتے تھے۔ ان کے پاس اللہ کی نازل کی ہوئی برق کتاب تھی تاکہ وہ ان باتوں کا فیصلہ کر دے جن میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں۔ یہ اختلاف ان لوگوں نے پیدا کیے جن کو کتاب دی گئی اور انھوں نے واضح ہدایات کی موجودگی میں محض ضد کی وجہ سے اختلافات پیدا کر لیے۔ پھر اللہ نے اپنے فضل سے ایمان والوں کو حق کے معاملے میں صحیح راہ و کھادی جس کے بارے میں لوگ بھگڑ رہے تھے۔ اور اللہ جسے چاہتا ہے، سیدھی راہ و کھادیتا ہے۔“ (213-211)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

ایتہ بیتہ: (روشن نشانیاں، واضح دلیلیں) اس سے وہ کلمے مجرمات مراد ہیں جو بنی اسرائیل کو دکھائے گئے جیسے عصا اور من و سلوٹی وغیرہ۔

نِعْمَةُ اللَّهِ : (اللہ کی نعمتیں) اس جگہ اس سے مراد دین اور شریعت ہے۔

الْعِقَابُ : اس سے وہ عذاب مراد ہوتا ہے جو اصل میں کسی گناہ کا نتیجہ یا بدله دیتا ہے۔

يَسْخَرُونَ : (وہ مذاق اڑاتے ہیں)۔ سُخِرَ مِنْهُ کے معنی ہیں: اس نے اس کا مذاق اڑایا۔

﴿سَلْ بَنَى إِسْرَائِيلَ كَمَا أَتَيْنَاهُمْ مِنْ آيَاتِنَا بَيِّنَاتٍ﴾ (211)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کی نعمتیں کو خطاب کر کے فرمایا کہ آپ ﷺ ان یہودیوں کو جنجوڑ کر ان سے پوچھیں کہ ان کے اسلاف اور بڑوں کو انبیاء کرام کے ذریعے کتنے مجرے دکھائے گے، کتنی نعمتیں دی گئیں مگر انہوں نے ان سب کا انکار کیا اور ناشکری کی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو عذاب میں پکڑا۔ تو کیا ب یہ لوگ اپنے انجام سے نہیں ڈرتے کہ اگر یہ بھی ہٹ دھری، ضد اور تکبر سے نبی ﷺ اور قرآن کا انکار کریں گے تو ان پر بھی اللہ سبحانہ کا عذاب آئے گا۔

﴿وَمَنْ يُبَدِّلُ نِعْمَةَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾ (۲۱۱)

پھر فرمایا جو لوگ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کی ناشکری کریں، اس کے احکام کی تافرمانی کریں، جان بوجھ کر ان میں رو بدل کر دیں اور ان سے ہدایت حاصل کرنے کی بجائے گمراہی مول لیں تو ایسے لوگ اللہ سبحانہ کے عذاب کے مستحق ہیں اور ضرور اپنے برے انجام کو پہنچیں گے۔

اس آیت میں آج مسلمانوں کے لیے بھی بڑا سبق ہے جنہوں نے قرآن جیسی عظیم ہدایت کو پس پشت ڈال رکھا ہے جنہوں نے اسلامی اخوت اور بھائی چارے جیسی بابرکت نعمت کو چھوٹی چھوٹی الگ ریاستوں، فرقوں اور پارٹیوں میں بااثر کر ضائع کر دیا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ دنیا میں کمزور، غلام اور ذلیل ہو کر رہ گئے ہیں۔

﴿رُزِّيْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِيْنَ آمَنُوا﴾ (212)

فرمایا کافروں کے لیے یہ دنیا اتنی پیاری اور پرکشش ہے کہ اس نے ان کو آخرت کی دائیٰ زندگی سے غافل کر رکھا ہے۔ وہ اسی کی خاطر جیتے اور عیش و عشرت میں پڑے رہتے ہیں۔ وہ ان اہل ایمان کو حقیر اور بے قوف سمجھ کر ان کا مذاق اڑاتے ہیں جو دنیا کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دیتے ہیں۔ جو دنیا کے عارضی مفاد کی خاطر اپنی عاقبت برآدھیں کرتے۔ جو حلال و حرام کا خیال رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مطابق زہد و قناعت اور توکل علی اللہ کی زندگی بس رکرتے ہیں۔

﴿وَالَّذِيْنَ اتَّقُوا فَوْقَهُمْ يَوْمُ الْقِيْمَةِ﴾ (212)

فرمایا، قیامت کے دن یہی ایمان والے، جن کا آج مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ وہ ان مذاق اڑانے والے کفار سے بہتر پوزیشن میں ہوں گے۔ کافروں کو دوزخ کے عذاب میں ڈالا جائے گا۔ جب کہ اہل ایمان جنت کی بھیشہ دائیٰ نعمتیں

حاصل کریں گے۔

یاد رہے کہ افراد ہوں یا اقوام دنوں کی خرابی کی جڑ ہمیشہ یہی دنیا پرستی رہی ہے خواہ وہ اہل کتاب ہوں یا اہل اسلام۔

﴿وَإِنَّ اللَّهَ يُرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حَسَابٍ﴾ (212)

آخر میں فرمایا کہ اللہ سبحانہ ہی سب کا رازق اور روزی رسائی ہے۔ وہ جسے چاہے بے حساب روزی دیتا ہے۔ دنیا میں آزمائش اور امتحان کے لیے دیتا ہے اور آخرت میں اُس کی جزا اوزارے گا۔

﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعْثَتِ اللَّهُ الْبَيْنَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ﴾ (213)

فرمایا، ابتداء میں لوگ ایک ہی دین پر تھے۔ ایک ہی امت تھی۔ سب ہدایت پر تھے۔ مگر بعد میں انہوں نے خواہش پرستی، ظلم و سرکشی اور آپس کی ضد ضدا کی وجہ سے دین حق کی واضح تعلیمات کی موجودگی میں اختلاف پیدا کر لیا جس سے وہ گمراہ ہو گئے، اور کفر و شرک اور فرقہ بندی میں بٹلا ہو گئے۔

پھر ان کی اصلاح و ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے جنت کی خوبخبری دینے والے اور دوزخ کی آگ سے ڈرانے والے پیغمبر صحیحے شروع کر دیے۔

﴿وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحُكِّمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ﴾ (213)

”اور ان پر کتابیں اور صحیحے نازل کیے تاکہ ان کی روشنی میں لوگوں کے مذہبی اختلافات کا فیصلہ کیا جاسکے، ان کو گمراہی سے بچایا جاسکے اور ان پر اعتماد جلت کر دیا جائے۔“

﴿وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبِيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ أَمْنَوْا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ يَرَدُنَّهُ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطِ مُسْتَقِيمٍ﴾ (213)

پھر باہمی ضد و عناواد سے کچھ لوگ گمراہ رہے لیکن جو حق کے طالب تھے ان کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی دولت سے نوازا۔ ان کے اختلاف ختم کر کے ان کو ہدایت کی سیدھی راہ دکھا دی۔

اللہ تعالیٰ کی یہی سنت اب نبی کریم ﷺ کی بعثت اور قرآن کے نزول کی صورت میں ظاہر ہو چکی ہے۔ جو لوگ اب حق کی پیروی کریں گے اور ایمان لا سیں گے تو اللہ سبحانہ ان کو اپنی ہدایت عطا فرمائے گا۔ مگر جو باہمی ضد، خواہش پرستی، نفس کی پیروی اور فرقہ پرستی کے تعصب میں بٹلارہیں گے وہ اس ہدایت سے محروم رہیں گے۔

اس آیت سے ان لوگوں کے اس غلط فلسفے کی تردید ہو جاتی ہے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انسانیت کی ابتداء گمراہی اور شرک کے ماحول میں ہوئی تھی اور پھر انسان بذریعہ توحید اور ہدایت کی طرف آتا گیا۔ جب کہ قرآن کہتا ہے کہ دنیا کا پہلا انسان ایک پیغمبر تھا جس کا نام آدم علیہ السلام تھا اور انسانیت کا آغاز ہدایت سے ہوا۔ بعد میں شیطان کے وسوسوں کے

سبب سے لوگ شرک و گراہی میں بٹلا ہوئے۔

**أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَاتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا
مِنْ قَبْلِكُمْ مَسْتَهْمُ الْبَاسَاءُ وَ الضَّرَاءُ وَ زُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ
الرَّسُولُ وَ الَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَّىٰ نَصْرُ اللَّهُ إِلَّا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ**

قِرْيَبٌ (۱۷)

”(مسلمانو!) کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ آرام اور مزے سے جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی تم پر وہ حالات نہیں گزرے جن سے پہلے لوگوں کو سابقہ پیش آیا، وہ مالی پریشانیوں میں بٹلا ہوئے، انھیں جسمانی اور میتیں دی گئیں اور خوف و ہراس نے انھیں جھوٹ کر رکھ دیا، یہاں تک کہ وقت کا رسول اور اس کے ایمان والے ساتھی کہنے لگے: اللہ کی مدحکب آئے گی؟ جان لو اللہ کی مدحقریب ہے۔“ (214)

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی تفسیر:

الْبَاسَاءُ:..... اس سے ہر طرح کی مالی اور ماحولیاتی پریشانی مراد ہوتی ہے جیسے تنگ دستی، مال چوری ہو جانا، گھر سے بے گھر ہو جانا وغیرہ۔

الضَّرَاءُ:..... اس سے ہر قسم کی بدنبالی اور جانی تکلیف مراد ہے جیسے، بیماری، درد، زخم اور قتل وغیرہ۔

ذُلْزِلُوا:..... یہ زلزلہ یا زلزال سے ہے جس کے معنی بار بار ہلنے اور جھوٹے جانے کے ہیں۔ زمین کے ہلنے کو بھی زلزلہ کہا جاتا ہے۔ انسانوں کے حوالے سے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ مصیبتوں اور تکلیفوں کی وجہ سے سخت گھبراہٹ کا شکار ہوئے، ان کے دل دل گئے اور کلیچ منہ کو آنے لگے۔ جیسا کہ غزوہ خندق کے موقع پر مسلمانوں کی حالت کو قرآن مجید نے اس طرح بیان کیا ہے:

﴿إِذْ جَاءَهُ وَ كُمْ مِنْ فَوْقَكُمْ وَ مِنْ أَسْفَلَ وَ مِنْ كُمْ وَ إِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَ تَلَاقَتِ الْقُلُوبُ
الْحَنَاجِرَ وَ تَظَنَّوْنَ بِاللَّهِ الظُّنُونَ هُنَالِكَ ابْتَلَى الْمُؤْمِنُونَ وَ زُلْزِلُوا زُلْزِلُوا شَدِيدًا﴾

(الاحزاب: 33: 10، 11)

”یاد کرو جب دشمن تم پر حملہ آور ہوا، تمہارے اوپر کی طرف سے اور تمہارے نیچے کی طرف سے۔ جب آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور کلیچ منہ کو آنے لگے اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ اس وقت مونموں کو سخت امتحان پیش آیا اور وہ بالکل ہلا دیے گئے۔“

﴿أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُ الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثْلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ (214)

اس مقام پر اہل ایمان کو راہ حق کی مشکلات سے آگاہ کیا گیا ہے جس سے وہ اسلام کے ابتدائی دور میں بیٹلا ہوئے تھے۔ فرمایا کہ تم جنت کے طلب گار ہو تو اس راستے میں کچھ مشکل مقامات بھی ہیں۔ اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں۔ بلکہ ایک متنق علیہ حدیث میں ہے کہ جنت تلواروں کے سامنے تلے ہے۔

“وَاعْلَمُوا أَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوفِ”

(صحیح بخاری، رقم: 2965، صحیح مسلم، رقم: 4542)

مطلوب یہ ہے کہ جنت اللہ کی راہ میں جان و مال قربان کرنے سے ملتی ہے۔ یہ سودا اتنا ستانہیں ہے بلکہ مہنگا ہے۔ اس راہ و منزل کے مسافروں کو پہلے بھی سخت اور کڑے امتحانوں میں سے گزرنما پڑا تھا اور تم مسلمانوں کو بھی ان میں سے گزرنما پڑے گا۔ کیونکہ یہی سعدت اللہ ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

﴿مَسْتَهْمُ الْبَاسَاءُ وَالضَّرَاءُ وَ زُلْدُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ أَمْنَوْا مَعَهُ مَثْنَى نَصْرُ اللَّهِ إِلَّا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ﴾ (214)

فرمایا، پہلے دور کے اہل ایمان اور پیغمبروں کو بھی راہ حق میں بڑی مشکلات پیش آئیں۔ نجف دتی، بیماری، جسمانی تکلیفیں اور دل ہلا دینے والے واقعات و حادثات نے ان کو جنجوڑ کر کر دیا تھا۔ یہی حالات اب مسلمانوں کو بھی پیش آئیں گے۔ اس آیت میں لف و نشر غیر مرتب ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ دو الگ الگ تکلم افراد کی طرف سے دو جدا جدا اقوال بیان ہوئے ہیں۔ اب ان اقوال کو ہر تکلم کے مقام و مرتبہ کے لحاظ سے جوڑا جائے گا جو ان کے مناسب حال ہو گا۔ اس میں پہلے قول متی نصر اللہ (اللہ کی مد کب آئے گی؟) کا تعلق اہل ایمان سے ہے اور الہ ان نصر اللہ قریب (جان لو کہ اللہ کی مد قریب ہے) کا تعلق رسولوں سے ہے جن کی طرف سے یہ پہلے سوال کا جواب ہے۔ کیونکہ اہل ایمان کے سوال میں بے بسی کے ساتھ مایوسی کا پہلو بھی کچھ نہیاں ہے۔ اس اسلوب کی مثال اور نظیر سورہ الفتح (48) کی آیات 8، 9 ہیں:

﴿إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ لِتُوْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝﴾ (الفتح: 8,9)

”بے شک ہم نے آپ ﷺ کو حق کی گواہی دینے والا، خوشخبری سنانے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیاں ہے۔ تاکہ تم لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاو۔ اس کی مد کرو، اس کی تعظیم کرو۔ اور صبح و شام اُس کی تسبیح کرو۔“

اس میں مدد اور تعظیم کرنے کا تعلق رسول اللہ ﷺ سے ہے اور صبح و شام تسبیح کرنے کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔ کیونکہ یہ مختلف باتیں ہیں اور ان کو ان کے مناسب حال ہستیوں سے جوڑنا ضروری ہے۔

جب کہ انبیاء کرام مسلم سخت ترین حالات میں بھی صبر و تحمل سے کام لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کسی حال میں بھی مایوس نہیں ہوتے۔ جیسا کہ یعقوب علیہ السلام نے دو سخت آزمائشوں کے موقع پر فَصَبَرْ جَوَيْنُ (یوسف 12:18، 83) فرمایا تھا اور جیسا کہ حضرت محمد ﷺ کی ہجرت کا واقعہ ہے جب غار ثور میں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی پریشانی اور تشویش دیکھ کر حضور ﷺ نے بڑے پڑاعتماد لجھے میں فرمایا:

﴿لَا تَعْزَّزْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾
”غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“

اسی طرح موسیٰ علیہ السلام بھی نہ اُس وقت گھبرائے اور نہ مایوسی کا شکار ہوئے حالانکہ ان کی قوم بنی اسرائیل گھبرا اٹھی تھی جب وہ لوگ مصر سے فلسطین کی طرف ہجرت کر کے جا رہے تھے۔ اُس وقت ان کے پیچھے فرعون کی فوجیں تھیں اور آگے سمندر کی موجودی تھیں۔ اس نازک موقع پر بنی اسرائیل گھبرا کر یوں:

﴿إِنَّا لَمُذَكَّرُونَ﴾
”ہم تو پکڑے گئے۔“

مگر عین اُس وقت موسیٰ علیہ السلام بڑے اطمینان سے فرماتا ہے تھا:

﴿قَالَ كَلَّا طَإِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيِّدِيْنِ﴾
(الشعراء 62:26)

”اُس (موسیٰ) نے کہا: ہرگز نہیں، بے شک میرا رب میرے ساتھ ہے، وہ مجھے ضرور کوئی راستہ بتائے گا۔“

افسوں بعض مفسرین نے اس آیت کے لف و نشر کو نہ سمجھا اور انبیاء کرام ﷺ جیسی عظیم ہستیوں کو بھی بے بسی کی تصویر اور نا امیدی میں بتلا قرار دے دیا۔

مزید تفصیل کے لیے آیت 155 کی تفسیر دیکھ لی جائے۔

يَسْأَلُونَكَ مَا ذَا يَنْفِقُونَ هُنَّ مَا أَنْفَقْتُمُ وَمِنْ خَيْرٍ فَلِلَّهِ الْدَّيْنُ

وَالْأَقْرَبُونَ وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينُ وَابْنُ السَّبِيلِ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ

خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ
۲۱۵

”اے نبی ﷺ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں اللہ کی راہ میں کیا خرچ کریں؟ آپ ﷺ کہیں: تم جو مال خرچ کرو، اس میں حق ہے تمہارے والدین کا، غریب رشتہ داروں کا، قیمتوں کا، مسکینوں کا اور مسافروں کا اور جو بھلائی بھی تم کرتے ہو، اللہ اسے جانتا ہے۔“ (215)

الفاظ کی حقیقیت اور آیت کی تفسیر:

مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ :..... قربیدہ دلیل ہے کہ اس جگہ خیر سے مراد مال ہے۔

﴿ يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ﴾ (215)

یہ سوال اللہ ایمان کی طرف سے کیا گیا تھا کہ وہ اپنا مال کہاں اور کن لوگوں پر خرچ کریں اور اس کے لیے کیا مصارف ہیں۔ یاد رہے یہ سوال نفلی صدقے اور خیرات سے متعلق تھا، زکوٰۃ کے بارے میں نہ تھا کیونکہ اس کے جواب میں نصاب یا مقدار کا ذکر نہیں۔

﴿ قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَإِلَوَالَّدِينِ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ

وَأَئِنَّ السَّبِيلَ ﴾ (215)

یہ اور پر کے سوال کا جواب ہے کہ تمہیں اپنا مال اپنے والدین پر، غریب رشتہ داروں پر، محتاجوں، مسکینوں پر اور ضرورت مند مسافروں پر خرچ کرنا چاہیے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بندے پر اپنے والدین اور عزیز واقارب کا حق سب سے پہلے ہے اور ان کے بعد دوسرے لوگوں کا حق ہے۔ کیونکہ اپنوں کی محتاجی میں عار بھی ہوتی ہے اور غریبوں کی کفالات سے معاشرے میں مالی استحکام پیدا ہوتا ہے۔ خاص طور پر ایسے افراد جو کسی وجہ سے مخدور یا محتاج ہوں، ان کی اجتماعی کفالات نہایت ضروری ہے۔

﴿ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ﴾ (215)

مطلوب یہ ہے کہ اور پر کے بتائے ہوئے مصارف پر تم جو مال خرچ کرو گے، یا کوئی نیکی کا کام جب بھی کرو گے تو اللہ تعالیٰ کی نگاہوں سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ وہ تمہارے سب نیک کاموں سے واقف ہے اور ان کا اجر و ثواب کئی گناہ بڑھا کر دے گا۔

یہی مضمون سورہ البقرہ 2 آیت 158 میں بھی آیا ہے وہاں بھی دیکھ لیا جائے۔

كُتُبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَكُمْ وَعَسَى أَنْ تَكْرُهُوا شَيْئًا وَهُوَ

خَيْرٌ لَكُمْ وَعَسَى أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌ لَكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ

لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢١﴾ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٌ فِيهِ قُلْ قِتَالٌ

فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدٌ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدُ الْحَرَامُ وَ

إِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرٌ عِنْدَ اللَّهِ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرٌ مِنَ القَتْلِ وَلَا

يَذَّلُونَ يُقَاتِلُوكُمْ حَتَّىٰ يَرُدُّوكُمْ عَنِ دِينِكُمْ إِنْ أَسْتَطَاعُوا
وَمَنْ يَرْتَدُ دِينَكُمْ عَنْ دِينِهِ فَإِنَّهُ كَافِرٌ فَأُولَئِكَ حَرَّكْتُ
أَعْمَالَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا
خَلِدُونَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَهَدُوا فِي
سَبِيلِ اللَّهِ أُولَئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ ۲۱۸

(اے مسلمانو!) تم پر جہاد فرض کیا گیا ہے جو تمہیں ناگوار محسوس ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے تمہیں کوئی چیز ناپسند ہو مگر وہ تمہارے لیے بہتر ہو اور ممکن ہے تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لیے بری ہو، اصل حقیقت اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔

(اے نبی ﷺ) لوگ آپ ﷺ سے پوچھتے ہیں حرمت والے ممینے میں لڑنا کیسا ہے؟ آپ ﷺ کہہ دیں اس میں لڑنا بہت برا ہے۔ مگر اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برا یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکا جائے، کفر اخیار کیا جائے، مسجد حرام سے روکا جائے اور وہاں کے رہنے والوں کو نکال باہر کیا جائے۔ یاد رکھو! (کفر اور شرک کا) قتل سے بھی بڑھ کر برا یہ ہے۔

اور (اے مسلمانو!) یہ شرک لوگ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ تمہیں تمہارے دین سے ہٹا دیں، اگر وہ تم پر قابو پائیں۔ لیکن یاد رکھو تم میں سے جو اپنے دین سے پھرے گا اور کفر کی حالت میں مرے گا، اس کے سارے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو جائیں گے۔ ایسے لوگ دوزخی ہوں گے اور ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

گر جو لوگ ایمان لائے، انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، وہ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اللہ بخششے والا ہمیان ہے۔“ (216-218)

آیات کی تفسیر:

﴿كُتْبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهَ لَكُمْ﴾ (216)

مال خرچ کرنے کے حکم کے بعد اب جہاد کا ذکر ہے۔ کیونکہ جہاد میں جان و مال دونوں خرچ ہوتے ہیں۔ فرمایا، تم مسلمانوں پر جہاد و قتال فرض ہے۔ گویا نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی طرح کفار و مشرکین کے خلاف جہاد کرنا بھی فرض ہے۔ بلکہ بعض خاص ہنگامی حالات میں یہ دوسرے تمام دینی فرائض سے بڑھ کر مقدم ہو جاتا ہے اور اس وقت اسے مؤخر

نہیں کیا جاسکتا، جب کہ دوسرے احکام مؤخر ہو سکتے ہیں۔

عام حالات میں جہاد فرض کفایہ ہے۔ مگر جب کوئی دشمن مسلمانوں کے علاقوں پر حملہ کر دے تو پھر یہ فرض عین ہو جاتا ہے۔ اس وقت نفیر عام کی صورت ہو جاتی ہے اور پھر خلیفہ یا حکمران کی اجازت کی شرط بھی ختم ہو جاتی ہے۔

﴿ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ﴾

وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۱۶﴾ (216)

ارشاد ہوا کہ جہاد کی حکمت و اہمیت معلوم نہ ہونے کی وجہ سے تمہیں اس کے بارے میں ابھی کچھ ناگواری سی محسوس ہوتی ہے۔ تم اسے ایک ہولناک شے سمجھتے ہو کیونکہ ابھی تم کمزور ہو، تعداد میں تھوڑے ہو اور جس دشمن سے لڑنا ہے وہ بہت طاقت و رواز تعداد میں بہت زیادہ ہے۔ تمہیں اندریشہ ہے کہ اس میں جان جانے کا بھی خطرہ ہے اور اس میں مالی وسائل بھی خرچ ہوں گے جو تمہیں ابھی بہت کم میسر ہیں۔ پھر اس میں اپنے بیوی بچوں سے جدائی سننی پڑے گی اور سفر کی صعوبتیں اور مشقتیں برداشت کرنی پڑیں گی جو بہر حال پھولوں کی سچ نہیں ہے۔ اس لیے تم جہاد کرنے سے گہراتے ہو۔ مگر تم بھول جاتے ہو کہ جہاد میں تمہارے لیے کتنے فوائد ہیں۔ اسلامی سرحدوں کی حفاظت، دین اسلام کا غالبہ اور اس کی سر بلندی، مالی غنیمت اور غازیوں اور شہیدوں کے لیے بخشش اور جنت کا اجر و ثواب، اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی، یہ سب انعامات تمہیں صرف اور صرف جہاد ہی کے ذریعے حاصل ہو سکتے ہیں۔ ورنہ ترک جہاد کی صورت میں کفار تھارے ملکوں اور علاقوں پر قابض ہو کر تمہیں اپنا غلام بنالیں گے۔ تمہارے ملکی و قومی وسائل پر قبضہ کر لیں گے اور تم غلامی کی ذلت و لعنت میں بٹلا ہو جاؤ گے۔

اس مقام پر یہ حقیقت بھی بتاوی گئی کہ انسان اپنے حقوق و نقصان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا، صرف اللہ سبحانہ ہی جانتا ہے کہ کس بات میں انسان کے لیے فائدہ اور کس میں اس کا نقصان ہے۔ بندے کا کام یہ ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ سبحانہ کے ہر حکم کی پیروی کرے خواہ اس میں اسے بظاہر نقصان نظر آتا ہو۔

صرف اسی صورت میں اسے دنیا اور آخرت کی فلاج و کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

یہ عجیب معاملہ ہے کہ انسانی طبیعت جن باتوں میں زیادہ رغبت اور کشش محسوس کرتی ہے وہ اس کے مقام کو پست کرنے والی ہیں لیکن جو باتیں اس کے نفس پر گراں اور بھاری ہوتی ہیں وہی اس کے درجے کو بلند کرنے والی ہیں۔ عیش و آرام اور کاہلی کی زندگی ہمیں مرغوب اور پسند ہے مگر یہی چیز ہماری شخصیت کو گرانے والی اور ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اپنی روزمرہ زندگی میں بھی ہم کی ناگوار چیزوں کو صرف اس لیے گوارا کر لیتے ہیں کہ اس میں ہمارا فائدہ ہوتا ہے۔ میریض کو کڑوی دوں ناپسند ہے مگر بعض اوقات اس کی محنت یا بی اور شفا کے لیے وہی ضروری ہے۔

﴿ يَسْتَعْوِنُكَ عَنِ الشَّهْرِ الْعَرَاهِ قِتَالٌ فِيهِ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ ﴾ (217)

حرمت والے مہینوں کا کچھ ذکر آیت 194 میں گزر چکا۔ اب جہاد فرض ہونے کی مناسبت سے دوبارہ ان کا ذکر

آگیا کہ ان مہینوں میں جہاد جائز ہے یا نہیں۔

اس آیت کا شان نزول اور پس منظر جیسا کہ تفسیر طبری وغیرہ میں ہے، یہ ہے کہ جمادی الثانی 2 ہجری میں نبی ﷺ نے عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ (اپنے پھوپھی زاد بھائی) کی کمان میں آٹھ (8) مہاجرین صحابہ کا ایک دستے خلہ (کے) اور طائف کے درمیان ایک مقام کی طرف بھیجا تاکہ کفار قریش کی نقل و حرکت کا پتہ چالایا جاسکے۔ کیونکہ ان کی طرف سے مدینے پر چڑھائی کا ہر وقت خطرہ رہتا تھا۔ اس دستے کو کافروں کے چار عزر افراد کا ایک مختصر تجارتی قافلہ مل گیا جس پر انہوں نے حملہ کر دیا۔ ان میں سے ایک شخص جس کا نام عمرو بن حضری تھا، اُس کو قتل کیا، دو کو قیدی بنا لیا، جب کہ چوتھا بھاگ نکلا۔ پھر جب یہ صحابہ کرام دو قیدیوں سمیت مال غنیمت لے کر مدینے پہنچنے تو نبی ﷺ نے ناراض ہو کر فرمایا "میں نے تمہیں دشمن کے حالات معلوم کرنے کے لیے بھیجا تھا، نہ کہ حرمت والے مہینے میں لڑنے کے لیے۔" پھر آپ ﷺ نے مال غنیمت لینے سے انکار کر دیا۔ چونکہ یہ واقعہ حرمت والے مہینے رب جن (22) کی پہلی تاریخ کو پیش آیا جب کہ مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ آج 30 جمادی الثانی ہے۔ بعد میں صورت حال واضح ہونے پر وہ شرمسار بھی ہوئے۔ مگر اس واقعے سے کفار مکہ کو مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کا موقع ہاتھ آگیا کہ یہ کیسے دین دار لوگ ہیں جو حرمت والے مہینوں کا احتراام نہیں کرتے، جب کہ اس میں لڑائی کرنا منع ہے۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی جس کے بعد نبی ﷺ نے اس مال غنیمت میں سے پانچواں حصہ بھی قبول فرمایا اور باقی مال اسی دستے کے مجاہدین میں تقسیم کر دیا۔

یہی واقعہ آگے چل کر جنگ بدر کا سبب اور پیش خیمه بن گیا۔

﴿ وَ صَدَّ عَنْ سَيِّئِ الْلَّهِ وَ كُفْرِهِ وَ كُفْرِ أَهْلِهِ وَ الْمُسْجِدِ الْحَرَامِ وَ إِخْرَاجِ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ ﴾ (217)

ارشاد ہوا کہ حرمت والے مہینے میں جنگ کرنا اگرچہ بڑی سکین بات ہے مگر اللہ کی راہ یعنی دین اسلام سے لوگوں کو روکنا، کفر میں بٹلا رہنا، مسجد حرام یعنی خانہ کعبہ میں عمرے، حج اور عبادت سے منع کرنا، وہاں کے مسلمان باشندوں کو گروں سے نکال کر بھرت پر مجبور کرنا..... ایسے گناہ اور جرائم ہیں جو کسی حرمت والے مہینے میں جنگ کرنے کے گناہ سے بڑھ کر شدید اور گھناؤ نے ہیں۔ اس لیے ان شدید اور گھناؤ نے جرائم کو روکنے کے لیے اگر حرمت والے مہینوں میں بھی جنگ کرنی پڑے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ بلکہ یہ عین جہاد ہو گا۔

﴿ وَ الْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ القَتْلِ ﴾ (217)

فرمایا فتنہ قتل سے بھی بڑھ کر گناہ ہے۔ لفظ فتنہ کی وضاحت اس سے پہلے آیت 191 میں گزر چکی ہے۔ اس سے وہ ظلم و تم مراد ہیں جو قریش مکہ کی طرف سے مسلمانوں کو دین اسلام سے ہٹانے کے لیے روا رکھا گیا۔ یہ کفر و شرک کے نتیجے کی حالت یہے جس کے خاتمے کے لیے اسلام میں جہاد فرض کیا گیا ہے۔

﴿وَلَا يَذَّلُونَ يَقَاتِلُوكُمْ حَتَّىٰ يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ إِنْ أَسْتَطَاعُواۚ﴾ (217)
اب مسلمانوں کو مناطب کر کے ان کو بتایا گیا کہ کفار و مشرکین اُس وقت تک چین سے نہیں بھیسیں گے اور تمہارے خلاف ہر وقت جنگ چھیڑتے رہیں گے جب تک وہ تمہیں تمہارے دین سے نہ پھیر دیں اور تم اسلام چھوڑ کر کفر و مشرک اختیار نہ کرو۔ یعنی باطل کی کشمکش اور جنگ ہے جو ہمیشہ سے چلی آرہی ہے اور ہمیشہ جاری رہے گی۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز

چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہی

﴿وَمَنْ يَرْتَدُ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهِ فَيَمُوتُ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَئِكَ حَرَثُتُ أَعْمَالَهُمْ

فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَلِدُونَ﴾ (217)

فرمایا، اگر کوئی مسلمان کفار کے دباؤ میں آ کر اپنا دین چھوڑ کر مرتد ہو جائے گا اور پھر کفر کی حالت میں مر جائے گا تو ایسے لوگ یاد رکھیں کہ ان کے تمام اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو جائیں گے۔ ان کا ٹھکانہ دوزخ ہو گا جس میں وہ ہمیشہ عذاب میں بدل رہیں گے۔

اسلامی شریعت میں ارماد یعنی مرتد ہونا سخت جرم ہے جس کی سزا قتل ہے اور جو صحیح احادیث، تعامل صحابہ اور ائمہ امت سے ثابت ہے۔

مرتد کی سزا کے بارے میں اب ہم تفصیل سے گفتگو کریں گے کیونکہ منکرین حدیث اور بعض مغرب زدہ لوگوں نے اس بارے میں کئی غلط فہمیاں پھیلا رکھی ہیں۔

صحیح احادیث:

نبی کریم ﷺ کے جن مستند فرائیں کی بنا پر علمائے امت کا مرتد کی سزا قتل ہونے پر اجماع ہے، وہ درج ذیل ہیں:
1۔ صحیح بخاری میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

((مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهُ فَاقْتُلُوهُ)) (صحیح بخاری، رقم: 6922)

”بُجُون (مسلمان) اپنا دین بدل دے، اسے قتل کر دو۔“

ای مضمون کی کچھ احادیث بعض جلیل القدر صحابہ کرام: سیدنا ابو بکر صدیق، سیدنا علی، سیدنا ابو موسیٰ الشعرا، سیدنا خالد بن ولید اور سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہیں۔

مذکورہ حدیث صحیح بخاری کے علاوہ سنن ابو داؤد، سنن ابی ماجد اور موسیٰ طا امام مالک میں بھی موجود ہے۔

2۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ایک متفق علیہ حدیث ہے کہ:

((عَنْ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: لَا يَرْجِلُ دُمُّ امْرِيَءٍ مُسْلِمٍ يَشَهُدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا

اللَّهُ، وَلَا يَرْسُلُ اللَّهُ إِلَّا بِإِحْدَى ثَلَاثَةِ النَّفْسِ، وَالشَّيْبُ الزَّانِيُّ، وَالْمُفَارِقُ

(صحیح بخاری، رقم : 2878) لِدِینِهِ التَّارِثُ لِلْجَمَاعَةِ))

”سیدنا عبد اللہ (بن مسعود رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی مسلمان کا خون بہانا جائز نہیں جو یہ گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں، سوائے تین صورتوں کے: ایک یہ کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو، دوسرا یہ کہ وہ شادی شدہ زافی ہو اور تیسرا یہ کہ وہ اپنادین چھوڑ کر (مسلمانوں کی) جماعت سے الگ ہو جائے۔“

یہ حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے علاوہ سنن ابو داؤد، جامع ترمذی، سنن ناسی، سنن ابن ماجہ، سنن داری اور منہد احمد بن حنبل میں بھی موجود ہے اور اسے سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے علاوہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے بھی روایت کیا ہے۔ اس حدیث سے بھی مرتد کے لیے قتل کی سزا ثابت ہوتی ہے۔

3۔ سنن البی داؤد کی حدیث ہے کہ:

((عَنْ أَبِي أُمَّامَةَ بْنِ سَهْلٍ قَالَ كُنَّا مَعَ عُثْمَانَ وَهُوَ مَحْصُورٌ فِي الدَّارِ وَكَانَ فِي الدَّارِ مَذْخَلٌ مِنْ دَخْلَهُ سَمِعَ كَلَامًا مِنْ عَلَى الْبَلَاطِ . فَدَخَلَهُ عُثْمَانُ فَخَرَجَ إِلَيْنَا وَهُوَ مُتَعَرِّبٌ لَوْنَهُ فَقَالَ إِنَّهُمْ لَيَتَوَاعِدُونَنِي بِالْفَتْلِ آتَنَا . قَالَ فَلَمَّا كَيْفَيْكُمُ اللَّهُ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ . قَالَ وَلَمْ يَقْتُلُنَّنِي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ لَا يَحِلُّ دَمُ امْرِئٍ مُسْلِيمٍ إِلَّا يَأْخُدَ ثَلَاثَةَ كُفُرٍ بَعْدَ إِسْلَامٍ أَوْ زِنَاءَ بَعْدَ إِحْصَانٍ أَوْ قَتْلُ نَفْسٍ بِغَيْرِ نَفْسٍ . فَوَاللَّهِ مَا زَنَيتُ فِي جَاهِلِيَّةٍ وَلَا فِي إِسْلَامٍ قَطُّ وَلَا أَحْبَبْتُ أَنْ لِي بِدِينِي بَدْلًا مُنْدُ هَدَانِيَ اللَّهُ وَلَا قَاتَلْتُ نَفْسًا قِيمَ يَقْتُلُنَّنِي)) (ابی داؤد، رقم : 4502)

”سیدنا ابو امامہ بن سہل رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں اور دوسرے لوگ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس موجود تھے، جب وہ اپنے گھر میں محصور تھے۔ اس گھر کا ایک راستہ تھا، جس کے اندر کھڑا آدمی گھر کی بالکوں پر کھڑے لوگوں کی بات آسانی سے سن سکتا تھا۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ وہاں تشریف لائے، ان کے چہرے کارنگ بدلا ہوا تھا۔ وہ باہر نکلے اور فرمایا: ابھی یہ لوگ مجھے قتل کر دینے کی دھمکی دے رہے تھے۔ ہم نے عرض کیا: اے امیر المؤمنین! ان کے مقابلے میں اللہ آپ کے لیے کافی ہے۔ پھر فرمایا: یہ لوگ مجھے کیوں قتل کر دینا چاہتے ہیں؟ جب کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ کسی مسلمان کا خون حلال نہیں، سوائے اس کے کہ تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت ہو۔ وہ اسلام لانے کے بعد کفر اختیار کرے۔ (مرتد ہو جائے) یا شادی کے بعد زنا کرے، یا کسی کو ناحق قتل کروے۔ اللہ کی قسم! میں نہ تو جاہلیت میں زنا کا مرتكب ہوا اور نہ اسلام لانے کے بعد۔ دوسرے یہ کہ میں نے اپنادین بدلنا کبھی پسند نہیں کیا جب سے اللہ نے مجھے ہدایت عطا فرمائی ہے۔ تیسرا یہ کہ میں نے کسی کو ناحق قتل بھی نہیں کیا۔ پھر یہ لوگ کس بنا پر

مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں؟“

ذکورہ بالصحیح احادیث سے یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام میں مرتد شخص واجب القتل ہوتا ہے۔ چنانچہ انہی احادیث صحیح کی بنا پر تمام فقهاء اسلام کا اس پر اجماع ہے کہ اسلامی شریعت میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ کتب احادیث (جن میں صحیح بخاری بھی شامل ہے) اور معتبر کتب تاریخ سے ثابت ہے کہ چاروں خلفائے راشدین نے اپنے اپنے دورِ خلافت میں مرتدین کو ہمیشہ قتل کی سزا دی۔ طوالت کے اندیشے سے ہم یہاں ان واقعات کی تفصیل نہیں دے رہے۔

اسی طرح خلفائے بنو امية اور خلفائے بنو عباس نے بھی مرتد پر سزاۓ قتل نافذ کی۔

اجماع امت:

اممہ مجتہدین کا بھی اس پر اتفاق ہے کہ مرتد کی سزا قتل ہے اور اس پر اجماع امت ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہی ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل حوالے ملاحظہ ہوں:

1۔ ائمہ اربعہ رضی اللہ عنہم کے فقہی مسائل پر مبنی کتاب ”الفقه علی المذاہب الاربعة“ (از عبد الرحمن جزیری) میں ہے کہ:

((وأتفق الأئمة الأربعية عليهم رحمة الله تعالى على أن من ثبت ارتداده عن الإسلام
— والعياذ بالله — وجب قتله، وأهدر دمه .))

(الفقه علی المذاہب الاربعة، جلد ۵، صفحہ 423)

”ائمہ اربعہ رضی اللہ عنہم کا اس پر اتفاق ہے کہ جو شخص اسلام سے پھر جائے اللہ چاہے اس کا قتل واجب ہے اور اس کا خون بہانا جائز ہے۔“

2۔ اسلامی فقہ کے اجماعی مسائل پر مشتمل انساکیو پیڈیا ”موسوعۃ الاجماع“ میں ہے کہ مرتد کا خون بہانا جائز ہے: ((اتفقوا على أن من كان رجلا مسلماً حرّا ثم ارتد إلى دين كفر أنه حل دمه .)) (موسوعۃ الاجماع جلد اول، ص 436)

”اس پر تمام فقهاء اسلام کا اتفاق ہے کہ آزاد مسلمان مردم مرتد ہو جائے تو اس کا خون بہانا جائز ہے۔“

3۔ اسلامی فقہ کی مشہور کتاب الفقه الاسلامی و ادله میں ذاکر وہ بہذیلی بھی احکام المرتد کے تحت مرتد کی سزا قتل ہونے پر اجماع امت نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

((اتفق العلماء على وجوب قتل المرتد لقوله ﷺ: ”من بدّل دينه فاقتلوه.“

وقوله ﷺ: ”لا يحل دم امرئ مسلم إلا بإحدى ثلات: الشيب الزاني، والنفس بالنفس، والتارك لدینه المفارق للجماعة.“ وأجمع أهل العلم على وجوب قتل

(المرتد۔))

(الفقه الاسلامی و ادلته، جلد 6، صفحہ 186)

”علا کا اس پر اتفاق ہے کہ مرتد کا قتل واجب ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ جو مسلمان اپنا دین بدل لے، اسے قتل کرو۔ نیز آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ کسی مسلمان شخص کا خون حلال اور مباح نہیں ہوتا مگر تین صورتوں میں: ایک یہ کہ وہ شادی شدہ زانی ہو، دوسرا یہ کہ وہ کسی جان کا قاتل ہو اور تیسرا یہ کہ وہ دین کو چھوڑ دے، یعنی مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہو جائے اور اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ مرتد واجب القتل ہے۔“

مذکورہ بالا شرعی دلائل کی تفصیل سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی شریعت میں مرتد کی سزا قتل ہے اور اس پر اجماع امت ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے:

مرتد کو مزائے موت دین کے سلسلے میں نہیں دی جاتی بلکہ اسے ایک سیاسی غداری کی سزا دی جاتی ہے۔ دنیا کی کوئی حکومت غداری کرنے والے کو معاف نہیں کرتی۔ اسلام میں چونکہ سیاست اور دین میں کوئی دوئی نہیں۔ اس لیے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ شخص دین سے انحراف کی سزا ہے۔ ہم کسی کو اسلام میں داخل ہونے اور اسلامی امت کا رکن بننے کے لیے جر نہیں کرتے لیکن جب وہ مسلمان ہونے کے بعد اس اجتماعی نظام سے بغاوت کرتا ہے تو اس کو دنیا کے عام سیاسی قواعد اور سیاسی ضرورتوں کے تحت غداری کی سزا دی جاتی ہے۔ (ڈاکٹر محمد حمید اللہ رحمۃ اللہ علیہ ”خطبات بہاولپور“ ص 333)

مرتد کے لیے سزاۓ قتل کے عقلی دلائل:

اب تک ہم نے ایسے شرعی دلائل پیش کر دیے ہیں جن سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلامی شریعت میں مرتد کی سزا قتل ہے اور اس کی بنیاد احادیث صحیح، تعامل صحابہؓ اور اجماع امت پر ہے۔ ان شرعی دلائل کو جان لینے کے بعد ایک صاحب ایمان کا دل تو مطمئن ہو جاتا ہے کہ اسلام میں ارتدا کی بھی سزا ہے۔ مگر کیا کیجیے، آج کل بہت سے اہل ایمان کے دلوں کو کسی شرعی حکم کے بارے میں محض شرعی دلائل سے اطمینان حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کے علاوہ عقلي دلائل بھی چاہتے ہیں تاکہ انھیں شرح صدر حاصل ہو۔ اس لیے ہم ذیل میں مرتد کی سزاۓ قتل کے بارے میں چند عقلي دلائل بھی پیش کرتے ہیں:

- 1۔ سب سے پہلے یہ حقیقت پیش نظر رکھنی ضروری ہے کہ اسلام دوسرے مذاہب کی طرح کا کوئی ایسا نہ ہب نہیں ہے جو انسانی زندگی کا محض ایک جزو یا ضمیمہ بن کر رہے اور جو ہر شخص کا ایک ذاتی اور خجی معاملہ (Private Matter) ہو۔ وہ کوئی لباس بھی نہیں جسے کوئی شخص آج پسند کر کے پہنے اور کل اُسے ناپسند کر کے اپنے جسم سے اٹا رکھنکے۔ وہ دراصل ایک دین اور ایک نظام زندگی ہے۔ ایک مکمل ضابطہ حیات (Code of Life) ہے۔ وہ انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر محیط ایک منظم معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ عبادت، معاشرت، معیشت،

سیاست اور اخلاق، غرض انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے، وہ ایک ایسی منظم و منضبط ریاست (Disciplined State) کی تشكیل کا خواہاں ہے جس کا ہر شہری اس کے جملہ احکام و قوانین کی پابندی کرے اور ان کی خلاف ورزی سے باز رہے۔

اب اگر اسلامی ریاست کا کوئی شہری اس کے کسی قانون کو توڑتا ہے تو وہ اپنے شہری کو اپنے قانون کے مطابق سزا دینے میں حق بجانب ہے۔ جب کوئی مسلمان شہری مرتد ہو جائے گا تو اسلامی ریاست ایسے شخص کو ارتداد (Apostasy) کے جرم کا ارتکاب کرنے پر موت کی سزا دے گی۔ یہ اسلامی ریاست کا قانون ہے اور دنیا کی دوسری ریاستوں کی طرح وہ بھی اپنے قانون کے نفاذ کا اختیار رکھتی ہے۔

2۔ اسلام نے اپنے دائرے میں داخل نہ ہونے والوں اور اس میں داخل ہو کر نکل جانے والوں میں فرق کیا ہے۔ وہ پہلے گروہ کو ”کفار“ اور دوسرے کو ”مرتدین“ کہتا ہے۔ وہ پہلے گروہ کو برداشت کرتا اور کچھ حقوق بھی دیتا ہے، مگر دوسرے گروہ کو برداشت نہیں کرتا اور اسے ہر حق سے محروم رکھتا ہے۔ پہلا گروہ بیگانوں کا ہے اور دوسرا بے وفا بیگانوں کا۔ اسے بیگانوں کی بے مرمتی پر کوئی شکوہ نہیں، مگر اپنوں کی بے وفا اسے گوار نہیں۔ وہ بیگانوں سے محتاط رہتا ہے اور ان کو اپنا رازداری نہیں بناتا۔ اس لیے بیگانے اسے زیادہ نقصان بھی نہیں پہنچاسکتے۔ مگر اپنوں سے اس کی رازداری ہے۔ جن کے چھوڑ جانے سے اس کا دل کرڑھتا ہے اور ان کی طرف سے اسے بہت زیادہ نقصان پہنچنے کا اندریشہ لاحق ہو جاتا ہے کہ کہیں وہ سازش کر کے اسے کسی بڑے خطرے سے دوچار نہ کر دیں، کیوں کہ ”گھر کا بھیدی لنکاڑھائے“ ہے۔

مرتد کا معاملہ اسی دوسری قسم سے متعلق ہے، وہ اسلام کا رازدار ہوتا ہے۔ جب وہ ارتداد کا مرتكب ہو کر دین اسلام سے الگ ہوتا ہے تو اپنے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت اور دشمنی کے جذبات لیے ہوئے اہل کفر کی صفت میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے یہ متفق جذبات کفار کی طرف سے اسلام اور اسلامی ریاست کے خلاف کسی بڑے خطرے اور سازش کا پیش خیمہ بن سکتے ہیں، جس کے اسداد کے لیے اسلام نے مرتد کو موت کی سزا مانی ہے۔

3۔ اسلام نے دنیا کے سامنے سوا چودہ سو برس پیشتر سے یہ اعلان کر رکھا ہے کہ اس کے دائرے میں داخل ہونے یا نہ ہونے کی ہر شخص کو محلی آزادی حاصل ہے۔ اس کے لیے کسی کو مجبور نہیں کیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ﴾
(البقرہ: 256)

”دنیا (اسلام قبول کرنے) میں کوئی زبردستی نہیں۔“

لیکن اس دائرے میں داخل ہونے کے بعد اس سے باہر نکلنے پر پابندی عائد ہے اور جو کوئی اس پابندی کو توڑے گا اسے موت کے گھاث آثارا جائے گا۔

اب اگر کوئی شخص اسلام کا یہ اعلان سن لینے کے بعد اپنی آزاد مرضی سے اس کے دائرے میں داخل ہوتا ہے۔ پھر اپنی آزاد مرضی کے ساتھ اس سے باہر نکلے پر عائد پابندی کو توڑتا ہے اور پھر اپنی اس حرکت پر اپنے کی سزا پاتا ہے تو بتائیے اس میں اسلام کا کیا قصور ہے؟

4۔ ارتادو اسلام کے خلاف سازش کا ذریعہ بھی بنایا جاسکتا ہے اور مدینے کے یہودیوں نے مسلمانوں کے خلاف یہ ہتھیار فی الواقع استعمال بھی کیا تھا، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے کہ:

﴿وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أَمْنُوا بِاللَّذِي أُنزِلَ عَلَى النَّبِيِّ أَمْنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَأَكْفُرُوا أَخِرَّهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾ (آل عمران: 72)

”اہل کتاب کا ایک گروہ (اپنے لوگوں سے) کہتا ہے: تم جا کر صبح کو اس (دین) پر ایمان لے آؤ جو مسلمانوں پر اُترتا ہے اور پھر شام کو انکار کر دو تاکہ اس طرح اور (مسلمان) بھی (اپنے دین سے) پھر جائیں۔“

اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہودیوں نے یہ سازش کی تھی کہ اپنے ہاں کے کچھ پڑھے لکھے معتبر لوگوں کو مسلمانوں کی جماعت میں شامل کیا جائے، وہ ظاہرہ دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ پھر جلد ہی اسلام کو چھوڑ کر اس سے بیزاری کا انتہا رکریں۔ اس کی ”خرابیاں“ دوسرے لوگوں تک پہنچائیں، اس طرح مسلمانوں بالخصوص نو مسلموں کا ایمان کمزور اور مجزل کیا جاسکے اور وہ اسلام سے برگشتہ ہو جائیں کہ جب پڑھے لکھے معقول حفظات بھی اسلام کے قریب جا کر اس سے بدک جاتے ہیں تو ضرور اس دین میں کچھ خرابیاں ہیں۔ اس کے علاوہ اس طریقے سے عام لوگوں میں اسلام اور اہل اسلام کے لیے کوئی کشش اور ترغیب باقی نہ رہے گی۔ اگرچہ یہودیوں کی یہ سازش بوجوہ ناکام رہی، تاہم آج بھی ارتادو کی کسی سازش کے ذریعے کمزور ایمان والے مسلمانوں کے لیے کسی مقام پر بھی کوئی قتنہ کھڑا کیا جاسکتا ہے۔

5۔ آج کی مہذب ریاستوں کے عام قانون کی رو سے کسی شخص کو فوجی ملازمت اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ مگر جب کوئی شخص اپنی مرضی سے فوجی ملازمت اختیار کر لیتا ہے تو اُسے ایک خاص مدت سے پہلے نوکری چھوڑنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اگر وہ اپنی مرضی سے وقت سے پہلے نوکری چھوڑ دے تو اسے مجرم قرار دیا جاتا ہے۔ اس کا کورٹ مارشل کر کے اسے سزا دی جاتی ہے اور اگر وہ مفرور (Deserter) ہو جائے تو اسے سزا موت کا محتق بھی قرار دیا جاتا ہے۔

آخر ایسا کیوں ہے اور اس عالمگیر قانون پر اعتراض کیوں نہیں کیا جاتا؟

اس لیے کہ فوج بھیزوں کا گلہ نہیں ہوتا، وہ ایک مقتلم ادارہ ہوتا ہے۔ وہ اجتماعی ذمہ داریوں کا ایسا نظام ہے جو ظم و ضبط (Discipline) کی سختی کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ سول (Civil) میں جن کاموں کو بالکل معمولی سمجھ کر ان سے اعیاض کیا جاتا ہے، وہی کام فوج میں جرائم قرار پاتے ہیں۔ وقت پر جماعت نہ بنوانا، اپنے بوٹ پاش نہ

کرنا، ان کے لئے نہ باندھنا، وقت پر کھانا نہ کھانا، اپنا بستر درست نہ رکھنا، سول (Civil) میں کوئی جرائم نہیں مگر یہی کام فوج میں جرائم شمار ہوتے ہیں۔

بالکل یہی معاملہ اسلامی ریاست کا ہے، وہ بھی کوئی بکریوں کا ریوڑنیں ہوتی کہ جس بکری کا جب جی چاہا ریوڑ سے الگ ہو گئی اور جب چاہا اس میں پھر شامل ہو گئی۔ اسلامی ریاست ایک خدائی فوج (حرب اللہ) ہے۔ جس کے نظم و ضبط میں عام فوجی نظم و ضبط سے بڑھ کر سختی اور پابندی ہے۔ عام فوج کے لیے چونیں گھنٹوں میں صرف دو دفعہ حاضری ہے، مگر اسلامی معاشرے کے مردوں کو پانچ وقت مسجد میں حاضری دینی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک اسلامی ریاست ارتدا دکو جرم قرار دیتی اور مرتد کو سخت ترین سزا دیتی ہے تاکہ اس کا اندر ورنی نظم و ضبط قائم رہے۔ وہ ایک مرتد کو سزادے کر اسی طرح اپنے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کے ایمان کا تحفظ کرتی ہے جس طرح کسی قاتل کو سزادے کر پورے معاشرے کی زندگی کو تحفظ دیا جاتا ہے۔ لہذا اسلامی ریاست کے اس نظم و ضبط کی سختی پر اعتراض کرنے والوں کو پہلے اپنے ہاں کے فوجی نظم و ضبط کی سختی پر غور کر لیتا چاہیے اور اپنے گریبان میں بھی جھاںک لینا چاہیے۔

⦿ اس مقام پر بعض لوگ یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ جب کوئی مرتد مسلح ہو کر بغاوت کرے تو صرف اسی صورت میں وہ واجب القتل ہو سکتا ہے اور اگر وہ اسلامی ریاست کے خلاف مسلح جدوجہد اور بغاوت نہ کرے تو اسے قتل کی سزا نہیں دی جاسکتی۔

اس اعتراض کا شرعی جواب تو یہ ہے کہ جن احادیث صحیح کی بنیاد پر مرتد کے واجب القتل ہونے پر اجماع ہے، ان احادیث میں یہ بات مذکور نہیں ہے کہ مرتد جب تک مسلح بغاوت نہ کرے، اُسے قتل نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ ان احادیث میں مرتد کے محض مرتد ہونے پر اس کے لیے قتل کی سزا کا ذکر آیا ہے۔

اور اس اعتراض کا عقلی جواب یہ ہے کہ جس طرح دنیا بھر میں کسی مغروف فوجی کو محض مغروف ہو جانے پر فوجی قانون کی رو سے موت کی سزا کا مستوجب قرار دیا جاتا ہے اور اسے یہ سزا دینے کے لیے اُس کی طرف سے مسلح بغاوت ہونا کوئی شرط نہیں، بالکل اسی طرح ایک اسلامی ریاست بھی اپنے شرعی قانون کے مطابق مرتد کو، اُس کی طرف سے مسلح بغاوت کیے بغیر بھی موت کی سزادے سکتی ہے۔

فَإِنَّ الَّذِينَ أَهْمَوْا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَئِكَ يَرَجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿218﴾

کفار و مشرکین اور مرتدین کے بعد اب اللہ سبحانہ کے نیک بندوں کا ذکر ہے جو ایمان لائے، انہوں نے بھرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ ایسے لوگ ہی اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے فضل و کرم کی توقع رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بھی ان لوگوں کو دنیا اور آخرت کی بھلائی اور فلاح سے نوازے گا۔

آخر میں فرمایا کہ جو بندہ اپنے گناہوں سے توبہ کر لے اور اللہ تعالیٰ سے بخشش اور مغفرت کی دعا مانگے تو اللہ تعالیٰ

اسے بخش دیتا ہے کیونکہ وہ بخشنے والا مہربان ہے۔

يَسْعَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِنَّمَا كَيْرُ وَ مَنَافِعُ
لِلنَّاسِ وَ إِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا وَ يَسْعَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ
قُلِ الْعَفْوُ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ^(۱۹)
فِي الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ وَ يَسْعَلُونَكَ عَنِ الْيَتَمِ قُلْ إِصْلَاحُ لَهُمْ خَيْرٌ
وَ إِنْ تُخَالِطُهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ وَ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ وَ لَوْ

شَاءَ اللَّهُ لَا عَنْتَكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ^(۲۰)

”(اے نبی ﷺ!) لوگ آپ ﷺ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ ﷺ کہہ دیں: ان دونوں چیزوں میں بڑا گناہ ہے۔ ابھی بعض لوگوں کا مفاد ان سے وابستہ ہے، مگر ان دونوں کا گناہ ان کے ساتھ وابستہ مفاد سے بڑھ کر ہے۔

(اے نبی ﷺ) لوگ آپ ﷺ سے پوچھتے ہیں اللہ کی راہ میں کیا خرچ کریں؟ آپ ﷺ کہہ دیں: جو ضرورت سے زائد ہو۔ اس طرح اللہ تمہارے لیے اپنے احکام و ضاحت سے بیان کرتا ہے تاکہ تم غور و فکر کرو، دنیا اور آخرت کے معاملات میں۔

(اے نبی ﷺ) لوگ آپ ﷺ سے تیہوں کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیں جس میں ان کا بھلا ہو، وہ کرنا بہتر ہے۔ اگر تم ان کو اپنے ساتھ شامل کرلو، تو وہ تمہارے بھائی ہیں۔ اللہ خوب جانتا ہے کون ان کا خیر خواہ ہے اور کون بد خواہ۔ اللہ چاہتا تو اس بارے میں تمہیں مشقت میں ڈال دیتا۔ بے شک اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔“ (219-220)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

الْخَمْرُ:..... اس کے معنی شراب کے ہیں۔ خَمَرَ الشَّيْءَ کے معنی ہیں کسی چیز کو ڈھانپ دینا، یا اس پر پردہ ڈال دینا۔ اسی سے خُمار ہے جس کے معنی اوڑھنی یا دوپٹے کے ہیں جس سے جسم کو ڈھانپا جاتا ہے۔ شراب کو خراں لیے کہتے ہیں کہ یہ عقل کو ڈھانپ لیتی ہے اور اس پر پردہ ڈال دیتی ہے۔

الْمَيْسِرُ: اس کے معنی جوئے کے ہیں۔ یہ یُسْرُ سے بنا ہے جس کے معنی آسانی کے ہیں۔ جوچے کو اس لیے میسیر کیا جاتا ہے کہ اس میں بغیر زحم و مشقت کے آسانی سے مال حاصل ہو جاتا ہے۔

لَا عَنْتَكُمْ: (وہ ضرور تمہیں مشقت میں ڈالتا) یہ اللعنت سے بنا ہے جس کے معنی زحمت، مشقت اور بھاری کام کے ہیں۔ اسی سے باب افعال اعنت یعنی اعنتا ہے جس کے معنی کسی کو زحمت دینے، اسے مشقت میں ڈالنے اور اس سے بھاری کام لینے کے ہیں۔

﴿يَسْأَلُونَكُمْ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَ مَنَافِعٌ لِلنَّاسِ وَ إِشْهَمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا﴾ (219)

فرمایا گیا جو لوگ شراب اور جوئے کے بارے میں شرعی حکم پوچھتے ہیں ان کو جواب دیا جائے کہ یہ دونوں کام کبیرہ گناہ ہیں۔ البتہ ابھی کچھ لوگوں کا تجارتی مفاد یا وقتنی مفاد ان سے وابستہ ہے۔ مگر ان دونوں کا گناہ ان کے وقت فائدے سے بڑھ کر ہے۔

شراب اور جوئے کے بارے میں یہ ابتدائی حکم ہے۔ اس کے بعد سورۃ النساء میں یہ حکم آیا کہ:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرُبُوا الصَّلَاةَ وَ أَنْتُمْ سُكْرٍ﴾ (النساء 4: 43)

”اے ایمان والوائے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔“

اور آخر میں سورۃ المائدہ میں ان کو منوع اور حرام قرار دیا گیا۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْأَنْصَابُ وَ الْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَنِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۝ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَنُ أَنْ يُوقَعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ وَ يَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَ عَنِ الصَّلَاةِ۝ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ﴾ (المائدہ 5: 90، 91)

”اے ایمان والو اشраб، جوا، بتوں کے آستانے اور تیروں سے فال لینا، سب گندے کام میں شیطان کے، ان سے بچوتا کہ تم فلاح پاؤ۔ شیطان تو چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان دشمنی اور بغضہ ڈال دے اور تمہیں اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے۔ تو کیا تم ان برے کاموں سے بازیں آؤ گے۔“

اس مقام پر بعض لوگوں کو شہرہ ہوتا ہے کہ قرآن نے شراب اور جوئے کے نقصانات کے ساتھ ان کے بعض فوائد کو بھی تسلیم کیا ہے۔ مگر یہ شبہ کی لحاظ سے غلط ہے۔

1- اس جگہ نفع کے مقابلے میں ضرر (نقصان) کا ذکر نہیں آیا بلکہ اُنہم یعنی گناہ کا لفظ آیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ قرآن کا مقصد ان کے فائدے اور نقصان کا موازنہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ حقیقت بتانا ہے کہ ان کا وقت فائدہ اپنی جگہ مگر ان

میں گناہ بہت زیادہ ہے۔

2۔ اس مقام پر مَنَافِعُ لِلنَّاسِ (لوگوں کے لیے فائدے) کے الفاظ سے ان وقتی اور عارضی فائدوں کی طرف اشارہ ہے جو شراب نوشی اور جوئے بازی سے وابستہ ہو گئے تھے۔

عربوں میں دستور تھا شراب پینے کے بعد اور جواری ہوا جیتنے کے بعد اپنے مال میں سے بہت سخاوت کرتے تھے جس سے غریبوں کو فائدہ پہنچتا تھا۔ لیکن ظاہر ہے ان فوائد کے مقابل میں جوان دونوں کے ذریعے سے اخلاقی خرابیاں معاشرے میں پھیلتی ہیں ان کا گناہ کہیں بڑھ کر ہے۔

3۔ قرآنی احکام میں جو تدریجی اصول ہے، اس آیت کا حکم اس کی ایک مثال ہے جس سے معاشرے کی اصلاح و ترتیب مرحلہ وار کی جاتی ہے۔ ورنہ فوری طور پر معاشرے میں تبدیلی نہیں لائی جاسکتی اور لوگوں کی عادتوں کو یک دم بدلا نہیں جاسکتا۔ اس لیے پہلے شراب کو گناہ قرار دے کر اس سے نفرت دلائی گئی۔ پھر نمازوں کے اوقات میں اس سے روکا گیا اور آخر میں اسے ممنوع اور حرام ٹھہرایا گیا۔ اس تدریج کے نتیجے میں عرب معاشرے سے یہ برائی ختم ہو گئی۔

زمانہ حال میں بعض مغربی ممالک میں کئی بار قانون کے ذریعے اچانک شراب کو جرم قرار دیا گیا۔ مگر ہر بارنا کا میں مند دیکھنا پڑا اور لوگوں نے شراب نوشی نہیں چھوڑی جس کے بعد اس قانون ہی کو ختم کرنا پڑا۔ ۶

چھٹی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

اس کی مزید تفصیل ان شاء اللہ سورۃ المائدہ آیات ۹۰، ۹۱ کی تفسیر میں آئے گی۔

﴿وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ۗ قُلِ الْعَفْوُ ﴾ (219)

مدینے کی اسلامی ریاست کے قیام کے ساتھ ہی معاشرے کی اصلاح کے حوالے سے کئی سوالات پیدا ہوئے تھے۔ عام مسلمانوں کی طرف سے یہ سوال بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی کہ اللہ کی راہ میں کتنا مال خرچ کیا جائے؟ اس سوال کے جواب میں فرمایا کہ جتنا مال تمہاری اور تمہارے اہل و عیال کی ضروریات سے زائد ہو اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر دو۔

جب ہر فقہا کے نزدیک یہ حکم صرف نفلی صدقات اور خیرات سے متعلق ہے اور زکوٰۃ کا حکم اس سے بالکل الگ چیز ہے۔ اشتراکی لوگ (Communists) اور بعض منکرین حدیث نے قرآنی الفاظ ”قُلِ الْعَفْوُ“ کی من مانی تفسیر کی ہے۔ وہ اس کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ ہر شہری کی ضروریات سے زائد مال حکومت کا حق ہے جو وہ لوگوں سے زبردستی وصول کرنے کا حق رکھتی ہے۔ مگر یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ ”قُلِ الْعَفْوُ“ سے تو اتنا اشتراکیت (Communism) اور سو شلزم (Socialism) کی جڑ کش جاتی ہے کیونکہ اس سے شہریوں کو ذاتی ملکیت کا حق ثابت ہوتا ہے جو کہ اشتراکی فلسفے کی رو سے حرام ہے۔ دوسرے اس کے بعد زکوٰۃ کا حکم کا عدم ہو جاتا ہے جو اسلام کے بنیادی اركان میں سے ہے۔

﴿كَذَلِكَ يَبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴾ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ﴿219﴾ (220-219)

فرمایا، اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنے احکام کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم دنیا اور آخرت دونوں کے حوالے سے غور و فکر کرو کہ قرآن کے تمام احکامات ایسے ہیں جن پر عمل کرنے سے دنیا اور آخرت کی سعادت اور فلاح حاصل ہو سکتی ہے۔ انسانی زندگی اپنیا پسندی اور عدم توازن کے باگڑ سے محفوظ رہتی ہے۔ ان میں وہ اعتدال اور توازن ہے جس میں نہ ترک دنیا اور رہبانیت ہے اور نہ خواہشات کی پیری وی ہے اور نہ دنیا پرستی۔

﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ قُلْ إِصْلَاحُهُمْ خَيْرٌ وَلَا تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمُّ﴾

(220)

جو لوگ تیموں کے بارے میں شرعی حکم پوچھتے ہیں ان کو بتا دیا جائے کہ ان کی اصلاح اور کفالت کرنی چاہیے اور ان کی فلاح و بہبود کا خیال رکھا جائے۔ پھر اگر خیر خواہی کی نیت سے اور سہولت کی خاطر تم ان کا مال اپنے مال میں شامل کرلو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ وہ تمہارے نبی یا دینی بھائی ہی تو ہیں۔

﴿وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ﴾ (220)

فرمایا، اللہ سبحانہ اچھی طرح جانتا ہے کہ تیموں کا سرپرست اور کفیل شخص کیسا ہے؟ ان کا خیر خواہ ہے یا بد خواہ؟ ان کے مال کی حفاظت کرنے والا ہے یا ان کا مال ہر پ کرنے اور بر باد کرنے والا ہے۔ پھر وہ ہر ایک کے رویے اور طرز عمل کے مطابق اسے جزا اور سزادے گا۔

﴿وَكُوْشَاءَ اللَّهُ لَا يَعْنَتُكُمُ﴾ (220)

پھر فرمایا، اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی آسانی اور سہولت کے لحاظ سے آسان احکام دیے ہیں اور اپنے بندوں کو تنگی اور مشقت سے بچایا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو تم لوگوں کو سخت احکام دے کر تمہیں مشقت میں ڈال دیتا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ دین کے معاملے میں اس نے کوئی تنگی نہیں رکھی۔

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (الحج: 78)

”اواس (اللہ) نے دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ (220)

آخر میں فرمایا اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ اس لیے تیموں کے بد خواہ سرپرستوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اللہ کی پکڑ سے نجٹھیں سکتے۔ اس کے ساتھ وہ حکمت والا بھی ہے کہ اس کے ہر حکم میں کوئی نہ کوئی مصلحت اور حکمت ہوتی ہے جس میں بندوں کے لئے بھلاکی، سعادت اور فلاح ہے۔ تیموں کے بارے میں مزید تفصیل ان شاء اللہ سورۃ النساء 4 کی آیات 2، 3، 10 کی تفسیر میں آئے گی۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِتَ حَتَّىٰ يُؤْمِنَۤ وَلَا مَأْمَةٌ مُؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُشْرِكَةٍ
وَلَوْ أَعْجَبْتُكُمْ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُواۤ وَلَعَبْدٌ مُؤْمِنٌ
خَيْرٌ مِّنْ مُشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبْتُكُمْ أُولَئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِۤ وَاللَّهُ
يَدْعُوكُمْ مُشْرِكِي وَلَوْ أَعْجَبْتُكُمْ أُولَئِكَ يَدْعُونَ إِلَى الْجَنَّةِ وَاللَّهُ
يَدْعُوكُمْ إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِۤ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ

لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۲۲۱﴾

”(اے مسلمانو!) مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لائیں۔ کیونکہ مشرک عورت خواہ تمہیں کتنی پسند ہواں سے مسلمان لوٹدی بہتر ہے۔ اسی طرح مسلمان عورتوں کو مشرک مردوں کے نکاح میں نہ دو جب تک وہ ایمان نہ لائیں۔ کیونکہ آزاد مشرک مرد خواہ کتنا پسند ہواں سے مسلمان غلام بہتر ہے۔ مشرک لوگ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی دوزخ کی طرف بلا تے ہیں۔ مگر اللہ اپنے فضل و کرم سے جنت اور بخشش کی طرف بلا تا ہے۔ اللہ اپنے احکام لوگوں کے لیے کھوں کر بیان کرتا ہے تا کہ وہ صحیح ہے۔“ (221)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

﴿وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِتَ حَتَّىٰ يُؤْمِنَۤ وَلَا مَأْمَةٌ مُؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُشْرِكَةٍ وَلَوْ
أَعْجَبْتُكُمْ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُواۤ وَلَعَبْدٌ مُؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ
مُشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبْتُكُمْ﴾ (221)

فرمایا مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو۔ یہ جائز نہیں ہے بلکہ حرام ہے۔ کوئی مشرک عورت خواہ تمہیں کتنی ہی اچھی لگے اس سے مسلمان لوٹدی بہتر ہے۔ اسی طرح کسی مشرک مرد سے اپنی لڑکی کا نکاح نہ کرو، یہ بھی حرام ہے خواہ وہ مشرک تمہیں کتنا ہی بھلا معلوم ہو، اس سے مسلمان غلام بہتر ہے۔

اس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ اگر میاں بیوی میں سے کوئی ایک مشرک، کافر یا مرتد ہو جائے تو ان میاں بیوی کا نکاح خود بخوبی ہو جائے گا۔

﴿أُولَئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِۤ وَاللَّهُ يَدْعُوكُمْ إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِۤ﴾

(221)

یہ مشرک مردوں اور عورتوں سے نکاح نہ کرنے اور ایسے ہر نکاح کے حرام ہونے کی وجہ اور دلیل بتائی گئی ہے کہ

مشرک لوگ خود بھی دوزخ کا ایندھن بنیں گے اور اپنے جیون ساتھیوں کو بھی وہاں لے جانے کا حجہ بنیں گے۔ گویا ہے
ہم تو ذوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ذوبیں گے

والی بات ہو گی۔ جب کہ اللہ تمہیں گناہوں سے بچتے اور جنت کی طرف بلاتا ہے جو صرف اس صورت میں تم کو میر آسکتی ہے جب تمہارے گھر میں ایمان اور دینداری کا ماحول ہو گا؟ شرک اور کفر کا ماحول نہ ہو گا۔

اس طرح کے نکاح کے بارے میں یہ سوال اس لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا تھا کہ نزول قرآن کے وقت ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک ہی قبلیے کے مردوں اور عورتوں میں کوئی شخص مشرک اور کافر تھا اور کوئی مسلمان ہو چکا تھا۔

بعض لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن میں جہاں بھی مشرکین (خواہ وہ مرد ہوں یا عورت) کا ذکر آیا ہے اس سے صرف عرب کے اسی زمانے کے مشرکین مراد ہیں۔ لیکن یہ تخصیص خود قرآن مجید کے نصوص کے خلاف ہے۔ قرآن نے کئی مقامات پر مشرکین عرب کے علاوہ دوسری قوموں کے لیے بھی مشرکین کا لفظ استعمال کیا ہے۔

ایک مقام پر ارشاد ہوا:

﴿فُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِ طَكَانَ أَكْثَرُهُمْ مُشْرِكُينَ﴾
(الروم 42:30)

”کہہ دیجئے! تم زمین میں چلو پھر و اور دیکھو ان لوگوں کا کیا انجام ہوا، جوان سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ ان میں سے اکثر مشرکین تھے۔“

اس آیت میں صرف عرب کے مشرکین مراد نہیں ہو سکتے بلکہ قرآن نے ساری زمین کے تمام مشرکین مراد لے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عرب مشرکین کے علاوہ بھی دنیا کی بہت سی قومیں مشرکین تھیں۔ قرآن نے ایک جگہ اور بھی سارے جہان کے مشرکین کو مشرکین اور کافروں کو کفار قرار دیا ہے۔ جس میں عرب کے مشرکین و کفار کی کوئی تخصیص نہیں ہے: فرمایا:

﴿أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۝ كَانُوا أَكْثَرُ مِنْهُمْ وَأَشَدُ قُوَّةً وَآثَارًا فِي الْأَرْضِ فَمَا أَغْنَى عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝ فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبُيُّنَاتِ فَرَحُوا بِمَا عِنْدُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ۝ فَلَمَّا رَأَوْا بِأَسْنَانِ قَالُوا أَمَّنْ بِاللَّهِ وَحْدَةً وَكَفَرُنَا بِمَا نَدَّنَا بِهِ مُشْرِكُينَ ۝ فَلَمَّا يَكُنْ يَنْفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَهَا رَأَوْا بِأَسْنَانِ سُنَّةِ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَّتْ فِي عِبَادَةِ هَؤُلَاءِ ۝ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكُفَّارُونَ ۝﴾
(المومن 40:82 تا 85)

”کیا یہ لوگ زمین پر چلے پھرے نہیں تاکہ دیکھتے ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جوان سے پہلے گزرے ہیں؟ وہ ان سے وقت میں بھی زیادہ تھے اور ان آثار میں بھی جو وہ زمین پر چھوڑ گئے، ان سے بڑھ کر تھے۔ پھر ان

کی کمائی ان کے کام نہ آئی۔ جب ان کے پاس ہمارے پیغمبر کھلی نشانیاں لے کر آئے تو وہ لوگ اپنے علم و ہنر پر مغزور رہے جو ان کے پاس تھا، اور پھر ان پر وہ عذاب آپڑا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ جب انھوں نے ہمارا عذاب آتا دیکھا تو کہنے لگے اب ہم اللہ واحد پر ایمان لائے۔ ہم ان معبدوں کو نہیں مانتے جن کو مان کر ہم پہلے مشرکین بننے ہوئے تھے۔ مگر اس وقت ان کا ایمان لانا ان کے کام نہ آیا کیونکہ وہ ہمارا عذاب دیکھے چکے تھے۔ اس بارے میں اللہ کی یہی سنت ہے جو اس کے بندوں میں جاری ہے کہ عذاب آنے پر کافروں کو بر باد ہونا ہوتا ہے۔“

معلوم ہوا عربوں سے پہلے بھی مشرکین اور کفار ہوتے تھے اور آج بھی دنیا میں موجود ہیں۔

پھر اس غلط بیان پر یہ لوگ موجودہ دور کے تمام مشرکوں اور کفار مثلاً ہندوؤں اور سکھوں سے مسلمان مردوں اور عورتوں کا نکاح جائز قرار دیتے ہیں جو کہ قرآن، سنت اور اجماع امت تینوں کے خلاف ہے۔

﴿وَ يُبَيِّنُ أَيْتَهُ لِلنَّاسِ لَعَنْهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴾ (۲۲۱)

”آخر میں فرمایا کہ اللہ سبحانہ لوگوں کے لیے اپنی آیتیں کھول کر بیان کرتا ہے اور واضح احکام دیتا ہے تاکہ لوگ ان کو سمجھیں، ان کے بارے میں غور فکر کریں، اور ان کے مطابق عمل کر کے دنیا اور آخرت کی کامیابی حاصل کریں۔“

وَ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيطِ ۖ قُلْ هُوَ أَذَىٰ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيطِ
 وَ لَا تَقْرِبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ ۚ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأَتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ
 أَمْرَكُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَابِينَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ۝ نِسَاءٌ كُمْ
 حَرَثٌ لَكُمْ فَأَتُوا حَرَثَكُمْ أَنِّي شَعْتُمْ وَ قَدِّمُوا لِأَنفُسِكُمْ وَ اتَّقُوا اللَّهَ
 وَ اعْلَمُوا أَنَّكُمْ مُلْقُوَةٌ وَ بَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ ۝ وَ لَا تَجْعَلُوا اللَّهَ عُرْضَةً
 لِأَيْمَانِكُمْ أَنْ تَبَرُّوا وَ تَتَقَوَّلُوا وَ تُصْلِحُوا بَيْنَ النَّاسِ ۖ وَ اللَّهُ سَيِّعٌ عَلَيْهِمْ ۝
 لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَ لِكُنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا كُسِّبَتْ
 قُلُوبُكُمْ وَ اللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۝ لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِنْ نِسَاءِهِمْ تَرَبُّصٌ

أَرْبَعَةُ أَشْهُرٍ فِيْنُ فَاءُوْ فِيْنَ اللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ وَإِنْ عَزَمُوا
 الظَّلَاقَ فِيْنَ اللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيْمٌ ۝ وَالْمُطَلَّقَتُ يَتَرَبَّصُ بِأَنفُسِهِنَّ
 ثَلَاثَةٌ قُرْوَى وَلَا يَحْلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمُنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِيْ أَرْحَامِهِنَّ
 إِنْ كُنَّ يُؤْمِنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبِعُولَتِهِنَّ أَحَقُّ بِرَدَدِهِنَّ فِيْ
 ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ
 وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ طَوِيلَةٌ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝

”اے نبی ﷺ! لوگ آپ ﷺ سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ ﷺ کہہ دیں: وہ ناپاکی ہے لہذا اس میں بیویوں سے الگ رہو۔ جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں ان کے قریب نہ جاؤ۔ پھر جب وہ پاک صاف ہو جائیں تو ان کے پاس جاؤ جیسے اللہ نے سکھایا ہے۔ بے شک اللہ توبہ کرنے والوں کو اور پاک صاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں۔ اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو جاؤ۔ اور اپنی آخرت کے لیے بھی کچھ آگے بھجو۔ ہر حال میں اللہ سے ڈرو اور یقین رکھو کہ تمہیں ایک نہ ایک نہ ایک دن اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے۔ اور اے نبی ﷺ! آپ ایمان والوں کو خوشخبری دیں۔

(مسلمانو) اللہ کی ذات کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ کہ قسم کھالی ہے اس لیے کوئی نیکی اور پرہیزگاری کا کام نہیں کر سکتے اور نہ لوگوں میں صلح صفائی کر سکتے ہیں بے شک اللہ سننے والا جانے والا ہے۔ اللہ تمہاری بے ارادہ قسموں پر نہیں پکڑے گا، لیکن جن قسموں میں تمہارا دلی ارادہ شامل ہوگا (اور وہ جھوٹی ہوں گی) تو ان پر ضرور پکڑے گا۔ اللہ بخششے والا جعل والا ہے۔

جو لوگ اپنی بیویوں کے قریب نہ جانے کی قسم کھالیں، ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے۔ اگر اس عرصے میں رجوع کر لیں تو اللہ بخششے والا مہربان ہے اور اگر طلاق کا پکار ارادہ کر لیں تو یاد رکھیں اللہ سننے والا جانے والا ہے۔ جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو، وہ تین حیض تک انتظار کریں اور اگر وہ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہیں تو ان کے لیے جائز نہیں کہ اس چیز کو چھپا کیں جو اللہ نے ان کے پیٹ میں پیدا کی ہے۔ اور اس دوران میں اگر ان کے شوہر صلح کرنا چاہیں وہ زیادہ حق رکھتے ہیں کہ وہ اپنی عورتوں کو واپس لے آئیں اور یاد رکھو ان عورتوں کے لیے

دستور کے مطابق اسی طرح حقوق ہیں جس طرح دستور کے مطابق ان پر ذمہ داریاں ہیں۔ البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ برتری حاصل ہے۔ اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔“ (228-222)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

آذی :..... اس کے معنی ”تکلیف“ اور ”ناپاکی“ کے ہیں۔

عُرْضَةُ :..... اس کے معنی نشانے اور ہدف (TARGET) کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو قسموں کا نشانہ اور ہدف بنانے سے مراد یہ ہے کہ اس کے پاک نام کو اپنی فضول، بے مقصد اور بلا ضرورت قسموں کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔

أَنْ تَبَرُّوْا :..... یہ اصل میں جیسا کہ تفسیر طبری میں ہے، آن تَبَرُّوا تھا۔ عربی زبان میں ان کے بعد کا لا کبھی حذف بھی ہو جاتا ہے اور سیاق کلام (CONTEXT) اور قرینے سے اس مخدوف (ABBREVIATION) کا پتہ چل جاتا ہے۔ جیسا کہ ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

﴿يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ أَنْ تَضْلُوا طَوَّافًا وَاللَّهُ يُكَلِّ شَيْءٍ عَلَيْهِمْ﴾ (النساء 4: 176)

”اللہ تمہارے لیے (اپنے احکام) وضاحت سے بیان کرتا ہے تاکہ تم گراہی میں نہ پڑ جاؤ اور اللہ ہر چیز کو جانے والا ہے۔“

اس جملہ آن کے بعد لا مخدوف ہے جسے ترجمے میں کھول دیا گیا ہے۔

يُؤْنُونَ :..... یہ ایلاء سے ہے جس کے اصل معنی قسم کھانے کے ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص اس بات کی قسم کھانے کو وہ اتنی مدت تک یا غیر معینہ مدت تک اپنی بیوی کے قریب نہیں جائے گا۔

قُرْوَعُ :..... یہ قُرْءُ یا قَرَءُ کی جمع ہے جس کے اصل معنی ”وقت“ کے ہیں۔ لیکن اس سے حیض یا طہر مراد ہوتا ہے کیونکہ دونوں کا تعلق وقت ہی سے ہے۔ لیکن یہ لفظ اپنے دو مختلف معنی رکھنے کی وجہ سے مشترک (COMMON) کہلاتا ہے۔

بُعُولَةُ :..... بُعُولَة جمع ہے بَعْلُ کی۔ اس کی آۃ (تائیتی تائیش) جمع کو ظاہر کرتی ہے۔ بَعْلُ کے معنی زوج (SPOUSE) کے ہیں۔ پھر جس طرح میاں بیوی ایک دوسرے کے زوج ہوتے ہیں، اسی طرح میاں بیوی ایک دوسرے کے بعل ہیں۔

دَرَجَةُ :..... اس سے ایک درجے (GRADE) کی برتری مراد ہے جس کو سورۃ النساء میں اس طرح واضح کیا گیا ہے:

﴿الرِّجَالُ قَوْمُونَ عَلَى الْبَسَاءِ بِمَا فَضَلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَّ بِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ﴾ (النساء 4: 34)

”مردوں بیویوں کے برابر ہیں، کیونکہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر برتری دی اور اس وجہ سے کہ مرد

بیویوں پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔“

﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيطِ قُلْ هُوَ أَذَّى فَاعْتَزِزُوا بِالنِّسَاءِ فِي الْمَحِيطِ وَ لَا تَقْرُبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ﴾ (222)

عورتوں کے حیض سے متعلق سوال کیا گیا کہ اس بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟ اس پر فرمایا گیا کہ وہ ایک ناپاکی ہے اور جب تک بیوی اس سے پاک نہ ہو جائے اس کے قریب نہیں جانا چاہیے۔ پھر ”اس قریب جانے“ کی تشریع ایک صحیح حدیث میں اس طرح فرمائی گئی:

((اَصْنَعُو اُكُلَّ شَيْءٍ إِلَّا النِّكَاحَ))

(صحیح مسلم، رقم: 694، ابو داؤد، رقم: 258 ، تمذی، رقم: 2977، نسائی ، رقم: 288)

”جماع کے سواب کچھ کر سکتے ہو۔“

گویا بوس و کنار جائز ہے مگر صحبت جائز نہیں۔

بیویوں اور بعض دوسری قوموں کے ہاں اس بارے میں بڑی افراط و تفریط پائی جاتی تھی۔ اکثر ان دونوں میں عورتوں کو اچھوت بنا کر رکھ دیتے تھے۔ ان کے ہاتھ کا پاک ہوا کھانا نہ کھاتے تھے اور ان کو الگ مکان میں رکھتے تھے۔ لیکن اسلام میں ان خاص دونوں میں بیوی سے جماع کے سواب کی قسم کی پابندی نہیں لگائی گئی۔ البتہ ان ایام میں عورت نہ نماز پڑھے گی، نہ روزہ رکھے گی، نہ کسی مسجد میں ظہرے گی اور نہ قرآن پاک کی تلاوت کرے گی۔

يَطْهُرُنَ : (وہ پاک ہو جائیں) سے مراد وہ حالت ہے جب حیض کا خون آتا بند ہو جائے۔ اس کے بعد صحبت جائز تو ہو جاتی ہے مگر شریعت میں یہ ناپسندیدہ ہے اور پسندیدہ یہ ہے کہ ان کے نہاد ہو کر اچھی طرح پاک صاف ہو جانے تک انتظار کیا جائے۔

حیض کی حالت میں جماع سے زوجین کو طی اور جسمانی نقصانات بھی ہوتے ہیں۔

حیض سے متعلق تفصیلی احکام فتنہ کی کتابوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

﴿فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأُتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمْرَ كُمُّ اللَّهُ﴾ (222)

مراد یہ ہے کہ حیض کا خون بند ہو جانے کے بعد جب وہ نہاد ہو کر اچھی طرح پاک صاف ہو جائیں تو پھر ان سے صحبت کی جائے۔ بھی پسندیدہ طریقہ ہے۔

﴿مِنْ حَيْثُ أَمْرَ كُمُّ اللَّهُ﴾ (جہاں سے اللہ نے تمہیں سکھایا ہے) میں امر کے معنی شرعی حکم نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ لفظ کئی معنوں میں آتا ہے۔ اس جگہ اس سے مراد وہ طبعی طریقہ ہے جس سے سب انسان بلکہ جانور بھی فطری طور پر واقف ہوتے ہیں اور جس کی وضاحت اگلی آیت 223 میں لفظ حَرْثُ (کھتی) سے ہو گئی ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ﴾ (222)

فرمایا، اللہ سبحانہ تو بے کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے گویا جو لوگ تو بے کے ذریعے اپنے باطن کو ہر قسم کے گناہوں سے پاک کر لیتے ہیں اور اپنے ظاہر کو ہر طرح کی گندگی اور نجاست سے پاک صاف رکھتے ہیں، وہی اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ بندے ہیں، جن کو وہ اپنے انعامات سے نوازے گا۔

اس سے یہ اشارہ بھی لکھتا ہے کہ جو لوگ گناہوں میں بٹلارہتے ہیں اور تو بے نہیں کرتے، یا جسمانی طور پر نجاست اور گندگی میں لمحہ رہتے ہیں وہ اللہ سبحانہ کے ہاں ناپسندیدہ ہیں۔

﴿نَسَأَلُكُمْ حَرُثٌ لَّكُمْ فَإِنَّا حَرُثُمُ أَنِّي شَهِيدٌ﴾ (223)

ارشاد ہوا کہ تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں جن کے ذریعے تم اولاد کی پیداوار حاصل کرتے ہو، یہ اس سے پہلی آیت کے الفاظ **﴿مِنْ حَيْثُ أَمْرَكُمُ اللَّهُ﴾** (جہاں سے تمہیں اللہ نے سمجھایا ہے) کی مزید وضاحت ہو گئی۔ ظاہر ہے اولاد حاصل کرنے کے لیے بیوی کے پاس جانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ اس کے خلاف سارے طریقے غیر فطری اور حرام ہیں جن سے بچنا لازم ہے۔ جیسے حیض کی حالت میں بیوی کے قریب جانا یا اس سے بدفعی کرنا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ بیوی سے جماع اس کے مخصوص مقام پر کرو اور اس کے جوانہ اداز اور پوزیشن چاہو وہ اختیار کر سکتے ہو۔ قرآن نے بیوی کو کھیتی کے قرار دے کر خاندانی منصوبہ بندی یا بہبود آبادی جیسی سکیموں کا غلط اور نا معقول ہونا ثابت کر دیا ہے۔ کیونکہ کھیتی کے بارے میں معقول بات یہی ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ اور اچھی پیداوار حاصل کی جائے مگر یہ نہایت نا معقول اور احتمانہ حرکت ہے کہ کھیتی میں بچ تو زیادہ سے زیادہ ڈالے جائیں مگر پیداوار کم سے کم لی جائے۔

مزید تفصیل ان شاء اللہ سورۃ الانعام (6) آیت (151) کی تفسیر میں آئے گی۔

﴿وَقَدْ مُوا لِأَنْفِسِكُمْ﴾ (223)

اس سے مراد ہے کہ بیوی سے جماع کا مقصد صرف لذت اور لطف اندوڑی نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کا اصل مقصد اولاد کا حصول ہونا چاہیے۔ اولاد کو اگر تم صحیح تعلیم و تربیت سے آراستہ کرو گے تو وہ تمہارے لیے آخرت میں نیکی کا سامان اور صدقہ جاریہ ہے۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت ابو حریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ إِنْقَطَعَ عَنْهُ عَمْلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةِ أَشْيَاءٍ: صَدَقَةً جَارِيَةً، أَوْ عِلْمًٍ يُتَعَفَّعُ

بِهِ، أَوْ وَلَدَ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ)) (صحیح مسلم، رقم: 4223، ابو داؤد، رقم: 2880)

”جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے سوائے تین چیزوں کے ایک صدقہ جاریہ، دوسری چیز وہ علم ہے جس سے فائدہ اٹھایا جائے، اور تیسرا وہ نیک اولاد ہے جو اس کے حق میں دعا کرتی رہے۔“

﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُو أَنَّكُمْ مُّلْقُوْهُ وَبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۲۲۳﴾

اس مقام پر تقویٰ لیعنی اللہ سے ذر نے کی تاکید اس لیے فرمائی گئی کہ آج دنیا میں ہر شخص کو مہلت ملی ہوئی ہے کہ وہ

چھپ کر یا سب کے سامنے اللہ کی قائم کی ہوئی حدود کو توڑ سکتا ہے اور فطرت کے قوانین کی خلاف ورزی کر سکتا ہے۔ لیکن وہ یاد رکھ کر اسے ایک دن اللہ سبحانہ کے پاس حاضر ہونا ہے۔ جو ہماری ہر حرکت کو دیکھتا اور سب کچھ جانتا ہے۔ اس لیے اس کی پکڑ بے پچو۔

البتہ جو ایمان والے ہر حال میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کرتے ہیں، وہ آخرت میں نہ صرف سزا سے بچ جائیں گے بلکہ ان کے لیے جنت کی نعمتوں کی خوشخبری ہے۔

﴿وَلَا تَجْعَلُوا اللَّهَ عُرْضَةً لِّأَيْمَانِكُمْ أَنْ تَبَرُّوا وَتَتَقْرُبُوا وَتُصْلِحُو بَيْنَ النَّاسِ ۝﴾ (224)
فرمایا، اللہ کے نام کو اپنی غلط قسموں کے لیے ڈھال (SHIELD) اور بہانہ نہ بناؤ کہ جس کے بعد کوئی نیکی کا کام نہ کرسکو، جیسے صدر جمی ختم کر دو اور رشتہ داروں کے حقوق ادا نہ کرو، یا صدقہ و خیرات کرنے سے ہاتھ روک لو، یا لوگوں کے درمیان صلح صفائی اور مصالحت کرانی چھوڑ دو۔ بلکہ ایسی فتنمیں جو تمہیں نیکی کے کاموں سے روکنے والی ہوں ان کا کفارہ ادا کر دو اور نیکی کے کام کرتے رہو، جیسا کہ صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن سرہ رضی اللہ عنہ کو نبی ﷺ نے قسم کا کفارہ ادا کرنے کا حکم اس طرح دیا تھا:

((إِذَا حَلَقْتَ عَلَىٰ يَمِينِ ، فَرَأَيْتَ عِيرَاهَا خَيْرًا مِّنْهَا فَكَفَرْتُ عَنْ يَمِينِكَ ، وَأَيْتَ الَّذِي هُوَ خَيْرٌ))
(صحیح بخاری، رقم: 6622)

”جب تو کسی بات کی قسم کھائے، پھر اس کے خلاف کرنا بہتر سمجھے تو اپنی قسم کا کفارہ ادا کر، اور جس کام کو بہتر سمجھے وہی کر۔“

﴿وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝﴾ (224)

آخر میں فرمایا اللہ تعالیٰ تمہاری ہر بات سنتا اور تمہاری نیت اور ارادے کو جانتا ہے۔ پھر جیسے تمہارے اعمال ہوں گے ویا تمہیں بدلتے گا۔ تمہارے ابھی اعمال پر ثواب اور برے اعمال پر سزادے گا۔

﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَكُنْ يُؤَاخِذُكُمُ بِمَا كَسَبْتُ قُلُوبُكُمْ ۝﴾

(225)

مطلوب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری بے مقصد، بے ارادہ اور فضول قسموں پر تمہیں نہیں پکڑے گا جو تم تکمیل کلام کے طور پر کھاتے ہو، مگر تمہاری ان سمجھیدہ قسموں پر ضرور پکڑے گا جو تم نے دلی ارادے کے ساتھ اٹھائی ہوں گی۔ پھر یا تو ان کو پورا کرو گے یا پھر ان کا کفارہ ادا کرو گے، ورنہ پکڑ ہو گی۔

﴿وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۝﴾ (225)

آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بخششے والا ہے کہ وہ غلط طرح کی سمجھیدہ قسم توڑنے پر کفارہ ادا کرنے والوں کو بخششے والا ہے، اور تمہاری فضول قسموں پر تمہاری گرفت اس لیے نہیں کرتا کیونکہ وہ تخلی والا ہے۔ اس کی مزید تفصیل ان شاء اللہ

سورة المائدہ 5 آیت 89 کی تفسیر میں ملے گی۔

﴿لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِنْ نِسَاءِهِمْ تَرْبُصُ أَرْبَعَةُ أَشْهُرٍ فَإِنْ فَاءَهُ فَإِنَّ اللَّهَ عَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (226)

شوہر کی طرف سے بیوی کے قریب نہ جانے کی قسم کھالینا "ایلاء" کہلاتا ہے۔

دور جاہلیت میں بیویوں کو نگ کرنے کے لیے ان کے خاوند اس طرح کی قسم کھالیتے اور پھر طویل عرصے تک نہ ان کے قریب جاتے اور نہ ان کو طلاق دیتے تھے۔ ظاہر ہے اس سے عورتوں کی حق تنفسی ہوتی تھی اور وہ معلقة (وہ میان میں لگی ہوئی) بن کر رہ جاتی تھیں۔

اس لیے اللہ سماج نے اس زیادتی کے خلاف قرآن میں یہ حکم نازل فرمادیا کہ ایسے خاوندوں کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے۔ اس مدت کے اندر اندر وہ رجوع کر سکتے ہیں، یا پھر ان کو طلاق دیتی پڑے گی۔ اگر وہ اس عرصے میں رجوع کر لیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی یہ کوتاہی معاف کردے گا کیونکہ وہ بخشش والا ہم بریان ہے۔

﴿وَ إِنْ عَزَمُوا الظَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَيِّعُ عَلَيْمٌ﴾ (227)

لیکن طلاق دینے کی صورت میں اگر کوئی خاوند بدینتی سے عورت کو نگ کرے گا تو وہ یاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ ہربات سنتا اور ہر ایک کی نیت کو جانتا ہے۔ اس لیے وہ ایسی حرکت پر اسے سزا دے گا۔ اس جگہ چونکہ قسم کے کفارے کا ذکر نہیں ہے اس لیے بعض فقہا کی رائے یہ ہے کہ رجوع کر لینے کی صورت میں قسم کا کوئی کفارہ نہیں ہے۔ لیکن فقہا کی اکثریت کے نزدیک خاوند کو اپنی قسم توڑنے کا کفارہ دینا پڑے گا جو قرآن کی سورۃ المائدہ (5) آیت 89 میں میان ہوا ہے۔

پھر آیت میں چونکہ قسم اٹھانے کا ذکر ہے اس لیے اکثر فقہا (جن میں احناف بھی شامل ہیں) کے ہاں ایلاء کے اس حکم کا اطلاق صرف قسم کھانے کی صورت میں ہو گا، ورنہ نہیں ہو گا۔ گرام مالک رشیدیہ کی رائے یہ ہے کہ اس بارے میں خاوند قسم کھائے یا قسم نہ کھائے دونوں حالتوں میں ایلاء ہو جائے گا۔ کیونکہ دونوں صورتوں میں عورت کے لیے ضرر یعنی نقصان ایک جیسا ہے اور دونوں حالتوں میں رجوع کے لیے چار مہینوں کی مہلت ہوگی۔

اس کے علاوہ حضرت علی بن ابی طالب، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور حسن بصری رضی اللہ عنہ کی رائے میں ایلاء کے حکم کا اطلاق صرف اسی صورت میں ہو گا جب میاں بیوی میں ناجاہتی اور ناراضی ہو، ورنہ خویگوار تعلقات کی موجودگی میں اس حکم کا اطلاق نہیں ہو گا، اگر وہ کسی مصلحت سے آپس میں قریب نہ کریں، خواہ اس کے لیے کتنی ہی مدت گزر جائے۔

لیکن بعض فقہاء کے نزدیک ایسی قسم اٹھانا جس سے میاں بیوی میں جنسی تعلق نہ رہے، وہ ایلاء ہے اور اس میں رجوع کے لیے چار ماہ کی مہلت ہے۔ چار ماہ گزر جانے کے بعد طلاق کے بارے میں بھی فقہاء کا اختلاف ہے۔

امام شافعی رشیدیہ اور امام مالک رشیدیہ اسے ایک طلاق رجعی قرار دیتے ہیں۔ جب کہ احناف کے نزدیک یہ مدت

گزرتے ہی طلاق پڑ جائے گی اور یہ طلاق باکن ہو گی۔ جس کا مطلب ہے کہ اب ان کا نکاح کوٹ چکا اور میاں بیوی میں علیحدگی ہو چکی۔ لیکن اگر فریقین چاہیں تو باہمی رضامندی سے آپس میں دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں۔

امام مالک رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے فقہاء کی رائے میں چار مہینے کی مدت کے بعد معاملہ قاضی کے پاس جائے گا اور وہ خاوند کو حکم دے گا کہ وہ رجوع کر لے یا طلاق دیدے۔ پھر اگر وہ ان دونوں باتوں سے انکار کر دے تو قاضی اس عورت کے حق میں طلاق کا فیصلہ دے سکتا ہے۔

ان دونوں آئیتوں پر غور کرنے سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایلاء کے معاملے میں رجوع کر لینا طلاق دینے سے بہتر اور افضل ہے۔ کیونکہ اس پر بخشش اور رحمت کا ذکر آیا ہے اور طلاق کی صورت میں تنہیہ کا سامانداز ہے۔

یاد رہے ایلاء بھی طلاق ہی کی ایک قسم ہے۔

﴿وَ الْمُكْلَفُتُ يَتَرَبَّصُ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُونٍ﴾ (228)

اس سے پہلے ”ایلاء“ (جو کہ طلاق ہی کی ایک قسم ہے) کا ذکر آیا تھا۔ اب اسی مناسبت سے طلاق کے بارے میں تفصیلی احکام دیئے جارہے ہیں۔

مطلوب یہ ہے کہ جن بیویوں کو طلاق دی جائے ان کو چاہیے کہ وہ تین حیض تک (جیسا کہ احناف کی رائے ہے) یا تین طہر تک (جیسا کہ امام شافعی رضی اللہ عنہ کی رائے ہے) رکی رہیں۔ یہی ان کے لیے طلاق کی عدت ہے۔

جاہلیت کے زمانے میں طلاق کے لیے کوئی عدت مقرر نہ تھی۔ اس لیے جب عورت کو طلاق دی جاتی اور بعد میں اس کا حمل ظاہر ہوتا تو اس پچے کو عورت کے دوسرے شوہر کی طرف منسوب کر دیا جاتا۔

قرآن نے اس جاہلی رواج کو حرام قرار دیا۔ مطلقة عورت کے لیے عدت مقرر کر دی تاکہ نسب کی حفاظت بھی ہو اور عورت ذاتی طور پر دوسرے نکاح کے لیے تیار بھی ہو سکے۔

﴿وَ لَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَنْكُثُنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنَ بِاللَّهِ وَ إِلَيْهِ الْأُخْرَى﴾ (228)

فرمایا، طلاق والی عورتوں کے لیے جب کہ وہ حاملہ ہوں، یہ جائز نہیں ہے کہ وہ جان بوجھ کر اپنے حمل کو چھپا دیں، یا حیض کے بارے میں صحیح معلومات نہ دیں تاکہ اگر دوسرے نکاح کا جلد امکان نہ ہو تو وہ محض نان و نفقہ لینے کی خاطر اپنی عدت کا عرصہ بڑھا لیں۔

پھر فرمایا اگر وہ طلاق یافتہ حاملہ عورتیں صحیح مسلمان ہیں تو ان کو چاہیے کہ وہ حمل کو نہ چھپا دیں اور حیض کے بارے میں ٹھیک بات کریں۔ اللہ سبحانہ نے حلال و حرام کا جو ضابطہ بنایا ہے وہ بندوں کے فائدے ہی کے لیے بنایا ہے۔ اس لیے وہ اس ضابطے کی پابندی کریں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان کا یہی تقاضا ہے۔ اسی طرح آخرت پر ایمان رکھنے کا تقاضا

یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ کی جائے۔ ورنہ قیامت کے دن مواخذہ اور احتساب ہو گا۔

﴿وَ بِعُوْتِهِنَّ أَحَقُّ بِرَدَّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا﴾ (228)

مطلوب یہ ہے کہ شوہر اس بات کا زیادہ حق دار ہے اور اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ عدت کے دوران میں، یا عدت گزرنے کے بعد بھی جب کہ ابھی تیری طلاق نہ دی ہو، رجوع کر لے۔ لیکن اس کی نیت خشگوار ازدواجی زندگی گزارنے کی ہو اور وہ یہوی کو تک کرنے یا اسے نقصان پہنچانے کے لیے ایسا نہ کرے۔ اگر وہ یہوی کو تک کرنے یا اسے نقصان پہنچانے کے لیے رجوع کرے گا تو اللہ تعالیٰ کے ہاں پکڑا جائے گا۔

شوہر اس لیے رجوع کا زیادہ حق رکھتا ہے کیونکہ بھی تو وہ اپنے طلاق کے فیصلے پر خود پشمیان ہوتا ہے۔ بھی اسے اپنے بچوں کی صحیح پرورش اور تربیت کے لیے ان کی ماں کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اسلام میں مردوں کو عورتوں کا سربراہ ہونے کی وجہ سے بھی طلاق اور رجوع کا زیادہ حق حاصل ہوتا ہے۔

رجوع کے بارے میں یہی مضمون آگے آیت 232 میں بھی آ رہا ہے۔

﴿وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ يَا لِمَعْرُوفٍ وَ لِلِّيْجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ (228)

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح دستور کے مطابق یہویوں کے ذمے فرائض ہوتے ہیں اسی طرح دستور کے مطابق ان کے حقوق ہوتے ہیں۔ البته مردوں کو عورتوں پر ایک درجے کی برتری حاصل ہے جس کی وضاحت سورۃ النساء 4 آیت 34 میں اس طرح کی گئی ہے کہ مرد عورتوں کے سربراہ ہیں۔

گویا مردوں کو عورتوں کی سربراہی کا درجہ حاصل ہے۔

بعض لوگ اس آیت کو مساوات مردوں کے مغربی تصور کی دلیل بناتے ہیں جو کہ غلط ہے۔ اول تو اس آیت میں مردوں اور عورتوں کے حقوق و فرائض کی مساوات بیان نہیں ہوئی ہے۔ صرف عورتوں کے بارے میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جہاں ان پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں وہاں ان کو کچھ حقوق بھی حاصل ہیں۔ اس سے دونوں میں مساوات کہاں سے آگئی۔ دوسرے بعد کے مکارے ﴿لِلِّيْجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ (اور مردوں کو ان پر ایک درجہ یا فضیلت حاصل ہے) کے الفاظ عدم مساوات کا اعلان کر رہے ہیں۔

﴿وَ اللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ (228)

آخر میں فرمایا کہ اوپر کے تمام احکام، مردوں اور عورتوں کے درمیان حقوق و فرائض کی تقسیم، یہ سب کچھ اس اللہ کی طرف سے ہے جو غالب اور حکمت والا ہے۔

مزید تفصیل ان شاء اللہ سورۃ النساء (4) آیت 34 کی تفسیر کے تحت آئے گی۔

الظلاق مرتين فامساك بمعروف او تسریح بمحسان ولا
 يحل لكم ان تأخذوا امماً اتيتموهن شيئاً الا ان يخافاً الا يقيسوا
 حذود الله فان خفتم الا يقيسوا حذود الله فلا جناح عليهم ما
 فيهما افتقدت به تلك حذود الله فلا تعتدوا و من يتعد
 حذود الله فاولئك هم الظالمون فان طلقها فلا تحل له
 من بعد حتى تنكح زوجاً غيره فان طلقها فلا جناح عليهم ما
 ان يتراجعاً ان طلقاً ان يقيسوا حذود الله و تلك حذود الله
 يبينهما لقوم يعلمون و اذا طلقت النساء قبلهن اجلهن
 فاما مسكونهن بمعروف او سرحوهن بمعروف ولا تمسكونهن
 ضراراً لتعتدوا و من يفعل ذلك فقد ظلم نفسه ولا
 تتخدوا ايته الله هروباً و اذكروا نعمت الله عليكم و ما انزل
 عليكم من الكتاب والحكمة يعظكم به و اتقوا الله و اعلموا
 آن الله يحيى شئ علىم ۝

"ظلاق دوبار ہے۔ اس کے بعد دستور کے مطابق یا تو یوں کو رکھ لینا ہوتا ہے یا خوش اسلوبی سے رخصت کر دینا۔ اگر ان کو رخصت کرو تو تمہارے لیے یہ جائز نہیں کہ جو مال انھیں دے چکے ہو، اس میں سے کچھ واپس لو۔ البتہ اگر یہ صورت ہو کہ دونوں میاں یوں کو یہ اندیشہ ہو کہ وہ اللہ کے بعض احکام کی صحیح پابندی نہ کر سکیں گے تو پھر جائز ہے کہ باہمی رضامندی سے عورت اپنے شوہر کو کچھ مال دے کر خلع (کی طلاق حاصل) کر لے۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں، ان سے باہرنہ نکلو، اور جو اللہ کی حدیں سے نکل جائیں وہی ظالم ہیں۔"

اور اگر شوہرنے تیسری طلاق دی تو پھر جدائی ہوئی۔ اب وہ عورت اس کے لیے حلال نہیں۔ لیکن اگر وہ عورت کسی اور مرد سے نکاح کر لے اور وہ (اپنی مرضی سے) اسے طلاق دیجے تو ایسی صورت میں پہلے شوہر سے اس عورت کا دوبارہ نکاح درست ہے، بشرطیکہ دونوں کو اللہ کی حدود پر قائم رہنے کی توقع ہو۔ یہ اللہ کے احکام ہیں جنہیں وہ ان لوگوں کے لیے وضاحت سے بیان کرتا ہے جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ اگر تم اپنی بیویوں کو (دوفعہ) طلاق دو اور وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انہیں یا تو دستور کے مطابق رکھلو، یا بھلے طریقے سے رخصت کر دو۔ مگر ان کو تکلیف پہنچانے کی غرض سے نہ رو کو کہ پھر ان پر زیادتی کرو۔ جو ایسا کرے گا وہ اپنا ہی برا کرے گا۔

اور اللہ کی آیتوں کو مذاق نہ بناؤ۔ بلکہ اپنے اوپر اللہ کی نعمتوں کو یاد رکھو، اور کتاب و حکمت کو بھی، جو اس نے نازل کی ہے اور جس کے ذریعے وہ تمہیں سمجھاتا ہے۔ ہر حال میں اللہ سے ڈر و اور اچھی طرح جان لو کہ اللہ ہر چیز کو جانے والا ہے۔⁽²³¹⁻²²⁹⁾

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ اس جگہ فعل کی بجائے طلب فعل کا مفہوم مراد لیا جائے گا۔ مطلب یہ ہو گا کہ ان لوگوں کے لیے جو چاننا چاہتے ہیں۔

﴿أَلَّا تَلَاقُ مَرْثِينَ قَامَسَاكُمْ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيْحٌ بِإِحْسَانٍ﴾⁽²²⁹⁾

فرمایا، جس طلاق کے بعد رجوع ہو سکتا ہے وہ صرف دوبار ہے۔ پھر تیسری طلاق دینے کے بعد رجوع نہیں ہو سکتا اور میاں بیوی میں جدای ہو جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بیک وقت تین طلاقیں دینا قرآن کے منشاء کے خلاف ہیں۔ تیسری طلاق کا ثبوت بعد کے الفاظ **﴿فَإِمْسَاكُمْ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيْحٌ بِإِحْسَانٍ﴾** (پھر دستور کے مطابق روک لیتا یا بھلے طریقے سے رخصت کر دینا) سے مل جاتا ہے۔

ارشاد ہوا کہ دو طلاقوں کے بعد عدت کے دوران میں یا تو بھلے طریقے سے رجوع کر لیتا ہوتا ہے یا پھر عدت گزر جانے کے بعد عورت کو خوش اسلوبی سے رخصت کر دینا ہوتا ہے۔

دورِ جاہلیت میں طلاقوں کی تعداد پر کوئی پابندی نہ تھی۔ اہل عرب اپنی بیویوں کو تنگ کرنے کے لئے ان کو جتنی چاہتے طلاقیں دے ڈالتے۔ پھر عدت کے دوران رجوع کر لیتے تھے۔ اس طرح عورت یچاری معلقہ بن کر رہ جاتی جو قانونی طور پر بیوی ہوتی مگر عملی طور پر بیوی نہ ہوتی۔ وہ کسی اور مرد سے نکاح بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اس آیت کا شانِ نزول جامع ترمذی کی وہ حدیث ہے جو امام المومنین حضرت عائشہؓ فیض ہمانے روایت کی ہے کہ: جاہلیت کے دور میں مرد اپنی بیوی کو جتنی چاہتا طلاقیں دیتا اور عدت کے اندر رجوع کر لیتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ سو

بار یا اس سے بھی زیادہ مرتبہ طلاق دیتا اور رجوع کر لیتا تھا۔ ایک (انصاری) مرد نے اپنی بیوی سے کہا: اللہ کی قسم! نہ تجھے طلاق دوں گا کہ تو مجھ سے الگ ہو جائے اور نہ تجھے رکھوں گا۔ عورت نے پوچھا: وہ کیسے؟ اس نے جواب دیا: میں تجھے طلاق دیتا رہوں گا اور عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کر لیا کروں گا۔ یہ جواب سن کر وہ عورت حضرت عائشہؓ پر فتنہ کے پاس فریاد لے کر آئی۔ اس کی بات سن کر حضرت عائشہؓ پر فتنہ خاموش رہیں۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ گھر تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ پر فتنہ نے ان کو سارا قصہ سنایا تو حضور ﷺ خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿الْطَّلاقُ مَرْتَأْتِينَ﴾ (ترمذی، رقم: 1192)

قرآن کریم نے اس جاہلی طریقے اور معاشرتی خرابی کی اصلاح فرمائی۔ عورت کی حق تلفی کا ازالہ کیا۔ مردوں کو حکم دیا کہ وہ صرف دو طلاقوں تک رجوع کر لینے کا حق رکھتے ہیں۔ جب وہ تیسرا مرتبہ طلاق دیں گے تو ان کے لیے رجوع کا حق ختم ہو جائے گا۔ عورت عدت گزارنے کے بعد آزاد ہو گی کہ جہاں چاہے دوسرا نکاح کر لے۔

طلاق کے بارے میں تفصیلی احکام یہ ہیں:

1۔ بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دینا سخت گناہ ہے۔ ایسے ایک واقعہ پر نبی ﷺ نے سخت ناراضی اور ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا تھا۔ (صحیح بخاری، رقم: 4908، صحیح مسلم، رقم: 3652)

ایسی طلاق کو بدی طلاق کہتے ہیں مگر یہ بھی ایک (پہلی) طلاق شمار ہوتی ہے۔

2۔ حیض کی حالت کے دوران میں ایک تو بیوی کی طرف خاوند کی رغبت کم ہوتی ہے اور میاں بیوی میں پچھہ دوری کی پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرے اس حالت میں عام طور پر عورت کا مزاج نارمل (NORMAL) نہیں رہتا جس کی وجہ سے میاں بیوی کے درمیان بھگڑے کا امکان ہو سکتا ہے جو بڑھ کر طلاق کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ اسی سے بچنے کے لیے مرد کو اس عرصے میں صبر و تحمل اور برداشت سے کام لینے کی تاکید اور اپنی بیوی کو طلاق نہ دینے کی ہدایت کی گئی ہے۔ لیکن اگر ایسی حالت میں خاوند سے غلطی ہو جائے اور وہ طلاق دے بیٹھے تو اسے رجوع کر لینا چاہیے۔ البتہ اگر طلاق دیے بغیر چارانہ ہو تو بعد میں ایسے طہر میں جس میں بیوی سے صحبت نہ کی ہو، اسے ایک طلاق دی جائے۔ اس طرح اگر چہ دو طلاقیں واقع ہو جائیں گی تاہم رجوع کا حق باقی رہے گا۔

3۔ طلاق اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے اس لیے اسے صرف آخری چارہ کار کے طور پر اختیار کرنا چاہیے۔ اگر ناگزیر حالات میں بھی اس کی اجازت نہ دی جاتی تو میاں بیوی کے لیے زندگی مصیبت اور عذاب بن جاتی۔

4۔ طلاق دینے کا سب سے بہتر اور احسن طریقہ یہ ہے کہ بیوی کو ایسے طہر میں، جس میں صحبت نہ کی گئی ہو، ایک طلاق (رجعی) دی جائے تاکہ عدت کے دوران میں رجوع کر لینے کی گنجائش باقی رہے۔ شوہر اگر عدت کے دوران میں رجوع کر لیتا ہے تو نکاح برقرار رہتا ہے۔ لیکن اگر عدت کی مدت گزر جائے تو رجوع نہیں ہو سکتا کیونکہ اب نکاح ختم ہو چکا ہے۔ البتہ دونوں کی رضا مندی سے دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ اگر دوبارہ نکاح نہیں کرتے تو

عدت گزارنے کے بعد کسی دوسرے مرد سے شادی کر سکتی ہے۔

طلاق دینے کا ایک اور طریقہ بھی حسن اور درست ہے کہ خاوند اپنی بیوی کو ہر طہر میں ایک ایک کر کے الگ الگ تین طلاقیں دے۔ اس کے بعد عورت اپنی عدت گزارنے کے بعد کسی اور مرد سے نکاح ٹانی کر سکتی ہے۔

5۔ طلاق صرف خاوندے سکتا ہے۔ بیوی اپنے شوہر کو طلاق نہیں دے سکتی۔

6۔ شوہر اپنی بیوی کو صرف تین طلاق دینے کا اختیار رکھتا ہے۔

7۔ طلاق کی تین قسمیں ہیں: رجعی، باکن (یا بائکن) اور مغاظہ۔

طلاق رجعی یہ ہے کہ خاوند اپنی بیوی کو ایک طلاق دے یا دو طلاقیں (الگ الگ) دے اور عدت گزرنے سے پہلے رجوع کر لے۔

طلاق باکن (یا بائکن) یہ ہے کہ شوہر نے ایک طلاق یا دو طلاقیں دیں اور طلاق کی عدت گزر گئی تو اب نکاح ثبوت کیا اور میاں بیوی میں جدائی ہو گئی۔ (عربی زبان میں بینَ یا بینوْنَتْ کے معنی جدائی کے ہیں۔) لیکن اگر فریقین چاہیں تو باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں۔

طلاق مغاظہ یہ ہے کہ پہلے ایک طلاق یا دو طلاقیں دی جائیں۔ پھر عدت ختم ہونے سے پہلے تیسرا طلاق دے دی جائے۔ اس صورت میں نکاح بھی ختم ہو جاتا ہے اور دوبارہ نکاح بھی نہیں ہو سکتا۔

8۔ ایک ہی وقت اور مجلس میں تین طلاقیں دے ڈالنا طلاق بدی ہے جو شریعت میں سخت ناپسندیدہ اور گناہ کی بات ہے۔ لیکن یہ طلاقیں مؤثر (Effective) ہوتی ہیں۔ اس کے بعد مرد کو نہ توجہ جمع کا حق باقی رہتا ہے اور نہ وہ اس عورت سے دوبارہ نکاح کر سکتا ہے۔ اسے اربعہ اور جمہور فقهاء کا بھی مسلک ہے۔ لیکن یاد رہے کہ اس مسلک اور رائے پر امت کا اجماع اور اتفاق نہیں ہے۔ جو لوگ اس پر اجماع ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ان کا دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ اہل حدیث مسلم میں یہی وقت دی گئی تین طلاقیں ایک ہی طلاق شمار ہوتی ہے جس کے بعد رجوع ہو سکتا ہے۔ بعض حنفی فقہاء نے بھی مخصوص حالات میں اس مسلک کو اختیار کر لینے کے نتے دیے ہوئے ہیں۔

﴿وَلَا يَحِلُّ لِكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا أَتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا﴾ (229)

مطلوب یہ ہے کہ طلاق دینے کے بعد شوہر کو یہ حق نہیں ہے کہ جو مہر، زیور اور کپڑے وغیرہ اس نے بیوی کو دیے ہوں، وہ ان میں سے کوئی چیز واپس لے۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَإِنْ أَرَدْتُمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجَ مَكَانَ زَوْجٍ وَّ أَتَيْتُمُ إِحْدَهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا طَالَتْ أَتَأْخُذُونَهُ بِهَتَانًا وَإِنَّمَا مُبْيَنًا ۵ وَ كَيْفَ تَأْخُذُونَهُ وَ قَدْ أَفْضَى بَعْضُكُمُ إِلَى بَعْضٍ وَّ أَخْذَنَ مِنْكُمْ مِّيقَاتًا غَلِيظًا﴾ (النساء: 4: 20-21)

”اویہ اگر تم ایک بھی کی جگہ دوسری بیوی بدلنا چاہو جب کہ تم پہلی کو ڈھروں مال دے چکے ہو، تو طلاق کے

بعد علیحدگی کی صورت میں اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو۔ کیا تم اپنا دیا ہوا مال کسی بہتان یا قلم کے ذریعے واپس لو گے؟ اور تم کس طرح وہ مال لو گے جب کہ تم ایک دوسرے سے خلوت کر پکے اور وہ نکاح کے وقت تم سے پختہ عہد لے چکیں۔“

اسلام میں دیے گئی یہ بات سخت ناپسندیدہ ہے کہ کوئی شخص کسی کو تختہ، ہدیہ، ہبہ یا صدقہ دے کر اس سے واپس مانگے۔ ایسی ذلیل حرکت کرنے والا گویا اپنی قے خود چاٹ لینے والا ہے۔ جیسا کہ متفق علیہ حدیث ہے:

((فَإِنَّ الْعَادِيَنِ فِي صَدَقَتِهِ كَالْكُلْبِ يُعُوذُ فِي قَبْيَتِهِ))

(صحیح مسلم، رقم: 4163، صحیح بخاری، رقم: 1490)

”بے شک اپنا صدقہ واپس لینے والا شخص اُس نگتے کی طرح ہے جو اپنی قے خود چاٹتا ہے۔“

لیکن کسی شوہر کا اپنی بیوی کو طلاق دے کر رخصت کرتے وقت ایسی شرمناک حرکت کرنا کہ وہ اس کو دیے ہوئے تختے تھائے تھائے واپس لے، انتہائی کینگی اور بے غیرتی ہے۔
بلکہ قرآن نے ایسے موقع پر یہ تاکید کی ہے کہ ہر قسم کی طلاق کے بعد عورت کو کچھ دے والا کر رخصت کیا جائے اور فرمایا ہے کہ:

﴿وَلِلْمُطَّلَّقِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ طَحَّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴾ (البقرہ 2: 241)

”اور جن عورتوں کو طلاق دی جائے ان کو دستور کے مطابق کچھ دے والا کر رخصت کرو۔ یہ اللہ سے ڈرنے والوں کی ذمہ داری ہے۔“

﴿إِلَّا أَن يَخَاْفَ أَلَا يُقْيِسَا حُدُودَ اللَّهِ طَفَّلُمْ أَلَا يُقْيِسَا حُدُودَ اللَّهِ طَفَّلُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ طَفَّلُمْ﴾ (229)

فرمایا، میاں بیوی کی ناجاٹی کی صورت میں اگر بیوی اپنے خاوند کو کچھ مال دے کے طلاق حاصل کر لے تو یہ جائز ہے۔ اصطلاح میں اسے ”خلع“ کہا جاتا ہے۔ اور یہ بھی طلاق کی ایک قسم ہے۔

خلع کا معاملہ اگر گھر پر طے ہو جائے تو تھیک، ورنہ عدالت میں جائے گا اور عدالت صورت حال کا جائزہ لے کر اگر بیوی کے حق میں فیصلہ دیتی ہے اور کوئی مناسب رقم بطور فدیہ مقرر کرتی ہے تو خاوند اپنی بیوی سے وہ فدیہ لے کر اسے طلاق دے گا۔ اور یہ خلع کی طلاق ہو گی جو رجعی نہیں ہوتی بلکہ باس ہوتی ہے۔ اس میں خاوند کو جو عکس حق حاصل نہیں ہوتا۔ البتہ اگر وہ دونوں چاپیں تو باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں۔

جمہور فقہا کے نزدیک خلع کی عدت وہی ہے جو طلاق کی ہے۔ دیے گئے ایک حدیث سے اس کی عدت ایک حیض بھی ثابت ہے۔

خلع سے متعلق چند احادیث یہ ہیں:

- ۱۔ "خلع" یہ ہے کہ کوئی عورت اپنے شوہر کو کچھ دے والا کراس سے طلاق حاصل کر لے۔
- ۲۔ خلع کا معاملہ گھر میں طے ہو سکے تو بہتر ہے اور جو کچھ طے ہو جائے اس کے مطابق اس پر عمل درآمد ضروری ہے۔
- ۳۔ لیکن اگر معاملہ عدالت میں چلا جائے تو عدالت اس بات کی تحقیق کرے گی کہ کیا عورت کو اپنے شوہر سے اس حد تک نفرت ہو چکی ہے کہ اب وہ اپنے شوہر کے ساتھ نباہ نہیں کر سکتی۔ جب یہ معلوم ہو جائے تو عدالت حالات کے لحاظ سے جو فدیہ (یا معاوضہ) چاہے مقرر کر سکتی ہے۔ یہ فدیہ (یا معاوضہ) یہوی اپنے شوہر کو ادا کرے گی جسے قبول کر کے شوہر اپنی یہوی کو طلاق دے دے گا۔
- ۴۔ عام حالات میں شوہر کی رضامندی ہی سے خلع ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ ہٹ وھری کا مظاہرہ کرے یا یہوی کے خاندان کو پریشان کرنے کا روایہ اختیار کرے۔ عدالت کے ہار بار سکن اور طلبی کی جان بوجہ کرتیل نہ کرے اور عدالت میں حاضر ہونے سے گریز کرے تو عدالت کو اختیار حاصل ہے کہ وہ خاوند کی رضامندی کے بغیر بھی خلع کی ڈگری جاری کر دے۔ پھر عدالت کا یہ یک طرز فیصلہ ہی خلع کی طلاق کے قائم مقام ہو جائے گا۔ کیونکہ لوگوں کے حقوق کی حفاظت بہر حال ضروری ہے۔ فتحی موشکافیوں کے ذریعے کسی کی حق تلفی نہیں کی جاسکتی۔
- ۵۔ مناسب یہ ہے کہ جتنا مال شوہر نے یہوی کو پہلے دیا تھا یعنی حق مهر، تو اتنا مال ہی ندیے میں اسے واپس لوٹا دیا جائے، یا مرد چاہے تو یہ فدیہ معاف بھی کر سکتا ہے۔
- ۶۔ یہوی کی طرف سے خلع لینے کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً شوہر ننان نقۃ ندیتا ہو یا وہ نامرد ہو وغیرہ۔
- ۷۔ خلع کی طلاق رجعی طلاق نہیں ہوتی بلکہ یہ باسند ہوتی ہے اور چونکہ اسے عورت نے فدیہ دے کر خریدا ہوتا ہے اس لیے شوہر کو اس طلاق سے رجوع کا حق نہیں ہوتا۔ لیکن اگر یہی میاں یہوی آپس میں راضی ہو جائیں اور دوبارہ نکاح کرنا چاہیں تو اس کی بالکل اجازت ہے۔
- ۸۔ جمہور فقہا کے نزدیک خلع کی عدت وہی ہے جو طلاق کی ہے لیکن بعض فقهاء خلع کی عدت صرف ایک ہی حیض قرار دیتے ہیں۔

﴿تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا وَ مَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴾ (229)

آخر میں فرمایا کہ یہ سارے احکام اللہ کی حدود ہیں۔ ان سے آگے نہ بڑھو۔ ان کی پابندی کرو۔ جو لوگ ان حدود سے تجاوز کریں گے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کریں گے وہ ظالم ہوں گے اور اللہ سبحانہ ایسے ظالموں کو سزا دے گا۔

﴿فَإِنْ طَلَقَهَا فَلَا تَحْلُلُ لَهُ مِنْ بَعْدِ حَلْقِيَّ زَوْجًا غَيْرَهُ فَإِنْ طَلَقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ يُقْبَلَهَا حُدُودَ اللَّهِ﴾ (230)

مطلوب یہ ہے کہ تیسری طلاق دینے کے بعد میاں یوی میں جدائی واقع ہو جاتی ہے اور دونوں میں خاوند یوی کا تعلق بالکل ختم ہو جاتا ہے۔

البتہ ایک مکمل صورت باقی راتی ہے جو یہ ہے کہ طلاق یافتہ عورت نے کسی اور مرد سے نکاح کر لیا اور اس نے اپنی آزاد مرضی سے اسے طلاق دے دی تو اب اس عورت کا نکاح اس کے پہلے خاوند سے درست ہو سکتا ہے بشرطیہ وہ دوبارہ خوشگوار ازدواجی زندگی گزارنے پر آمادہ ہوں۔ لیکن وہ سازشی اور لعنتی نکاح جسے حلالہ کہتے ہیں۔ سخت حرام، بے غیرتی اور ایک قسم کی زنا کاری ہے کہ کوئی مرد کسی عورت سے صرف اس لیے نکاح کرے کہ وہ بعد میں اسے طلاق دیدے گا تاکہ وہ پہلے شوہر کے لیے حلال ہو جائے۔ صحیح حدیث میں ایسے مرد کو کرانے کا سامان (آلٰ یٰسٌنُ الْمُسْتَعَارُ) کہا گیا ہے۔ (ابن ماجہ، رقم: 1936) ایک اور صحیح حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے حلالہ کرنے والے اور جس کے لیے حلالہ کیا جائے، دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔ جامع ترمذی میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((لَعْنَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْمُحَلَّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهُ)) (ترمذی، رقم: 1120)

”رسول اللہ ﷺ نے حلالہ کرنے والے اور جس کے لیے حلالہ کیا جائے، دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔“

اس کے علاوہ جیسا کہ تفسیر ابن کثیر میں اس آیت کی تفسیر کے تحت لکھا ہے کہ امیر امویین عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اسے زنا سمجھتے ہوئے اس پر حرج یعنی سنگ ساری کی سزا دینے کا اظہار فرمایا تھا۔

((وَ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿٢٣٠﴾)) (230)

پھر تاکید کے لیے آخر میں دوبارہ فرمایا کہ یہ سارے احکام اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حدیں ہیں، جن کو کھولوں کریں کر دیا گیا ہے تاکہ لوگ ان کو صحیح اور ان کے مطابق عمل کر کے اجر و ثواب پائیں۔

((وَ إِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ)) (231)

فرمایا جب تم اپنی یویوں کو دو مرتبہ طلاق دے دو تو عدت گزرنے سے پہلے یا تو رجوع کر لو اور دستور کے مطابق ان کو رکھ لو، یا پھر بھلے طریقے سے کچھ دے دلا کر ان کو رخصت کر دو، تو یہ تیسری طلاق ہو جائے گی۔ جس کے بعد میاں یوی میں بالکل عیحدگی ہو گئی۔ ساتھ ہی مرد کے لیے رجوع کا حق بھی ختم ہو گیا۔

((وَ لَا تُمْسِكُوهُنَّ ضَرَارًا إِلَّتَعَدُوا وَ مَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ)) (231)

فرمایا، ایک یادو طلاق دینے کے بعد رجوع کر کے یوی کو رکھ لینا اسے نقصان پہنچانے یا نگ کرنے کے لیے نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ پھر سے خوشگوار ازدواجی زندگی گزارنے کے لیے ہونا چاہیے۔ اگر کوئی خاوند اس لیے رجوع کرے تاکہ عورت کو نگ کیا جائے یا اسے کوئی نقصان پہنچایا جائے یا اسے خلع لینے پر بجور کیا جائے، تو جو کوئی ایسا کام کرے گا وہ خود اپنے اوپر ظلم کرے گا، گناہ کمائے گا اور آخرت میں عذاب کا مستحق ہو گا۔

﴿وَ لَا تَتَّخِذُ وَा أَيْتَ اللَّهُ هُزُواً﴾ (231)

پھر میا طلاق اور رجوع سے متعلق اللہ کی آئیوں کو اور اس کے دوسرے احکام کو مذاق نہ بناؤ، اور ان کی خلاف ورزی نہ کرو۔ بلکہ ان پر ان کی اصل روح (Spirit) کے مطابق عمل کرو۔ کیونکہ اگر مذاق کی صورت میں طلاق دو گے تو وہ بھی واقع اور موثر ہو جائے گی۔

﴿وَ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَ مَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتَابِ وَ الْحِكْمَةِ
يَعْظِلُكُمْ بِهِ﴾ (231)

پھر ارشاد ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو۔ اس کا شکر ادا کرو جس نے تمہیں جاہلیت سے نکال کر اسلام کی دولت عطا فرمائی، جو تمہیں ایسے احکام دیتا ہے جس میں تمہارے لیے بھلانی ہی بھلانی ہے۔ اس کے علاوہ تم قرآن و سنت اور دین کی حکمت و دنائی جیسی نعمتیں ملنے پر بھی اللہ سبحانہ کا شکر کرو اور ان کے مطابق عمل کرو۔

﴿وَ اتَّقُوا اللَّهَ وَ اعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ شَيْءًا عَلَيْهِمْ﴾ (231)

آخر میں تقوے کی تلقین کی گئی کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا علم رکھتا ہے، تمہارے ایک ایک کام کو جانتا ہے اور اس کے مطابق تمہیں جزا اورزادے گا۔

وَ إِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَلَا يَكُلَّغُنَّ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ
يَنْكِحُنَّ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضُوا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ ۚ ذَلِكَ
يُوَعِّظُ بِهِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَ الْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَلِكُمْ
أَذْكُرُ لَكُمْ وَ أَطْهَرُ ۖ وَ اللَّهُ يَعْلَمُ وَ أَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ وَ الْوَالِدَاتُ
يُرْضِعْنَ أُولَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتَّمِّمَ الرَّضَاعَةَ ۖ
وَ عَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَ كُسوَّتِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ لَا تُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا
وُسْعَهَا ۗ لَا تُضَارَّ وَ الْدَّةُ ۝ بِوَلَدِهَا وَ لَا مَوْلُودُ لَهُ بِوَلَدِهِ ۝ وَ عَلَى الْوَارِثِ
مِثْلُ ذَلِكَ ۝ فَإِنْ أَرَادَ أَصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَ تَشَاءُرٍ فَلَا جُنَاحَ
عَلَيْهِمَا ۝ وَ إِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أُولَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا

سَلَّمَتُم مَا أَتَيْتُم بِالْمَعْرُوفِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا تَعْمَلُونَ
 بِصَيْرٌ ۝ وَالَّذِينَ يَتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجَهُنَّ تَرَبَّصُنَ بِأَنفُسِهِنَّ
 أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا فَإِذَا بَلَغُنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا
 فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝ وَلَا جُنَاحَ
 عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَضْنَمْ بِهِ مِنْ خُطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَتْنَمْ فِي أَنفُسِكُمْ
 عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذَكُرُونَهُنَّ وَلَكُنْ لَا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرَّا إِلَّا أَنْ
 تَقُولُوا قَوْلًا مَعْرُوفًا وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ
 أَجَلَهُ ۝ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ ۝ وَاعْلَمُوا

۱۷۴ أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ

”اور جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دے دو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو ان کو اس سے نہ روکو کہ وہ اپنے پہلے یا (ہونے والے) شوہروں سے نکاح کر لیں، جب کہ وہ دستور کے مطابق آپس میں راضی ہوں۔ یہ ان لوگوں کو نصیحت کی جاتی ہے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ تمہارے لیے یہی طریقہ زیادہ پاکیزہ اور سترہا ہے۔ اور اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔

اور وہ مائیں جن کو ان کے شوہروں نے طلاق دی ہو، اپنے بچوں کو پورے دوسال تک دودھ پلا کیں جب کہ وہ لوگ ان سے پوری مدت دودھ پلانا چاہتے ہوں۔ ایسی صورت میں بچے کے باپ کی ذمہ داری ہے کہ وہ دستور کے مطابق ان عورتوں کو روٹی کپڑا دے۔ ہر کسی کے لیے اس کی گنجائش کے مطابق حکم دیا جاتا ہے۔ نہ کسی ماں کو بچے کی وجہ سے تکلیف دی جائے اور نہ کسی باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے نقصان پہنچایا جائے۔ باپ موجود نہ ہو تو اس کی ذمہ داری اس کے وارث پر ہے اور جب ماں باپ باہمی رضامندی اور آپس کے صلاح مشورے سے بچے کا دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر کوئی گناہ نہ ہوگا۔ اور اگر تم اپنے بچوں کو ماں کی بجائے کسی اور عورت سے دودھ پلانا چاہو تو پھر بھی تم پر کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ اس کا جو معاوضہ دینا طے کرو، وہ دستور کے مطابق ادا کر دو۔ ہر حال میں اللہ سے ڈرو اور یاد رکھو جو کچھ تم کرتے ہو واللہ اسے دیکھ رہا ہے۔“

”اور تم میں سے جو لوگ مر جائیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑ جائیں تو ان بیواؤں کو چار مہینے دس دن کی عدت گزارنی چاہیے۔ اس مدت کے بعد وہ دستور کے مطابق کہیں نکاح کر لیں تو اس کا تم پر کوئی گناہ نہیں۔ اور اللہ تمہارے کاموں سے اچھی طرح باخبر ہے۔“

”اور تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم ان عورتوں کو عدت کے دوران میں اشارے کنائے سے نکاح کا پیغام دے دو، یا اس معاملے کو اپنے تک محدود رکھو۔ اللہ جانتا ہے کہ تمہارے دل میں ایسی عورتوں کا خیال آئے گا لیکن اس دوران خفیہ طور پر ان سے نکاح کی بات کی نہ کرو۔ البتہ دستور کے مطابق ان سے کوئی بات کہہ سکتے ہو۔ مگر جب تک عدت پوری نہ ہو، نکاح کا حقیقتی فصلہ نہ کیا چاہے۔ خوب جان لو کہ اللہ تمہارے دلوں کی بات بھی جانتا ہے، لہذا اس سے ڈردار اور یہ بھی جان لو کہ اللہ جنتے والا حمل والا ہے۔ (235-232)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

تعضِلُوهُنَّ :..... عَضْلُ کے معنی روکنے اور رکاوٹ ڈالنے کے ہیں۔

أَزْوَاجُهُنَّ :..... اس سے ان عورتوں کے آئندہ ہونے والے شوہر مراد ہیں۔

حَوْلَيْنِ :..... (دو سال) حَوْلٌ کے معنی ایک سال یا برس کے ہیں۔ اس کے ہم معنی الفاظ میں عَامٌ ، سَنَةٌ اور حِجَّةٌ (اصل میں حِجَّجٌ آیا ہے جو کہ جمع ہے حِجَّةُ کی) قرآن مجید میں آئے ہیں۔

الْمَوْلُودُكَهُ :..... (وہ جس کا پچھہ ہے) اس سے پچھے کا باپ مراد ہے کیونکہ نسب اسی کا ہے۔

لَا تُكَلَّفْ :..... عربی زبان میں ”تکلیف“ کے معنی ہیں: کسی شخص پر کسی کام کی ذمہ داری سونپ دینا۔

وُسْعَهَا :..... (اس کی طاقت) وُسْعٌ کے معنی ایسی قوت و صلاحیت کے ہیں جس کے ذریعے کوئی کام آسانی کے ساتھ کیا جاسکے اور اس کے کرنے میں کوئی تنگی یا مشقت نہ ہو۔

فِصَالًا :..... فِصَالُ کے معنی فِطَامٌ کے ہیں یعنی پچھے کا دودھ چھڑانا۔ کیونکہ اس کے بعد پچھے اپنی ماں سے کچھ الگ سا (فضل) ہو جاتا ہے اور غذا کھانے کے قابل ہوتا ہے۔

الْكِتَبُ :..... یہ الْمُكْتُوبَ کے معنوں میں ہے یعنی لکھا ہوا، فرض کیا گیا اور لازم کیا گیا۔

﴿وَإِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ إِنْ يَئْتِكُنْ حُنْ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ﴾ (232)

فرمایا جب تم اپنی بیویوں کو ایک یا دو بار طلاق دے دو اور عدت گزار چکی ہو مگر ابھی تک تیری طلاق نہ دی ہو تو وہی یا کسی اور کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ان عورتوں کو نکاح سے روکیں، جب کہ وہ اپنی رضا مندی سے پہلے شوہر کے ساتھ یا ہونے والے دوسرے خاوند سے دستور کے مطابق نکاح کرنا چاہیں۔

مشرکین عرب ایسی صورت میں اپنی بیویوں کو بہت شگ کرتے تھے۔ ان کو طلاق دینے کے بعد اتفاقی طور پر نکاح ثانی سے روکتے تھے۔

اس آیت سے یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ ولی کی اجازت کے بغیر بھی عورت کا نکاح درست ہے۔ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا یہی مسلک ہے۔ لیکن جبکہ فقہا (جن میں امام شافعی رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں) کے نزدیک ولی کی اجازت کے بغیر عورت کا نکاح جائز نہیں ہے۔ ان کی دلیل درج ذیل حدیث ہے جو حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت کی ہے۔

((لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوْلَيْهِ)) (ابوداؤد، رقم: 2085، ترمذی، رقم: 1101، ابن ماجہ، رقم: 1881)
”ولی کے بغیر (عورت کا) نکاح نہیں۔“

اس حدیث کے علاوہ بھی کئی صحیح حدیث ہیں جن میں ولی کے بغیر عورت کے نکاح کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ لیکن صحیح مسلم میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((الثَّيْبُ أَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَلِيَّهَا، وَالْكُرْبُ يَسْتَأْذِنُهَا أَبُوهَا فِي نَفْسِهَا، وَإِذْنُهَا صُمَانُهَا))

(صحیح مسلم، رقم: 3478، ابو داؤد، رقم: 2099، ترمذی، رقم: 1108،نسائی، رقم: 3262)

”شادی کے بعد بے شوہر ہونے والی (مطلقہ یا بیوہ) عورت اپنے بارے میں اپنے ولی سے زیادہ حق رکھتی ہے۔ اور کنواری لڑکی کے نکاح کے لیے اس کا باپ اس سے اجازت حاصل کرے گا۔ اور اس لڑکی کا خاموش رہنا بھی اس کی طرف سے اجازت ہے۔“

اس مسئلے کے حوالے سے درج ذیل امور قابل غور ہیں۔

1۔ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ بالغ لڑکے کے نکاح کے لیے اس کے ولی کا ہونا شرط نہیں ہے۔ وہ اپنا نکاح کرنے میں خود مختار ہے۔

2۔ اس پر بھی سب متفق ہیں کہ نابالغ لڑکی کا نکاح درست ہے۔ مگر یہ نکاح اس کے ولی (سرپرست) کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ گویا نابالغ لڑکی کے نکاح کے لیے ولی کا ہونا ضروری شرط ہے۔ بلکہ وہ نابالغہ کا نکاح زبردستی بھی کراں سکتا ہے اور بالغ ہونے کے بعد لڑکی کو وہ نکاح باقی رکھنے یا فتح یعنی ختم کرانے کا اختیار ہے۔

3۔ بعض صحیح احادیث کی بنیاد پر جبکہ فقہا کے نزدیک بالغہ عورت (خواہ وہ کنواری ہو، یا طلاق یافتہ ہو، یا بیوہ ہو) کے نکاح کے لیے ولی کا ہونا ضروری شرط ہے۔ اس کے بغیر اس عورت کا نکاح درست نہیں ہے۔ مگر امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے ہاں بالغہ عورت کے نکاح کے لیے ولی کی کوئی شرط نہیں ہے بلکہ ولی کے بغیر بھی نکاح ہو سکتا ہے۔

4۔ ہمارے ملک کی اکثریت فقہی کی پیروکار ہے، اس لیے ہماری عدالتیں بھی اس فقہ کی پیروی میں ولی کی اجازت کے بغیر بالغ لڑکی کے نکاح کو جائز قرار دیتی ہیں۔ مگر یہ صورت حال عام طور پر نہایت بھی انک نتائج پیدا کرتی

ہے۔ اس سے نوجوان نسل میں یاری آشنای (Love Affair) کا رجحان فروغ پاتا ہے۔ والدین اور خاندان کی عزت بر باد ہوتی ہے جو موقع پا کر کبھی اپنی مفترور لڑکی کو اس کے شوہر سمیت قتل کر ڈالتے ہیں۔ اس سے جرام میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ صورت حال ہمارے نجح صاحبان اور حنفی علمائے کرام کے لیے لمحہ فکر یہ ہے۔

ہونا تو یہ چاہیے کہ ایسے معاملے میں دیکھا جائے کہ زیادتی کس جانب سے ہوئی ہے۔ ولی کی طرف سے یا لڑکی کی جانب سے۔ ولی کی طرف سے زیادتی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ دولت کے لائق میں اپنی جوان لڑکی کا نکاح کسی امیر بوڑھے مرد سے کرنا چاہتا ہے اور لڑکی نے تنگ آ کر اپنی شادی خود کرنے کا فیصلہ کر لیا، ایسی صورت میں لڑکی کے حق میں فیصلہ دیا جائے۔ لیکن اگر یہ صورت ہو کہ لڑکی اپنے والدین کی مرضی کے خلاف، ان کی اور ان کے خاندان کی عزت کو محض اپنی خواہش نفس پر قربان کر رہی ہے تو ولی کے حق میں فیصلہ دیتے ہوئے ایسے نکاح کو فتح کر دیا جائے۔

5۔ جمہور کی رائے کے برخلاف جس حنفی فقہ کے سہارے ہماری عدالتیں مفترور لڑکوں کے حق میں فیصلے دیتی ہیں اسی فقہ میں یہ حکم بھی ہے کہ اگر لڑکی اپنی مرضی سے کسی غیر کفوڑ کے سے خود نکاح کر لے، تو ولی ایسے نکاح کو فتح کرانے کا اختیار رکھتا ہے۔ مگر ہماری عدالتیں حنفی فقہ کے اس فتوے پر شاذ و نادر ہی عمل کرتی ہیں اور اس طرح وہ مغرب کے زیر اثر خود حنفی فقہ کے بارے میں بھی اپنا دو ہر امعیار (Double Standard) رکھتی ہے۔

﴿ذلِكَ يُوعظُ بِهِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ (232)

فرمایا، ان عورتوں کے بارے میں نکاح کا یہ حکم ایک ایسی نصیحت ہے جو ہر اس شخص کو قبول کرنی چاہیے جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اور اپنی خواہش نفس کی پیروی کرنے والا ہے۔ اس لیے اسے چاہیے کہ ایسی عورتوں کے نکاح میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہ ڈالے۔

﴿ذلِكُمْ أَذْكُرُ لَكُمْ وَأَطْهَرُ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ (232)

کیونکہ ایسی عورتوں کے نکاح میں، خواہ یہ پہلے شوہر کے ساتھ تجدید نکاح کی صورت میں ہو، یا دوسرا شوہر سے نکاح ثانی کی صورت میں، کتنی برکت اور فائدہ ہے اور اس سے کس قدر پا کیزگی اور پاک و امنی حاصل ہوتی ہے، اسے تم نہیں جانتے ہو، صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

﴿وَالْوَالِدَاتُ يُرِضِّعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتَّمِّمَ الرَّضَاعَةَ﴾

(233)

مطلوب یہ ہے کہ ہر ماں، خواہ وہ مطلقة ہو یا غیر مطلقة، اپنے بچے کو پورے دو (2) سال دو دھ پلانے کیونکہ رضاعت کی پوری مدت یہی ہے۔ یہ رضاعت بچے کا حق ہے اور یہ ماں باپ پر واجب ہے۔

﴿وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَ كَسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ لَا شَكَفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا﴾

(233)

مراد یہ ہے کہ مطلاطہ ماں کے دودھ پلانے کی صورت میں اس کے لیے روٹی کپڑے (نان و نفقہ) کا انتظام بچے کے باپ کے ذمے ہے، جو حالات اور ماحول کے مطابق طے ہوگا۔ لیکن اس بارے میں کسی جان پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجہ نہیں ڈالا جائے گا۔

﴿لَا تُضَارُّ وَالِّدَةُ إِبْرَاهِيمَ وَلَا مَوْلُودُهُ يُوَلِّهُ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ﴾ (233)

مراد یہ ہے کہ مطلاطہ والدہ کو اس کے بچے کی وجہ سے کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے کہ اس کو نان و نفقہ سے محروم رکھا جائے اور خرچہ نہ دیا جائے، یا اگر وہ بچے کو خود دودھ پلانا چاہتی ہو تو اسے دودھ پلانے سے روکا جائے۔ اسی طرح اگر وہ بچے کو اپنے پاس رکھنا چاہتی ہو تو اس سے بچہ چھین لیا جائے۔ یہ سب صورتیں ماں کو نقصان پہنچانے اور اسے تنگ کرنے کی ہیں۔ لہذا ایسی حرکتوں سے باز رہو۔ اسی طرح باپ کو اس کی حیثیت سے زیادہ خرچہ دینے کے لیے مجبور نہ کیا جائے۔ غرض والدین میں سے کسی کو بھی ان کے بچے کی وجہ سے کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے کیونکہ ایسا کرنا سخت گناہ ہے۔ پھر اگر باپ موجود نہ ہو تو بچے کے سر پرست یا ولی پر وہی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جو بچے کے باپ کی ہیں۔

﴿فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوِرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا﴾ (233)

پھر اگر والدین باہمی رضا مندی اور آپس کے مشورے سے کسی مصلحت کے تحت رضا عatts کی اس مدت کو کم کر لیں تو یہ بھی جائز ہے اور اس پر اُن کو کوئی گناہ نہ ہوگا۔

﴿وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْ لَا دَلَمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا أَتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ﴾ (233)

اور اگر باپ اپنے بچے کو کسی اور عورت سے دودھ پلانا چاہے تو اس کی بھی اجازت ہے، بشرطیکہ دستور کے مطابق جو معاوضہ دینا طے کیا جائے وہ پورا ادا کر دیا جائے۔

﴿وَالْقُوَّاللَهُ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾ (233)

آخر میں فرمایا ہر معاملے میں اللہ سبحانہ سے ڈرتے رہو۔ اس کے احکام کی نافرمانی سے بچو اور ہمیشہ یاد رکھو کہ تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے اور وہ اس کا تم سے حساب لے گا۔

﴿وَالَّذِينَ يَتَوَفَّونَ مِنْكُمْ وَيَدْرُونَ أَزْوَاجَهُمْ تَرَبَّصُنَ بِأَنْقُسْهُنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا﴾ (234)

طلاق کی عدت کے بعد اب وفات کی عدت کا ذکر آگیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن عورتوں کے خاوند فوت ہو جائیں تو ان یہ واوں کو چار (4) مہینے دیں (10) دن کی عدت گزارنی چاہیے۔ یہ ان پر واجب ہے۔ یہی ہر زیدہ کی عدت ہے۔

عدت خواہ بیوہ کی ہو یا طلاق کی، اس میں عورت پر کچھ شرعی پابندیاں عائد ہوتی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

- 1۔ وہ شوخ رنگیں کپڑے نہیں پہنے گی۔

- 2۔ وہ زینت کے لیے آنکھوں میں سرمنہ نہیں لگائے گی۔
- 3۔ وہ خوشبو استعمال نہیں کرے کی۔
- 4۔ وہ زیورات نہیں پہنے گی۔
- 5۔ وہ ہندی یا خضاب نہیں لگائے گی۔

اس کے علاوہ جب کسی جوان یوہ عورت کی عدت گزر جائے تو اس کے بعد اسے کسی مرد سے ضرور شادی کر لیں چاہیے۔ یہی صحیح اسلامی طریقہ ہے۔

ہمارے ہاں بعض یوہ عورتیں شوہر کے مرتبے ہی میکے چلی جاتی ہیں اور شوہر کے گھر جو عدت گزارنی ہوتی ہے، وہ نہیں گزارتیں، یہ چیز شریعت کے خلاف ہے۔ ایک عام غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف جوان یوہ عورت کے لیے عدت ضروری ہے اور زیادہ عمر کی یوہ عورت کے لیے عدت گزارنا ضروری نہیں ہے۔ حالانکہ یہ عدت شوہر کی وفات اور اس سے جدا کی کامگی اور سوگ بھی ہے، تو کیا زیادہ عمر کی یوہ عورتوں کو اپنے شوہروں کی وفات اور اس سے جدا کی کامگی اور سوگ نہیں ہونا چاہیے؟ جب کہ یہ چیز قرآنی حکم کے علاوہ صحیح حدیث کے حکم کے بھی خلاف ہے۔

﴿فَإِذَا أَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾

(234)

فرمایا جب یوہ عورتوں کی عدت پوری ہو جائے تو اب وہ آزاد ہیں اور دستور کے مطابق اگر چاہیں تو کہیں دوسرا جگہ اپنا نکاح کر سکتی ہیں۔ لیکن اگر وہ حاملہ ہوں تو ان کی عدت وضع حمل (DELIVERY) تک ہے جیسا کہ دوسرے

مقام پر فرمایا:

﴿وَأَوْلَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَن يَضَعُنَ حَمْلَهُنَّ﴾ (الطلاق 4:65)

”اور جو مطلقہ عورتیں حاملہ ہوں تو ان کی عدت وضع حمل تک ہے۔“

﴿وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ حَمِيرٌ﴾ (234)

آخر میں فرمایا تم جو کچھ کرتے ہو اللہ سبحانہ اس سے باخبر ہے پھر جیسے تمہارے اعمال ہوں گے ان کے مطابق وہ جزا و سزادے گا۔

﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَضْتُمْ بِهِ مِنْ خُطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنْتُمْ فِي أَنفُسِكُمْ﴾

(235)

اس مقام پر مردوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ یوہ عورتوں کو ان کی عدت کے دوران میں نہ تو نکاح کا پیغام بھیجنیں اور نہ ان سے منگنی کریں۔ لیکن دل میں ان سے نکاح کا ارادہ رکھنے، یا اشارے کنائے سے بات کر لینے پر کوئی گناہ نہیں۔ جیسے یوں کہا جائے کہ آپ ابھی جوان ہیں، خوب صورت ہیں، مجھے بھی کسی ابھجھے جیوں ساتھی کی تلاش ہے غیرہ۔

﴿عَلَمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتُذْكَرُونَ هُنَّ مَا تَوَاعِدُونَ هُنَّ سِرّاً إِلَّا أَنْ تَقُولُوا
قَوْلًا مَعْرُوفًا وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّى يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ﴾ (235)

مطلوب یہ ہے کہ تم مردوں کا ذکر ضرور کرو گے مگر ان کی عدت کے دران خفیہ طور پر ان سے نکاح کی بات پکی نہ کرو اور نہ نکاح کرو۔ ایسا نکاح حرام ہے۔ پھر جب ان کی عدت گزر جائے تو نکاح کا پیغام بھیج سکتے ہو اور ان سے شادی کر سکتے ہو۔

﴿وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ
عَفُوٌ حَلِيمٌ ﴾ (235)

آخر میں فرمایا کہ یاد رکھو اللہ سبحانہ صرف تمہارے اعمال ہی سے واقف نہیں بلکہ باتوں اور نیتوں کو بھی جانتا ہے۔ اس لیے اس کی پکڑ سے ڈراؤ اس کے کسی حکم کی نافرمانی نہ کرو۔ البتہ برائی کا محض ارادہ کرنے پر وہ تمہارا مواخذہ نہیں کرے گا بلکہ اسے معاف کر دے گا۔ ایک متفق علیہ حدیث میں تو یہ بھی ہے کہ:

((وَمَنْ هُمْ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلُهَا كَتَبَ اللَّهُ عِنْهُ حَسَنَةً كَامِلَةً))

(صحیح بخاری، رقم: 6419، صحیح مسلم، رقم: 338)

”اور جو کسی برائی کا ارادہ کرنے مگر وہ برائام نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایک نیکی لکھ دیتا ہے۔“

پھر یہ بھی یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے ان کو جو اپنے گناہوں سے توبہ کر لیتے ہیں اور وہ تحمل والا بھی ہے کہ گناہوں پر تمہیں فوراً نہیں پکڑتا۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُوْهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا
لَهُنَّ فِرِيضَةٌ وَمَنْتَعُوهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرَهُ وَعَلَى الْمُقْتَرِ قَدَرَهُ
مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ حَقًا عَلَى الْمُحْسِنِينَ وَإِنْ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ
أَنْ تَمْسُوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فِرِيضَةً فَنَصْفُ مَا فَرَضْتُمُ إِلَّا
أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوا الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ
لِلتَّقْوَىٰ وَلَا تَنْسُوا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ

”اور اگر تم اپنی بیویوں کو ایسی حالت میں طلاق دو کہ ابھی ان کو ہاتھ نہ لگایا ہو اور نہ ان کے لیے مہر مقرر کیا ہو تو

دستور کے مطابق کچھ دینا ہوگا۔ خوش حال مرد اپنی حیثیت کے مطابق دے کر رخصت کرے گا اور غریب آدمی اپنی حیثیت کے مطابق۔ یہ لازم ہے نیک لوگوں پر۔

اور اگر تم اپنی بیویوں کو ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دو جب کہ ان کے لیے مہربھی مقرر کر چکے تھے تو جتنا مہر تم نے مقرر کیا، اس کا آدھا ادا کر دو۔ البتہ بیویاں چاہیں تو یہ آدھا بھی معاف کر سکتی ہیں۔ اسی طرح شوہر پورا مہر دینا چاہیں تو بھی دے سکتے ہیں، کیونکہ تقویٰ یہی ہے کہ نرمی اور معافی کا برتاؤ کرو۔ اور کسی حال میں بھی ایک دوسرے سے بھلانی کرنا نہ بھولو۔ بے شک تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔” (237-236)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

تَمَسْوُهُنَّ : یہ مَسْ اور مسَاسَ سے بنا ہے جس کے اصل معنی ہاتھ سے اس طرح بخونے کے ہیں کہ درمیان میں کوئی چیز حائل نہ ہو۔ مگر شریعت کی زبان کے اسلوب میں اس سے جماع مراد ہے۔

فَرِيْضَةُ : اس سے مراد مہر ہے۔

مَتَّعُوهُنَّ : یہ متاع سے ہے جس کے معنی کسی چیز سے واقعی اور عارضی طور پر فائدہ اٹھانے کے ہیں۔ اسی سے متع او ر تَمَتعُ کے الفاظ ہیں جو انہی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔

الْمُؤْسِعُ : یہ اُوسَعَ سے ہے جس کے معنی خوش حالی اور فارغ المابی کے ہیں۔

الْمُقْتَرُ : یہ افْتَرَ سے ہے جس کے معنی نگد دست ہونے کے ہیں۔

الَّذِيْنَ يَبَدِّلُهُنَّ عَقْدَةَ النِّكَاحِ : اس سے شوہر مراد ہے جس کو نکاح کی اگہ باندھنے اور اسے کھول دینے کا اختیار حاصل ہے۔

﴿لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسْوُهُنَّ أُوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيْضَةً﴾ (236)

مطلب یہ ہے کہ اگر نکاح کے وقت مہر مقرر نہ ہوا، یا کبھی خصتی نہیں ہوئی اور میاں بیوی ابھی ملنہیں اور اس موقع پر اگر کسی سبب سے طلاق دینی پڑی تو اس میں کوئی گناہ نہیں اور ایسی طلاق بہر حال موثر ہو جائے گی۔

﴿وَ مَتَّعُوهُنَّ عَلَى الْمُؤْسِعِ قَدَرُهُ وَ عَلَى الْمُقْتَرِ قَدَرُهُ﴾ (236)

فرمایا، ایسی صورت میں نہ تو مہر مثل (ایسی خاندان کی دوسری عورتوں کے مہر کے برابر) واجب ہوگا اور نہ پورا مہر دینا ہوگا، البتہ کچھ مال دینا پڑے گا تاکہ اس طرح عورت کا رشتہ نوٹنے سے اس کو جونقصان پہنچا ہے اس کی کچھ تلافی ہو سکے۔ خوشحال آدمی اپنی حیثیت کے مطابق مال دے گا اور غریب شخص اپنی بساط کے لحاظ سے دے گا۔

﴿مَتَّاعًا بِالْمَعْرُوفِ حَقًا عَلَى الْمُحْسِنِينَ﴾ (236)

فرمایا، اس طرح کی مطلقاً عورت کو کچھ نہ کچھ مال دیا جائے۔ جو لوگ اللہ سماج سے ڈرتے ہیں، ظلم و زیادتی کو ناپسند کرتے ہیں اور ہر معاملے میں دوسروں سے بھلائی کرتے ہیں، ان کو چاہیے کہ وہ ضرور کچھ مال ایسی عورتوں کو دیں۔ چونکہ اس مال کی نوعیت اور مقدار کا تعین قرآن و سنت کی کسی نص سے ثابت نہیں ہے، اس لیے اس بارے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہو گیا ہے۔ بعض نے اسے واجب اور کچھ نے مستحب قرار دیا ہے۔ فقہی میں اس کی مقدار کم سے کم پانچ درہم اور زیادہ سے زیادہ نصف مہر مثلاً سے کم ہے۔ یا تین کپڑوں کا وہ جوڑا ہے جو عام طور پر ایک مسلمان عورت پہنچتی ہے۔

﴿وَ إِنْ طَلَّقْتُهُنَّ مِنْ قَبْلٍ أُنْ تَمْسُوهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمُ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمُ﴾ (237)

اب ایسی طلاق کا ذکر ہے جو شخصی یا ملاقات سے پہلے دی جائے اور نکاح کے وقت اس کا مہر مقرر کیا جا چکا تھا۔ ایسی صورت میں خاوند کی طرف سے عورت کو آدھا مہر دینا پڑے گا۔

﴿إِنَّمَا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوا النِّسَاءُ عَعْدَهُ عَعْدَهُ الْنِّكَاحِ ۖ وَ أَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّنَفُّوِيِّ ۖ وَ لَا تَنْسُوا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ﴾ (237)

البنت عورت خود یا اس کا ولی یا آدھا مہر یا اس کا کچھ حصہ معاف بھی کر سکتا ہے اور خاوند چاہے تو آدمی کے بجائے پورا مہر بھی دے سکتا ہے۔ کیونکہ تقویٰ یہی ہے کہ مرد اور عورتیں ایک دوسرے سے اچھا برداشت کریں، باہمی خیر خواہی اور بھلائی کریں خواہ اس کے لیے اپنا حق بھی چھوڑنا پڑے، یا دوسرے کو اس کے حق سے زیادہ دینا پڑے۔ صرف اسی طریقے سے انسانوں کے باہمی تعلقات خوشگوار رہ سکتے ہیں۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾ (237)

آخر میں فرمایا کہ اللہ سماج ہر شخص کے اعمال دیکھ رہا ہے اور ان کے مطابق جزا اسزادے گا۔ اس اسلوب میں ایک طرح کی تنبیہ پائی جاتی ہے۔

حَفِظُوا عَلَى الصَّلَوةِ وَ الصَّلُوةُ الْوُسْطَىٰ وَ قُومُوا بِاللَّهِ قُنْتَيْنَ ①
فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا ۗ فَإِذَا أَمْنَتُمْ فَأَذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلِمْتُمُ مَا
لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ۚ ۝ وَ الَّذِينَ يُتَوَفَّونَ مِنْكُمْ وَ يَذْرُونَ أَزْوَاجًا ۗ
وَ صَيَّةً لِلَّأَزْوَاجِهِمْ مَتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ ۗ فَإِنْ خَرَجُنَ

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْتُمْ فِي أَنفُسِهِنَّ مِنْ مَعْرُوفٍ ۚ وَ اللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۚ وَ لِلَّهِ طَلَقٌ مَتَّاعٌ بِالْمَعْرُوفِ ۚ حَقًا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۚ

كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ أَيْتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۚ

”(مسلمانو!) ساری نمازوں کی پابندی کرو اور خاص طور پر درمیانی (عصر کی) نماز کی۔ اور اللہ کے سامنے عاجزی سے کھڑے ہوا کرو۔ دشمن کا خطرہ ہو تو پیدل یا سوار، جس حالت میں بھی تم ہو، نماز پڑھ لیا کرو، جب انہوں ہو تو اللہ کو اس طریقے سے یاد کرو جو اس نے سکھایا ہے اور جو تمہیں پہلے معلوم نہ تھا۔

اور تم میں سے جو لوگ مرنے کے قریب ہوں اور ان کی بیویاں ہوں تو وہ اپنی بیویوں کے لیے وصیت کر جائیں کہ ایک سال تک ان کو گھر میں رکھ کر خرچ دیا جائے پھر اگر وہ خود گھر چھوڑنا چاہیں تو دستور کے مطابق اپنے بارے میں جو کچھ کریں گی، اس کا تم پر کوئی الزام نہیں۔ بے شک اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

اور جن عورتوں کو طلاق دی جائے انھیں دستور کے مطابق کچھ دے دلا کر رخصت کرو۔ یہ اللہ سے ڈرنے والوں کی ذمہ داری ہے۔ اس طرح اللہ تھہارے لیے اپنے احکام کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم سمجھو۔“ (242-238)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

حَفِظُوا :..... یہ حافظ یعنی حفاظت مَحَافَظَة سے ہے حافظ علی اشیاء کے معنی ہیں کسی کام کو بار بار اور ہمیشہ پابندی سے کرتے رہنا۔

الصَّلَوةُ :..... اس سے پانچ وقت کی فرض نمازیں مراد ہیں جو قرآن، سنت اور اجماع امت سے ثابت ہیں۔

الصَّلُوةُ الْوُسْطَىُ :..... اس کے معنی درمیانی یا افضل نماز کے ہیں۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ یہ کون سی نماز ہے۔ اکثر مفسرین نے اس سے عصر کی فرض نماز مراد لی ہے۔

قِنْتِيْنَ :..... یہ قیامت کی جمع سالم مذکور ہے۔ اس کا مصدر قوت ہے جس کے معنی پوری توجہ اور نہایت خشوع و خضوع کے ہیں۔

حَقًا :..... اس کے معنی حق اور ذمہ داری کے ہیں جو بعض صورتوں میں واجب اور بعض حالتوں میں مستحب ہے۔

﴿ حَفِظُوا عَلَى الصَّلَوةِ وَ الصَّلُوةُ الْوُسْطَىُ ﴾ (238)

فرمایا، تمام فرض نمازوں کی پابندی کرو اور خاص طور پر ”صلوٰۃ الوسطیٰ“ کی۔ اس میں بہت اختلاف ہے کہ صلوٰۃ

وسطیٰ سے کیا مراد ہے؟

جمهور مفسرین نے اس سے عصر کی نماز مرادی ہے اور ہمارے نزدیک بھی صحیح ہے۔ کیونکہ صحیح احادیث میں صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ اس سے نماز عصر مراد ہے۔ ظاہر ہے صحیح حدیث کی موجودگی میں کسی اور کا قول جست اور معنی نہیں ہو سکتا۔

صحیح بخاری میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوہ خندق کے موقع پر فرمایا:

((مَلَّ اللَّهُ بِيُوتِهِمْ وَقُبُورِهِمْ نَارًا، شَغَلُونَا عَنْ صَلَاتِ الْوُسْطَىٰ حَتَّىٰ غَابَتِ الشَّمْسُ))

(صحیح بخاری ، رقم: 2931)

”اللہ تعالیٰ ان (مشرکین) کے گروں اور قبروں کو آگ سے بھردے جنہوں نے ہمیں درمیانی

نماز (عصر) پڑھنے کی فرصت نہیں دی، یہاں تک کہ سورج ڈوب گیا۔“

یہی حدیث صحیح مسلم، رقم 1420، اور ترمذی رقم 2984 میں بھی موجود ہے۔

تمام نمازوں کا ذکر کر کے اس میں ایک خاص نماز کا الگ سے ذکر کیا گیا تاکہ اس کی اہمیت نمایاں ہو جائے۔ یہ بھی

قرآن کا ایک اسلوب ہے کہ وہ عام کو بیان کرنے کے بعد خاص کا ذکر کر دیتا ہے۔ جیسے

1. (وَ إِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّنَ مِيثَاقَهُمْ وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُوحٍ وَ إِبْرَاهِيمَ وَ مُوسَى وَ

عِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ) (الاحزاب 7:33)

”(اے نبی ﷺ یاد کریں) جب ہم نے تمام نبیوں سے ان کا عہد لیا۔ آپ ﷺ سے بھی، نوح،

ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہ السلام سے بھی (عہد لیا)۔“

اس آیت میں پہلے تمام انبیاء کرام کا عام ذکر کر کے پھر ان میں سے چند کا خاص طور پر ذکر کیا گیا۔

2. (فِيهَا فَاكِهَةٌ وَ نَخْلٌ وَ رَمَانٌ) (الرحمن 55:68)

”ان دو (باغوں) میں پہل میوے، بھجوریں اور انار ہوں گے۔“

اس جگہ پہلے پہل میووں کا عام ذکر کیا گیا اور پھر بھجوروں اور اناروں کا خاص طور پر ذکر کیا گیا حالانکہ وہ پھل میووں میں شامل تھے۔

﴿وَ قَوْمُوا بِلِلَّهِ قُنْتِيْنَ﴾ (238)

اس کے شانِ نزول کے بارے میں تفسیر طبری میں مجاہد الحنفیہ کا یہ قول موجود ہے کہ شروع میں صحابہ کرام نماز کے دوران میں ایک دوسرے سے بات چیت بھی کر لیتے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اس سے یہ مراد ہے کہ نماز کی حالت میں عاجزی اور فرمائ برداری کے ساتھ مودب ہو کر کھڑے ہونا چاہیے اور اس دوران میں گفتگو اور بات چیت بالکل منع ہے کیونکہ اس سے نمازوٹ جاتی ہے۔

﴿فَإِنْ خَفِتُمْ فَرِجَالًا أَوْ زَلْبَانًا﴾ (239)

اس آیت میں نمازِ خوف کا ذکر ہے اور قرآن کی سورہ النساء 4 آیت نمبر: 101، 102 میں اس کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔

مطلوب یہ ہے کہ دشمن (یا درندوں) کے خوف کی حالت میں پیدل یا سوار، جس حالت میں بھی ہو، نماز پڑھلو، خواہ قبلہ رُو ہو کر، یا بغیر قبلے کی طرف منہ کیے۔ اور چاہے حرکات و سکنات پوری ہوں یا کم ہوں۔

﴿فَإِذَا أَمْتَهُمْ فَأَذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلِمْتُمْ مَا لَمْ تَعْلَمُوا﴾ (239)

پھر جب خوف کی حالت باقی نہ رہے تو امن و اطمینان کے ساتھ، قبلہ رُو ہو کر، قیام کرتے ہوئے نماز پڑھو۔ اس جگہ فَإِذَا كُرُوا اللَّهَ (پھر اللہ کا ذکر کرو) میں ذکر سے مراد نماز ہے کیونکہ نماز دراصل ذکرا ذکار ہی کا مجموعہ ہے جسے تسبیح، تحمید، تشهد اور قرأت وغیرہ۔

قرآن نے ایک اور مقام پر ذکرِ اللہ (اللہ کے ذکر) سے نمازِ جمعہ مراد لی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِي لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعُوا إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ﴾ (الجمعة 9:62)

”لے ایمان والوا جب جمعہ کے دن کی نماز کے لیے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف چل پڑو اور خریدو فروخت چھوڑ دو۔“

اور شریعت نے ذکر اور نماز کا جو طریقہ سمجھا یا ہے اسی کے مطابق ذکر کرو اور نماز ادا کرو۔ جیسا کہ ایک جگہ فرمایا:

﴿وَإِذْ كُرُوهُ كَمَا هَدَكُمْ﴾ (البقرہ 2:198)

”اور اللہ کو ایسے یاد کرو جیسے اس نے تمہیں بتایا ہے۔“

﴿وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصَيْلَةً لِلأَزْوَاجِهِمْ مَتَّاعًا إِلَى الْحَوْلِ عَيْرًا إِخْرَاجٍ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَعْرُوفٍ﴾ (240)

اس سے پہلے نماز کا ذکر آیا ہے لیکن اس سے بھی پہلے نکاح و طلاق وغیرہ عائلی احکام کا مضمون بیان ہوا تھا۔ اب یہ آئیں پہلے مضمون ہی کا گویا ضمیمه یا تتمہ (SUPPLEMENT) ہے۔

مراد یہ ہے کہ جو خاوند نے کے قریب ہوں اور ان کی بیویاں موجود ہوں تو وہ اپنی بیویوں کے حق میں یہ وصیت کر جائیں کہ ان کو ایک سال تک اسی گھر میں رکھ کر نان و نفقة یعنی خرچہ دیا جائے۔

لیکن اگر وہ بیوائیں سال ختم ہونے سے پہلے ہی وہاں سے چلی جائیں اور دستور کے مطابق کہیں اور جگہ شادی کر لیں تو اس میں کوئی حرج نہیں اور ان کے کسی ولی یا سرپرست کو اس پر کوئی گناہ نہ ہو گا۔

یاد رہے اس آیت کا حکم بعد میں منسوخ ہو گیا تھا۔ جب بیواؤں کے لیے چار(4) ماہ وس (10) دن کی عدت مقرر ہو گئی (البقرہ 2:234) اور راغت میں بھی ان کا حصہ متعین ہو گیا۔ (النساء 4:12)

﴿وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ (240)

آخر میں فرمایا اللہ سبحانہ غالب اور زبردست ہے کہ جو اس کی نافرمانی کرے گا، اسے وہ سزا دینے کی تدریت و طاقت رکھتا ہے۔ اور حکمت والا ہے کہ بندوں کو ایسے احکام دیتا ہے جن میں ان کا مغادہ ہوتا ہے۔

﴿وَ لِلّٰهِ طَلَقٌتِ مَتَّاعٌ بِالْمَعْرُوفِ طَّهٌ عَلٰى الْمُتَّقِيْنَ ﴾ (241)

اس سے پہلے آیت 236 میں صرف ایسی مطلقہ عورت کو مناسب مال دے کر رخصت کرنے کا ذکر تھا جس کی ابھی رخصتی نہ ہوئی ہو اور جس کا مہر بھی مقرر نہ ہوا ہو۔

اب اس آیت کا حکم عام مطلقہ عورت کے لیے ہے کہ اسے بھی کچھ دے والا کر رخصت کرنا چاہیے، خالی ہاتھ نہیں بھیج دینا چاہتے۔ اسے بعض فقہاء واجب اور کچھ نے مستحب حکم مانا ہے۔

لیکن ایک رائے یہ بھی ہے کہ اس آیت کے حکم سے مطلقہ کی عدت کا وہ نان و نفقہ اور خرچ مراد ہے جو شوہر پر اس کی مالی حیثیت کے مطابق واجب ہوتا ہے۔

﴿كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ أَيْتَهُ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴾ (242)

مطلوب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ اپنے یہ احکام (بھی نکاح، طلاق، عدت، رضاعت وغیرہ) وضاحت سے بیان کرتا ہے تا کہ تم لوگ ان کو اچھی طرح سمجھو لو کہ یہ سارے احکام بندوں کے فائدے کے لیے ہیں۔ ان میں سے ہر حکم اپنے پیچھے عقلی بنیاد رکھتا ہے اور مصلحت و حکمت پر مبنی ہے۔ ان احکامات پر عمل کر کے دنیا اور آخرت کی فلاں و کامرانی حاصل کی جا سکتی ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ :..... (تا کہ تم عقل سے کام لو) کے الفاظ ظاہر کر رہے ہیں کہ دین اسلام کے جملہ احکام میں عقل و حکمت کا فرماء ہے۔

**الْهُ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ هُمُ الْوُفُوقُ حَذَرَ الْمَوْتُ فَقَالَ
لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوا فَلَمَّا أَحْيَاهُمْ إِنَّ اللّٰهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ
وَلِكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿٢٤٣﴾ وَ قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَ أَعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ
سَيِّعُ عَلَيْمٌ ﴿٢٤٤﴾ مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَعِّفَهُ لَهُ
أَضْعَافًا كَثِيرَةً وَ اللّٰهُ يَعْصِمُ وَ يَعْصِمُ وَ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢٤٥﴾**

”کیا تم نے ان لوگوں کے واقعہ پر غور کیا جو ہزاروں کی تعداد میں تھے اور موت کے ذر سے اپنے گھروں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اللہ نے ان کو موت کی نیز سلا دیا اور پھر زندہ کر دیا۔ بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر فضل

فرماتا ہے مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔

(مسلمانو) اللہ کی راہ میں جہاد کرو اور یقین رکھو اللہ سنتے والا جانے والا ہے۔ کون ہے جو اللہ کو اچھا قرض دے؟ پھر اللہ اس کے قرض کوئی گناہ بڑھا کر ادا کرے گا۔ (روزی اللہ کے ہاتھ میں ہے) وہ جسے چاہے کم دے اور جسے چاہے زیادہ دے آخر تم سب کو اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔“ (243-245)

آیات کی تفسیر:

﴿اللَّهُ تَرَ إِلَى الَّذِينَ حَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمُ الْوُفُّ حَدَّدَ الْمُوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوْتُوا۝ ثُمَّ أَحْيَاهُمْ۝﴾ (243)

قرآن مجید بعض اوقات کسی خاص واقعہ (Event) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تر (کیا تو نے نہیں دیکھا؟) کا اسلوب اختیار کرتا ہے۔ اس اسلوب میں کوئی خاص فرد یا گروہ مخاطب نہیں ہوتا بلکہ یہ خطاب عام ہوتا ہے جس میں ہر وہ شخص مخاطب ہوتا ہے جس تک یہ بات پہنچے یا جو بھی یہ بات سن رہا ہے۔ پھر اس میں ع (کیا؟) کا حرف استفهام بھی سوال کے لیے نہیں ہوتا بلکہ تجب کے اظہار کے لیے پاہنچ آموزی کے لیے آتا ہے۔ اسی طرح تر (دیکھنا) کا الفاظ بھی دیکھنے کے لیے نہیں بلکہ جانے اور علم ہونے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔
اس آیت کی تفسیر میں اختلاف ہے۔

بعض مفسرین کے نزدیک یہ سرے سے کوئی واقعہ ہی نہیں ہے بلکہ محض ایک تمثیل (مثال) ہے جس کا مقصد سبق آموزی اور عبرت ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اسے ایک تمثیل سمجھنا اور اس کے ایک واقعہ ہونے کا انکار کرنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں اللہ تر کا اسلوب عام طور پر کسی واقعہ (Event) ہی کے لیے آتا ہے اور فرضی واقعہ کے لیے نہیں آتا۔ جیسا کہ آگے اسی سورۃ کی آیت 246 میں اللہ تر کے ساتھ ہی اسرائیل کا ایک تاریخی واقعہ بیان کیا گیا ہے۔
اس کے علاوہ اس اسلوب کی چند مثالیں یہ ہیں:

﴿اللَّهُ تَرَ إِلَى الَّذِينَ حَاجَ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنَّ أَنَّهُ اللَّهُ الْمُلْكُ﴾ (البقرہ 2:258)
”کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور نہیں کیا جسے اللہ نے بادشاہی عطا کی تھی، اس نے بادشاہی کے غرور میں ابراہیم علیہ السلام سے اس کے رب کے بارے میں مجھڑا کیا۔“

﴿اللَّهُ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبِّكَ بِأَصْحَابِ الْقِفْيلِ﴾ (الفیل: 1)
”کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟“

﴿اللَّهُ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبِّكَ بِعَادِ﴾ (الفجر 89:6)
”کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے قومِ عاد کے ساتھ کیا سلوک کیا؟“

کچھ دوسرا مفسرین یہ کہتے ہیں اس آیت میں بنی اسرائیل کا ایک واقعہ بیان ہوا ہے کہ جس میں ان کے ہزاروں لوگ طاعون کی وبا سے بچنے کے لیے اپنے شہر سے نکل بھاگے تھے۔ پھر جب وہ کسی اور جگہ بچنے تو اچانک وہ سارے مر گئے۔ پھر وہاں سے ایک بنی گزرے تو ان کی دعا سے وہ تمام مردے زندہ ہو گئے۔

ہم سمجھتے ہیں یہ واقعہ اسرائیلیات میں سے ہے اس لیے ناقابل اعتبار ہے۔ اس کے علاوہ یہ عقل و نقل کے بھی خلاف ہے۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ بعض لوگوں نے بیان کیا ہے کہ ایک زمانے میں بنی (20) برس تک بنی اسرائیل پر خوف اور بزدی طاری رہی اور یہی ان کی موت تھی۔ اس کے بعد جب اس قوم میں جرأت اور بہادری پیدا ہو گئی تو یہ ان کی زندگی ہو گئی۔ ہماری رائے میں آیت کی یہ تاویل بھی اسرائیلیات کو صحیح ثابت کرنے کی فضول کوشش ہے۔
ہمارے نزدیک اس آیت میں بنی اسرائیل کا وہی قصہ جمل طور پر بیان ہوا ہے جسے قرآن نے سورۃ المائدہ (5) کی

آیات 21 تا 26 میں تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے:

فَيَقُومُ اذْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَ لَا تَرْتَدُوا عَلَى أَذْبَارِكُمْ فَتَنَقْلِبُوا حَسِيرِينَ ۝ قَالُوا يُمُوسَى إِنَّ فِيهَا قَوْمًا جَبَارِينَ هُلْ وَ إِنَّا لَنْ نَدْخُلُهَا حَتَّى يَرْجُوا مِنْهَا فَإِنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنَّا دَخْلُونَ ۝ قَالَ رَجُلٌ مِنَ الَّذِينَ يَخَافُونَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمَا اذْخُلُوا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَإِذَا دَخَلْتُمُوهُ فَإِنَّكُمْ غَلِيُونَ هُ وَ عَلَى اللَّهِ فَتَوَكَّلُوا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ قَالُوا يُمُوسَى إِنَّا لَنْ نَدْخُلُهَا أَبَدًا مَا دَامُوا فِيهَا فَادْهَبْ أَنَّتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هُنَّا قِدُّونَ ۝ قَالَ رَبُّ إِنِّي لَا أَمِلُكْ إِلَّا نَفْسِي وَ أَخِي فَأَرْفَقْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ الْقَوْمِ الْفَسِيقِينَ ۝ قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً هُ يَتَبَيَّهُونَ فِي الْأَرْضِ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَسِيقِينَ ۝ (المائدہ 5: 21 تا 26)

”اے میری قوم! پاک سر زمین فلسطین میں داخل ہو جاؤ، جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے، اور ائے پاؤں نہ پھر جانا، ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ انہوں نے کہا: اے موی! وہاں ایک زبردست قوم موجود ہے ہم ہرگز وہاں نہ جائیں گے جب تک وہ وہاں سے نکل ن جائیں۔ جب وہ نکل جائیں، پھر ہم داخل ہوں گے۔ اس پر دو آدمی جو اللہ سے ڈرنے والوں میں سے تھے، اور ان پر اللہ کا فضل بھی تھا، کہنے لگے ”تم ان پر حملہ کر کے شہر کے پھاٹک میں داخل ہو جاؤ۔ جب تم اس میں داخل ہو جاؤ گے تو فتح تمہاری ہے۔ اور اللہ پر بھروسا کرو، اگر تم ایمان والے ہو۔“ انہوں نے کہا: اے موی! جب تک دشمن کے لوگ وہاں ہیں، ہم داخل نہیں ہوں گے۔ تم اور تمہارا خداوند، دونوں جا کر لڑو، ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ موی علیہ السلام نے کہا: اے میرے رب! میرا اپنے سوا اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر زور نہیں۔ تو ہمارے اور اس نافرمان قوم کے درمیان جدائی کر دے! اللہ نے فرمایا: وہ ملک ان پر چالیس (40) سال کے لیے حرام کر دیا گیا۔ یہ لوگ زمین پر

بھکتے پھریں گے۔ اے موی علیہ السلام! تم ان نافرمان لوگوں کی حالت پر افسوس نہ کرو۔“
اس سے معلوم ہوا کہ مصر کی غلامی سے نجات پانے کے بعد بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنا آبائی وطن فلسطین حاصل کرنے کے لیے وہاں پر قابض، غاصب قوم کے خلاف جہاد کریں۔ مگر انہوں نے لڑنے سے انکار کر دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ سزا دی کہ وہ چالیس (40) برس تک صحراء میں بھکتے پھرتے رہیں۔ پھر جب وہ غلامانہ ذہانت کی بزدل نسل ختم ہوئی تو صحراء میں پلی ہوئی تی جفاکش نسل نے یوش بن نون (حضرت موی علیہ السلام کے خلیفہ) کی کمان میں فلسطین فتح کر لیا کیونکہ اس وقت تک حضرت موی علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام وفات پا چکے تھے۔

زیرنظر آیت میں بنی اسرائیل کی پہلی بزدلی کے وفات پا جانے اور ان کی جگہ نئی بہادر جفاکش نسل کے پیدا ہو جانے کو بالترتیب ان کی موت اور ان کی زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلِ عَلَى النَّاسِ وَلَكِنَّ الْكُثُرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴾ (243)

آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر برا فضل و کرم کرتا ہے کہ ان کو جہاد کا حکم دیتا ہے جس میں ان کے لیے عزت و وقار اور دنیا و آخرت کی بھلانی ہے، مگر اکثر لوگ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایت و رہنمائی کی قدر نہیں کرتے اور ناشکری کرتے ہیں۔

﴿وَقَاتَلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَيِّعُ عَلَيْمٌ ﴾ (244)

بنی اسرائیل کے واقعے سے عبرت دلانے کے بعد اب مسلمانوں کو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ فرمایا گیا ہے کہ دیکھو اللہ تعالیٰ، تمہاری ہر بات سنتا، تمہارے حالات سے پوری طرح واقف اور سب کچھ جانتا ہے۔ لہذا وہ جہاد کا حکم دے کر تمہیں بے سہار انہیں چھوڑ دے گا بلکہ قدم قدم پر تمہاری مدد فرمائے گا۔ جس کے نتیجے میں فتح و کامیابی تمہارے قدم چوئے گی۔ وہ ہر جا ہدکو، جو غازی یا شہید ہو گا پورا اجر و ثواب عطا کرے گا۔ لہذا بنی اسرائیل کی طرح تم جہاد کو کبھی نہ چھوڑنا اور اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر ہمیشہ عمل کرتے رہنا۔

صحابہ کرام نے قرآن کے اس حکم پر دل و جان سے عمل کر دکھایا۔ غزوہ بدر کے موقع پر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے، جو قبیلہ غزورج کے سردار تھے، رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا:

الله کی قسم! آپ ﷺ فرمائیں تو ہم سمندر میں کوڈ پڑیں۔ (صحیح مسلم، رقم: 4621)

اسی طرح حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ نے بھی اس موقع پر نبی ﷺ سے کہا تھا کہ:

”ہم موی علیہ السلام کی قوم کی طرح یہ نہیں کہیں گے کہ آپ اور آپ کا خداوند جا کر لڑیں۔ ہم لوگ آپ ﷺ کے دائیں، باکیں، سامنے اور پیچے ہر طرف سے لڑیں گے۔ یہ سن کر نبی ﷺ کا چہرہ مبارک خوشی سے چمک اٹھا۔“

(صحیح بخاری، رقم: 3952)

موجودہ دور میں اسلام و معمون نے اسلامی جہاد کو دشت گردی کا نام دے کر بدنام کرنے کی بھوٹنگی کوشش کی ہے اس لیے اب ہم جہاد و قتال کے بارے میں قرآن و سنت کی روشنی میں تفصیلات بیان کریں گے۔

اسلام اور جہاد و قتال

تمہید:

”جہاد“ کے لفظی معنی ”انہائی کوشش اور جدوجہد کرنے“ کے ہیں۔ اسلامی اصطلاح میں جہاد اُس بھرپور جدوجہد کو کہا جاتا ہے جو اللہ کی راہ میں اُس کے دین کی سر بلندی کے لیے کی جائے۔ اسلام اُمن اور سلامتی کا دین ہے۔ وہ پوری انسانیت کے لیے اُمن و سکون کا پیغام ہے۔ لیکن وہ ظلم و جبراً اور کفر و شرک کے غلبے کے خلاف جہاد کا حکم دیتا ہے۔

جہاد کی کئی قسمیں ہیں:

جہاد بالمال، جہاد بالقلم، جہاد بالسان، جہاد بالنفس اور جہاد بالسیف وغیرہ۔

جہاد بالمال یہ ہے کہ کوئی مسلمان اللہ تعالیٰ کی راہ میں اور دین کی سر بلندی کے لیے اپنا مال خرچ کرے۔

جہاد بالقلم یہ ہے کہ تحریر کے ذریعے دین کے غلبے کی کوشش کی جائے۔

جہاد بالسان یہ ہے کہ زبان کے ذریعے اعلائے کلمۃ اللہ اور دعوت دین کا کام کیا جائے۔

جہاد بالنفس یہ ہے کہ نفسانی خواہشات کے خلاف جہاد کیا جائے۔ اور ان پر قابو پاتے ہوئے نفس کو اللہ و

رسول ﷺ کی اطاعت پر لگایا جائے۔

جہاد بالسیف یہ ہے کہ تکوار و اسلحے وغیرہ کے ذریعے باطل اور کفر کی طاقتوں کے خلاف جہاد کیا جائے۔ اس جہاد کو

قتال بھی کہتے ہیں۔ یہ دفاعی بھی ہوتا ہے اور جارحانہ بھی۔

یاد رہے کہ اردو زبان میں جہاد کا لفظ جہاد کی ان تمام اقسام کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور صرف قتال کے معنوں میں بھی جہاد کا لفظ بولا جاتا ہے۔

جہاد و قتال اسلام میں ایک اہم اور مقدس فریضہ ہے جو قیامت تک جاری رہے گا۔ یہ اہل اسلام کے لیے شوکت و وقار کا ذریعہ ہے۔ اس کو چھوڑنے میں ذلت و نامرادی ہے۔ یہ عام حالات میں فرض کفایہ ہے مگر تفہیر عام (خاص حالات) میں فرض عین بن جاتا ہے جیسے نماز کا حکم ہے۔

جہاد کے بارے میں فقہائے اسلام کی رائے یہ ہے کہ:

((هو (الجهاد) فريضة محكمة و امرًا ماضياً إلى يوم القيمة))

(الفقه الاسلامی مع ادلته از دکتور وہبہ زحلی جلد 6، ص 416)

”جہاد حکم فریضہ ہے جو قیامت تک جاری رہے گا۔“

جہاد کا مقصد:

اسلام میں جہاد و قتل کا اصل مقصد دنیا سے کفر و شرک کے فتنے اور غلبے کو مٹانا، اعلائے کلمۃ اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے کلے کو بند کرنا اور دین حق کا بول بالا کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةً وَيَكُونُ الَّذِينُ كُلُّهُ لِلَّهِ﴾ (الانفال: 89)

”اور تم ان (کافروں) سے لڑو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سارے کا سارا اللہ کے لیے ہو جائے۔“

لہذا جب تک دنیا میں کفر و شرک کا فتنہ اور غلبہ موجود ہے ان کے خلاف مسلمانوں کا جہاد جاری رہے گا۔

((عَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَمْرُتُ أَنْ أَفَاتِلَ النَّاسَ حَتَّىٰ يَقُولُوا: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، فَمَنْ قَاتَهَا، فَقَدْ عَصَمَ مِنْ مَالَهُ وَنَفْسَهُ إِلَّا بِحَقِّهِ وَحِسَابُهُ عَلَى اللَّهِ))

(صحیح بخاری، رقم 2949۔ صحیح مسلم، رقم 125)

”حضرت عمر بن الخطابؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں، جب تک وہ لا الہ الا اللہ کے قاتل نہ ہو جائیں۔ پھر جو اس کا قاتل ہو گیا تو اس نے اپنے مال اور اپنی جان کو مجھ سے بچالیساوائے اس کے حق کے اور اس کا حساب اللہ کے پرداز ہے۔“ (یاد رہے کہ بعض حالات میں صلح بھی ہو سکتی ہے اور جزیہ لینے کی صورت میں ذمیوں کے خلاف جہاد ہیں ہوتا۔)

ایک اور صحیح حدیث میں ہے کہ:

((عَنْ أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ الرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِلْمَعْنَمِ، وَالرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِلَّذِكْرِ، وَالرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِيُرِي مَكَانُهُ، فَمَنْ فِي سَيِّلِ اللَّهِ؟ قَالَ: مَنْ قَاتَلَ لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا، فَهُوَ فِي سَيِّلِ اللَّهِ)) (صحیح بخاری، رقم: 2810۔ صحیح

مسلم، رقم: 4919۔ ابو داؤد، رقم: 2517۔ نسائی، رقم: 3136۔ ابن ماجہ، رقم: 2783)

”حضرت ابو موسیٰ اشعريؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے پوچھا: ایک آدمی مال غنیمت کے لیے لڑتا ہے، ایک شہرت حاصل کرنے کے لیے لڑتا ہے اور ایک اس لیے تاکہ اس کی بہادری کی نمائش ہو تو ان میں سے کون اللہ کے راستے میں لڑتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ جو اس لیے جہاد کرتا ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو، صرف وہی اللہ کے راستے میں جہاد کر رہا ہے۔“

کیا جہاد کے لیے مسلمانوں کی حکومت کا اعلان شرط ہے؟

اسلام نے اقدامی یعنی جارحانہ جہاد و قتال کے لیے جو کہ فرضی کفایہ ہے، بعض شرائط رکھی ہیں جن میں اسلامی حکومت کا قیام اور اس کی طرف سے جہاد کے اعلان کی شرط بھی ہے۔ مگر دفاعی یعنی مدافعانہ جہاد کے لیے جو کہ فرضی عین ہے کوئی شرط نہیں رکھی۔

اہل علم جانتے ہیں کہ اسلام میں نماز جمعہ کی امامت و خطبہ، نماز عیدین کی امامت اور خطبہ، زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا نظام، مناسک حج کی ادائیگی کے لیے امیر حج اور خطبہ حج جیسے تمام امور اصلًا حکمرانوں کی ذمہ داریاں ہیں۔ مگر جب سے مسلم حکمران اپنی ان ذمہ داریوں سے غافل ہوئے ہیں، اہل اسلام اپنے طور پر یہ سارے دینی کام سرانجام دے رہے ہیں۔

بالکل یہی حال جہاد و قتال کا ہے جو کہ بنیادی طور پر مسلم حکمرانوں کی ذمہ داری ہے۔ مگر جب سے انہوں نے دوسرے دینی فرائض کی طرح اس اہم دینی فریضے کو فراموش کر دیا ہے اور اسلام و مسلم عناصر کے فرشت لائن اتحادی بن گئے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کے بعض نیک اور صالح افراد اپنے طور پر منظم ہو کر کفار کے خلاف دفاعی جہاد کر رہے ہیں اور وہ یہ کام قیامت تک کرتے رہیں گے۔ خواہ دنیا پرست آن کو دہشت گرد کہیں یا گالیاں دیں۔

صحیح حدیث میں ہے کہ:

((عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمْرُونَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ تَعَالَى لِنَّ يَرَحَ هَذَا الدِّينُ قَائِمًا ، تُقَاتَلُ عَلَيْهِ عِصَابَةٌ مِنَ الْمُسْلِمِينَ حَتَّى تَقُومَ السَّاعَةُ))

(صحیح مسلم، رقم 4953)

”حضرت جابر بن سمرة رضي الله عنه سے روایت ہے کہ رسول الله ﷺ نے فرمایا: یہ دین (اسلام) ہمیشہ قائم رہے گا۔ قیامت تک مسلمانوں کی ایک جماعت اس کی خاطر جہاد کرتی رہے گی۔“

قرآن و حدیث میں جہاد و قتال کی فرضیت اور اس کے بارے میں تفصیلی فضائل اور احکامات موجود ہیں۔ اس حوالے سے ہم سب سے پہلے قرآنی آیات درج کریں گے اور ان کے بعد احادیث بیان کی جائیں گی۔

قرآن اور جہاد و قتال:

قرآن مجید کفار کے خلاف جہاد و قتال کا حکم دیتا ہے۔ قرآن میں جہاد فی سبیل اللہ کا ذکر 26 مقامات پر آیا ہے اور قتال کا ذکر 79 جگہ پر ہے۔

1. ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ﴾

”(اے مسلمانو!) تم پر قتال (جہاد) فرض کیا گیا ہے۔“

2. ﴿وَقَاتَلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَوْيْغَ عَلَيْمٌ﴾ (البقرة: 244)

”اور (اے مسلمانو!) اللہ کی راہ میں لڑا اور یقین رکھو اللہ سنتے والا اور جانتے والا ہے۔“

3. ﴿فَاتَّلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزِيرَةَ عَنْ يَدِهِمْ صِفْرُونَ﴾ (التوبہ: 29)

”(اے مسلمانو!) تم لڑاؤ ان اہل کتاب سے جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ آخرت کے دن پر جوان چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے جنہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام قرار دیا ہے اور وہ سچے دین کو نہیں مانتے، یہاں تک کہ وہ مغلوب ہو کر خود اپنے ہاتھوں سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔“

4. ﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوَلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرَجْنَا مِنْ هَذِهِ الْقَرِيهَ الظَّالِمُونَ أَهْلَهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيَاهُ وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا﴾ (النساء: 45)

”اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں جہاد و قیال نہیں کرتے۔ اُن بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر جو اللہ کے آگے فرید کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اس بیتی سے نکال جس میں ظالموں کا راج ہے۔ ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی حمایتی پیدا کر دے اور ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی مددگار کھڑا کر دے۔“

5. ﴿فَإِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبُ الرِّقَابِ﴾ (محمد: 47)

”پھر جب (اے مسلمانو!) کافروں سے تمہارا مقابلہ ہو تو ان کی گرد نہیں مارو۔“

6. ﴿وَقَاتَلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ﴾ (البقرۃ: 190)

”اور (اے مسلمانو!) تم اللہ کے راستے میں اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔“

7. ﴿وَقَاتَلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَهَهُ كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَهَهُ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ﴾ (التوبہ: 9)

”اور (اے مسلمانو!) تم سب مل کر مشرکین سے جنگ کرو، جیسے وہ سب مل کر تم سے جنگ کرتے ہیں۔“

8. ﴿يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتُلُوا الَّذِينَ يَلُوئُكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلَيَجِدُوا فِيْكُمْ غِلَظَةً﴾ (التوبہ: 9)

”اے ایمان والو! ان کافروں سے جنگ کرو جو تمہارے آس پاس ہیں اور ضروری ہے کہ وہ تمہارے اندر سخت پائیں۔“

9. ﴿إِنْفِرُوا خَفَافًا وَثِقَالًا وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفِسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ذُلِّكُمْ﴾

حَيْرٌ لِّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ (التوبه: 9)

”اے مسلمانو! تم نکلو، خواہ ہلکے ہو یا بھل اور اپنے مال و جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔ یہ تھارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو۔“

10. **﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمْ أَنْفِرُوا فِي سَيِّئِ الْأَيَّامِ أَقْلَمْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ أَرْضَيْتُمُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ ۚ فَهَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ۝ إِلَّا تَنْفِرُوا يُعَذِّبُكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۖ وَيَسْتَبِدُّلُّ قَوْمًا غَيْرَ كُمْ وَلَا تَضُرُّهُ شَيْئًا ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝**“ (التوبه: 38-39)

”اے ایمان والو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلو تو تم زمین سے چپک جاتے ہو؟ کیا تم آخرت کے معاملے میں دنیا کی زندگی پر راضی ہو گئے؟ آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کا سامان بہت تھوڑا ہے۔ اگر تم نہ نکلو گے تو اللہ تمہیں دردناک سزا دے گا اور تمہاری جگہ دوسرا

قوم لے آئے گا اور تم اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

11. **﴿وَقَاتَلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةً وَيَكُونَ الَّذِينَ كُلُّهُمْ لِلَّهِ ۝** (الانفال: 39)

”اور (اے مسلمانو!) تم کافروں سے لڑو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سارے کا سارا اللہ کے لیے ہو جائے۔“

12. **﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ ۝** (الانفال: 65)

”اے نبی! اموشیں کو جہاد کا شوق دلائیں۔“

13. **﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدُ الْكُفَّارَ وَالْمُنْفِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۝** (التوبه: 73)

”اے نبی! کافروں اور منافقوں کے خلاف جہاد کریں اور ان پر بختی کریں۔“

14. **﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا حُذُّوا جُذُّرَ كُمْ فَانْفِرُوا ثُبَّاتٍ أَوْ انْفِرُوا جَوِيعًا ۝**

(النساء: 4) ”اے ایمان والو! اپنے دفاع کی تیاری کرو۔ پھر دستے بنا کر یا اکٹھے مل کر جہاد کے لیے نکلا کرو۔“

15. **﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرُكُمْ وَيُبَشِّرُكُمْ أَقْدَامَكُمْ ۝** (محمد: 7)

”اے ایمان والو! اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد فرمائے گا۔ اور تمہارے قدم جہادے گا۔“

16. **﴿فَرِحَ الْمُخَلَّفُونَ بِمَقْعِدِهِمْ خَلْفَ رَسُولِ اللَّهِ وَكَرِهُوا أَنْ يُعَاجِهُنَّوَا بِأَمْوَالِهِمْ**

وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَالُوا لَا تَنْفِرُوا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارٌ جَهَنَّمَ أَشَدُ حَرَاطاً لَوْ كَانُوا يَفْقَهُونَ ۝ (التوبہ: 81)

”پیچھے رہ جانے والے منافقین اللہ کے رسول ﷺ سے پیچھے رہنے پر بہت خوش ہوئے اور انہیں گراں گزرا کر وہ اپنے مال اور اپنی جان سے اللہ کی راہ میں چہار کریں۔ انہوں نے لوگوں سے کہا: ”گری میں نہ نکلو، آپ ان سے کہیں: ”وزخ کی آگ اس سے زیادہ گرم ہے۔“ کاش! انہیں سمجھ ہوتی۔“

17. ﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفَا كَانُهُمْ بُنْيَانٌ مَرْصُوصٌ ۝ (مرصوص: 50)

(الصف: 4:61)

”بے شک اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح مل کر رہتے ہیں گویا سیسہ پلاکی ہوئی دیوار ہیں۔“

18. ﴿هَيَأْكُلُهَا الَّذِينَ أَمْنُوا إِذَا لَقِيْتُمْ فِتَّةَ فَاقْبَلُوْا وَأَذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ (45:8)

”اے ایمان والوا جب کسی گروہ سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو، تاکہ تم فلاح پاوے۔“

19. ﴿الَّذِينَ أَمْنُوا وَهَاجَرُوا وَجَهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ أَعَظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللَّهِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ۝ (یہ پیشہ رہبہم برحمۃ منہ ورضوان) وَجَنِیْتُ لَهُمْ فِيهَا نَعِیْمٌ مُقِيمٌ خَلِیدِیْنَ فِيهَا آبَدٌ اِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ (22:9)

(التوبہ: 9:20 تا 22)

”جو لوگ ایمان لائے، انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں اپنے جان و مال سے چہار کیا، ان کا درجہ اللہ کے ہاں بہت بڑا ہے اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔ ان کا رب ان کو خوش خبری دیتا ہے، اپنی رحمت اور خوشودی کی اور ایسے باغوں کی جن میں ان کے لیے دائیٰ نعمتیں ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔“

”بے شک اللہ کے پاس بڑا اجر ہے۔“

20. ﴿وَمَنْ يُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلُ أَوْ يَغْلِبَ فَسَوْفَ نُوَتِيْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (50:9)

(التوبہ: 9:74)

”اور جو اللہ کی راہ میں چہار و قتال کرے، پھر شہید ہو جائے یا غازی ہو، تو ہم اسے بڑا اجر دیں گے۔“

21. ﴿يَأَيُّهَا الَّذِينَ أَمْنُوا هَلْ أَدْلُكُمْ عَلَى تِعْجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِنْ عَذَابَ أَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ فَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ ذَلِكُمْ خَيْرٌ ۝

لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ يَغْفِرُ لَكُمْ ذُنُوبُكُمْ وَيُدْخِلُكُمْ جَنَّتٍ تَجْرُى مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَرُ وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّتٍ عَذْنٍ طَذْلَكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝ وَآخْرٍ تُحْبُّهَا نَصْرٌ مِنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ طَبَشَرِ الْمُؤْمِنِينَ ۝) (الصف 61: 10-13)

”اے ایمان والو! کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں ایک دردناک عذاب سے بچائے۔ تم اللہ اور اُس کے رسول ﷺ پر ایمان رکھو اور اللہ کی راہ میں اپنے ماں اور اپنی جان سے جہاد کرو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانو۔ پھر اللہ تمہارے گناہ بخش دے گا، تمہیں ایسے باغوں میں داخل کرے گا، جن میں شہریں بہتی ہوں گی اور ہمیشہ رہنے والے باغوں میں تمہیں عمدہ گھر عطا کرے گا۔ یہ ہے بڑی کامیابی! اور ایک اور چیز جس کی تم تمنا رکھتے ہو، وہ ہے اللہ کی مدد اور جلد حاصل ہونے والی فتح۔ اور (اے نبی!) آپ ایمان والوں کو خوش خبری دے دیں۔“

22. ﴿إِنَّمَا يَهْبَطُ إِلَيْهَا الَّذِينَ أَمْنَوْا إِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُولُّهُمُ الْأَذْبَارَ ۝ وَمَنْ يُولِّهُمْ يَوْمَئِذٍ دُبْرَةً إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِيَقْتَالُ أَوْ مُتَحَبِّزًا إِلَى فِتْنَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَمَمْوَأْهَةً جَهَنَّمُ طَ وَبِعُسَ الْمُصِيرِ ۝﴾ (الانفال 8: 15-16)

”اے ایمان والو! جب تمہارا مقابلہ کافروں کے لشکر سے ہو، تو پیچھے نہ دکھاؤ اور جس نے ایسے موقع پر پیچھے دکھائی تو اُس پر اللہ کا غضب نازل ہوگا۔ اس کا شکانا جہنم ہے اور وہ بہت ہی براٹھکانا ہے۔ البتہ اگر پیچھے ہٹنا جنگی چال کے لیے ہو یا اپنے دوسرا لشکر سے جانلنے کے لیے ہو تو اس کی اجازت ہے۔“

23. ﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ طَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتَلُونَ وَيُقْتَلُونَ ۝﴾ (التوبہ 9: 111)

”بے شک اللہ نے مومنوں سے اُن کے جان و مال خرید لیے ہیں کہ وہ انہیں ان کے بدالے میں جنت دے گا، وہ اللہ کی راہ میں دوسروں کو ہلاک کرتے ہیں اور خود بھی شہید ہوتے ہیں۔“

24. ﴿قُلْ إِنْ كَانَ أَبَاكُمْ وَأَبْنَاءَكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ وَأَزْوَاجَكُمْ وَعَشِيرَتَكُمْ وَأَمْوَالُ بِنِ اقْتَرَفُتُمُوهَا وَتِجَارَةً تَخْشُونَ كَسَادَهَا وَمَسِكُنْ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ طَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۝﴾ (التوبہ 9: 24)

”کہہ دیجیے، اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان، تمہارا وہ مال جو تم نے کمیا، تمہارا وہ کاروبار جس کے مندا ہونے کا تمہیں اندریشہ ہے اور تمہارے رہنے کے گھر جنہیں تم پسند کرتے ہو، (یہ ساری چیزیں) تمہیں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ اور اُس کی راہ میں جہاد کرنے سے

زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیج دے۔ اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“ درج بالا تقرآنی آیات سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں جہاد و قتال کی بڑی اہمیت ہے۔ ایک اندازے کے مطابق قرآن مجید میں تین پاروں کے جنم کے برابر اسی آیات موجود ہیں جن کا تعلق جہاد و قتال سے ہے۔ جہاد قرآن کی زو سے فرض ہے۔ یہ دفائی بھی ہوتا ہے اور جارحانہ بھی۔ جہاد اللہ کی راہ میں اُن کافروں کے خلاف کیا جاتا ہے جو مسلمانوں کے ملک پر حملہ کریں یا اسلام کے لیے خطرہ بن جائیں۔ یا اسلام کی راہ میں اپنے کفو و شرک اور ظلم و تسم کی وجہ سے رکاوٹ نہیں۔ غیر مسلمون کے کافرانہ اور ظالمانہ اقتدار کا خاتمه کر کے اُن کو ذمی بنانا بھی اس کا ایک حصہ ہے۔ پہلے قریب کے کفار سے نپنا جائے گا، پھر دروازوں سے۔ یہ جہاد و قتال اُس وقت تک جاری رہے گا، جب تک دنیا میں کفو و شرک کے غلبے کا فتحہ باقی ہے۔ اگر مسلمان جہاد نہیں کریں گے تو وہ اللہ تعالیٰ کے قبر و غصب کے مستحق ہوں گے اور دنیا میں ذلت اور غلامی کی زندگی بسر کریں گے۔ جہاد ہر حال میں کیا جائے گا۔ خواہ وسائل کم ہوں یا زیادہ۔ اقدامی جہاد کے لیے چند شرائط ہیں، مگر مدافعانہ جہاد کے لیے کوئی شرط نہیں۔ وہ مجاہدین اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں جو اُس کی راہ میں صفات باندھ کر اس طرح لڑتے ہیں گویا وہ سیسے پلاٹی ہوئی دیوار ہیں۔ مسلمانوں کو جہاد کا شوق دلایا گیا ہے۔ وہ اپنا تحفظ اور دفاع بھی کریں گے اور میدانِ جنگ میں اللہ کا ذکر کرتے ہوئے ثابت تدبی بھی دکھائیں گے۔ اللہ سبحانہ کا وعدہ ہے کہ وہ سچے مسلمانوں کو ہمیشہ فتح و کامرانی عطا فرمائے گا۔ جہاد سے جی چرانا منافقت کی علامت ہے۔ جو مجاہد فتح پائے وہ عازی ہے اور جو مارا جائے وہ شہید ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے دونوں سے جنت کا وعدہ کر رکھا ہے۔

احادیث اور جہاد و قتال:

خود نبی ﷺ نے 27 غزوت میں حصہ لے کر جہاد کیا۔ 56 سال یعنی جنگی مہماں بھیجیں۔ ذیل میں جہاد سے متعلق چند احادیث پیش کی جاتی ہیں:

1- ((عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ †، قَالَ: سُئِلَ رَسُولُ اللَّهِ †: أَيُّ الْعَمَلِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: إِيمَانُ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ. قِيلَ لَهُ مَاذَا؟ قَالَ: "الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ". قِيلَ لَهُ مَاذَا؟ قَالَ: "حَجَّ مَبْرُورٌ".)) (صحیح بخاری، رقم: 26۔ صحیح مسلم 248۔ نسائی: 2624)

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سا عمل افضل ہے؟ فرمایا: اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لانا۔ پوچھا گیا: اس کے بعد کون سا عمل افضل ہے؟ فرمایا: جہاد فی سبیل اللہ۔ پوچھا گیا: اس کے بعد؟ فرمایا: مقبول حج۔“

2- ((عَنْ أَبِي ذِرٍ †، قَالَ: سَأَلْتُ النَّبِيَّ †: أَيُّ الْعَمَلِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: إِيمَانُ بِاللَّهِ وَجِهَادُ فِي سَبِيلِهِ.)) (صحیح بخاری، رقم: 527۔ صحیح مسلم، رقم: 248)

”حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ سے پوچھا: کون سا عمل افضل ہے؟ فرمایا: اللہ پر ایمان لانا اور اُس کی راہ میں جہاد کرنا۔“

3- ((عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَثُلُ الْمُجَاهِدُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ الصَّائِمِ الْقَائِمِ الْقَانِتِ بِآيَاتِ اللَّهِ، لَا يَفْتَرُ مِنْ صِيَامٍ وَلَا صَلوٰةً حَتَّى يَرْجِعَ الْمُجَاهِدُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ .)) (صحیح بخاری، رقم: 2787۔ صحیح مسلم، رقم: 4869)

”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے مجاہد کی مثال ایسے شخص کی ہے جو روزے رکھتا ہو، قیام کرتا ہو، قرآن کی تلاوت کرتا ہو، روزے اور (نفل) نماز میں کوتا ہی، نہ کرتا ہو، یہاں تک کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والا مجاہد واپس لوٹ آئے۔“

4- ((عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنْتَدَبَ اللَّهُ لِمَنْ خَرَجَ فِي سَبِيلِهِ لَا يُخْرِجُهُ إِلَّا إِيمَانُهُ بِيْ وَتَصْدِيقُ بِرْسُلِيْ، أَنْ أَرْجِعَهُ بِمَا نَالَ مِنْ أَجْرٍ أَوْ غَنِيمَةٍ، أَوْ أُدْخِلُهُ الْجَنَّةَ .)) (صحیح بخاری، رقم: 36۔ صحیح مسلم، رقم: 4859)

”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس بات کی ضمانت دی ہے کہ اُس کے راستے میں جو شخص جہاد کرے گا، جب کہ اُسے صرف مجھ پر اور پیغمبر کی طرف پر ایمان کا جذبہ گھر سے نکالے گا، تو میں ایسے شخص کو ثواب یا مال غنیمت کے ساتھ واپس لا دے گا، یا اُسے جنت میں داخل کروں گا۔“

5- ((عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْلَا أَنَّ رِجَالًا مِنَ الْمُسْلِمِينَ لَا تَطِيبُ أَنفُسُهُمْ أَنْ يَتَحَلَّفُوا عَنِيْ، وَلَا أَجِدُ مَا أَخْمَلُهُمْ عَلَيْهِ، مَا تَحَلَّفُتُ عَنْ سَرِيرَةٍ تَغُزوُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ . وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ ، لَوَدَدْتُ أَنْ أُفْتَلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ، ثُمَّ أُحْيَى ، ثُمَّ أُفْتَلُ ، ثُمَّ أُحْيَى ، ثُمَّ أُفْتَلُ .))

(صحیح بخاری، رقم: 2797۔ صحیح مسلم، رقم: 4864۔ نسائی، رقم: 3152)

”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قسم اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ کچھ مسلمان ایسے ہیں جو جہاد میں مجھ سے پیچھے رہنا پسند نہیں کرتے (گھر) میں ان کے لیے سواری کا انتظام نہیں کر سکتا..... تو میں کبھی کسی ایسے لشکر سے پیچھے نہ رہوں جو اللہ کے راستے میں جہاد کے لیے نکلتا ہے۔ اس ذات کی قسم، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں پسند کرتا ہوں کہ میں اللہ کی راہ میں شہید ہو جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید ہوں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید ہوں، پھر زندہ کیا جاؤں پھر شہید ہوں۔“

6- ((عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْرُرْ وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهِ نَفْسَهُ ، مَاتَ عَلَى شَعْبَةِ مِنْ نِفَاقٍ .))

(صحیح مسلم، رقم: 4931۔ ابو داؤد، رقم: 2502۔ نسائی، رقم: 3097)

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جو شخص اس حال میں مرا کہ اس نے نہ جہاد کیا اور نہ اس کے دل میں جہاد کا شوق اُبھر ل تو وہ مخالفت کے ایک حصے پر مرا۔“

7- ((عَنْ أَبِي أُمَامَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنْ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: قَالَ: مَنْ لَمْ يَغْزُ، وَلَمْ يُجَهِّزْ غَازِيًّا ، أَوْ يَخْلُفْ غَازِيًّا فِي أَهْلِهِ بِخَيْرٍ ، أَصَابَهُ اللَّهُ بِقَارِعَةَ قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ .))

(ابو داؤد، رقم: 2503۔ ابن ماجہ، رقم: 2762)

”حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے نہ خود جہاد کیا، نہ کسی مجاہد کو جہاد کا سامان فراہم کیا اور نہ کسی مجاہد کے پیچھے اس کے گھر والوں کی بھالانی کے ساتھ دیکھ بھال کی، تو اُسے اللہ تعالیٰ قیامت سے پہلے کسی مصیبت میں بٹلا کر دے گا۔“

8- ((عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: رِبَاطُ يَوْمٍ فِي سَيِّلِ اللَّهِ، خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا عَلَيْهَا .)) (صحیح بخاری، رقم: 2892)

”سلیل بن سعد رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی راہ میں ایک دن سرحدوں پر پہرہ دینا، دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے اس سے بہتر ہے۔“

9- ((عَنْ أَنَسِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَعْدَوَةٌ فِي سَيِّلِ اللَّهِ أَوْ رَوْحَةٌ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا .)) (صحیح بخاری، رقم: 6415۔ صحیح مسلم، رقم: 4874)

”حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے راستے میں جہاد کے لیے ایک صحیح جانا اور ایک شام جانا، دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے، اُس سے بہتر ہے۔“

10- ((عَنْ سُلَيْمَانَ الْقَارِسِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: رِبَاطُ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ فِي سَيِّلِ اللَّهِ، خَيْرٌ مِنْ صِيَامٍ شَهْرٍ وَقِيَامٍهُ، وَإِنْ مَاتَ جَرِيَ عَلَيْهِ عَمَلُهُ الَّذِي كَانَ يَعْمَلُهُ وَأَجْرِيَ عَلَيْهِ رِزْفَةٌ، وَأَمِنَ الْفَتَنَ .)) (صحیح مسلم، رقم: 4938۔ نسائی، رقم: 8167)

”حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: اللہ کے راستے میں ایک دن اور ایک رات سرحدوں پر پہرہ دینا ایک مہینے کے روزوں اور اس (کی راتوں) کے قیام سے بہتر ہے۔ اگر وہ شخص اسی حالت میں فوت ہو جائے تو جو عمل وہ کرتا تھا، وہ برابر جاری رہے گا اور وہ قبر کے فتنے سے محفوظ رہے گا۔“

11. ((عَنْ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ، قَالَ، قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: مَا أَغْبَرَتْ قَدْمًا عَبْدٌ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، فَتَمَسَّهُ النَّارُ .)) (صحیح بخاری، رقم: 2811۔ تمذی، رقم: 1632۔ نسائی، رقم: 3116) "حضرت ابو عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس آدمی کے قدم اللہ کی راہ میں غبار آؤ دو جوئے اُس پر دوزخ کی آگ حرام ہو گئی۔"

12. ((عَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: أُمِرْتُ أَنْ أَفَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَقُولُوا: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ، فَمَنْ قَالَهَا فَقَدْ عَصَمَ مِنْ مَالَهُ وَنَفْسَهُ إِلَّا حَقَّهُ وَحِسَابُهُ عَلَى اللَّهِ .)) (صحیح بخاری، رقم: 1400، ص1399۔ مسلم، رقم: 124۔ ابو داؤد، رقم: 1556۔ نسائی، رقم: 3091)

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اُس وقت تک جنگ کروں، جب تک وہ لا الہ الا اللہ کے قائل نہ ہو جائیں۔ پھر جو اس کا قائل ہو گیا تو اس نے اپنا مال اور اپنی جان کو مجھ سے بچالیا، سوائے کسی شرعی حق کے اور اُس کا معاملہ اللہ کے پرورد ہے۔"

((نوث: شرعی حق سے مراد ہے جیسے قاتل کو قصاص میں قتل کرنا۔ بعض حالات میں صلح بھی ہو سکتی ہے اور جزیہ لینے کے بعد ذمیوں کے خلاف جہاد نہیں کیا جائے گا۔))

13. ((عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: مَنْ جَهَّزَ غَازِيًّا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَقَدْ غَزا ، وَمَنْ خَلَفَ غَازِيًّا فِي أَهْلِهِ فَقَدْ غَزا .)) (صحیح بخاری، رقم: 2343۔ ص180۔ مسلم، رقم: 4902۔ ابو داؤد، رقم: 2509۔ نسائی، رقم: 3180)

"حضرت زید بن خالد رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کو ساز و سامان مہیا کیا، اُس نے بھی جہاد کیا۔ اور جس نے کسی مجاہد کے اہل و عیال کی دیکھ بھال کی اُس نے بھی جہاد میں حصہ لیا۔"

14. ((عَنْ أَبْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: عَيْنَانِ لَا تَمْسُهُمَا النَّارُ : عَيْنٌ بَكْتُ فِي خَشْيَةِ اللَّهِ، وَعَيْنٌ بَأَتَتْ تَخْرُسُنِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ .)) (تمذی، رقم: 1639) "حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دو آنکھوں کو دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی۔ ایک وہ آنکھ جو اللہ کے خوف سے روئی۔ دوسرا وہ آنکھ جو اللہ کے راستے میں رات پھر پہرہ دیتی رہی۔"

15. ((عَنْ أَبِي مُوسَى رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، فَقَالَ: الْرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِلْمُغْنِمِ، وَالرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِلذِّكْرِ، وَالرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِيُرِي مَكَانَهُ، فَمَنْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ؟ قَالَ: مَنْ قَاتَلَ لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلِيَا، فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ .)) (صحیح بخاری، رقم: 2310، ص180)

مسلم، رقم: 4919۔ ابو داؤد، رقم: 2517۔ نسائی، رقم: 3136۔ ابن ماجہ، رقم: 2783)

”حضرت ابو موسیٰ اشتری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے پوچھا: ایک شخص مال غنیمت کے لیے لڑتا ہے، ایک شہرت حاصل کرنے کے لیے لڑتا ہے اور ایک اس لیے لڑتا ہے کہ اس کی بہادری کی نمائش ہوتا ان میں سے کوئی اللہ کے راستے میں لڑتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اس لیے جہاد کرتا ہے کہ اللہ کا حکم بلند ہو، صرف وہی اللہ کے راستے میں جہاد کر رہا ہے۔“

16۔ ((عَنْ مُعاذِ بْنِ جَبَلَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ يَقُولُ: مَنْ قَاتَلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَوَاقَ نَافِعَةً، فَقَدْ وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ، وَمَنْ جُرِحَ جُرْحًا فِي سَبِيلِ اللَّهِ، أَوْ تُبَكَّبَ نُكْبَةً..... فَإِنَّهَا تَجِدُ يَوْمَ الْقِيَامَةَ كَاغْرِيرًا مَا كَانَتْ، لَوْنُهَا الرَّعْفَرَانُ، وَرِيحُهَا الْمُسْكُ..... وَمَنْ خَرَجَ بِهِ خُرَاجٌ..... فِي سَبِيلِ اللَّهِ، فَإِنَّ عَلَيْهِ طَابَ الشَّهَادَاءِ۔))

(ترمذی، رقم: 1657۔ ابو داؤد، رقم: 2541۔ نسائی، رقم: 3141)

”حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: جس کسی نے اللہ کے راستے میں اونٹی کا دودھ دوئے کے وقت کے برابر جہاد کیا، اس کے لیے جنت واجب ہوگی۔ اور جس شخص کو اللہ کی راہ میں زخم لگا، یا چوٹ لگی تو وہ زخم یا چوٹ قیامت کے دن اتنی بڑی ہوگی جتنی دنیا میں بڑی سے بڑی ہو۔ اس کے خون کا رنگ زعفران کی طرح ہوگا۔ اس کی خوشبوستوری جیسی ہوگی۔ اور جس آدمی کو اللہ کی راہ میں پھوڑا انکل آیا تو بے شک اس پر شہیدوں کا نشان ہے۔“

17۔ ((عَنْ آسِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: إِنْطَلَقَ رَسُولُ اللَّهِ رَبِيعَ الْأَوَّلَ وَأَصْحَابُهُ حَتَّى سَبَقُوا الْمُشْرِكِينَ إِلَى بَذْرٍ وَجَاءَ الْمُشْرِكُونَ. فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ: «فُوْمُوا إِلَى جَنَّةَ عَرْضُهَا السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ» قَالَ عُمَيْرُ بْنُ الْحَمَّامَ: بَخَ بَخَ. فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ: مَا حُمُلْكَ عَلَى قَوْلِكَ: بَخَ بَخَ. قَالَ: لَا، وَاللَّهِ يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِلَّا رِجَاءَ أَنْ أَكُونَ مِنْ أَهْلِهَا. قَالَ: فَإِنَّكَ مِنْ أَهْلِهَا. قَالَ: فَأَخْرَجَ تَمَرَاتٍ مِنْ قَرْبِهِ، فَجَعَلَ يَأْكُلُ مِنْهُنَّ. ثُمَّ قَالَ: إِنِّي أَنَا حَيْيٌ حَتَّى اكْلَ تَمَرَاتِي إِنَّهَا لَحِيَاةٌ طَوِيلَةٌ. قَالَ: فَرَمَى بِمَا كَانَ مَعَهُ مِنَ التَّمَرَ، ثُمَّ قَاتَلَهُمْ حَتَّى قُتِلَ۔))

(صحیح مسلم، رقم: 4915۔ مسند احمد، رقم: 12425)

”حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام روانہ ہوئے، یہاں تک کہ مشرکین سے پہلے بدر کے مقام پر پہنچ گئے۔ اتنے میں مشرکین بھی آگئے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”کھڑے ہو جاؤ اس جنت میں جانے کے لیے جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔“

یہ سن کر حضرت عمر بن حمام شفشا نے کہا: ”واہ واه۔“ اس پر رسول اللہ ﷺ نے اُن سے پوچھا: ”یہ تم نے کیوں کہا؟“ اُس نے جواب دیا: ”اللہ کی قسم! یا رسول اللہ ﷺ! صرف اس امید پر کہ میں جنتی ہو جاؤں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا:

”بے شک تو جنتی ہے۔“ راوی نے کہا: ”اس شخص نے اپنے ترش سے چند کھجوریں نکالیں اور کھانے لگا۔ پھر کہنے لگا: اگر میں یہ کھجوریں کھاتا رہتا تو زندگی لمبی ہو جائے گی۔ راوی نے کہا: پھر اس نے اپنے ہاتھ سے کھجوریں پھینک دیں اور لڑکہ شہید ہو گیا۔“

18. ((عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ: أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: الْقَتْلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُكَفِّرُ كُلَّ شَيْءٍ إِلَّا الدِّينَ .)) (صحیح مسلم، رقم: 4884)

”حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اللہ کی راہ میں شہید ہونا قرض کے سواتامان گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔“

19. ((عَنْ أَنَسِ بْنِ عَلِيهِ الْمُخْطَلَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَا مِنْ أَحَدٍ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ ، يُحِبُّ أَنْ يَرْجِعَ إِلَى الدُّنْيَا وَلَهُ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَيْءٍ ، إِلَّا الشَّهِيدُ يَتَمَّتِّنُ أَنْ يَرْجِعَ إِلَى الدُّنْيَا ، فَيُقْتَلَ عَشْرَ مَرَّاتٍ لِمَا يَرَى مِنَ الْكُرَامَةِ .))

(صحیح بخاری، رقم: 2817۔ صحیح مسلم، رقم: 4868۔ نسائی، رقم: 3160) ”حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی شخص جو جنت میں جائے گا، کبھی دنیا میں واپس لوٹا پسند نہیں کرے گا، اگرچہ اسے روئے زمین کی ساری دولت دی جائے، لیکن شہید یہ آرزو کرے گا کہ وہ دنیا میں واپس جا کر دس (10) بار شہید ہو۔ کیونکہ اسے شہادت کا مقام و مرتبہ معلوم ہو گا۔“

20. ((عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا يُكَلِّمُ أَحَدٌ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ، وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَنْ يُكَلِّمُ فِي سَبِيلِهِ إِلَّا جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَجُرْحُهُ يَثْبَعُ دَمًا ، الَّلَّوْنُ لَوْنُ الدَّمِ ، وَالرِّيحُ رِيحُ الْمُسْكِ .)) (صحیح بخاری، رقم: 2803۔ صحیح مسلم، رقم: 4862) نسائی، رقم: 3147۔ ابن ماجہ، رقم: 2795

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو کوئی بھی اللہ کی راہ میں زخم ہوتا ہے..... اور اللہ کو خوب معلوم ہے کہ اُس کی راہ میں کون زخمی ہوا..... تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے زخم سے خون بہرہ رہا ہو گا، جس کا رنگ خون جیسا ہی ہو گا، مگر خوبو کستوری جیسی ہو گی۔“

21- ((عَنْ أَبِي قَتَادَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّدَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَامَ فِيهِمْ، فَذَكَرَ لَهُمْ أَنَّ الْجِهَادَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، وَالْأَيْمَانَ بِاللَّهِ أَفْضَلُ الْأَعْمَالِ، فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ أَرَأَءَ يَسْتَ إِنْ قُتِلْتُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، يُكَفَّرُ عَنِي حَطَابِي؟ فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّدَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: نَعَمْ، إِنْ قُتِلْتَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأَنْتَ صَابِرٌ مُحْتَسِبٌ، مُقْلِلٌ غَيْرُ مُذِيرٍ. ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّدَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: كَيْفَ قُلْتَ؟ فَقَالَ: أَرَأَءَ يَسْتَ إِنْ قُتِلْتُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، يُكَفَّرُ عَنِي حَطَابِي؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّدَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: نَعَمْ، وَأَنْتَ صَابِرٌ مُحْتَسِبٌ، مُقْلِلٌ غَيْرُ مُذِيرٍ، إِلَّا الدِّينَ، فَإِنْ جِبْرِيلَ قَالَ لِي ذَلِكَ .)) (صحيح مسلم، رقم: 4880- ترمذی، رقم: 1712-نسائی، رقم: 3156)

”حضرت ابو قادہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہو کر صحابہ کرام کو بتایا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا اور اللہ پر ایمان لانا افضل کام ہیں۔

یہ سن کر ایک آدمی کھڑا ہو کر کہنے لگا: ”یا رسول اللہ ﷺ! آپؐ بتائیں اگر میں اللہ کی راہ میں شہید ہو جاؤں تو کیا میرے گناہ معاف ہو جائیں گے؟“

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”ہاں! اگر تو اللہ کی راہ میں ثابت قدم ہو اور ثواب کی خاطر ایسا کرے، آگے بڑھے، پیچھے نہ ہٹئے اور پھر شہید ہو جائے تو تیرے گناہ معاف ہو جائیں گے۔“ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اس آدمی سے دریافت فرمایا: ”تو نے کیا پوچھا تھا؟“

وہ بولا: ”اگر میں اللہ کی راہ میں شہید ہو جاؤں تو کیا اس سے میرے گناہ معاف ہو جائیں گے؟“

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”ہاں! جب تو ثابت قدم ہو، ثواب کی نیت رکھے، آگے بڑھے، پیچھے نہ ہٹئے۔ البتہ قرض معاف نہ ہوگا۔ مجھے جبراہیل علیہ السلام نے یہی بتایا ہے۔“

22- ((عَنْ أَبْنِ عُمَرَ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّدَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: إِذَا تَبَآيَتُمْ بِالْعِيَّةِ وَأَحَدُكُمْ أَذْنَابَ الْبَقَرِ وَرَضِيَّتُمْ بِالزَّرْعِ وَتَرَكْتُمُ الْجِهَادَ، سَلَطَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ ذُلْلًا لَا يَنْزِعُهُ حَتَّى تَرْجِعُوا إِلَى دِينِكُمْ .)) (ابی داؤد، رقم: 3462)

”حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ: جب تم بع عینہ کرو گے، بیلوں کی دمیں تھائے کھیتی باڑی سے خوش رہو گے اور جہاد چھوڑ دو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر ذلت مسلط کر دے گا، جسے اس وقت تک تم سے نہیں ہٹائے گا، جب تک تم اپنے دین کی طرف واپس نہیں لوٹو گے (اور جہاد نہیں کرو گے)۔“

غور کیجیے اس حدیث میں صرف جہاد کو دین قرار دیا گیا ہے۔

23- ((عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّدَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَنْ يَرْجَحَ هَذَا الدِّينُ قَائِمًا،

نَفَّاثِلُ عَلَيْهِ عِصَابَةُ مِنَ الْمُسْلِمِينَ حَتَّى تَقُومَ السَّاعَةُ۔)) (صحیح مسلم، رقم: 4953)

”حضرت جابر بن سرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ دین (اسلام) ہمیشہ قائم رہے گا۔ قیامت تک مسلمانوں کی ایک جماعت اس کی خاطر جہاد کرنی رہے گی۔“

مذکورہ بالا احادیث کی روشنی میں جہاد و قتال کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے کہ جہاد و قتال ایک فریضہ ہے۔ ایمان لانے کے بعد جہاد افضل ترین عمل ہے۔ جہاد ایک عبادت ہے۔ مجہد کے ساتھ فتح و نصرت اور مال غنیمت کا وعدہ ہے یا پھر جنت کا وعدہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے خود جہاد کیا اور صحابہ کرام کو اس کی ترغیب فرمائی۔ جہاد سے جی چڑانا منافقت ہے۔ جہاد کو چھوڑ دینے میں ذلت اور مصیبت ہے۔ ایک دن رات اسلامی سرحدوں پر پھرہ دینا، ساری دنیا کے مال و دولت سے بہتر ہے۔

راہ جہاد میں جن قدموں پر گرد و غبار پڑ جائے ان قدموں کو دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی۔ ”جہاد قیامت تک جاری رہے گا۔“

شہید کے فضائل

کشاد در دل سمجھتے ہیں اس کو
ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں

اسلام میں شہید کے لیے بڑی فضیلت ہے اور اسے اعلیٰ مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ شہید وہ شخص ہے جو دین کی سر بلندی کے لیے کافروں اور اسلام کے دشمنوں سے لڑتا ہوا اپنی جان دے دیتا ہے اور اس طرح اپنے ایمان پر سچائی کی گواہی دے دیتا ہے۔

قرآن و حدیث میں شہید کے لیے بہت سے فضائل بیان ہوئے ہیں۔

﴿مَنْ ذَا أَلَّى مُ يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَعِّفَهُ لَكَ أَضَعَافًا كَثِيرَةً﴾ (245)

پھر جہاد میں چونکہ مال کی بہت ضرورت ہوتی ہے اس لیے جانی قربانی کے بعد اب مالی قربانی کا الگ سے ذکر کیا گیا۔ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کو ”قرض حسن“، (اچھا قرض) کہا گیا۔ اللہ تعالیٰ اس مال کو جو اس کی راہ میں خرچ کیا جائے، حالانکہ وہ مال بھی اللہ سبحانہ ہی کا دیا ہوا ہوتا ہے، اپنے لیے قرض سے تعبیر کرتا ہے کہ تم میرا دیا ہوا مال مجھے قرض کے طور پر دے دو، وہ بھی سارا مال نہیں بلکہ اس میں سے کچھ حصہ دو۔

پھر قرض کے ساتھ ”حسن“ کی صفت یا شرط لگادی اور اسے ”قرض حسن“ کا نام دیا جس کا مطلب یہ ہے کہ مومن جو مال بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرے، وہ کھلے دل کے ساتھ خرچ کرے، اس میں بخل نہ کرے، دکھاوے اور ریا کاری

کے لیے نہ کرے۔ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اچھا مال خرچ کرے۔ اس کے سلے میں اللہ تعالیٰ، اس ایک کے بد لے میں دس سے لے کرسات سو گناہ تک، بلکہ احمد پھاڑ کے برا بر اجر و ثواب عطا فرمائے گا۔

﴿وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَيَعْصُمُ﴾ (245)

پھر یہ حقیقت واضح کر دی کہ اللہ تعالیٰ ہی رزق میں شگنگی اور کشادگی دیتا ہے۔ وہ جسے چاہے کم روزی دے اور جسے چاہے زیادہ دے۔ اس بارے میں سارا اختیار اسی کے پاس ہے۔ انسان کی ساری تدبیریں اس کی تقدیری کے آگے بے بُس ہیں۔

﴿وَاللَّهُ تَرْجُونَ﴾ (245)

یہ آخر میں فرمایا کہ آج اگر اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان و مال کے ذریعے جہان ہیں کرو گے اور بھل اور بزدی سے کام لو گے تو یہ دنیا کی زندگی تو عارضی ہے اس کے بعد آخرت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہو کر کیا جواب دو گے؟
البتہ اس میں مجاہدین کے لیے تسلی اور اطمینان کا پہلو بھی ہے کہ وہ آخرت میں اللہ سبحانہ کے ہاں اپنے جان و مال کی قربانی کا صل پانے والے ہیں۔

الْمُ تَرَ إِلَى الْمَلَائِمِ بَنِي إِسْرَائِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ إِذْقَالُو النَّبِيِّ لَهُمْ
أَبْعَثْ لَنَا مَلِكًا نَقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ
عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَا تَقَاتِلُوا قَاتِلُوا وَمَا لَنَا أَلَا نَقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَاءِنَا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا
إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ وَاللَّهُ عَلَيْهِمْ بِالظُّلْمِينَ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ
الَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا قَاتِلُوا أَئِنْ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ
عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِنَ الْمَالِ قَالَ
إِنَّ اللَّهَ أَصْطَفَهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللَّهُ
يُوَعِّظُ مُلَكَةً مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلَيْهِمْ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ

أَيَّهَا مُلِكُهُ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بِقِيمَةٍ مِّمَّا
 تَرَكَ أُولُو مُوسَى وَ أُولُو هَرُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَاءِهَ لَكُمْ
 إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ﴿٢﴾ فَلَمَّا فَصَلَ طَلْوُتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ
 مُبْتَلِيَكُمْ بِنَهَرٍ فَنَ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنْيٌ وَ مَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ
 مِنْ إِلَّا مَنْ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ فَلَمَّا
 جَاءَهُمْ هُوَ وَ الَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ لَقَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَاهُوتَ وَ جُنُودِهِ
 قَالَ الَّذِينَ يُظْنَوْنَ أَنَّهُمْ مُّلْقُوا اللَّهُ لَكُمْ مِّنْ فِعْلَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبْتُ
 فِعْلَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ وَ اللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿٣﴾ وَ لَمَّا بَرَزُوا إِلَيْهِمْ
 وَ جُنُودُهُ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبَرًا وَ ثَبِيتْ أَقْدَامَنَا وَ اصْرُنَا عَلَى
 الْقَوْمِ الْكُفَّارِينَ ﴿٤﴾ فَهَزَّمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ وَ قَتَلَ دَاؤُدْ جَاهُوتَ وَ أَتَهُ
 اللَّهُ الْمُلْكُ وَ الْحِكْمَةُ وَ عَلَيْهِ مِمَّا يَشَاءُ وَ لَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ
 بِعَضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَ لِكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى
 الْعَالَمِينَ ﴿٥﴾ تِنْكَ أَيُّهُ اللَّهُ نَتَلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَ إِنَّكَ لَمِنَ

الْمُرْسَلِينَ ﴿٦﴾

”کیا تم نے اس واقعے پر غور کیا جو موئی علیہ السلام کی وفات کے بعد بنی اسرائیل کے سرداروں کو پیش آیا؟ انہوں نے اپنے نبی سے درخواست کی آپ ہمارے لیے باادشاہ مقتر کر دیں، تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔“ نبی نے جواب دیا ایسا ہے جب تم پر جہاد فرض ہو تو تم لڑنے سے انکار کر دو۔“ وہ بولے: یہ کیسے ہو سکتا ہے ہم اللہ کی راہ میں جہاد نہ کریں، ہم تو پہلے ہی گھروں سے بے گھر ہوئے اور بال بچوں سے جدا ہوئے۔“ پھر جب ان کو جہاد کا

حکم دیا گیا تو تھوڑے لوگوں کے سواب نے پیچھے کھا دی۔ اللہ ایسے ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ ان کے نبی نے ان سے کہا: اللہ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا ہے۔“ وہ بولے: اسے ہم پر حکمرانی کا کیا حق ہے؟ اس کے مقابلے میں ہم بادشاہی کے زیادہ حق دار ہیں۔ اس کے پاس مال و دولت نہیں۔“ نبی نے کہا: اللہ نے بادشاہی کے لیے تمہارے مقابلے میں طالوت ہی کو چنا ہے۔ اسے تم سے زیادہ قابلیت اور قوت دی ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے، بادشاہی عطا کرتا ہے۔ اللہ بڑی وسعت والا جانتے والا ہے۔

ان کے نبی نے ان سے کہا: اللہ کی جانب سے طالوت کے بادشاہ ہونے کی نشانی یہ ہے کہ اس کی بادشاہی میں تمہارے پاس وہ صندوق آجائے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لیے تسلیم ہے۔ اسی میں آل موسیٰ اور آل ہارون کی چھوڑی ہوئی یادگاریں ہیں۔ فرشتوں کی نگرانی میں وہ صندوق لا یا جائے گا۔ اس میں تمہارے لیے بڑی نشانی ہے اگر تم یقین رکھنے والے ہو۔

جب طالوت لشکر لے کر روانہ ہوا تو اس نے ان سے کہا: اللہ نہیں راستے میں ایک دریا کے ذریعے آزمائے گا جس نے اس کا پانی پیا، وہ میرا ساتھی نہیں، اور جس نے اسے نہ چکھا وہ میرا ساتھی ہے، البتہ اگر کسی نے اپنے ہاتھ سے چلو بھر پانی پی لیا، تو اس کی اجازت ہے۔“ مگر جب وہاں پہنچے تو تھوڑے لوگوں کے سواب نے خوب سیر ہو کر پانی پی لیا۔ اور جب طالوت اور اس کے (چچے) مسلمان ساتھی دریا پار کر گئے تو باقی لوگ کہنے لگے: آج ہم جالوت اور اس کی فوجوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“ لیکن جو لوگ یقین رکھتے تھے کہ انھیں ایک دن (اپنے) اللہ سے ملنا ہے، وہ پکارا ٹھی: ایسا کئی بار ہوا کہ چھوٹے لشکروں نے اللہ کے حکم سے بڑے لشکروں پر فتح پائی! اللہ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے۔

پھر جب جالوت اور اس کی فوجوں سے ان کا آمنا سامنا ہوا تو انھوں نے دعا کی: اے ہمارے رب! ہم پر صبر انڈیل دے ہمارے قدم جمادے، اور ان کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرم۔ اس کے بعد انھوں نے اللہ کے حکم سے کافروں کو شکست دی۔ داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کیا۔ اللہ نے داؤد علیہ السلام کو بادشاہی اور داتائی عطا فرمائی۔ اس کے علاوہ بھی اللہ نے جو چاہا اسے سکھا دیا۔ اگر اللہ بعض لوگوں کے ہاتھوں دوسرے لوگوں کو اقتدار سے نہ ہٹائے تو زمین فساد سے بھر جائے۔ اس لیے اللہ دنیا والوں پر اپنا فضل فرماتا رہتا ہے۔

اے نبی ﷺ! یہ اللہ کی آسمیں ہیں جو جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے ہم آپ ﷺ کو سنارہ ہیں، اور بے شک آپ ﷺ ہمارے رسولوں میں سے ہیں۔“ (246-252)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

.....الْمَلَأ..... اس کی اصل مَلَأْ یَمَلُّا ہے جس کے معنی ”بھرنے“ (TO FILL) کے ہیں۔ لیکن اس سے مردود

کی وہ جماعت یا مجلسیں مراد ہوتی ہے جو باہم مشورے اور فیصلے کرتی ہے۔ قدیم زمانے میں اس سے بادشاہ کے درباری مراد ہوتے تھے یا سرداروں کی مجلس مراد ہوتی تھی۔ اسے آج کل کی زبان میں پنچائیت، جرگہ، کونسل، کابینہ یا پارلیمنٹ کہا جاسکتا ہے۔ چونکہ ایسی مجلس آنکھوں کو نظارے سے اور دلوں کو رعب سے بھر دیتی ہے اس لیے اسے یہ نام دیا گیا۔

إِصْطَفَهُ : اس کا مادہ صرف ہے۔ اس کے معنی کسی کو چن لینے اور اسے فضیلت عطا کرنے کے ہیں۔

سَكِينَةً : یہ سکن سے ہے۔ اس سے مراد ایسی چیز ہے جو لوگوں کو اطمینان اور روح کو تسکین دیتی ہو۔

تَحْمِلَةً : حمل کے معنی بوجھ اٹھانے کے ہیں۔ لیکن سفر میں کسی چیز کی حفاظت اور نگرانی کرنے والے کو بھی ”حمل“ کہتے ہیں۔ خواہ وہ کوئی شے اٹھا کر لائے یا نہ اٹھائے۔ ہمارے ہاں کرنی نوٹوں پر جو ”حمل ہذا“ لکھا ہوتا ہے اس کا بھی یہی مفہوم ہے۔

فَصَلَّ : اس کے معنی کسی مقام، گھر یا شہر کو چھوڑ کر کسی اور طرف کو روانہ ہو جانے کے ہیں۔ جیسا کہ سورہ یوسف میں ہے۔

﴿وَلَمَّا فَصَلَّى الْعَيْرُ قَالَ أَبُوهُمَّ لِيْلَى لَا إِجْدُرِيَّ يُوْسُفَ لَوْ لَا أَنْ تُفَنِّدُونِ﴾ (50)

(یوسف 12:94)

”اور جب وہ قافلہ روانہ ہوا تو ان کے باپ (یعقوب علیہ السلام) نے کہا: اگر تم مجھے بڑھاپے میں بھکی باتیں کرنے والا نہ سمجھو تو میں کہتا ہوں کہ مجھے یوسف علیہ السلام کی خوبیو آرہی ہے۔“

الْجُنُودُ : یہ جنڈکی جمع ہے جس کے معنی لشکر کے ہیں۔

يَطْعَمُهُ : طکعم الشیء کے معنی کسی چیز کو جکھنے کے ہیں، خواہ وہ کھانے کی شے ہو یا پینے کی۔

يُظْهِنُونَ : ظہن کے اصل معنی ”گمان کرنے“ کے ہیں مگر یہ یقین کرنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اس جگہ یہی معنی مراد ہیں۔

فِتْنَةً : اس سے لوگوں کی جماعت مراد ہوتی ہے خواہ چھوٹی ہو یا بڑی۔

بَرَزُواً : اس کے معنی ہیں: وہ کھلی جگہ پر یا کھلے میدان میں ظاہر ہوئے۔ اسی سے مبارزت ہے جس کے معنی ہیں: مقابلے کے لیے دشمن کو لاکارنا کہ میدان میں آجائے۔

أَفِرِغُ : یہ افرائے سے ہے جس کے معنی ہیں: بھرے ہوئے برتن کو انڈیل کر خالی کر دینا۔ **أَفِرِغَ عَلَيْنَا صَمِراً** سے مراد یہ ہے کہ ہمیں بہت زیادہ صبر و ہمت اور استقامت عطا فرماد۔

ثَبَّتْ أَقْدَامَنَا : ہمیں ثابت قدمی عطا فرماد۔ گویا ہمیں ایسی قوت دے جس سے دشمن کے مقابلے میں ہمارے قدم جتھے رہیں۔ ہمیں دشمن پر غلبہ حاصل ہو اور ہم فتح پا لیں۔

﴿الَّهُ تَرَالِي الْمَلَإِ مِنْ بَقِيِّ إِسْرَاءِيْلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ﴾ (246)

اوپر جہاد کا ذکر آیا ہے اب اسی مناسبت سے ایک تاریخی واقعہ بیان کیا جا رہا ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد بنی اسرائیل کو قوم کو پیش آیا تھا۔

﴿إذْقَأْلُوا النَّبِيَّ لَهُمْ أَبْعَثُ لَنَا مَلِكًا نُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ (246)

واقعہ یوں ہے کہ بنی اسرائیل کے کچھ سرداروں نے اپنے وقت کے نبی غالباً سموئیل علیہ السلام (Samuel) سے عرض کیا کہ ان کے لیے کوئی بادشاہ مقرر کیا جائے تا کہ اس کی کمان میں دشمن کے خلاف جہاد کیا جاسکے۔

یاد رہے کہ بنی اسرائیل میں کبھی تو ایسا ہوتا کہ کوئی ایک ہی شخصیت ان کے لیے بنی بھی ہوتا اور بادشاہ بھی۔ جیسا کہ داؤد علیہ السلام اور ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام بیک وقت بنی بھی تھے اور بادشاہ بھی۔ لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا کہ بنی اور بادشاہ الگ الگ ہوتے۔ بنی کا کام دعوت و تسلیخ کرنا اور بادشاہ کا کام جہاد کرنا ہوتا اور بادشاہ بنی کے ماتحت ہوتا تھا۔

﴿قَالَ هَلْ عَسِيْتُمْ إِنْ كُتْبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَا تُقَاتِلُوا﴾ (246)

چونکہ ہر بنی اپنی قوم کا بنا پس اور ان کے حالات سے واقف ہوتا ہے، اس لیے اس بنی نے کبھی سرداروں سے فرمایا کہ تم لوگ جہاد کے لیے کسی بادشاہ کا تقرر چاہتے ہو، مگر کچھ بعد نہیں کہ جب وہ مقرر ہو جائے اور جہاد فرض ہو جائے تو تم لوگ جہاد کرنے سے انکار کر بیٹھو۔

﴿قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَاءِنَا﴾ (246)

سرداروں نے جواب دیا ہم جہاد کیوں نہیں کریں گے جب کہ ہماری حالت یہ ہو گئی ہے ہم تو دشمنوں کے ہاتھوں گھروں سے بے گھر ہو چکے ہیں۔ انہوں نے ہماری عورتوں اور بچوں کو پکڑ کر قیدی بنار کھا ہے۔ اور ہم یہ ذلت زیادہ عرصے تک بروادشت نہیں کر سکتے۔

﴿فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا فِيهِمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴾ (246)

پھر جب ان پر جہاد فرض ہوا تو ان میں سے بہت کم نکلے جوڑنے کے لیے تیار ہوئے۔ جب کہ اکثریت نے جہاد سے منہ موز لیا۔ ان ظالموں اور عہد توڑنے والوں کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے اور ان سے حساب لے گا۔

﴿وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَائُوتَ مَلِكًا﴾ (247)

پھر بنی سموئیل علیہ السلام نے ان سرداروں سے فرمایا کہ تمہارے لیے اللہ سبحانہ نے طالوت کو بادشاہ مقرر کر دیا ہے۔ وہ تمہارا امیر ہے۔ لہذا تم لوگ اس کی اطاعت کرو اور اس کی کمان میں جہاد کرو۔

﴿قَالُوا أَنَّى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ

سَعَةً مِنَ الْمَالِ﴾ (247)

مگر سرداروں نے اعتراض کیا کہ طالوت ہمارا بادشاہ کیسے بن سکتا ہے؟ وہ ایک عام اور معمولی آدمی ہے، کوئی مال دار یا سردار نہیں ہے۔ اس لیے اسے ہمارا بادشاہ بننے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہم سرداروں میں سے کسی ایک کو بادشاہ ہونا چاہیے۔ بادشاہی کے حق دار صرف ہم سردار لوگ ہیں۔

﴿قَالَ إِنَّ اللَّهَ أَصْطَفَنِهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلَيْهِمْ﴾ (247)

نبی سویل علیہ السلام نے ان سرداروں کے اعتراض کے جواب میں فرمایا کہ اللہ سبحانہ نے طالوت ہی کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا ہے جو تم سے زیادہ دماغی صلاحیت، معاملہ فہمی، دین داری اور جسمانی طاقت رکھتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں قیادت و امارت کا معیار دولت یا خاندان وغیرہ نہیں ہے بلکہ اس کے لیے علم، تقویٰ اور جسمانی صحت و قوت معیار ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتَقْكُمْ﴾ (الحجرات 49:13)

”بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا ہے جو سب سے زیادہ پر ہیز گار ہے۔“

یاد رہے کہ خلفائے راشدین کا انتخاب بھی اسی معیار کے مطابق ہوا تھا۔

آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے بادشاہی عطا کر دے۔ یہ اس کا اختیار ہے۔ وہ بڑے فضل والا اور علم والا ہے اور جانتا ہے کہ کون بادشاہی کا اہل ہے اور کون نا اہل ہے۔

﴿وَقَالَ لَهُمْ تَبَيَّهُمْ إِنَّ أَيَّةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّنَّا تَرَكَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْهُرُونَ تَحْمِلُهُ الْمُلَكُّوْكَهُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (248)

پھر ان کے نبی سویل علیہ السلام نے فرمایا کہ طالوت کے بادشاہ ہونے کی نشانی یہ ہے کہ اس کے ذریعے تمہیں اپنا کھویا ہوا تابوت یعنی صندوق واپس مل جائے گا۔ فرشتے اسے اٹھا کر طالوت کے گھر پہنچا دیں گے۔ اس میں تمہارے دلوں کے لیے الٹینان اور حوصلہ افزائی کا سامان ہے۔ توریت کی تختیاں ہیں۔ موی علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کے خاندان کی کچھ یادگاریں ہیں، جیسے موی علیہ السلام کا عصا وغیرہ۔ اس کے بعد اگر تم واقعی اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو تمہیں یقین ہونا چاہیے کہ طالوت کو اللہ تعالیٰ نے بادشاہی کے لیے چن لیا ہے۔ لہذا اب پہلے کی طرح پھر اس متبرک صندوق کو میدان جگ میں اپنے آگے رکھ کر دشمن کے خلاف جہاد کرو۔

﴿فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ

فَلَيْسَ مِنْهُ وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنْ إِلَّا مَنْ اغْتَرَفَ عُزُوفَةً بِيَدِهِ﴾ (249)

پھر جب طالوت اپنے لشکروں سمیت جہاد کے لیے روانہ ہوئے تو اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اللہ تعالیٰ

تمہیں راستے میں آنے والے ایک دریا کے ذریعے آزمائے گا، تاکہ تم میں سے اصلی اور نقلی مجاہدین کی پہچان ہو جائے۔ تم اس دریا سے پانی نہ پینا۔ جو شخص اس سے پانی پچے گا وہ میرا ساتھی نہیں ہو گا اور ہمارے لشکر کا آدمی شمارہ ہو گا۔ البتہ جو کوئی اس میں سے تھوڑا سا چکھ لے، یا چلو بھرپی لے تو اس کی اجازت ہے اور ایسا آدمی ہمارا اپنا بندہ ہو گا۔

﴿فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمُ الظَّالِمُونَ﴾ (249)

پھر جب وہ لشکر دریا پر پہنچا تو اس کی اکثریت نے اس میں سے خوب پانی پی لیا۔ مگر وہ تھوڑے لوگ، جو اصحاب بد رکی تعداد کے برابر (313) تھے۔ جو صابر اور ثابت قدم تھے۔ جنہوں نے اپنے امیر کے حکم کی اطاعت کی، انہوں نے زیادہ پانی نہ پیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر کی اطاعت ضروری ہے جب تک وہ گناہ یا معصیت کا حکم نہ دے۔

﴿فَكَيْمَا جَاؤْزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ أَمْنَوْا مَعَهُ لَا قَاتُلُوا لَا طَاقَةَ لَنَا إِلَيْهِمْ بِإِجَالُوتٍ وَجُنُودِهِ﴾ (249)

پھر جب دونوں لشکر آئنے سامنے آگئے تو وہ بے صبرے مجاہد، جنہوں نے اپنے امیر کے حکم کی نافرمانی کی تھی، اب کہنے لگے: ہماری بہت جواب دے گئی ہے۔ ہم جاہلوں کے مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہم جہاد نہیں کریں گے۔

﴿قَالَ الَّذِينَ يَظْلَمُونَ أَتَهُمْ مُلْقُوا اللَّهُ كَمْ مِنْ فِتْنَةٍ قَلِيلَةٌ غَلَبَتْ فِتْنَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴾ (249)

اس موقع پر وہ اصلی مجاہدین جو صابر، ثابت قدم، حوصلہ مندا اپنے امیر کی اطاعت کرنے والے اور آخرت پر یقین رکھنے والے تھے، بول اٹھے: کئی بار ایسا ہوا ہے کہ چھوٹے لشکروں نے اللہ کے حکم سے بڑے لشکروں پر فتح پائی ہے۔ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں اور ثابت قدم رہنے والوں کا مددگار اور حامی و ناصر ہے خواہ وہ تعداد میں تھوڑے ہی کیوں نہ ہوں۔

معلوم ہوتا ہے وہ حقیقی مجاہدین اس تاریخی حقیقت سے باخبر اور واقف تھے کہ ایک چھوٹا منظم اور حوصلہ مند لشکر بھی بڑے غیر منظم اور پست ہمت لشکر کو شکست دے سکتا ہے۔

تاریخ عالم میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں اور ہر زمانے میں ایسا ہو سکتا ہے۔

﴿وَلَمَّا بَرَزُوا إِجَالُوتٍ وَجُنُودِهِ قَاتُلُوا رَبَّنَا أَفْرَغَ عَلَيْنَا صَبَرًا وَثِيتُ أَقْدَامَنَا وَأَصْرُنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَفِرِينَ ﴿250﴾

پھر جب عمائدہ کے بادشاہ جاہلوں (JULIAT) کا لشکر مقابلے میں آیا تو طالوت کے سچے مجاہدین نے جنگ شروع ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی:

”اے ہمارے رب! ہمیں صبر سے بھردے، ہمیں ثابت قدمی عطا فرم۔ دشمن کفار کے مقابلے میں ہماری مدد فرمائ کہ ہمیں فتح نصیب ہو۔“

﴿فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ (251)

الله تعالیٰ نے طالوت کے مخلص مجاہدین کی دعا قبول فرمائی۔ ان کو صبر و استقامت سے نوازا۔ ان کی غیبی مدد فرمائی۔ نتیجہ یہ لکلا کہ ان کے دشمن جالوت کے لشکر کو شکست فاش ہوئی۔ وہ میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس طرح اللہ سبحانہ کی یہ سنت پوری ہوئی کہ وہ اہل باطل کے مقابلے میں اہل حق کی مدد کرتا اور ان کو فتح و نصرت عطا فرماتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

(الروم 30: 47) ﴿وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ﴾

”اور موننوں کی مدد کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔“

اس سے یہ سنت اللہ معلوم ہوئی کہ کفار کے خلاف اہل ایمان کی صرف وہی دعائیں قبول ہوتی ہیں جو میدان جنگ میں جا کر مانگی جائیں۔ رہیں فتح کے لیے وہ دعائیں جو بغیر جہاد کیے مانگی جائیں وہ قبول نہیں ہوتیں، خواہ وہ مساجد میں بلکہ حریم شریفین میں بیٹھ کر روتے ہوئے مانگی جائیں۔

(۲۵۱) ﴿وَقُتِلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَأَتْهَهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَمَهُ مِمَّا يَشَاءُ﴾

اس جنگ میں داؤد علیہ السلام نے کافر بادشاہ جالوت کو قتل کیا۔ جالوت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ بڑا پہلوان اور جنگجو تھا۔ اس نے ابتداء میں جب بنی اسرائیل کے لشکر کو مبارزت کی دعوت دی تو کسی کو ہمت نہ تھی کہ اس کا مقابلہ کرے۔ لیکن داؤد علیہ السلام، جو اس وقت ایک نوجوان چڑواہے تھے۔ مقابلے پر آئے اور فلاخن کے ذریعے پھر پھینک کر اسے ہلاک کر دیا۔ بعد میں انھی داؤد علیہ السلام کو، جنہوں نے عمالکہ کے کافر بادشاہ جالوت کو مارا۔ اللہ تعالیٰ نے علم و حکمت سے نوازا۔ نبوت سے سرفراز فرمایا۔ وہ پورے فلسطین کے حکمران بنے۔ ان کے ہاتھ میں لوہا موم ہو جاتا تھا۔ یہ مجذہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا تھا۔ وہ لوہے کی زریں بنانا کر بیچتے اور اپنے لیے حلال روزی کماتے تھے۔ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک روز نامہ کرتے تھے۔ جیسا کہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے:

(صحیح بخاری، رقم: 3420، صحیح مسلم، رقم: 2739)

(۲۵۱) ﴿وَلَوْلَا دَفَعَ اللَّهُ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَلَمِينَ﴾

فرمایا، اللہ سبحانہ کی یہ سنت ہے کہ وہ ایک سرکش اور ظالم قوم کو اس سے بہتر کسی قوم کے ذریعے ہٹاتا رہتا ہے۔ تاکہ اس کی زمین علمنی و قسم سے نہ بھر جائے، دنیا بدمانی اور قتل و غارت گری کا شکار نہ ہو جائے اور انسانیت بباہ و برباد نہ ہو۔ اگر خالق کائنات اپنے اس قانون کے ذریعے اپنے بندوں پر اپنا یہ فضل و کرم نہ فرمائے تو زمین کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔

تاریخ انسانی نے قرآن حکیم کی اس عالمگیر صداقت کی ہمیشہ گواہی دی ہے۔

(۲۵۲) ﴿تَنَاهَ أَيُّهُ اللَّهُ تَنَاهُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ﴾

اب نبی ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا گیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی آیتیں ہیں جو آپ ﷺ کو سنائی جا رہی ہیں۔ ان میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں، وہ سب حقیقت پر بنی ہیں۔ اہل کتاب نے ان واقعات کو پنی کتابوں میں غلط طور پر پیش کر دیا ہے۔ اصل حقیقت وہ ہے جو ہم نے اس قرآن میں وحی کے ذریعے بتادی ہے۔ ورنہ صدیوں پرانے تاریخی واقعات کو صحیح طور پر بیان کرنا کسی ایسے شخص کے لیے کیسے ممکن تھا جو نہ لکھنا پڑھنا جانتا ہو اور جس نے نہ کسی استاد سے باقاعدہ تعلیم پائی ہو۔ یہی چیز آپ ﷺ کے سچے نبی ہونے کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ صاحبِ وحی ہیں جن کو وحی کے ذریعے ان تمام واقعات سے آگاہ کیا گیا ہے۔

آخر میں دوبارہ نبی ﷺ کو مخاطب کر کے اطمینان دلایا گیا اور تسلی دی گئی کہ آپ ﷺ فی الواقع اللہ تعالیٰ کے رسولوں میں سے ہیں اور صرف ہٹ دھرم مخالفین ہی آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کا انکار کرتے ہیں۔



تِلْكَ الرَّسُولُ فَضَلَّنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ كَلَمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ وَأَتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَا بِرُوحِ الْقُدْسِ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَقْتَلَ الَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ مَنْ بَعْدِمَا جَاءَتِهِمُ الْبَيِّنَاتُ وَلَكِنَّ اخْتَلَفُوا فَيُنَهُمْ مَنْ أَمَنَ وَمِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَقْتَلُوا وَلَكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ

”ہم نے پیغمبروں میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔ ان میں بعض سے اللہ نے براہ راست کلام فرمایا۔ بعض کے درجے بہت بلند کیے۔ ہم نے عیسیٰ ابن مریم ﷺ کو کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس (جریل علیہ السلام) کے ذریعے ان کی مدد فرمائی۔ اللہ چاہتا تو اس کے بعد لوگ دین کے بارے میں نہ لڑتے جب کہ ان کے پاس واضح نشانیاں آچکی تھیں۔ اس کے باوجود انہوں نے اختلاف کیا۔ پھر ان میں سے کوئی ایمان لایا، کوئی کافر ہو گیا۔ اللہ چاہتا تو لوگ ایک دوسرے سے نہ لڑتے، مگر اللہ وہی کرتا ہے، جو چاہتا ہے۔“ (253)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

﴿تِلْكَ الرَّسُولُ فَضَلَّنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ كَلَمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ وَأَتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَا بِرُوحِ الْقُدْسِ﴾ (253)
اوپر حضرت محمد ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا گیا کہ آپ ﷺ یقیناً ہمارے بھیج ہوئے رسولوں میں سے ہیں۔ اب یہ بتایا گیا کہ قرآن میں جن رسولوں کا ذکر ہے آپ ﷺ ان میں شامل ہیں۔ ویسے تمام رسولوں کے حالات و واقعات قرآن میں بیان نہیں ہوئے، صرف کچھ کے ناموں اور حالات کا ذکر ہوا ہے۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر چند پیغمبروں کے تذکرے کے بعد فرمایا:

﴿وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَمْ نَقْصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ﴾ (النساء: 4:164)

”اور ہم نے ایسے رسول بھیجے جن کا حال ہم آپ ﷺ کو پہلے ساچکے ہیں اور ایسے رسول بھی، جن کا حال ہم نے آپ ﷺ کو نہیں سنایا۔“

اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ نَقْصُصْ

(المومن 78:40)

”اور (اے نبی ﷺ) بے شک ہم نے آپ ﷺ سے پہلے بہت سے رسول صحیح جن میں سے بعض کے حالات آپ ﷺ کو سنائے ہیں اور بعض کے حالات نہیں سنائے۔“

اب یہ وضاحت فرمائی ہے کہ تمام رسولوں کے فضائل، خصائص اور درجات میں فرق ہے اگرچہ سب صاحب وحی تھے، سب کو مجرزے دیے گئے تھے، سب کی دعوت ایک ہی تھی، سب کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے بھیجا تاکہ لوگ ان کی پیروی کر کے دنیا اور آخرت کی کامیابی اور فلاح حاصل کر سکیں۔

اس سے قرآن مجید کے اس بیان کی بھی وضاحت ہو گئی جو سورہ البقرہ (2) آیت 136 میں کچھ پیغمبروں کے ذکر کے بعد آیا ہے کہ اہل ایمان کا عقیدہ یہ ہونا چاہیے کہ:

(البقرہ 2:136)

﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَهِدٍ مِّنْهُمْ﴾

”ہم ان نبیوں میں سے کسی ایک کی بھی تفریق نہیں کرتے۔“

یعنی انکار نہیں کرتے (بلکہ سب کو مانتے ہیں)۔ یا جیسے آگے پہلی کر آیت 285 میں آئے گا کہ:

(البقرہ 2:285)

﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَهِدٍ مِّنْ رُسُلِهِ﴾

”ہم کسی ایک رسول کی تفریق یعنی اس کا انکار نہیں کرتے۔“

تو مشہور اور مسلمہ اصول تفسیر کے القرآن یقیناً بعضاً بعضہ بعضاً (قرآن اپنے ایک حصے کی تفسیر اپنے کسی دوسرے حصے سے کر دیتا ہے) کے مطابق یہ معلوم ہوا کہ تمام نبیوں اور رسولوں میں فضائل اور درجات کا فرق ہے۔ مگر چونکہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبouth ہوئے ہیں، اس لیے سب کو مانا اور سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اور کسی ایک کا انکار یا تفریق یعنی الرسل جائز نہیں ہے کہ بعض کو مانا جائے اور بعض کو نہ مانا جائے۔ کیونکہ یہ بعض کو مانا اور بعض کو نہ مانا کفر ہے اور سب کو مانا ایمان کا تقاضا ہے۔ جیسا کہ ایک اور مقام پر پوری وضاحت موجود ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذلِكَ سَبِيلًا ۝ أُولَئِكَ هُمُ الْكُفَّارُ ۝ حَقًا ۝ وَأَعْتَدْنَا لِلْكُفَّارِينَ عَذَابًا مُهِينًا ۝ وَالَّذِينَ أَمْنَوْا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَهِدٍ مِنْهُمْ ۝ أُولَئِكَ سَوْفَ يُوَتَّهُمْ أُجُورُهُمْ ۝ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝﴾

(النساء 4:150 تا 152)

”بے شک جو لوگ اللہ اور اُس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ رسولوں کو چھوڑ کر صرف اللہ کو مانیں اور کہتے ہیں کہ ”ہم بعض رسولوں کو مانتے ہیں، بعض کو نہیں مانتے“ اور وہ چاہتے ہیں کہ کفر اور اسلام کے درمیان کوئی اور راہ نہ کالیں۔ ایسے لوگ کچھے کافروں کے لیے ذلت کا عذاب تیار کر

رکھا ہے۔ لیکن جو لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور انہوں نے کسی رسول کا انکار نہ کیا، اللہ انہیں اس کا اجر دے گا۔ اور اللہ سخشنے والا مہربان ہے۔“

یہود و نصاریٰ اس لیے گراہ ہوئے کہ انہوں نے بعض رسولوں کو مانا اور بعض کو نہیں مانا۔ یہودیوں نے عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ کی رسالت کا انکار کیا اور گمراہی مولی۔ نصاریٰ نے حضرت محمد ﷺ کی نبوت و رسالت کو نہیں مانا اور گمراہی اختیار کی۔

ہدایت کا راستہ صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بھیج ہوئے تمام نبیوں اور رسولوں کو بحق مان کر اُن سب پر ایمان لایا جائے۔ اُن کی لائی ہوئی دعوت کی پیر وی کی جائے۔ کیونکہ کسی ایک نبی یا رسول کا انکار بھی سب نبیوں اور رسولوں کا انکار ہے جیسے قرآن مجید کی کسی آیت یا سورت کا انکار پورے قرآن کا انکار ہے۔

پھر عام (General) کے بعد خاص (Specific) کو بیان کرنے کے اسلوب میں فرمایا کہ ان رسولوں میں بعض سے اللہ تعالیٰ نے برادرست کلام فرمایا یعنی موسیٰ علیہ السلام جو پھر کلمِ اللہ کہلاتے:

﴿وَكَلَمُ اللَّهِ مُوسَى تَكْلِيمًا﴾

”اور موسیٰ علیہ السلام سے اللہ نے خوب کلام کیا۔“

بعض رسولوں کو بلند درجات عطا کیے گئے۔ اس سے مراد جیسا کہ تفسیر طبری میں مجاہد رَسُولَهُ کا قول ہے، حضرت محمد ﷺ مراد ہیں۔ جن کے بارے میں قرآن میں ہے کہ:

﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذُكْرَكَ﴾

”اور ہم نے آپ کا ذکر بلند کیا۔“

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا﴾

”اور (اے نبی ﷺ) آپ ﷺ پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔“

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿فُضِّلْتُ عَلَى الْأَنْبِيَاءِ بِسِيتٍ﴾

اعطیتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ، وَنَصَرْتُ بِالرُّعبِ، وَأَحْلَتُ لِي الْغَنَائِمُ، وَجَعَلْتُ لِي الْأَرْضُ
مَسْجِدًا وَطَهُورًا، وَأَرْسَلْتُ إِلَى الْخَلْقِ كَافَةً، وَخُتَمَ بِالنَّبِيُّونَ)

(صحیح مسلم، رقم: 1167، مسنند احمد، رقم: 9326)

”مجھے چھ (6) چیزوں میں دوسرے نبیوں پر فضیلت عطا کی گئی:

1۔ مجھے جو اجمع الکلم (مختصر الفاظ اور معانی زیادہ) دیے گئے۔

2۔ دشمن پر رعب کے ذریعے میری مدد کی گئی۔

3۔ میرے لیے مال غنیمت حلال ہوا۔

4۔ میرے لیے ساری زمین سجدہ گاہ اور پاک قرار دی گئی۔

5۔ مجھے تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا۔

6۔ اور مجھ پر نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔“

اور بعض رسولوں کو کھلے معجزات دیے گئے جیسے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام جو اللہ سبحانہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کرتے تھے،

پیدائشی انہوں کو بینائی دیتے اور کوڑھ (LEPROSY) کے مريضوں کو شفایاب کرتے تھے۔

﴿وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنِّي قَدْ جَعَلْتُكُمْ بَأْيَةً مِّنْ رَّبِّكُمْ لَا إِنَّمَا أَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الظِّئِينَ كَهْيَةً الطَّيِّرِ فَأَنْفَخْ فِيهِ فَيَكُونُ طَيِّرًا مِّنْ يَادِنِ اللَّهِ وَأَبْرَئُ الْأَنْجَةَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِيَادِنِ اللَّهِ وَأُبْعَدُكُمْ بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ طَإِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِيَّةً لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ﴾ (آل عمران: 49)

”(وہ عیسیٰ علیہ السلام کہے گا: اے لوگو! مجھے بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔ میں تمہارے رب کی طرف سے نشانی (محجزہ) لے کر آتا ہوں۔ میں تمہارے لیے مٹی سے کسی پرندے کی صورت بناتا ہوں اور اس میں پھونک مارتا ہوں تو اللہ کے حکم سے واقعی پرندہ بن جاتا ہے۔ میں اللہ کے حکم سے پیدائشی انہیں اور کوڑھی کو اچھا کرتا ہوں۔ اللہ کے حکم سے مردے کو زندہ کرتا ہوں، اور میں تمہیں بتا سکتا ہوں تم کیا کھاتے ہو اور اپنے گھروں میں کیا ذخیرہ کرتے ہو؟ بے شک میری ان باتوں میں تمہارے لیے بڑی نشانی ہے اگر تم ایمان لانے والے ہو۔“

پھر نذکورہ آیت میں عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کا نام خصوصیت کے ساتھ لے کر ان کا ذکر کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کھلے اور واضح معجزات دیے اور روح القدس جبریل علیہ السلام کے ذریعے ان کی خاص تائید فرمائی۔ کیونکہ اہل کتاب کے دونوں گروہوں، یہود و نصاریٰ نے ان کے بارے میں افراد و تقریب سے کام لیا اور گمراہ ہوئے۔ ایک گروہ نے ان کو اللہ کا رسول مانتے سے انکار کر دیا اور دوسرے نے ان کو این اللہ یعنی اللہ کا بیٹا قرار دے دیا۔

﴿وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَلَ الَّذِينَ مِنْ مُّبَدِّعِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمْ الْبَيِّنَاتُ وَلِكِنَّهُمْ اخْتَلَفُوا فِيهِنَّهُمْ مَنْ أَمَنَ وَمِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَلُوا فَقَدْ وَلِكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ﴾ (البقرہ: 253)

”فرمایا: اگر اللہ سبحانہ چاہتا تو اس کے واضح احکام آجائے کے بعد یہود و نصاریٰ اور دوسری قوموں میں مذہبی اختلاف اور باہم جنگ وجدال کی نوبت نہ آتی۔ سب لوگ ایمان والے ہوتے، کوئی کافرنہ ہوتا، نہ کفر

وَاسْلَامٌ كَيْ لِثَانِيٰ ہوتی۔ اللہ تعالیٰ سب کو زبردستی اسلام پر قائم رکھتا اور کفر سے دور رکھتا۔

جیسا کہ ارشاد ہوا:

﴿وَ لَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَ لَكُنْ لَّيَبْلُوُكُمْ فِي مَا أَنْتُمْ فَاسْتَبِقُوا الْغَيْرِيْتِ﴾
(المائدہ 5)

”اور اگر اللہ چاہتا تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا مگر اس نے چاہا کہ وہ اپنے دیے ہوئے حکموں میں تمہاری آزمائش کرے۔ لہیں تم نبیوں کی طرف بڑھو۔“

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَ لَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَ لَكُنْ يُضْلِلُ مَنْ يَشَاءُ وَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ طَوْ لَتُسْعِلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾
(الحل 16)

”اور اگر اللہ چاہتا تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا۔ لیکن وہ گراہ کرتا ہے چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے ہے چاہتا ہے۔ اور ضرور تم سے تمہارے اعمال کی پوچھ ہوگی۔“

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿وَ لَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَ لَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ۵ إِلَّا مَنْ رَحْمَ رَبُّكَ وَ لِذِلِّكَ خَلَقَهُمْ طَوْ﴾
(ہود 118:11)

”اور اگر آپ ﷺ کا رب چاہتا تو لوگوں کو ایک ہی طریقے پر چلنے والی امت بنا دیتا۔ لیکن لوگ آپس میں اختلاف کرتے رہیں گے۔ سوائے ان کے جن پر آپ ﷺ کا رب رحم فرمائے۔ باہمی اختلاف کے لیے تو اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے۔“

اور پھر یہ بھی فرمایا:

﴿وَ لَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَأْمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَوِيْعًا طَوْ إِفَانَتْ تُمْرِدُهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾
(يونس 10:99)

”اور (اے نبی ﷺ) اگر آپ ﷺ کا رب چاہتا تو روئے زمین پر بننے والے سب لوگ ایمان لے آتے۔ تو کیا آپ ﷺ ان لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کریں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ نہ تھی۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہے اور جسے کوئی بد نہیں سکتا کہ یہ دنیا دار الامتحان اور دارالعمل ہے۔ لوگوں کو نیکی اور بدی کی تیزی دی گئی۔ وجی کی واضح ہدایات اور احکام دیے گئے۔ مجازات دکھائے گئے۔ انسانوں کو آزادی دی گئی کہ وہ اپنی مرضی سے چاہے نیکی کی راہ اپنائیں یا بدی کا راستہ اختیار کر لیں۔ پھر جو لوگ نیکی کی راہ اپناتے ہیں، اللہ ان سے راضی ہوتا ہے

اور ان کو آخرت میں جنت کی نعمتیں دے گا۔ جو لوگ بدی کارست اختیار کرتے ہیں، اللہ ان کو ناپسند کرتا ہے اور ایسے آخرت میں دوزخ کا عذاب بھیتیں گے۔

آخر میں فرمایا: وَلِكُنَ اللَّهُ يَفْعُلُ مَا يُرِيدُ کہ اللہ سبحانہ کسی کا پابند نہیں۔ وہ پن مریض کا مالک ہے۔ وہ جو چاہے کرے، کوئی اُس سے پوچھنے والا نہیں۔

(البروج 16:85)

﴿فَعَالٌ لِمَا يُرِيدُ﴾

”وہ جو چاہتا ہے، کرتا ہے۔“

(الأنبياء 23:21)

﴿لَا يُشَدُّ عَنَّا يَفْعُلُ وَهُمْ يُسْتَلُونَ﴾

”اللہ جو کچھ کرے اُس سے باز پرس نہیں ہو سکتی۔ لیکن لوگوں سے باز پرس ہونی چاہیے۔“

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا يَبْيَعُ
فِيهِ وَلَا خُلَةٌ وَلَا شَفَاعةٌ وَالْكُفَّارُ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٥٥﴾ إِلَهٌ لَا إِلَهَ إِلَّا
هُوَ الْحَقُّ الْقَيُّومُ لَا تَأْخُذْهُ سِنَةٌ وَلَا نُومٌ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا
فِي الْأَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِي يُشَفِعُ عِنْدَهُ إِلَّا يَأْذِنُهُ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ
أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ
وَسَعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَلَا يَعُودُ حِفْظُهُمَا وَهُوَ عَلَىٰ الْعَظِيمِ ﴿٥٦﴾

”اے ایمان والو! ہمارے دیے ہوئے مال میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرو، اس سے پہلے کہ قیامت کا دن آجائے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی۔ جو لوگ اس حکم کو نہ مانیں، وہ کافر ہیں اور وہ نقصان اٹھائیں گے۔

اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ زندہ اور سب کو سنبھالنے والا ہے۔ اسے نہ اونکھ آتی ہے نہ نیند۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ کون ہے جو اُس کے پاس اُس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے۔ وہ سب جانتا ہے جو کچھ لوگوں کے سامنے ہے اور جو کچھ ان سے پوشیدہ ہے۔ لوگ اُس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جو وہ چاہے۔ اُس کی کری آسمانوں اور زمین پر پھیلی ہوئی ہے۔ کائنات کا نظام چلانے سے وہ ہر گز نہیں تھکتا۔ وہ بلند مرتبے والا اور بڑی عظمت والا ہے۔“ (255-254)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

يَوْمٌ:..... اس سے مراد قیامت کا دن ہے۔

بَيْعٌ:..... اس سے مراد عام تجارت نہیں ہے بلکہ اس سے فدیے کے لین دین کی نفی کی گئی ہے۔

الْكَافِرِينَ:..... اس جگہ کافروں سے مراد وہ لوگ ہیں جو زکوٰۃ کے حکم کے مکرر ہیں۔ بھی وجہ ہے کہ سیدنا ابو بکر

صدیق رضی اللہ عنہ نے متعین زکوٰۃ یعنی زکوٰۃ نہ دینے والوں کو غیر مسلم قرار دے کر ان کے خلاف جہاد کیا تھا۔

الظَّالِمُونَ:..... موقع دلیل ہے کہ اس جگہ ان لوگوں کو ظالم کہا گیا ہے جو مال کو صحیح طور پر خرچ نہیں کرتے، بلکہ بُلْ

سے کام لیتے یا فضول خرچی کرتے ہیں۔

الْقِيَومُ:..... یہ قائم سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ ہے جو خود اپنی ذات سے قائم اور رسولوں کو قائم رکھنے والا، ان کا کفیل، ان کا تنظیم اور ان کو سنبھالنے تھا منے والا ہے۔ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت اور اُس کے اسماءؐ حشری میں سے ہے۔

جیسا کہ ارشاد ہوا:

﴿إِنَّهُ هُوَ قَائِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ﴾ (الرعد 13:33)

”کیا پھر وہ (الله) جو ہر شخص کے اعمال پر نگران اور ان کا حساب لینے والا ہے۔“

كُرُسُمٌ:..... اس سے علم الہی مراد لیا گیا ہے۔ اور بعض اس سے اقتدار کی کرسی مراد لیتے ہیں۔

لَا يَؤْدُهُ:..... آدیئُودُ اُودَا کے معنی ہیں کسی چیز کا بھاری، گراں اور پر مشقت ہونا۔

الْعَلِيُّ:..... ایسا بلند و برتر جو ہر مثال اور شریک سے بالا اور ماوراء ہے۔

الْعَظِيمُ:..... وہ ذات جو بڑائی اور عظمت میں بے مثال ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا يَبْيَعُ فِيهِ وَلَا

خُلَةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ وَالظَّالِمُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿254﴾

اس آیت میں اللہ سمجھا نے اہل ایمان کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر لمحے کو غیمت جانتے ہوئے اللہ کی راہ

میں اپنا مال خرچ کریں، ورنہ جب موت آئے گی تو پھر یہ نیکی کمانے کا موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔

اس آیت میں درج ذیل امور بیان ہوئے ہیں:

1۔ اہل ایمان کو اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے (زکوٰۃ، صدقات، جہاد کی تیاری اور خیرات وغیرہ) کی ترغیب دی گئی ہے۔

قرآن مجید میں جہاں بھی أَنْفِقُوا (خرچ کرو) کا لفظ آیا ہے اس سے انفاق فی سبیل اللہ یعنی اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا مراد ہے۔

2۔ یہ حقیقت بھی واضح کی گئی کہ لوگوں کا مال دراصل ان کا اپنا مال نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔ اس لیے وہی یہ حق رکھتا ہے کہ اسی کے حکم کے مطابق، اسی کی رضا کے لیے اور اسی کی راہ میں خرچ کیا جائے۔

3۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت و شفقت اور کمال میربانی دیکھیے کہ وہ اپنے بندوں کو یہ حکم نہیں دے رہا کہ اس کا عطا کیا ہوا سارا مال اس کی راہ میں خرچ کرو۔ بلکہ صرف یہ حکم دے رہا ہے کہ ہمارے دیے ہوئے مال میں سے کچھ مال ہماری راہ میں بھی خرچ کرو۔ مثلاً زکوٰۃ صرف ذہانی فیصد (21%) ہے۔ ظاہر ہے اگر سارا مال خرچ کرنے کا حکم دیا جاتا تو کتنا مشکل اور دشوار ہوتا۔ اس لیے اللہ سبحانہ نے اپنے بندوں کو ایسا حکم دیا ہے جس پر عمل کرنا ان کے لیے آسان ہے۔

4۔ اس آیت میں مرنے سے پہلے پہلے خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ کیونکہ مرنے کے بعد اس کا موقع نہیں رہے گا۔ یہ چیز بھی بندوں پر اللہ سبحانہ کی کمال میربانی اور شفقت ہے کہ وہ یہ نہیں چاہتا کہ اس کے بندے آج غفلت میں پڑے رہیں اور آخرت میں برے انجام سے دو چار ہوں۔ لہذا لوگوں کو چاہیے کہ وہ نیکی کے کام میں جلدی کیا کریں، ورنہ مرنے کے بعد نیک اعمال کا سلسہ منقطع ہو جائے گا۔ پھر ہر شخص آخرت کے اُس عالم میں چلا جائے گا جہاں نہ خرید و فروخت ہوگی، نہ دوستی کا تعلق باقی رہے گا اور نہ کوئی سفارش چلے گی۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ ”کافر ہی ظالم ہیں۔“ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے اس کی راہ میں خرچ نہ کرنا کفر ان نعمت ہے جو کہ عملی کفر بھی ہے اور ظلم بھی ہے کہ دوسرا محتاج کو اس کا حق نہیں دیا جا رہا۔ پھر ظاہر ہے کہ کافروں اور ظالموں کا انجام بہت برا ہو گا اس لیے اہل ایمان کو کافر اور ظالم بننے سے پہنچا چاہیے اور انفاق فی سُبْلِ اللہ کرتے رہنا چاہیے۔

اس آیت کی نظر یہ ہے:

﴿وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجِزُّ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُبْقَى مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعةٌ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ﴾
(البقرہ: 2)

”اور اُس دن سے ڈر جب کوئی کسی کے کام نہ آئے گا، نہ کسی سے معاوضہ لے کر چھوڑا جائے گا، نہ کوئی سفارش چلے گی اور نہ کہیں سے کوئی مدل سکے گی۔“

﴿اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْأَكْبَرُ الْقَيُّومُ لَا تَأْخُذْهُ سَيْنَةٌ وَلَا تَوْمَدْ لَهُ مَا فِي السَّوْلَتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِي يُشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ وَلَا يَعْوِدُهُ حِفْظُهُمْ وَهُوَ عَلَى الْعَظِيمِ عٰلِمٌ﴾ (255)

یہ ”آیت الکرسی“ ہے۔ صحیح حدیث میں اسے قرآن کی سب سے افضل آیت قرار دیا گیا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابی بن کعب رض سے روایت ہے کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے پوچھا:

((يَا أَبَا الْمُنْذِرِ! أَتَدْرِي أَيْ أُعْظَمُ مِنْ كِتَابِ اللَّهِ مَعَكَ أَعْظَمُ؟ قَالَ: فَلَمْ: اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ، قَالَ: يَا أَبَا الْمُنْذِرِ! أَتَدْرِي أَيْ أُعْظَمُ مِنْ كِتَابِ اللَّهِ مَعَكَ أَعْظَمُ؟ قَلْتُ: (اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَقُّ الْقَيُّومُ) قَالَ: فَضَرَبَ فِي صَدَرِي، وَقَالَ: (وَاللَّهُ لِيَهُنَّكَ الْعِلْمُ يَا أَبَا الْمُنْذِرِ)) (صحیح مسلم، رقم: 1885)

”اے ابو منذر! (یہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی کیتی ہے) کیا تم جانتے ہو تمہارے پاس اللہ کی کتاب (قرآن مجید) کی سب سے عظیم اور افضل آیت کون سی ہے؟ میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے پھر پوچھا: اے ابو منذر! جانتے ہو تمہارے پاس اللہ کی کتاب کی سب سے زیادہ عظمت والی اور افضل آیت کون سی ہے؟ میں نے عرض کیا: اللہ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَقُّ الْقَيُّومُ: (آیت الکرسی) یہ سن کر حضور ﷺ نے میرے سینے پر ہاتھ مار کر فرمایا: ابو منذر! تمہیں علم مبارک ہو۔“ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی توحید بیان ہوئی ہے اور شرک کی نفی کی گئی ہے۔

فرمایا: اللہ کے سوا کوئی اور معبد نہیں، صرف وہی عبادت کے لاائق اور معبد برحق ہے۔ وہ ہمیشہ سے زندہ موجود ہے اور ہمیشہ زندہ موجود رہے گا۔ پوری کائنات کا نظام اس کے ہاتھ میں ہے۔ وہی تمام مخلوقات کی ضروریات پوری کرتا اور سب کا نگہبان ہے۔ اسے نہ اوگھے آتی ہے نہ نیند۔ اس لیے وہ کسی لمحے بھی اپنی مخلوق سے غافل اور بے خبر نہیں ہوتا۔ وہ ساری کائنات کا مالک، خالق اور آقا ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس کے سامنے اس کی اجازت کے بغیر کسی کے لیے سفارش کر سکے۔ اس کا علم ہر شے پر حادی ہے۔ کوئی مخلوق اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ البته وہ جسمے چاہے، اپنے علم میں سے کچھ عطا کر دے۔ اس کے دائرہ علم سے یا اس کی کرسی اقتدار سے کوئی چیز باہر نہیں۔ ہر چیز اسی کے تابع ہے۔ سب پر اسی کا حکم چلتا ہے۔ کائنات کا نظام سنبھالنے اور تدبیر امور کرنے میں اسے ذرا مشکل پیش نہیں آتی۔ اس کام کی وجہ سے نہ وہ تھکتا ہے اور نہ اکتاتا ہے۔ وہ بلند مرتبہ، اوپری شان والا اور سب پر غالب ہے۔ وہی عظمت والا، بڑائی اور کبریائی والا اور سب سے بڑا ہے۔

یہ آیت الکرسی اس اعتبار سے قرآن مجید کی سب سے اعلیٰ اور افضل سورت ہے کہ اس میں سولہ (16) مرتبہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اختیارات کا ذکر آیا ہے، اور یہ خصوصیت اور انفرادیت قرآن کی کسی اور آیت کو حاصل نہیں ہے۔ مصیبت اور آفت سے بچنے اور شیاطین کے برے اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے اس آیت کا پڑھنا بہت فائدہ مند ہے، بالخصوص جب اسے ہر نماز کے بعد پڑھا جائے یا سوتے وقت پڑھ لی جائے۔

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قُدْمَ قَدْمَ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيْرِ فَمَنْ يَكْفُرُ بِالظَّاغُوتِ
وَمَا يُعَمِّلُ بِإِلَهِهِ فَقَدِ اسْتَهْسَكَ بِالْعُرُوَةِ الْوُثْقَى لَا إِنْفَصَامَ لَهَا
وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلَيْهِ ﴿٢٥٦﴾ أَللَّهُ وَلِلَّهِ الَّذِينَ آمَنُوا لَا يُخْرِجُهُمْ مِنَ
الظُّلْمَتِ إِلَى النُّورِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْ لِيَعْمَلُوهُمُ الظَّاغُوتُ لَا يُخْرِجُونَهُمْ
مِنَ النُّورِ إِلَى الظُّلْمَتِ أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَلِدُونَ ﴿٢٥٧﴾

”دین اسلام قبول کرنے میں کوئی زبردست نہیں۔ ہدایت اور گمراہی واضح ہو چکی ہیں۔ جو شیطان کو نہ مانے اور اللہ پر ایمان لائے، اُس نے مضبوط سہارا پکڑ لیا، جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔ اور اللہ سنتے والا جانتے والا ہے۔ اللہ کارساز ہے ایمان والوں کا جو انہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ مگر کافروں کے دوست شیطان ہیں جو ان کو روشنی سے نکال کر اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ لوگ دوزخی ہیں اور ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔“ (257-256)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

فِي الَّذِينَ:..... اس سے فِي دُخُولِ الَّذِينَ مراد ہے۔ کہ دین میں داخل ہونے پر جزو اکراہ اور زبردستی نہیں ہے۔

الرُّشْدُ:..... رُشد اور رشاد دنوں کے معنی ہدایت کے ہیں۔

الظَّاغُوتُ:..... یہ طغی اور طغیان سے بنا ہے جس کے معنی ہیں حد سے آگے بڑھ جانا، حد سے باہر نکل جانا۔ طاغوت سے ہر وہ چیز مراد ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی کے دائرے سے باہر نکل جائے، یا باہر نکل جانے کا بدب اور ذریعہ ہو۔ شیطان، بت اور ہر باطل شے طاغوت ہے۔

الْعُرُوَةُ:..... اس کے معنی ہیں: گول حلقة، دستہ یا کنڈا۔

الْوُثْقَى:..... یہ أوثق کا مونث ہے جس کے معنی مضبوط رستے کے ہیں۔

إِنْفَصَامَ:..... اس کے معنی ہیں: ٹوٹنا، کٹ جانا۔

وَلِيُّ:..... اس کے معنی مد دگار، حمایت، دوست اور کارساز کے ہیں۔

الظُّلْمَتِ:..... (اندھیرے) اس سے کفر، شرک، نفاق اور ہر قسم کی گمراہی کے اندھیرے مراد ہیں۔

النُّورُ:..... (روشنی) ملک سے ہدایت، ایمان اور نیک اعمال مراد ہیں۔

﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ﴾ (256)

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو دین میں زبردستی داخل نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے الفاظ میں کسی انسان کو زبردست مسلمان بنانا جائز نہیں۔ ہر کسی کو اختیار ہے خواہ وہ دینِ اسلام کو قبول کرے یا نہ کرے، ایمان لائے یا کفر پر چلے گرا پنا انجام سوچ لے۔

جیسا کہ ارشاد فرمایا:

﴿وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ قَفْنُ شَاءَ فَلَيُؤْمِنُ وَمَنْ شَاءَ فَلَيَكُفُرْ﴾ (الکھف: 29)

”اور کہہ دیجیے یہ قرآن حق ہے۔ تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اسے مان لے، جس کا جی چاہے نہ مانے.....“

گویا ہدایت اور گمراہی کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے جب کو پسند نہیں فرمایا:

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے کبھی کسی غیر مسلم کو زبردست مسلمان نہیں بنایا، جب کہ دوسرے مذاہب والوں نے مثلاً ہندوؤں اور عیسائیوں نے دوسرے لوگوں کو ہندو مت اور عیسائیت میں جبری طور پر داخل کیا۔

لیکن قرآن کے اس حکم کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مختلف جرام پر مجرموں کو سزا میں نہ دی جائیں۔ یا کفار کے خلاف جہاد و قتال درست نہیں، یا اسلام میں مرتد ہونے کی کھلی چھٹی ہے۔ بلکہ اسلامی شریعت میں ہر مجرم پر حد یا تعریر نافذ ہوگی اور ارتدا دیعنی مرتد ہونے کی سزا قتل ہے۔ گویا اسلام میں داخل ہونے یا نہ ہونے کی تو آزادی ہے مگر اسلام چھوڑنے پر پابندی ہے۔ اس کی تفصیل آیت 217 کی تفصیل میں گزر چکی ہے۔

﴿قُدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيْرِ فَمَنْ يَكْفُرُ بِالظَّاغُوتِ وَ مَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَبَّسَكَ بِالْعُرُوهَةِ الْوُثْقَى لَا إِنْفَصَامَ لَهَاۚ وَ اللَّهُ سَمِيعٌ عَلَيْهِ ﴾ (256)

فرمایا: نبی ﷺ اور قرآن مجید کے ذریعے ہدایت اور گمراہی کو واضح کر دیا گیا ہے۔ اب جو شخص ہدایت اور ایمان کی راہ اختیار کرے گا، اُسے ایک بڑا مضبوط سہارا میں جائے گا، جو کسی حال میں بھی اُس کا ساتھ نہ چھوڑے گا، بلکہ ہر جگہ اُس کا مددگار معاون اور رہنمہ ہو گا۔ مگر جو طاغوت یا شیطان کے پیچے چلے گا اور گمراہی اختیار کرے گا تو وہ اپنا انعام بھی سوچ لے کیونکہ اللہ سبحانہ ہر بات سنتا اور دلوں کے بھید جانتا ہے۔ وہ ہر ایک کو اُس کے اعمال کے لحاظ سے جزا یا مرا دے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ پر ایمان لانے سے پہلے شیطان اور طاغوت سے انکار کرنا ضروری ہے۔ جب تک جھوٹے خداوں سے سرکشی اور بغاوت نہ کی جائے، پچھے خدا کی اطاعت اور فرمائیں برداری نہیں ہو سکتی۔ کلمہ طیبہ (یا کلمہ اسلام) کے پہلے حصے کی تعلیم بھی یہی ہے کہ پہلے نبی کی جائے جھوٹے معبودوں کی، پھر اثبات کیا جائے اللہ واحد کے معبود برحق ہونے کا:

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ: کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے۔

اور یہ بالکل مقابل فرمات ہے کہ اللہ سے محبت کا دعویٰ ہوا اور دوستی شیطان اور طاغوت سے کی جائے۔

﴿أَلَّا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَإِلَيْهِ الَّذِينَ أَمْنَوْا أُمْنَوْا وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلْمَةِ إِلَى النُّورِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أُولَئِكُمُ الظَّاغُوتُ يُخْرِجُوهُمْ مِّنَ النُّورِ إِلَى الظُّلْمَةِ أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَلِدُونَ ﴾ (257)

فرمایا: اللہ سمجھا، اہل ایمان کا دوست، مددگار اور کارساز ہے جو ان کو کفر و شرک، گمراہی و بدعت اور جہالت و تسلیک کے اندھروں سے نکالتا ہے اور ان کو علم و یقین، ایمان وہدایت اور جنت کے راستے کی روشنی کی طرف لاتا ہے۔ جب کہ کفار و شرکیں کے ساتھی طاغوت اور شیطان ہیں جو ان کو ایمان وہدایت کی روشنی سے محروم کر کے خواہش پرستی، کفر و شرک، گمراہی و بدعت اور جہالت و تسلیک کے اندھروں کی طرف دھکیلتے ہیں۔

آیت میں ظلمات (اندھیرے) جمع اور اُس کے مقابل میں نور (روشنی) واحد آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کفر و شرک اور گمراہی کے شیطانی راستے بے شمار ہیں جب کہ ایمان وہدایت کی شاہراہ صراط مستقیم ایک ہی ہے۔ جیسا کہ سورہ الانعام میں فرمایا ہے:

﴿وَأَنَّ هَذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَبَعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقُ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ذُلِّكُمْ وَصُلُّكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ (الانعام: 6)

”اور یہ کہ تیکی میری سیدھی شاہراہ ہے۔ اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو، ورنہ وہ تمہیں اللہ کے راستے سے جدا کر دیں گے۔ اللہ نے اس بات کی تمہیں تاکید فرمائی ہے تاکہ تم پر ہیزگار بن جاؤ۔“

اور اسی مضمون کی تشریع میں وہ حدیث موجود ہے جو حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے کہ ((خطَ لَنَا رَسُولُ اللَّهِ صلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطَا، ثُمَّ قَالَ: هَذَا سَبِيلُ اللَّهِ، ثُمَّ خَطَ خَطُوطًا عَنْ يَمِينِهِ وَعَنْ شَمَالِهِ، وَقَالَ: هَذِهِ سُبُلٌ، عَلَى كُلِّ سَبِيلٍ مِّنْهَا شَيْطَانٌ يَدْعُوَا إِلَيْهِ، وَقَرَاءَ "وَأَنَّ هَذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ الآية))

(ابن ماجہ، رقم: 11، دارمی، رقم: 202، مسند احمد، 435/1، رقم: 4142)

”رسول اللہ ﷺ نے ہمارے لیے ایک خط کھینچا (لکیر کھینچی)۔ پھر فرمایا: یہ اللہ کا راستہ ہے۔ پھر آپ ﷺ نے اس خط کے دائیں بائیں کچھ اور خط کھینچنے اور فرمایا: یہ مختلف را ہیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک راہ پر ایک شیطان موجود ہے جو اس راہ کی طرف بلاتا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿وَأَنَّ هَذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ﴾ (الانعام: 6) (یہ پوری آیت اور اس کا ترجمہ اور پر گزر چکا ہے۔)

اسی طرح نور ہدایت عطا کرنے والا اللہ ایک ہے اس لیے ولیٰ کا لفظ واحد آیا ہے۔ مگر گمراہ کرنے والے شیاطین و طواغیت لا تعداد ہیں، اس لیے ان کے لیے جمع کا صیغہ اولیاً استعمال ہوا ہے۔

آخر میں فرمایا کہ ایسے کافروں اور مگرا ہوں کا انجام دوزخ کی آگ ہے جس کے عذاب میں وہ ہمیشہ گرفتار ہیں گے۔

اللَّهُ تَرَأَى إِلَيَّ الَّذِي حَاجَ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ أَنْتَهُ اللَّهُ الْمُلْكُ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُعْجِزُ وَيُمْكِنُ لَا قَالَ أَنَا أُعْجِزُ وَأُمْكِنُ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمِينَ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأَتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبِهِمَّتِ الَّذِي كَفَرَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّلَمِيْنَ ۝

”کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا جسے اللہ نے بادشاہی عطا کی تھی۔ اس نے بادشاہی کے غور میں ابراہیم عليه السلام سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑا کیا۔ ابراہیم عليه السلام نے کہا: میرا رب وہ ہے جس کے ہاتھ میں زندگی اور موت ہے۔ وہ بولا: ”زندگی اور موت میرے اختیار میں بھی ہے۔“ ابراہیم عليه السلام نے کہا: ”اچھا، اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تم اسے مغرب سے نکال دکھاؤ؟“ اس پر وہ کافر ہٹا بٹکا رہ گیا۔ اور اللہ خالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔“ (258)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

اللَّهُ تَرَأَى:..... اس میں (أ) کا استقہام انکاری ہے۔ گویا یہ سوال کے لیے نہیں بلکہ تجب کے لیے ہے اور اس کا مقصد مخاطب کو متوجہ کرنا ہوتا ہے۔ سورہ انفیل کے شروع میں بھی یہ اسی مفہوم میں ہے۔ یہ خطاب عام ہوتا ہے اور کوئی خاص شخص یا گروہ اس کا مخاطب نہیں ہوتا۔

الَّذِي:..... اس سے ایک کافر بادشاہ نمود مراد ہے جو حضرت ابراہیم عليه السلام کا ہم عصر (CONTEMPORARY) تھا۔

حَاجَ:..... اس کے معنی جَادِلَ کے ہیں۔ گویا ایسا مکالمہ اور مباحثہ جس میں ہر فریق اپنی بات کو دیل کے ساتھ پیش کرے۔

أَنْ:..... اس سے پہلے کوئی حرف جاری ہے لی یا بِ وغیرہ مذوف ہے۔ جو وہ اور سب کو ظاہر کر دے۔

فُبُهْتَ:..... بُهْت یہ اگرچہ مجھوں ہے مگر اسی حالت پر متنی استعمال ہوتا ہے۔ اس کی مثال یہ رَعُونَ ہے، جو مجھوں ہے اور متنی کی حالت میں مستعمل ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَجَاءَهُ قَوْمٌ يُهْرَعُونَ إِلَيْهِ﴾
(ہود: 11)

”اور اس کی قوم اس کی طرف دوڑتی ہوئی آئی۔“

بُهْتَ: کے معنی ہیں: بیہوت ہونا، ہمگا بگارہ جانا، لا جواب ہو جانا۔

الظَّلَمُيْنِ: اس جگہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو واضح دلائل اور کھلے حقائق کا انکار کر دیتے ہیں۔

﴿أَلَّهُ تَرَأَى الَّذِي حَاجَ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنَّ اللَّهُ أَنْشَأَ لَكُمْ لِكُلِّ شَيْءٍ﴾ (258)

اس سے پہلے یہ مضمون بیان ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا دوست اور مددگار ہے جو ان کو گمراہی کے اندر ہیروں سے نکال کر ہدایت کی روشنی کی طرف لاتا ہے۔ جب کہ کافروں کے دوست شیطان اور طاغوت ہیں جو ان کو ہدایت کی روشنی سے نکال کر گمراہی کے اندر ہیروں کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔

اب اسی حقیقت کو ایک واقعی مثال کے ذریعے سمجھایا جا رہا ہے جس میں ہدایت اور گمراہی کے دونوں نمونے پائے جاتے ہیں۔

اس آیت میں نمرود (بن کعنان بن سام بن نوح ﷺ) کا واقعہ ہے جو بابل (عراق) کا ایک مشرک، متکبر اور خدائی کا دعوے دار کافر بادشاہ تھا۔ وہ ابراہیم ﷺ کا ہم عصر (CONTEMPORARY) تھا۔ اس نے ابراہیم ﷺ سے اس کے معبود رب کے بارے میں مناظرہ کیا تھا جس کا ذکر تلمود (TALMUD) میں، جو کہ توریت کی شرح ہے، موجود ہے۔

نمرود کو اپنی بادشاہی اور اقتدار کا غرور بھی تھا اور وہ خدائی کا دعوے دار بھی تھا۔ لوگ اُسے سورج دیوتا کا اوٹار سمجھ کر اُس کی پوجا بھی کرتے تھے۔ اس طرح وہ خدائی بادشاہ (KING GOD) تھا۔ جب ابراہیم ﷺ نے قوم کے بت خانے میں گھس کر ان کے بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تو اس پر نمرود نے ابراہیم ﷺ کو بلا یا اور آپ سے سوال کیا کہ تم کس رب کو معبود مان کر اس کی عبادت کرتے ہو۔

﴿إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُهْبِي وَيُبَيِّثُ قَالَ آتَاكَ أُمْحِي وَأُمِيَّتُ طَ﴾ (258)

جواب میں ابراہیم ﷺ نے فرمایا: میں صرف اس رب کو معبود مانتا ہوں جس کے ہاتھ میں زندگی اور موت کا اختیار ہے۔ نمرود بولا: یہ اختیار تو میرے ہاتھ میں بھی ہے۔ پھر جیسا کہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے، اُس نے قید خانے سے دو قیدی ملنگوائے۔ ان میں سے ایک کو آزاد اور بری کر دیا، دوسرا کو قتل کر دیا اور بعد میں کہنے لگا: دیکھو، میں بھی زندگی اور موت کا اختیار رکھتا ہوں۔ اس طرح اُس نے مغالطہ دینے کی کوشش کی جو ظاہر ہے ایک نامعقول حرکت تھی۔

﴿قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمِّ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأَتَ إِلَيْهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَكُبِّهَتِ الَّذِي كَفَرَ﴾ (258)

اس پر ابراہیم ﷺ نے فرمایا: اچھا، میرا اللہ جس کو میں معبود اور رب مانتا ہوں، وہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے۔ اگر تو بھی رب اور خدا ہے تو سورج کو مغرب سے نکال دکھا۔ اس پر وہ کافر بادشاہ ہمگا بگارہ گیا۔ وہ لا جواب ہو گیا۔ کیونکہ

اب وہ کوئی مغالطہ نہیں دے سکتا تھا۔

اس مباحثے (DEBATE) سے معلوم ہوا کہ انہیاے کرام عام پیشہ ور مناظرہ بازوں کی طرح بحث برائے بحث میں نہیں انجھتے۔ بلکہ وہ دائی اور مبلغ ہوتے ہیں۔ وہ ایک باض طبیب کی طرح دیکھتے ہیں کہ اگر ایک دوا کا مریض پر اثر نہیں ہو رہا۔ تو وہ کوئی دوسرا نسخہ دے دیتے ہیں۔ ان کا مقصد دوسرے فریق کو زیچ کر کے چپ کرنا نہیں ہوتا۔ نہ وہ اسے بحث برائے بحث میں الجھائے رکھتے ہیں بلکہ وہ اپنی دلیل بدلت کر کوئی ایسی دوسری دلیل پیش کر دیتے ہیں جس سے خاطب کو اصل حقیقت دکھائی دینے لگتی ہے۔

﴿وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّلَمِينَ ﴾ (258)

آخر میں فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ اس قسم کے ظالموں کو سیدھی راہ نہیں دکھاتا۔ کیونکہ ان کی سوچ اپنے ذاتی مفادات اور اپنی خواہشاتِ نفسانی سے آگے نہیں بڑھتی۔ اس لیے یہ لوگ عقل کے اندر ہے اور بے بصیرت ہوتے ہیں۔ یہ نہ صرف حق کی تلاش اور سچائی کی جبوتوں کرتے بلکہ واضح دلائل اور کھلی حقائق کا انکار کر دیتے ہیں۔ اپنے غلط اور جھوٹے موقف کے حق میں کوئی مضبوط دلیل نہیں رکھتے۔ محض ادھر ادھر کی بے کنکتے ہیں اور نامعقول باتوں اور بہاؤں کا سہارا لیتے ہیں۔ ایسے لوگ باطل کے گندہ چھیاروں سے حق کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ظاہر ہے حق و باطل کی ہر لڑائی میں حق کی فتح اور باطل کی شکست یقینی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زُهُوقًا﴾ (بنی اسرائیل 17:81)

”اور کہہ دیجئے: حق آگیا اور باطل مت گیا۔ بے شک باطل مت جانے والی چیز ہے۔“

اس جگہ ظالموں کے بارے میں ہے کہ اللہ سبحانہ ان کو سیدھی راہ پر نہیں چلاتا اور ہدایت نہیں دیتا۔ لیکن بعض دوسرے مقامات پر آیا ہے کہ کافروں اور فاسقوں نافرانوں کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ کی یہی سنت ہے:

﴿وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكُفَّارِينَ﴾

”اور اللہ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔“

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَسِيقِينَ﴾

”اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“

کیونکہ یہ لوگ ظالم، کافر، فاسق ہدایت کے طلبگار نہیں ہیں اور ہدایت صرف اسے ملتی ہے جو ہدایت کا طلب گار ہو اور اس کی طرف رجوع کرے:

﴿اللَّهُ يَعْجِزُ إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ يُنِيبُ﴾

(الشوری 42:13) ”اللہ جسے چاہتا ہے جُن لیتا ہے اور ہدایت اسے دیتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔“

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرِيبَةٍ وَ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا۝ قَالَ أَنِّي
يُحِبُّ هَذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا۝ فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةً عَامًا ثُمَّ بَعْثَةٌ۝ قَالَ
كَمْ لَبِثْتُ۝ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ۝ قَالَ بَلْ لَبِثْتَ
مِائَةً عَامًا فَانْظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهُ۝ وَ انْظُرْ
إِلَىٰ حِمَارِكَ وَ لِنَجْعَلَكَ آيَةً لِلنَّاسِ وَ انْظُرْ إِلَىٰ الْعِظَامِ كَيْفَ
نُنْشِرُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا۝ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ۝ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ

اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ ۱۵۹

”یا اُس آدمی کے بارے میں تم نے غور نہیں کیا جس کا گزر ایک ایسی بستی پر ہوا جس کے مکانات چھتوں سمیت زمین بوس ہو چکے تھے۔ اُس نے تعجب سے کہا: ”اللَّهُ اس بستی کو دوبارہ کیسے زندہ کرے گا؟“ اللَّه نے اُس آدمی پر سو (100) برس تک کے لیے موت طاری کر دی۔ پھر اسے زندہ کیا اور پوچھا: ”تم کتنا عرصہ اس حالت میں رہے؟“ اس نے کہا: ایک دن، یا ایک دن سے بھی کچھ کم۔“ اللَّه نے فرمایا: ”نہیں، تم سو (100) سال رہے۔ اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو، وہ لگی سری نہیں، لیکن اپنی سواری کے گدھے کا پخیرد دیکھو۔ یہ سب کچھ ہم نے اس لیے کیا تاکہ اسے لوگوں کے لیے اپنی قدرت کی نشانی بنادیں۔ اور تم اپنے مردہ گدھے کو زندہ ہوتے دیکھو، کس طرح ہم اُس کی ہڈیوں کا ڈھانچہ کھڑا کرتے ہیں، پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ جب اس آدمی پر ساری حقیقت ظاہر ہو گئی تو وہ پکارا ہوا: میرا یقین ہے کہ اللَّه ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔“ (259)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

خَاوِيَةٌ: اس کے معنی ساقطہ یعنی گری ہوئی کے ہیں۔ خَوَى الْبَيْتُ کے معنی ہیں: گھر گر گیا۔

عُرُوشٌ:..... اس کا واحد عَرْشٌ ہے جس کے اصل معنی چھت کے ہیں۔ ہر وہ چیز جو دھوپ سے بچنے کے لیے سائے کے طور پر بنائی جائے وہ عرش یا عریشہ ہے۔ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا کا مطلب یہ ہے کہ پہلے چھتیں گریں اور پھر دیواریں گر گئیں۔

أَنِّي:..... اس کے معنی آئیں (کہاں) کے بھی ہوتے ہیں اور گئیف (کیسے) کے بھی۔ اس جگہ یہ دوسرے معنی مراد

پہلی۔

لَمْ يَتَسَّنَّهُ: (س ن ن) اس کے معنی ہیں لَمْ يَتَغَيِّرْ، وَلَمْ يَفْسُدْ کے ہیں کہ نہ وہ بدلا اور نہ خراب ہوا۔ یہ تَسْنَةُ الشَّئْوَعُ کے معنی میں ہے کہ کسی چیز پر کئی برس گزر گئے، یا کوئی چیز برسوں تک پڑی رہی۔

نُنْشُرُهَا: آنَهَرَ يُنْشِرُ إِنْشَازًا کے معنی ہیں ہڈیوں کو زمین سے اٹھا کر جسم میں ان کی مناسب جگہ پر لگا دینا۔

﴿أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرِيَّةً وَ هِيَ خَاوِيَّةٌ عَلَىٰ عُرُوشَهَا﴾ (259)

اس ”آؤ“ (یا) کا عطف اور ”الْمُتَّرَ“ (کیا تم نے غور کیا) پر ہے جو آیت 258 میں آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یا تم اس دوسرے واقعے پر غور کرلو۔

اس سے پہلے ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کے درمیان بحث و مباحثے سے یہ حقیقت سامنے آئی تھی کہ ابراہیم علیہ السلام کا راب اور معبد صرف سورج پر کنٹرول رکھتا ہے (جس کو خود نمرود بھی ایک دیوتا مان کر پوجتا تھا) بلکہ پوری کائنات کا نظام بھی اُسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اب اسی بنیاد پر ایک نبی (حضرت عزیز علیہ السلام) کا واقعہ بیان کر کے بتایا چاہا ہے کہ جب اللہ سبحانہ ہر چیز پر قادر ہے تو وہ قیامت کے دن مردہ انسانوں کو بھی دوبارہ زندہ کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور یہ کہ آخرت کی زندگی ایک حقیقت ہے۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کے ایک نبی حضرت عزیز علیہ السلام کے ایک مشاہدے کا ذکر ہے جن کا گزر فلسطین میں بیت المقدس کے قریب ایک بستی پر ہوا، جو بابل کے ایک ظالم بادشاہ بخت نصر کی غارت گری کے نتیجے میں تباہ ہوئی تھی۔ جس کے مکانات چھوٹوں سمیت زمین بوس ہو چکے تھے، جانور تک مر چکے تھے اور اب وہ بستی ایک کھنڈر کا منظر پیش کر رہی تھی۔

﴿قَالَ أَفَلَيْخْيُ هُنْدِيَ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَأَمَّا تَهُدُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعْثَهُ إِلَيْهِ قَالَ كُنْ لَيْسْتَ بِكُنْتَ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ إِنَّمَا قَالَ بَلْ لَيْسْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ إِلَى طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ يَتَسَّنَهُ﴾ (259)

حضرت عزیز علیہ السلام کے دل میں خیال گزرا اور ان کو تعجب ہوا کہ اس تباہ شدہ بستی کے انسانوں کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کیسے دوبارہ زندہ کرے گا اور یہ دیراثہ بھی کبھی آباد ہو سکتا ہے!

اس پر اللہ سبحانہ نے عزیز علیہ السلام کو سو (100) سال تک موت کی نیند سلاٹے رکھا اور پھر زندہ کر کے پوچھا: تم کتنی مدت مردہ حالت میں رہے؟ انہوں نے اپنے گمان کے مطابق عرض کیا: ایک دن، یا دن کا کچھ حصہ نیند میں گزرا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم پورے سو (100) برس تک موت کی آنکھوں میں بے جان پڑے رہے تھے۔ اب میری قدرت کا کر شمشہ دیکھو، تمہارے سفر کے کھانے پینے کی چیزیں بالکل محفوظ اور اپنی اصلی حالت پر ہیں۔ نہ وہ باسی ہوئی ہیں اور نہ ان کا ذائقہ بدلا ہے۔

﴿وَ انْظُرْ إِلَىٰ حَمَارِكَ وَ لِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ وَ انْظُرْ إِلَىٰ الْعِظَامِ كَيْفَ نُذْشِهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا﴾ (259)

مگر اپنی سواری کے جانور گدھے کو غور سے دیکھ لو، جو مرنے کے بعد صرف چند بوسیدہ ہڈیاں رہ گئی ہیں، کہ ہم اب اسے دوبارہ کیسے زندہ کرتے ہیں۔ پہلے اس کی ہڈیوں کو جوڑ کر ان کا ڈھانچہ کھٹرا کریں گے۔ پھر ان ہڈیوں پر گوشت چڑھادیں گے اور وہ دوبارہ پہلے جیسا جیتا جا گتا گدھا بن جائے گا۔

اس طرح یہ واقع سیدنا عزیز ﷺ کے لیے علم یقین سے بڑھ کر عین یقین کی حد تک اللہ تعالیٰ کی اس قدرت کی نشانی بن گیا کہ وہ آخرت میں لوگوں کو دوبارہ زندہ فرمائے گا اور یہی واقعہ آئندہ کے لوگوں کے لیے بھی اللہ سبحانہ کی قدرت کی نشانی بن گی۔

﴿فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ (259)

پھر جب حضرت عزیز ﷺ نے گدھے کے دوبارہ زندہ ہونے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو پاکارا ہے: مجھے اب پختہ یقین ہو گیا ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور وہ قیامت کے دن تباہ شدہ بستی کے انسانوں کو بھی دوبارہ زندہ کر دے گا۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيْ أَرِنِيْ كَيْفَ تُحْكِيُ الْمَوْتَىْ قَالَ أَوَ لَمْ تُؤْمِنْ قَالَ
بَلٌ وَلَكِنْ لِيَطْمِئِنَ قَلْبِيْ قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ
إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْعًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَا تَبَّانِكَ

سَعْيًا وَ اعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ

۱۵

”اور یاد کرو جب ابراہیم ﷺ نے کہا: اے میرے رب! مجھے دکھاتو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟ فرمایا: کیا تمہیں اس کا یقین نہیں؟ عرض کیا: یقین تو ہے لیکن میں دیکھنا چاہتا ہوں تاکہ میرا دل پوری طرح مطمئن ہو جائے۔ فرمایا: چار پرندے لو، انہیں اپنے ساتھ ہلا لو تاکہ وہ مانوس ہو جائیں۔ پھر ان کے لکڑے کر کے الگ الگ پہاڑی پر ان کا ایک ایک لکڑا رکھو۔ پھر ان کو بلاو، وہ تمہارے پاس دوڑ کر آئیں گے۔ اور یاد رکو، اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔“ (260)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

لِيَطْمِئِنَ قَلْبِيْ: (تاکہ میرے دل کو اطمینان حاصل ہو جائے) اس سے آخرت پر یقین کے بارے میں اطمینان مراد نہیں ہے کیونکہ وہ تو ان کو پہلے ہی وجی کے ذریعے حاصل تھا۔ بلکہ اس جگہ تخلیق کی حالت کا مشاہدہ مراد ہے۔

فَصُرُّهُنَّ:..... یہ صور سے ہے۔ صارِ یصوُّر کے معنی ہیں مائل کرنا، جھکانا۔ اپنے سے ہلانا اور مانوس کر لینا۔
جُزْءُهُ:..... اس سے پرندوں کے ٹکڑے کرنا مراد ہے۔

سَعْيًا:..... اس سے مراد ہے پرندوں کا تیزی سے بیک وقت چلنا، دوزنا اور اڑنا۔

﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمَ رَبِّ أَرْبَيْنِي كَيْفَ تُنْجِي الْمُوْتَىٰ قَالَ أَوَ لَهُ تَوْصِيْنٌ قَالَ بَلٌ وَلِكُنْ لَيْطَمِيْنَ قَلْبِيٰ ﴾ (260)

اب آخرت کی زندگی کو ثابت کرنے کے لیے یہ دوسری مثال دی گئی۔ جس سے ایک تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کا دوست اور مددگار ہے۔ دوسرے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی زندگی ہے جس میں لوگوں کا حساب کتاب ہوگا۔

اوپر آیت 258 میں اللہ تعالیٰ کے رب اور معبد ہونے کے بارے میں صرف ایک ہی واقعہ کی مثال کافی ہوئی۔ مگر آیت 259 اور 260 میں آخرت کی زندگی کے ثبوت میں دو واقعات کی مثالیں دی گئیں۔ کیونکہ پہلی حقیقت کو مانے والے بہت لوگ ہیں۔ جب کہ دوسری حقیقت پر یقین رکھنے والوں کی تعداد دنیا میں کم رہی ہے جن کے لیے ایک سے زیادہ واقعات کی مثالیں بیان کرنے کی ضرورت تھی۔

ارشاد ہوا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے ایک موقع پر اللہ سبحانہ سے عرض کیا: میرے رب! مجھے دھا کہ تو مردہ انسانوں کو کیسے زندہ کرے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا تمہیں اس کا یقین نہیں؟ عرض کیا: یقین تو ہے مگر میں اپنے دلی اطمینان اور شرح صدر کے لیے اس کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔

﴿قَالَ فَخَذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الظَّيْرِ فَصُرُّهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَا تَيْنَكَ سَعْيًا ﴾ (260)

اس پر اللہ سبحانہ نے ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا: اچھا، چار پرندے لے لو۔ ان کو اپنے ساتھ اچھی طرح مانوس کرلو۔ پھر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان کو الگ الگ پھاڑی پر رکھ دو۔ اس کے بعد ان کو اپنی طرف بلاو۔ وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آجائیں گے۔ تم ان کو بچاں لو گے کہ یہ واقعی وہی پرندے ہیں جو پہلے میرے پاس تھے۔

یہ انبیاء علیہم السلام کا خاص مرتبہ و مقام ہے کہ عقائد و حقائق کے بارے میں ان کا علم فلسفیوں اور دانشوروں کی طرح محض عقلی اور استدلائی نہیں ہوتا بلکہ مشاہداتی اور عین یقین کے درجے کا ہوتا ہے۔

معلوم ہے اسی طرح نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ کو بھی معراج کے موقع پر جنت و دوزخ وغیرہ کے مشاہدات کرائے گئے تھے۔

یاد رہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا مذکورہ مجرہ ان کے اپنے اطمینانِ قلب اور ذاتی شرح صدر کے لیے تھا اور عام مجردوں کی

طرح ان کی قوم پر اتمام جوت کے لیے نہ تھا۔

﴿وَاعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴾ (260)

آخر میں فرمایا: کہ اس حقیقت کا یقین ہونا چاہیے کہ اللہ سبحانہ عزیز اور حکیم ہے۔ وہ غالب اور زیر دست ہے کہ اپنی قدرت و طاقت سے انسانوں کو دوبارہ زندہ کر کے آخرت کی زندگی برپا کر سکتا ہے۔ اور وہ حکمت والا ہے اور اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ آخرت کی جزا اور ضرور ہو۔ ورنہ انسانوں کی تخلیق اور دنیا کی یہ زندگی فضول، بے مقصد اور عبث ہو کر رہ جاتی ہیں۔

**مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ
سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِائَةً حَبَّةً وَاللَّهُ يُضْعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ
وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلَيْهِمْ ۝ ۲۶۱ ۷۳۱ أَلَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
ثُمَّ لَا يُتَبِّعُونَ مَا أَنْفَقُوا مَثَماً وَلَا أَذْغَى لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ
وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزُنُونَ ۝ ۲۶۱**

”جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، ان کے ثواب کی مثال بیج کے اس دانے کی ہے جس سے سات (7) بالیں پیدا ہوں۔ ہر بالی میں سو سو (100) دانے ہوں۔ اللہ جس کے لیے چاہتا ہے، اس سے بھی زیادہ بڑھاتا ہے۔ اللہ بڑی وسعت والا سب کچھ جانے والا ہے۔

جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ اس کے بعد کسی پر احسان نہیں جلتا تے اور نہ تکلیف پہنچاتے ہیں، وہ اپنے رب کے ہاں اجر پائیں گے۔ ان کو نہ کوئی ڈر ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

﴿مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ
فِي كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِائَةً حَبَّةً ﴾ (261)

اس سے پہلے یہ مضمون بیان ہوا کہ آخرت کی زندگی یقینی ہے۔ اب اس زندگی کی تیاری کے لیے اچھے اعمال کا ذکر ہے اور ان میں سے ایک اچھا عمل یہ ہے کہ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے۔ یہ اتفاق فی سبیل اللہ صرف اللہ سبحانہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے ہونا چاہیے۔ اس لیے نہ ہو کہ جس پر خرچ کیا جائے اُس پر احسان جلتا یا جائے، یا اُسے

نگ کیا جائے اور تکلیف پہنچائی جائے۔ ورنہ اس طرح کا صدقہ دینے سے تو نہ دینا بہتر ہے۔

فرمایا جو لوگ اللہ کی رضا کے لیے اُس کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں اُن کے ثواب کی مثال ایسی ہے جیسے کھیت میں ایک دانہ بویا جائے۔ (یاد رہے حبّة (دانہ) واحد ہے اس کی جمع حبّ (دانے، انماج، غلہ) ہے۔) جس سے سات بالیاں لٹکیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں، تو یہ ایک دانے کے سات سو دانے ہوئے۔

دہقان اگر نہ ہو تن آسان

ہر دانہ ہے صد ہزار دانہ!

اسی طرح ایک نیکی سات سو (700) نیکیوں کے برابر ہو جاتی ہے۔

﴿وَاللَّهُ يُضِعِّفُ لِمَنْ يَشَاءُ﴾ (261)

پھر فرمایا: ”اللہ جس کے لیے چاہتا ہے اُس کا اجر کئی گناہ بڑھادیتا ہے۔“

اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ کسی ایک نیکی کا سات سو نیکیاں ہو جانا آخری حد نہیں ہے بلکہ اس سے زیادہ اضافہ ہو سکتا ہے۔

صحیح حدیث میں ہے کہ بعض اوقات کسی ایک نیکی کا ثواب پہاڑ یا اس سے بھی بڑھ کر ہو جاتا ہے۔

﴿الَّذِي تَكُونُ مِثْلَ الْجَبَلِ أَوْ أَعْظَمَ﴾

(صحیح بخاری، رقم: 1410، نسائی، رقم: 2526، ابن ماجہ، رقم: 1842)

”یہاں تک کہ وہ (نیکی) پہاڑ جیسی یا اس سے بھی بڑی ہو جاتی ہے۔“

بعض لوگ جو حدیث و سنت کی اہمیت کو نہیں سمجھتے وہ وَاللَّهُ يُضِعِّفُ لِمَنْ يَشَاءُ (اللہ جس کے لیے چاہتا ہے اس سے بھی زیادہ بڑھاتا ہے) کو ایک خدائی ضابطہ تصور کر کے ایک نیکی کے ثواب کو صرف سات سو (700) گناہ بڑھنے تک محدود اور مخصوص خیال کرتے ہیں، لیکن وہ نہیں جانتے کہ اگر یہ ضابطہ ہے تو فقط یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی ایک نیکی کا اجر بہت سی نیکیوں کے اجر کے برابر کر دیتا ہے۔ یہ ضابطہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف سات سو (700) تک اضافہ کرنے کا محاذ ہے اور وہ اس سے زیادہ کا اضافہ کرنے میں بے بس ہے۔

مثال کے طور پر یہ ایک ضابطہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کی روزی کم کر دیتا یا بڑھادیتا ہے۔

﴿وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُطُ﴾ (البقرہ 2: 245)

”اور اللہ کم دیتا ہے اور زیادہ دیتا ہے۔“

تو کیا اس کا یہ مطلب لیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کسی کی روزی 2 روپے سے کم اور ایک کروڑ روپے سے زیادہ نہیں کر سکتا کیوں کہ یہ اس کے ضابطے کے خلاف ہے۔ جب کہ قرآن کا اعلان ہے کہ:

﴿وَاللَّهُ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (البقرہ 2: 212)

”اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔“

دوسرا سے جب ایک صحیح حدیث موجود ہے کہ ایک نیکی کا ثواب ایک پہاڑ کے برابر یا اس سے بھی زیادہ ہو سکتا ہے تو اس حدیث کو قرآن ہی کی تشریع کے طور پر کیوں نہ مانا جائے؟

جب کوئی نیکی مشکل حالات میں نگہ و سائل سے بڑے جوش و جذبے کے ساتھ کی جائے گی، اس میں ریا کاری اور دکھاو ا شامل نہ ہوگا، اور وہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا اور اُس کی خوشنودی کی خاطر کی جائے گی تو اس کا اجر و ثواب سات سو(700) گنا سے زیادہ بڑھ سکتا ہے۔

یہ سراسر خدائے رحمان و رحیم کا افضل و احسان اور اُس کی بے پایاں رحمت و شفقت ہے کہ وہ ایک نیکی کو کم سے کم دس (10) نیکیوں کے برابر قرار دیتا ہے مگر کوئی برائی صرف ایک ہی برائی شمار کرتا ہے۔ پہلی صورت اُس کا افضل ہے اور دوسری صورت اُس کا عدل ہے۔ سورۂ الانعام میں ہے:

﴿مَنْ جَاءَ بِالْخَيْرِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى إِلَّا مِثْهَاكَ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾ (الانعام: 6)

”جو شخص ایک نیکی لائے گا اُسے دس نیکیوں کا ثواب ملے گا۔ اور جو برائی لے کر آئے گا اُسے اُس برائی کے برابر بدلہ ملے گا۔ اور اُن سے کوئی نافرمانی نہیں کی جائے گی۔“

اور بعض اوقات وہ کسی ایک نیکی کو سات سو(700) گنا بلکہ ایک پہاڑ کے برابر یا اس سے بھی زیادہ تک بڑھا دیتا ہے۔

﴿وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴾ (261)

اللہ ایک نیکی کا ثواب کئی گنا بڑھا دیتا ہے کیونکہ وہ وَاسِعٌ (وسعت والا) ہے۔ اُس کے وسیع خزانوں میں کوئی کمی نہیں۔ اُس کے ہاں ہر شے کی فراوانی ہے۔ پھر وہ عَلِيمٌ (علم والا) بھی ہے۔ ہر بات جانتا ہے۔ کوئی نیکی خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی، اُس کی نگاہ سے چھپ نہیں سکتی اور وہ دلوں کی نیقوں اور ارادوں کو بھی جانتا ہے۔

﴿أَلَّا ذِيَّنَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ لَا يُنْتَهُونَ مَا أَنْفَقُوا مَثَّا وَ لَا أَذَى لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (262)

فرمایا: جو لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اُس کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ پھر جن کو وہ صدقہ و خیرات دیتے ہیں، ان پر نہ کوئی احسان جلتاتے ہیں، نہ ان کی دل آزاری کرتے ہیں تو ایسے لوگوں کو ان کے رب کے ہاں ضرور اجر ملے گا۔

﴿وَلَا خُوفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَمُونَ ﴾ (262)

یہ اُس اجر کی وضاحت ہے جو انفاق فی سبیل اللہ کرنے والوں کو ملے گا کہ وہ آخرت میں ایک ایسے مقام پر رہیں گے جہاں ان کو نہ آئندہ کا خوف و خطر ہو گا اور نہ وہ ماضی کی کسی بات کی وجہ سے غمگین ہوں گے۔

یاد رہے قرآن کی اس تعبیر سے جنت اور اس کی ابتدی نعمتیں مراد ہوتی ہیں۔ جیسا کہ سورہ الاعراف میں ہے:

﴿أَدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خُوفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا أَنْعُمْ تَعْزَزُونَ﴾ (الاعراف: 49:7)

”تم جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اب تمہارے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ تم غمگین ہو گے۔“

قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَ مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَتَبَعَّهَا آذَىٰ وَ اللَّهُ

عَنِّيْ حَلِيمٌ ۲۶۳

”بھلی بات کہنا اور درگزر کرنا اُس صدقے سے بہتر ہے جس کے بعد شک کرنا ہو۔ اور اللہ بے نیاز اور تحمل والا ہے۔“ (263)

آیات کی تفسیر:

﴿قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَ مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَتَبَعَّهَا آذَىٰ﴾ (263)

فرمایا: سائل یا محتاج سے اچھے انداز میں بات کرنا، اُس سے عفو و درگزر کرنا اور بھلے طریقے سے مغفرت کر لینا،

جیسے یوں کہہ دیا جائے:

”معاف کیجئے“، ”الله بھلا کرے“، ”الله خیر کرے گا“، وغیرہ۔ یہ ایسے صدقہ و خیرات سے کہیں بہتر ہے جس کے بعد اُس بچارے محتاج کی دل آزاری کی جائے، خواہ احسان جتا کر، یا اُس کی تحقیر کر کے، یا اُسے کسی طرح سے ٹک کر کے۔

﴿وَ اللَّهُ عَنِّيْ حَلِيمٌ﴾ (263)

فرمایا: اللہ تعالیٰ غنی اور بے نیاز ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں۔ جو کوئی اُس کی راہ میں صدقہ و خیرات کرتا ہے تو وہ اپنے فائدے کے لیے کرتا ہے کہ اُس کا اجر ملے گا۔ پھر جو شخص صدقہ کر کے صدقہ لینے والے کی دل آزاری کرتا ہے تو اللہ ایسے صدقے کا کوئی ثواب نہیں دے گا۔

اور اللہ حلیم اور تحمل والا بھی ہے کہ جو مال دار صدقہ نہیں کرتا، یا صدقہ کر کے محتاج کی دل آزاری کرتا ہے تو اللہ ایسے لوگوں کو فوری طور پر سزا نہیں دیتا بلکہ مهلت دیتا ہے کہ وہ توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر لیں۔

يَا يَهُهَا الَّذِينَ أَمْنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمِنْ وَ الْأَذْيَ كَالَّذِي
يُنْفِقُ مَالَهُ رِعَاءَ النَّاسِ وَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَ الْيَوْمَ الْأُخْرَ فَمِثْلُهُ
كَمَشْلِ صَفْوَانِ عَلَيْهِ تَرَابٌ فَاصَابَهُ وَ اِبْلٌ فَتَرَكَهُ صَلَدًا لَا يَقْدِرُونَ
عَلَى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا وَ اللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكُفَّارِ

(۲۶۴)

”اے ایمان والو! دوسروں پر احسان جتا کر اور انہیں تکلیف پہنچا کر اپنے صدقے کا ثواب ضائع نہ کرو۔ جیسے وہ شخص اپنا ثواب ضائع کر دیتا ہے جو دکھاوے کے لیے مال خرچ کرتا ہے، نہ اللہ پر اس کا ایمان ہوتا ہے اور نہ آخرت کے دن پر۔ ایسے شخص کی مثال ایسی ہے جیسے پھر کی ایک چٹان ہو، جس پر کچھ مٹی پڑی ہو، پھر اس پر زور کی بارش ہو، اور اسے بالکل صاف کر دے۔ ایسے لوگوں کو اپنی کمائی سے کچھ حاصل نہ ہوگا اور ایسے کافروں کو اللہ ہدایت نہیں دیتا۔“ (264)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

صفویان: اس کے معنی ہیں چکنا اور ملائم پھر یا چٹان۔

الْوَابِلُ: اس کے معنی زوردار بارش کے ہیں۔

صَلَدًا: اس کا مطلب ہے بالکل صاف، پھیل چیز، جس پر کوئی گرد و غبار نہ ہو۔

لَا يَقْدِرُونَ عَلَى شَيْءٍ: اس کے معنی ہیں لَا یَجِدُونَ وَ لَا یَمْلُکُونَ الشَّيْءَ یعنی وہ کچھ حاصل نہیں کر سکتے اور نہ کسی چیز کے مالک ہوتے ہیں۔

﴿يَا يَهُهَا الَّذِينَ أَمْنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمِنْ وَ الْأَذْيَ﴾ (264)

اس آیت میں ایسی تین چیزوں کا ذکر ہے جن کی وجہ سے صدقے کا اجر و ثواب ضائع ہو جاتا ہے۔

سب سے پہلی چیز جو صدقہ و خیرات کو بر باد کر دینے والی ہے وہ ”مَنْ“ یعنی احسان جلتانا ہے۔ جو شخص صدقہ کر کے کسی مستحکم پر اس کا احسان جلتا ہے اسے صدقے کا کوئی ثواب نہیں ملتا۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں جن تین قسم کے آدمیوں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ تو کلام فرمائے گا، نہ ان کی طرف رحمت کی نظر سے دیکھے گا اور نہ ان کو گناہوں سے پاک کرے گا، ان میں سے ایک وہ شخص ہوگا جو صدقہ کر کے کسی پر احسان جلتا ہے۔

((الْمَنَانُ الَّذِي لَا يُعْطِي شَيْئًا إِلَّا مِنْهُ))

(صحیح مسلم، رقم: 294، ترمذی، رقم: 1211، نسائی، رقم: 2563)

”ایسا احسان جتلانے والا جو احسان جتلائے بغیر کچھ نہیں دیتا۔“

دوسرا چیز جو صدقے کا اجر ختم کر دیتی ہے وہ ”اذی“ یعنی سنتا اور تکلیف پہنچانا ہے۔ یہ سنتا اور تکلیف پہنچانا ہمیں طور پر بھی ہو سکتا ہے اور جسمانی طور پر بھی۔ جس کو صدقہ دیا ہے اس سے بذریعی کرنا، اسے صدقے کا طعنہ دینا، اس کی بے عزتی کرنا، یہ سب ”اذی“ میں داخل ہیں۔

﴿كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِعَاةً النَّاسِ وَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَ الْيَوْمَ الْآخِرُ﴾ (264)

اب تمیزی چیز بیان کی جاتی ہے جس سے صدقے کا ثواب ضائع ہو جاتا ہے اور وہ ہے ریا کاری اور دکھاو۔ جو شخص اللہ سبحانہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے صدقہ نہیں دیتا بلکہ لوگوں کو دکھانے کے لیے صدقہ دیتا ہے تو اس کی نیت ہی درست نہیں ہے جب کہ تمام اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔ اس لیے ریا کاری کو اس کے بظاہر نیک کام کا کوئی ثواب نہیں ملتا خواہ و دکھاوے کا صدقہ کرے، یاد دکھاوے کی نماز پڑھے یاد دکھاوے کا حج کرے۔ ریا کاری کے ساتھ کی گئی کوئی عبادت اور کوئی نیکی مقبول نہیں ہے اور اس کا کوئی ثواب نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں نیت دکھاوے کی ہوتی ہے۔

ایک صحیح حدیث میں ریا کاری کو شرک قرار دیا گیا ہے۔

مسند احمد میں حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنًا:

(مَنْ صَلَّى يُرَايْيَ فَقَدْ أَشْرَكَ، وَمَنْ صَامَ يُرَايْيَ فَقَدْ أَشْرَكَ، وَمَنْ تَصَدَّقَ يُرَايْيَ فَقَدْ أَشْرَكَ)

(مسند احمد، رقم: 17270)

”جس نے دکھاوے کی نماز پڑھی اُس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کا روزہ رکھا اُس نے شرک کیا، اور جس نے دکھاوے کا صدقہ کیا اُس نے شرک کیا۔“

حقیقت یہ ہے کہ ریا کار شخص کا ایمان کمزور اور ناقص ہوتا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر یقین نہیں ہوتا۔ آیت کے الفاظ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

﴿فَمَثَلُهُ كَمِثْلِ صَفَوَانَ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَإِلٌ فَتَرَكَهُ صَلَدًا﴾ (264)

اب اسی بات کو کہ احسان جتلانے، تکلیف پہنچانے اور ریا کاری کے نتیجے میں صدقہ و خیرات کا ثواب ضائع ہو جاتا ہے، ایک مثال کے ذریعے سمجھایا گیا ہے کہ جیسے کسی چکنے سخت پھر پر کچھ گرد بڑی ہو اور اس پر زور کی بارش ہو جائے تو ساری گرد و حل جائے گی اور نیچے صاف چکنا پھر نمایاں ہو جائے گا۔ جیسے وہ پہلے تھا بھی وہی ہے۔ اس مثال میں مٹی کا گرد و غبار صدقہ ہے اور احسان جتلانے، تکلیف پہنچانے اور ریا کاری کرنے کو بارش سے تشبیہ دی گئی ہے جس کے بعد صدقے کا سارا ثواب ختم ہو جاتا ہے۔

﴿لَا يَقْدِرُونَ عَلَى شَيْءٍ وَمَا كَسَبُوا﴾ (264)

اپر مثال دے کر سمجھایا گیا کہ جو لوگ ریا کاری سے، یادل آزاری سے، یا طعنے والے کر صدقہ و خیرات کرتے ہیں،

وہ اپنا ثواب ضائع کر دیتے ہیں۔ یہ ایک منافقانہ حرکت ہے جس کا نہ کوئی فائدہ ہے اور نہ اجر، بلکہ اٹا اس کا گناہ ہو گا۔ گویا نیکی بر باد ہو جائے گی اور گناہ لازم ہو جائے گا۔

﴿وَاللَّهُ لَا يَهِدِي الْقَوْمَ الْكُفَّارِ﴾ (264)

آخر میں فرمایا کہ ”اللہ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا“، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ صدقہ کر کے احسان جتنا، ایذا دینا اور دکھاؤ کرنا انسان کو کفر کی حد تک پہنچا سکتا ہے جس سے بچنا ضروری ہے ورنہ انجم اچھا نہیں ہو گا۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہوئی کہ صدقہ محسن اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشودی حاصل کرنے کی نیت سے دینا چاہیے۔ صرف ایسے ہی صدقے کا ثواب ملتا ہے اور وہ قبول ہوتا ہے۔ لیکن اگر کسی کو صدقہ دے کر اس پر احسان جلتا یا جائے، یا اسے کوئی تکلیف پہنچائی جائے، یا دکھاوے کے لیے صدقہ دیا جائے تو ان تمام سورتوں میں اللہ سبحانہ کسی صدقے کو نہ تو قبول فرماتا ہے اور نہ اس پر کوئی اجر دیتا ہے۔

وَ مَثَلُ الدِّينِ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ أَبْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَ تَشْبِيهُتَّا
 مِنْ أَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّتِ بِرْبُوٰةِ أَصَابَهَا وَ أَبْلُ فَاتَّ أُكْلَهَا
 ضَعْفَيْنِ فَإِنْ لَمْ يُصِبْهَا وَ أَبْلُ فَطَلْ وَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ^{٢٦٤}
 أَيُوْدُ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِنْ تَخْيِيلٍ وَ أَعْنَابٍ تَجْرِيُ مِنْ
 تَحْتِهَا الْأَنْهَرُ لَهُ فِيهَا مِنْ كُلِّ الشَّرَكٍ لَا أَصَابَهُ الْكِبَرُ وَ لَهُ ذِرَّيَّةٌ
 ضَعْفَاءُ فَاصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ لَ كَذِلِكَ يُبَيِّنُ

اللَّهُ لَكُمُ الْآيَتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ

”جو لوگ اپنا مال اللہ کی رضا کے لیے دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔ ان کی اس نیکی کی مثال ایسی ہے جیسے ایک باغ ہو جو کسی بلند اور ہموار جگہ پر ہو۔ اگر زور کی بارش ہو گئی تو دگنا پھل پیدا ہو گیا۔ اگر زیادہ بارش نہ ہوئی تو اس کے لیے ہلکی بھوار کافی ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔“
 کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اگر اس کے پاس بکھوروں اور انگوروں کا باغ ہو، جس میں نہریں بہتی ہوں، اس باغ میں اس کے لیے کثرت سے پھل پیدا ہوتا ہو، مگر حال یہ ہو کہ وہ خود بوڑھا ہو چکا ہوا اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں۔ پھر اچاک اس باغ میں بگولا آجائے جس میں آگ ہو۔ اس سے سارا باغ جل کر

راکھ ہو جائے؟ اللہ اس طرح تمہارے لیے نشانیاں بیان کرتا ہے تاکہ تم غور فکر کرو۔ (265-266)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

تَثْبِيتًا:..... اس کے معنی مضبوط مستحکم کرنے اور جمانے کے ہیں۔ **تَثْبِيتًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ** سے مراد ہے کہ اس طرح وہ اپنے دلوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مضبوط و مستحکم کرتے ہیں اور کھلے دل سے مال خرج کرتے ہیں۔

رَبْوَةٌ:..... اس کے معنی ایسی بلند اور اوچی جگہ کے ہیں جو ہموار بھی ہو۔

أُكْلُهَا:..... **أُكْلٌ** کے اصل معنی ایسی چیز کے ہیں جو کھائی جاسکے (EDIBLES)۔ لیکن اس جگہ اس سے پھلوں کی پیداوار مراد ہے۔

الَّطَّلُ:..... معمولی بارش، یونداباندی اور پھواڑ کو کہتے ہیں۔

إِعْصَارٌ:..... اس کے معنی گردباد اور بگولے کے ہیں۔ (CYCLONE)

نَارُ:..... اس جگہ اس کے معنی آگ کے نہیں ہیں بلکہ اس سے گرم لوم مراد ہے جس کو باد سوم بھی کہتے ہیں۔

﴿وَمَنْشُلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ أَبْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَ تَثْبِيتًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ كَمَشِلِ جَنَاحَةِ رَبَّوَةٍ أَصَابَهَا وَإِلَيْلٌ فَاتَّ أُكْلَهَا ضَعْفَيْنِ إِنَّ لَهُمْ يُصْبِهَا وَإِلَيْلٌ فَطَلَّ﴾ (265)

اوپر کی مثال میں جس گروہ کا ذکر تھا وہ احسان جتا کر، دل آزاری کر کے اور ریا کاری کی وجہ سے اپنے صدقہ و خیرات کا ثواب ضائع کر دیتا ہے۔ اب اس کے مقابل میں دوسرے گروہ کا ذکر ہے جو اللہ سبحانہ کی رضا کی خاطر اپنا مال دل کھول کر نیک نیت سے خرچ کرتا ہے اور کئی گناہ زیادہ اجر پاتا ہے۔ یہ لوگ نہ احسان جاتے ہیں، نہ دل آزاری کرتے ہیں اور نہ ریا کاری کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے اتفاق کا بڑا اجر ہے۔ ان لوگوں کے ثواب کو ایک ایسے باغ کی مثال دے کر سمجھایا گیا ہے، جو کسی بلند، ہموار اور زرخیز میں پر واقع ہو۔ جہاں کی آب و ہوا خوشگوار ہو۔ وہاں جب خوب بارش برے تو ڈگنا پھل پیدا ہوتا ہے۔ اگر بارش نہ بھی ہو تو ایسی زمین کے باغ کے لیے بھل پھواڑ یا شبنم ہی کافی ہے۔ اس سے بھی پورا پھل حاصل ہو جاتا ہے۔

﴿وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾ (265)

اس میں اسی دوسرے نیک گروہ کے لیے تسلی اور اطمینان ہے جو اپنا مال صرف اللہ سبحانہ کی خوشنودی کے لیے خرچ کرتا ہے۔ کسی پر احسان نہیں جاتا۔ کسی کی دل آزاری نہیں کرتا اور ریا کاری نہیں کرتا۔ ایسے مغلص بندوں کے اتفاق کو اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے اور ان کو اس کا پورا ثواب دے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی نیکی کرنے والے کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيغُ أَجَرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ (النوبہ: 9)

”بَشَّكَ اللَّهُ تَعَالَى كَرْنَهُ وَالْوَلُونَ كَا جَرْ ضَاعَ نَبِيْنَ كَرْتَا۔“

﴿أَيُوْذُ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُونَ لَهُ جَهَنَّمُ مِنْ نَّخْلِيلٍ وَّ أَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا إِلَّا نَهَرٌ لَهُ فِيهَا مِنْ كُلِّ الشَّهَرَاتِ وَ أَصَابَهُ الْكِبْرُ وَ لَهُ ذُرْيَةٌ صَعْفَاءٌ فَاصَابَهَا أَعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ﴾ (266)

اوپر آیت 264 میں جس برعے انفاق کی مثال دی گئی ہے یہ اسی کی مزید وضاحت ہے۔

فرمایا، کیا تم میں سے کوئی شخص یہ پسند کرے گا کہ اُس کے پاس قیمتی کھجوروں کا ایک باغ ہو، جس میں نہیں بہتی ہوں۔ اس کا پھل کثرت سے پیدا ہوتا ہو، مگر حالت یہ ہو کہ وہ شخص خود بوڑھا ہو چکا ہو اور اُس کے بچے بھی چھوٹے ہوں۔ اچانک اُس باغ پر گرم لو کا بگولا یا گردبار (WHIRLWIND, CYCLONE) آجائے جو اسے جھلسا کرتا ہو رہے۔ اور اس آدمی کے ہاتھ میں کچھ نہ آئے، جب کہ وہ خود بڑھاپے کی وجہ سے محتاج ہو اور اس کے چھوٹے بچے بھی بے سہارا ہوں۔

یہ مثال بھی ایسے شخص کی ہے جو اپنا مال اللہ کی راہ میں ریا کاری اور دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے۔ جس کسی پر خرچ کرتا ہے اُس پر احسان جاتا ہے اور اُس کی دل آزاری کرتا ہے۔ ایسے آدمی کو آخرت میں اس کی کوئی نیکی نہیں ملے گی جب کہ وہ اُس وقت نیکیوں کا سخت محتاج ہو گا اور پھر حسرت و پیشانی کی تصویر بن کر رہ جائے گا۔ کیونکہ اس کی اس نیکی کو ریا کاری، احسان جتنے اور دل آزاری کے گبولے نے جلا کر راکھ کر دیا ہو گا۔

عربوں کے ہاں ایک مثالی باغ کا نقشہ کچھ یوں تھا کہ وہ کسی بلند اور ہموار جگہ پر واقع ہو، جہاں کی آب و ہوا خوش گوار ہو زمین زرخیز ہو۔ پاس ہی سے نہر گزرتی ہو جس کا پانی اس باغ کو سیراب کرتا ہو۔ کناروں پر کھجوروں کے درخت ہوں جو باغ کو گرمی اور اڑتی ریت سے بچاتے ہوں۔ بیچ بیچ میں انگور کی بیلیں اور دوسرے پھل دار درخت ہوں۔ خالی گلزوں اور قلعات میں گندم اور جو کی کاشت ہوتی ہو۔ اس طرح باغ ہی سے پھل اور انانچ دونوں پیدا ہوتے ہوں۔ کیونکہ ”شرات“ کا الفاظ عربی زبان میں ان دونوں کے لیے آتا ہے اور صرف پھل کے لیے فاکہہ کا الفاظ ہے۔

خود قرآن نے سورہ الکھف میں ایک ایسے ہی مثالی باغ کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

﴿وَ اضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا رَجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَ حَفَنْنَهُمَا بَنَغَلٍ وَ جَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا هَرِكْلَتَا الْجَنَّتَيْنِ اتَّثَ أُكْلَهَا وَ لَمْ تَظْلِمْ مِنْهُ شَيْئًا وَ فَيَرَنَا خَلْلَهُمَا نَهَرًا﴾ (الکھف: 32، 18)

”اور (اے نبی ﷺ) اُن لوگوں کو ایک مثال سنائیے دو آدمی تھے۔ ان میں سے ایک کو ہم نے انگوروں کے دو باغ دیے۔ ان کے چاروں طرف کھجوروں کے درختوں کا احاطہ بنایا۔ دونوں کے درمیان کھیتی رکھ دی۔ دونوں باغ اپنا پورا پھل لائے۔ ان کی پیداوار میں کچھ کمی نہ ہوئی۔ ان باغوں کے اندر ہم نے نہر

جاری کر دی۔“

﴿كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَكَبَّرُونَ ﴾ (266)

مطلوب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ اپنی آیتوں کے مضامین کو مثالوں کے ذریعے واضح کرتا ہے تاکہ تم لوگ غور فکر کرو۔ شریعت کے احکام کی حکمت اور ان کا مقصد سمجھو۔ اپنے اعمال بر بادہ نہ کرو۔ صدقہ و خیرات کا ثواب ضائع نہ کرو۔ اس بات کا یقین کرلو کہ یہ دنیا عارضی اور فانی ہے اور حقیقی اور داعی زندگی آخرت کی زندگی ہے۔

**يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفَقُوا مِنْ طِبِّتِ مَا كَسْبُتُمْ وَ مِمَّا أَخْرَجْنَا
لَكُمْ مِّنَ الْأَرْضِ وَ لَا تَيْمِمُوا الْخَيْثَرَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ وَ لَسْتُمْ
بِأَخْزِيْهِ إِلَّا أَنْ تُغْنِضُوا فِيهِ وَ اعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ** ۲۶۶

”اے ایمان والو! اللہ کی راہ میں پاکیزہ اور عمدہ مال خرچ کرو، خواہ وہ تمہاری عام کمائی سے ہو، یا جسے ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کیا ہو۔ اور اللہ کی راہ میں روئی چیزوں دینے کا ارادہ نہ کرو۔ کیونکہ اگر وہی چیزوں میں دی جاتی تو تم اسے لینا گوارا نہ کرتے، یا ناپسندیدگی سے لیتے۔ یاد رکھو، اللہ بے نیاز اور خوبیوں والا ہے۔“ (267)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفیری:

طَبِّئَات: یہ طبیعت کی جمع ہے جس کے معنی پاکیزہ، عمدہ اور سترہی چیزوں کے ہیں۔ اس کی ضد خبیثت ہے جس کی جمع خبیثات ہے۔

لَا تَيْمِمُوا: اس کے معنی ہیں: لَا تَقْصِدُوا مطلب یہ ہے کہ کبھی اس کا ارادہ بھی نہ کرو۔

تُغْنِضُوا: یہ اغناص سے ہے جس کے معنی چشم پوشی کرنے یا آنکھیں بند کرنے کے ہیں۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفَقُوا مِنْ طِبِّتِ مَا كَسْبُتُمْ وَ مِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ
مِّنَ الْأَرْضِ﴾ (267)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو خطاب کر کے انہیں حلال اور پاکیزہ مال میں سے افلاق کرنے یعنی زکوٰۃ، عشر اور صدقہ و خیرات کرنے کا حکم دیا ہے اور اس حوالے سے خراب اور روڈی مال دینے سے منع فرمایا ہے۔

اس میں پہلے ایمان والوں کو مخاطب کر کے حکم دیا گیا کہ تم اپنی حلال اور پاکیزہ کمائی میں سے اللہ کی راہ میں مال خرچ کر دو، خواہ وہ زکوٰۃ اور عشرت کی شکل میں ہو، یا عام صدقہ و خیرات کی صورت میں ہو۔ کیونکہ حرام کمائی سے زکوٰۃ اور صدقہ دینا نہ صرف حرام ہے بلکہ اس کا کوئی اجر و ثواب نہیں ملتا۔

پھر فرمایا کہ جو کچھ ہم نے تمہارے لیے زمین میں سے پیدا کیا، اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ اس سے زرعی پیداوار پر عشر مراد ہے جس کا واضح حکم سورہ الانعام میں آیا ہے کہ:

(الانعام: 6) ﴿ وَ أَتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ ﴾

”اوْنَصُ الْأَهَاتَةَ وَقْتَ اللَّهِ كَا حَتَّىٰ لِيْسَ عَشْرَ اَدَارِكُو“

عشر اور زکوٰۃ کے تفصیلی احکامات فقه کی کتابوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

﴿ وَ لَا تَيْكِنُوا الْخَيْرَ إِذْنُهُ تُنْفِقُونَ وَ لَئِنْ شَرِّمْ بِإِلَّا أَنْ

تُغْهِضُوا فِيهِ ﴾ (267)

ارشاد ہوا کہ زکوٰۃ ہو یا صدقہ و خیرات، اس میں ایسا رُویٰ اور خراب مال نہ دو کہ اگر وہ تمہیں دیا جاتا تو تم اسے لینا گواران کرتے۔ ہاں آنکھیں بند کر کے شاید لے لیتے۔

﴿ وَ اعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَنِّيْحَ حَمِيدٌ ﴾ (267)

آخر میں فرمایا کہ اللہ بنے نیاز اور خوبیوں والا ہے۔ یہ سمجھو کر وہ تمہارے مال کا محتاج ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں۔ تم اگر اس کے دیے ہوئے مال میں سے کچھ اس کی راہ میں خرچ کرتے ہو تو یہ اللہ تعالیٰ پر احسان نہیں ہے بلکہ اس کا احسان ہے کہ اس نے تمہیں مال سے نواز ہے۔

پھر جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا صلہ تمہیں آخرت میں ملے گا اور دنیا میں بھی تمہارے بھائی بندوں ہی کو اس کا فائدہ پہنچ گا۔ اللہ تعالیٰ تو غنی اور بنے نیاز ہے، اسے کسی کے مال کی حاجت نہیں۔ وہ ساری خوبیوں کا مالک اور حمد و شکر کے لاائق ہے۔

الشَّيْطَنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَ يَا مُرْكِمْ بِالْفَحْشَاءِ وَ اللَّهُ يَعِدُكُمْ

مَغْفِرَةً مِنْهُ وَ فَضْلًا وَ اللَّهُ وَاسِعٌ عَلَيْهِ ۲۶۸

”دیکھو، شیطان تمہیں متاجی سے ڈراتا اور بخل سکھاتا ہے، مگر اللہ تمہارے لیے بخشش اور فضل کا وعدہ فرماتا ہے، اور اللہ وعدت والا جانتے والا ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے دین کی کچھ عطا کرتا ہے اور جسے دین کی کچھ مل گئی اُسے سب کچھ مل گیا۔ اور نصیحت وہی قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔“ (268)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

یَعِدُكُمْ: وَعَدَ کے معنی وعده کرنے کے بھی آتے ہیں اور اسکے معنی وعید یعنی خوف دلانے کے بھی ہوتے ہیں

اور اس جگہ تکہ مراد ہیں۔

یَأْمُرُ كُمْ: امر صرف حکم دینے کے معنوں میں نہیں آتا بلکہ اس سے اور بھی کئی معنی مراد ہوتے ہیں۔ اس جگہ قرینة دلیل ہے کہ اس کے معنی ہیں: غلط مشورہ دینا، وسوسہ ذالت۔

فَحْشَاءُ: اس کے عام معنی بے حیائی کے ہیں۔ اس کے اصل معنی ایسے کام یا بات کے ہوتے ہیں جس کو لوگوں کے سامنے کرتے ہوئے انسان شرم یا عار محسوس کرتا ہے۔ لیکن اس جگہ یہ بخل کے معنوں میں آیا ہے کیونکہ موقع دلیل ہے۔ لغت میں بھی فحشاء کے ایک معنی بخل کے موجود ہیں۔

آلِ عَلْمَة: اس کے معنی دانائی کے ہیں۔ اس سے مراد وہ نافع علم ہوتا ہے جو کسی شخص کے دل میں یقین پیدا کرتا اور اسے صالح اعمال پر آمادہ کرتا ہے۔

﴿أَلَّا شَيْطَانٌ يَعِدُ كُمْ الْفَقْرَ وَ يَأْمُرُكُمْ بِإِلْفَحْشَاءِ﴾ (268)

فرمایا کہ شیطان تمہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتا ہے اور وہ دو طریقوں سے روکتا ہے: ایک یہ کہ وہ وسوسہ ذالت ہے کہ اگر تم نے اپنا مال خرچ کر دیا تو خود محتاج اور کنگال ہو جاؤ گے۔ اس لیے انفاق نہ کرو۔ دوسرے وہ تمہیں بخل سکھاتا ہے۔ اس مقام پر فحشاء کے معنی بخل کے ہیں جس کی لغت اور سیاق کلام دونوں سے تائید ہوتی ہے۔ شیطان کہتا ہے تمہیں کیا پڑی ہے دوسروں پر اپنا مال خرچ کرو۔ کما و تم اور کھائیں دوسرے لوگ۔ یہ تمہارا اپنی محنت سے کمایا ہوا مال ہے اسے تم جتنا چاہو، جیسے چاہو، اپنی مرضی سے اپنے اوپر خرچ کرو۔ اپنے لیے آسانیں خریدو۔ عیش و عشرت کے سامان مہیا کرو۔ سیر سپاٹے کرو۔ چار دن کی زندگی ہے خوب مزے اڑاؤ۔ دوسروں کو کچھ دینے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود کھائیں کھائیں۔ تمہاری ذمہ داری نہیں ہے کہ سارے جہان کو کھلاتے پھرو۔ شیطان اس قسم کے کئی اور وسوسوں اور بخکنڈوں سے انسان کو انفاق فی تسلیم اللہ سے روکتا ہے۔

﴿وَاللَّهُ يَعِدُ كُمْ مَغْفِرَةً مِنْهُ وَ فَضْلًا﴾ (268)

دوسری طرف اس کے مقال میں اللہ سبحانہ بھی دو چیزوں کا وعدہ فرماتا ہے اور وہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔ اگر تم اس کے حکم پر اس کی رضا کے لیے اس کی راہ میں مال خرچ کرو گے تو وہ تمہارے گناہوں کو بخش دے گا اور اپنے فضل سے تمہیں اور زیادہ دے گا اور آخرت میں جنت عطا فرمائے گا۔

یہ بات کہ خرچ کرنے سے مال کم نہیں ہوتا بلکہ بڑھتا ہے، اس میں اضافہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ مزید عطا فرماتا ہے خود قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔

سورہ سما میں ہے کہ:

﴿وَمَا آنْفَقْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ وَ هُوَ خَيْرُ الرُّزْقِينَ ۝﴾ (سما: 34: 39)

”اور تم جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے تمہیں اس کا بدلہ ملے گا اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے۔“

اسی مضمون کی یہ حدیث بھی ہے کہ:

((مَا مِنْ يَوْمٍ يُصْبِحُ فِيهِ الْعِبَادُ إِلَّا مَلَكَانْ يَنْزِلُانِ، يَقُولُ أَحَدُهُمَا: اللَّهُمَّ اعْطِ مُنْفِقاً خَلْقَكَ وَيَقُولُ الْأَخْرُ: اللَّهُمَّ اعْطِ مُمْسِكًا لَّهُنَّا)) (صحيح مسلم، رقم: 2336)

”بندوں پر ایسی کوئی صبح نہیں آتی کہ جس میں دو فرشتے نہ اترتے ہوں۔ ان میں سے ایک کہتا ہے: اے اللہ! خرج کرنے والے کو اس کا بدل عطا فرم۔ جب کہ دوسرا فرشتہ کہتا ہے: اے اللہ! خرج نہ کرنے والے کے مال کو تباہ کر دے!“

یاد رہے کہ یہ قرآن کا ”اسلوب مقابلہ“ ہے جس میں پہلی دو چیزوں نظر اور فحاء کے مقابل میں دو چیزوں مغفرت اور فضل کا ذکر آیا ہے۔

﴿وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلَيْهِمُ الظُّلُمُ﴾ (268)

کیونکہ اللہ سبحانہ واسیع (و سعت والا) ہے۔ اس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں۔ اس کے ہاں ہر شے کی بہتات اور فراوانی ہے۔ پھر وہ علیم (خوب جانے والا) بھی ہے۔ وہ جانتا ہے تم نے کتنا اس کی راہ میں خرج کیا اور کس نیت اور ارادے سے کیا اور اسکے مطابق تمہیں اجر دے گا۔

يُؤْتَى الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتَ

خَيْرًا كَثِيرًا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُوا الْأَلْبَابُ ⑥

”وہ جسے چاہتا ہے دین کی سمجھے عطا کرتا ہے۔ اور جسے دین کی سمجھمل گئی اسے سب کچھ مل گیا۔ اور نصیحت وہی قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔“

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی تفسیر:

فرمایا: اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور وہ صرف اسی کے لیے چاہتا ہے جو اس کا اہل اور مستحق ہوتا ہے۔ جو اسے حاصل کرنے کے لیے مخت اور کوشش کرتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اسے یہ حکمت یعنی دین کی سمجھ اور اس میں پختگی اور مضبوطی عطا کرتا ہے۔ جس سے بندے کا ایمان مضبوط ہوتا ہے۔ وہ ایسے نیک اعمال بڑی خوشی سے کرتا ہے جس سے اس کا رب راضی ہو جائے جیسے اتفاق فی سبیل اللہ وغیرہ۔

پھر بتایا جسے یہ حکمت مل گئی اسے ”خیر کثیر“ مل گیا۔ جس کے معنی ہیں، بہت زیادہ بھلائی، فائدے، نعمتیں اور خیر و برکت۔ جس کے نتیجے میں انسان راہ ہدایت پر چلتا اور دنیا و آخرت میں فلاح و کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔

بعض لوگ اس ”حکمت“ سے علم فلسفہ مراد لیتے ہیں جو درست نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن فلسفے کی کتاب نہیں ہے بلکہ ہدایت کی کتاب ہے۔ حکمت سے مراد صرف دینی بصیرت اور علم نافع ہی ہے۔

﴿وَمَا يَذَّكِرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابُ﴾ (269)

آخر میں فرمایا یہ حکمت، یہ بصیرت اور یہ دین کی سمجھ صرف ان لوگوں کو میر آتی ہے جو عقل والے ہیں۔ عقل سے کام لیتے ہوئے راہ ہدایت پر چلتے ہیں۔ فانی دنیا کی بجائے آخرت کی ہمیشہ کی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔ پختہ ایمان رکھتے ہیں۔ اپنے جان و مال کی قربانی دے کر جنت خرید لیتے ہیں۔

اس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ جو لوگ ایمان نہیں لاتے، دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں۔ اللہ کو راضی کرنے کی بجائے اپنے نفس کو راضی کرنے میں لگ رہتے ہیں، وہ عقل والے نہیں ہیں بلکہ جاہل اور بے وقوف ہیں اگرچہ وہ پی ایج ڈی کیوں نہ ہوں۔

وَ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ أُو نَذَرْتُمْ مِنْ نَذْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُهُ أَطْ وَ مَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ۝ إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۝ وَ إِنْ تُخْفُوهَا وَ تُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ ۝ وَ إِنَّ كَفِرَ عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ ۝ وَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَيْرٌ ۝

”تم اللہ کی راہ میں جو خرچ کرتے ہو، یا نذر مانتے ہو، اللہ اسے جانتا ہے۔ اور یاد رکھو، ظالموں کو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی مددگار نہ ملے گا۔ اگر تم اپنے صدقات ظاہر کر کے دو تو بھی اچھا ہے اور اگر تم انہیں چھپا کر متاجوں کو دو، تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اور اگر تم انہیں چھپا کر دو گے اور وہ تمہارے کاموں سے واقف ہے۔“

(271-270)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

نَذْرٌ:.....لغت میں نذر کے معنی **الْعَزْمُ عَلَى إِلْتِزَامِ شَيْءٍ خَاصٍ فِعْلًا أَوْ تَرْكِ** کے ہیں یعنی کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کا پختہ ارادہ کر لینا۔ شریعت میں اسے **إِلْتِزَامُ طَاعَةٍ تَقْرُبًا إِلَى اللَّهِ تَعَالَى** کہتے ہیں جس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے کسی خاص نیکی اور اطاعت کے کام کی پابندی کرنا۔ عام فہم زبان میں اس کے معنی منت ماننے کے ہیں کہ اگر کمیری فلاں مراد پوری ہو گئی تو میں فلاں عبادت کروں گا یا اتنا مصدقہ کروں گا۔

﴿وَ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ أُو نَذَرْتُمْ مِنْ نَذْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُهُ أَطْ

(270)

فرمایا: تم جو مال بھی خرچ کرتے ہو..... کم یا زیادہ، جائز یا ناجائز طور پر، نیک نیت سے اللہ کی رضا کے لیے یا

ریا کاری اور دکھاوے کے ساتھ، یا دوسروں پر احسان جتا کر، یا اُن کی دل آزاری کر کے، پوشیدہ طور پر یا علانية.....
بہر حال اللہ تعالیٰ اُسے جانتا ہے اور اسی کے مطابق تمہیں جزا و سزادے گا۔

یہی معاملہ نذر و نیاز کا ہے اگر تم تینی کے کام کی نذر مانو گے، یا برائی کے لیے نذر مانو گے تو اسے بھی اللہ سچاہ جانتا ہے اور اس کے مطابق تمہیں اچھا یا برابلہ دے گا۔

اسلامی شریعت میں نذر مانا جائز ہے اور اس کو پورا کرنا واجب ہے۔ لیکن کسی برے کام کے لیے، یا قطع رحمی کے لیے نذر مانا اور اسے پورا کرنا جائز نہیں ہے۔ بلکہ وہ برائی کام نہیں کرنا چاہیے اور ایسی نذر کا کفارہ دے دینا چاہیے جو کہ تم کے کفارے کے برابر ہے۔

فَوَمَا لِلظَّلَمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ﴿٢٧٠﴾

مطلوب یہ ہے کہ جو لوگ بخل کریں گے، صدقہ کر کے احسان جائیں گے، دوسرا کی دل آزاری کریں گے، انفاق میں ریا کاری اور دکھاوہ کریں گے۔ غریبوں اور مسکینوں کے حقوق ادا نہیں کریں گے، وہی ظالم ہوں گے جن کا آخرت میں کوئی مددگار نہیں ہوگا اور وہ اپنے کی سزا پائیں گے۔

﴿إِنْ تُبْدِلُ وَالصَّدَقَاتِ فَنَعِمَّا هِيَ وَإِنْ تُخْفُوهَا وَتُعْثُرُهَا الْفَقَرَاءُ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ﴾ (271)

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ جب اوپر کی آیت 270 نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے نبی ﷺ سے عرض کیا کہ کون سا صدقہ افضل ہے؟ وہ جو چھپا کر دیا جائے یا جو ظاہر کر کے دیا جائے۔ اس پر یہ آیت اُتری۔ فرمایا: اگر صدقہ و خیرات ظاہر کر کے دو گے تو یہ بھی اچھا ہے کیونکہ اس سے دوسروں کو بھی انفاق کی ترغیب ملے گی اور اگر پوشیدہ طور پر محتاجوں کو دے دو تو یہ زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس میں ریا کاری اور دکھاؤ نہیں ہوگا۔

اکثر اہل علم اور فقہا کے نزدیک فرض صدقہ یعنی زکوٰۃ کو علانية دینا اور اسی طرح تمام دینی فرائض مثلاً نماز، روزہ، حج وغیرہ کو سب کے سامنے ادا کرنا پسندیدہ اور بہتر ہے۔ کیونکہ اس سے اسلامی شعائر کا اظہار اور فروغ ہوتا ہے۔ لیکن نفی صدقہ و خیرات میں عام طور پر اظہار کی بجائے اختفاء پسندیدہ اور بہتر ہے کہ یہ پوشیدہ طور پر ہوتا کہ اس میں ریا کاری اور دکھاؤ نہ ہو سکے۔ البتہ جہاں دوسروں کو ترغیب دینی مقصود ہو وہاں نفی صدقہ کا اظہار بھی درست ہے۔ یعنی سب کے سامنے اسے دینا درست ہے

فَبِعِمَّا هِيَ كَمْعِنِي ہیں فَبِنَعْمَ شَيْءٍ هُذَا (یہ اچھی چیز ہے)۔

اس مقام پر "الفقراء" (حتاج لوگ) کا لفظ آیا ہے جس کے مفہوم میں مسلم اور غیر مسلم دونوں قسم کے محتاج شامل ہیں۔

﴿فَوَمِنْ كَفَرَ عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ ﴾ (271)

یہ ایسے صدقہ و خیرات کا صلہ اور بدلہ ہے جو اللہ تعالیٰ اُس بندے کو دے گا جو صرف اُس کی رضا اور خشنودی کے لیے انفاق کرتا ہے، خواہ وہ فرض صدقے کو ظاہر کر کے یا نظری صدقہ چھپا کر دیتا ہے کہ اللہ سبحانہ اُس کے گناہوں کو بخش دے گا۔ گویا صدقے سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

﴿وَاللَّهُ يِمَّا تَعْمَلُونَ خَيْرٌ﴾ (۲۷۱)

فرمایا اللہ تمہارے تمام اعمال سے باخبر ہے کہ تم نے کون سا کام کس نیت اور ارادے سے اور کیسے کیا۔ خاص طور پر جو تم صدقہ کرو گے پوشیدہ یا علائیہ، وہ اُسے جانتا ہے اور اس کا تمہیں اجر دے گا۔

قرآن کے ان الفاظ میں صدقہ و خیرات کو پوشیدہ طور پر دینے کی ترغیب پائی جاتی ہے۔

۲۷۱

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدًى لَهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَمَا
تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا نَفْسُكُمْ وَمَا تُنْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ
اللَّهِ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُؤْفَ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ
لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبَيْلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِعُونَ ضَرَبًا فِي
الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعْفُفِ تَعْرِفُهُمْ
بِسَيِّئِهِمْ لَا يَسْعَلُونَ النَّاسَ إِلَحَافًا وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ
فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ﴿۲۷۱﴾ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ
سِرَّاً وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرٌ هُوَ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خُوفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ

يَخْرُنُونَ ﴿۲۷۲﴾

۲۷۲

”(اے نبی ﷺ) لوگوں کو ہدایت دینا آپ ﷺ کی ذمہ داری نہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اور جو مال تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے، اپنے لیے کرو گے۔ تمہیں اسی لیے خرچ کرنا چاہیے کہ اللہ کی رضا حاصل ہو۔ اور تم جو مال خرچ کرو گے، اس کا تمہیں پورا اجر ملے گا اور تمہاری کوئی حق تلفی نہ ہوگی۔

صدقہ و خیرات میں اُن لوگوں کا زیادہ حق ہے جو اللہ کے کاموں میں اس طرح گھرے ہوئے ہیں کہ روزی کمانے کے لیے دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔ ناواقف آدمی ان کے نہ مانگنے کی وجہ سے انہیں خوش حال سمجھتا

ہے۔ لیکن تم انہیں آن کی صورت سے پہچان سکتے ہو۔ وہ لوگوں سے لپٹ کرنہیں مانگتے۔ اور جو مال تم خرچ کرو گے، اللہ اسے جانتا ہے۔

جو لوگ دن رات اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پوشیدہ یا علاجی، انہیں اپنے رب کے ہاں اس کا اجر ملے گا۔ انہیں نہ کوئی خوف ہوگا، نہ وہ غمگین ہوں گے۔“ (274-272)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

ہُدَاهُمْ:..... (آن کو ہدایت دینا) اس جگہ ہدایت سے مراد ایمان ہے جس کی توفیق صرف اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے۔

ہدایت کا لفظ کئی اور معنوں میں بھی آتا ہے جیسے:

1۔ راستہ دکھانا:

(الشوری 52:42) **وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطِ مُسْتَقِيمٍ**

”اور بے شک آپ ﷺ ضرور سیدھا راستہ دکھاتے ہیں۔“

2۔ راستے پر چلانا:

(الفاتحہ) **إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ**

”میں سیدھے راستے پر چلا۔“

3۔ منزل تک پہنچانا:

(الاعراف 43:7) **وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَيْنَا إِلَيْهَا**

”شکر ہے اللہ کا جس نے ہمیں اس (جنت کی منزل) تک پہنچایا۔“

لِلْفُقَرَاءِ:..... اس سے پہلے ایک مبتدا مذکور ہے جو صدقہ یا انفاق کے ہم معنی کوئی لفظ ہو سکتا ہے جو محتاجوں کی

خاطر ہو۔

أَخْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ:..... اس کے معنی ہیں **مُنْعِوا وَ حُبْسُوا** فی طَاعِتِه لِغَزوٍ أَوْ تَعْلِمُ عِلْمٍ یعنی اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں جہاد یا دینی تعلیم کے حصول میں اس قدر مصروف ہو جائیں کہ اپنی روزی کامنے سے رہ جائیں۔ گویا کسی دینی خدمت کی مصروفیت میں اس طرح گر گئے ہوں کہ کسب معاش کے لیے دوڑ دھوپ نہ کر سکیں۔

ضَرَبَنَا فِي الْأَرْضِ:..... اس کے معنی سفر کرنے کے ہیں۔ جیسے سورہ المزمل میں ارشاد ہوا ہے کہ:

(المزمل 73:20) **وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ**

”او بعضاً دوسراً ہوں گے جو اللہ کے فضل (روزی) کی تلاش میں زمین میں سفر کریں گے۔“

الْجَاهِلُ: اس سے مراد ناواقف اور بے خبر شخص ہے۔
 الْتَّعَفُ: یہ عَفَةٌ (بچنا) سے ہے۔ اس جگہ مراد ہے کہ خودداری کی وجہ سے سوال کرنے اور مانگنے سے بچنا۔
 سَيِّئَةً: اس کے معنی علامت اور نشانی کے ہوتے ہیں جس سے کوئی چیز پہچانی جاسکتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًا مِّسْيَاهُمْ﴾ (الاعراف: 7)

”اور اعراف (جنت اور دوزخ کے درمیان ایک مقام) پر کچھ آدمی ہوں گے جو ہر ایک کو اس کی علامت سے پہچانیں گے۔“

سورة الرحمن میں ہے کہ:

﴿يُعْرِفُ الْمُجْرِمُونَ بِسَيِّئَاتِهِمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِي وَالْأَقْدَامِ﴾ (الرحمن: 41:55)

” مجرم لوگ اپنی نشانیوں سے پہچانے جائیں گے۔ پھر انہیں پیشانی کے بالوں سے اور پاؤں سے کپڑا کر (دوزخ میں پھینکا جائے گا)۔“

بعض اردو مترجمین کو غلط فہمی ہوئی ہے اور انہوں نے سَيِّئَةً کو فارسی زبان کا لفظ سمجھ کر اسے ”چہرے“ کے معنی میں لے لیا ہے جو کہ عربیت کے خلاف ہے۔

لَا يَسْتَلُوَنَ النَّاسَ إِلَخَافًا: إِلَخَافًا کے معنی إِلَخَافًا کے ہیں یعنی لپٹ کر سوال کرنا۔ گویا کوئی سائل کسی کے پیچھے اس طرح پڑ جائے کہ کچھ لے کر ہی ملے گا۔

اصل میں لَا يَسْتَلُوَنَ سے سوال کی نظری مراد ہے کہ وہ کبھی سوال نہیں کرتے۔ إِلَخَافًا کی قید مانگنے کی گھٹیا حالت کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ ورنہ یہ کوئی شرط نہیں ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کے بعض مقامات پر اس اسلوب کی کئی مثالیں اور نظائر موجود ہیں جیسے:

1. **﴿وَلَا تَقْتُلُوا أُولَادَكُمْ خَشِيَةً إِثْلَاقٍ﴾** (بني اسرائيل: 31:17)

”اوپانی اولاد کو تغلق دتی کے خوف سے قتل نہ کرو۔“

اس کا مطلب نہیں ہے کہ اگر تغلق دتی کا خوف نہ ہو تو اولاد کو قتل کرنا جائز ہے۔
 اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہوا۔

2. **﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَآءَ أَضْعَافًا مُّضَعَّفَةً﴾** (آل عمران: 3:130)

”اے ایمان والو! کئی گناہ بڑھا کر سودہ کھاؤ۔“

اس کا بھی یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر کئی گناہ ہو تو اس سے کم سود لینا جائز ہو گا۔
 اسی طرح ایک اور جگہ فرمایا:

3. ﴿وَلَا تُنْكِرُهُوا فَتَيَّأْتِكُمْ عَلَى الْبَغَاعِ إِنَّ أَرْدَنَ تَحْصَنًا﴾ (النور 24)

”اور اپنی لوگوں کو بدکاری کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور نہ کرو اگر وہ پاک دامن رہنا چاہتی ہوں۔“

اس کا بھی یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر وہ لوگوں پاک دامن نہ رہنا چاہتی ہوں تو پھر ان کو پیشہ کرنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔

﴿لَيْسَ عَلَيْكَ هُدًى هُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ﴾ (272)

اس آیت کے شانِ نزول کے بارعے میں کئی روایات ہیں لیکن سب کا مضمون ایک ہی ہے:

1. عبد اللہ ابن عباس رض کا قول ہے کہ نبی ﷺ نے پہلے صرف مسلمان محتاجوں پر صدقہ و خیرات کرنے کا حکم دیا تھا۔ مگر اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اس میں ہر محتاج کو..... خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم صدقہ و خیرات دیے جانے کا حکم دیا گیا۔

2. تفسیر طبری میں ہے کہ مشرکین قریش سے بعض انصاری صحابہ کی رشتہ داری تھی اور وہ اپنے غریب رشتہ دار مشرکین کو اس لیے صدقہ و خیرات نہیں دینا چاہتے تھے کہ جب وہ اسلام قبول کر لیں گے تو ان کو صدقہ دیں گے، ویسے نہیں دیں گے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

3. مصنف ابن الیثیب میں سعید بن جبیر رض سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں سے فرمایا تھا کہ: ”تم صرف (حتاج) مسلمانوں کو صدقہ و خیرات دو اور غیر مسلموں کو نہ دو۔“

تو اس پر یہ آیت اُتری کہ ہر محتاج کو صدقہ و خواہ وہ مسلمان ہے یا غیر مسلم ہے۔ فرمایا: نبی ﷺ کا کام دعوت و تبلیغ ہے۔ ان کا کام کسی کو زبردست ہدایت دینا یا ایمان کی توفیق دینا نہیں ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ جس کو چاہے ہدایت اور ایمان کی توفیق عطا کرتا ہے۔

یہی مضمون قرآن مجید کے کئی اور مقامات پر بھی آیا ہے:

1. ﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحَبَبْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ﴾ (القصص 28)

”(اے نبی ﷺ) آپ ﷺ جسے چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے۔ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہ ہدایت قبول کرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔“

2. ﴿إِنَّ تَحْرِضُ عَلَى هُدُّهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ يُضْلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نُصْرَىٰ﴾ (النحل 16)

”(اے نبی ﷺ) آپ ﷺ کو ان لوگوں کے ہدایت پانے کی کتنی ہی آرزو ہو گرالہ ان کو ہدایت نہیں دیتا جس کو وہ گراہ کرتا ہے۔ پھر ان کا کوئی مددگار نہیں ہوتا۔“

3. ﴿قُلْ إِنَّ اللَّهَ يُصْلِلُ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنْشَأَ﴾ (الرعد: 27)

”کہہ دیجئے! بے شک اللہ جسے چاہتا ہے گراہ کرتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے اُسے وہ بہارت دیتا ہے۔“

4. ﴿إِنَّ اللَّهَ يَعْتَبِرُ إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ يُنْشِئُ﴾ (الشوری: 42)

”اللہ جسے چاہتا ہے ہُن لیتا ہے اور بہارت اُسے دیتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ صرف ایسے شخص کو بہارت اور ایمان کی توفیق دیتا ہے جو اسے حاصل کرنے کے لیے کوشش کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔

اور جو شخص بہارت کی جبوتوں میں کرتا، اپنی خواہش کے پیچھے چلتا ہے اور شیطان کی پیروی کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اُسے گراہی کی طرف دھکیل دیتا ہے۔

﴿وَلَا تَتَّبِعِ الْهُوَى فَيُضْلِلَكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ﴾ (ص: 38)

”اور خواہش کی پیروی نہ کر، ورنہ وہ تجھے اللہ کے راستے سے بھکارے گی۔“

﴿وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا نَقْسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ﴾ (272)

فرمایا: تمہارے انفاق کرنے میں اللہ تعالیٰ کا کوئی مفاد نہیں ہے بلکہ اس میں تمہارا اپنا ہی فائدہ ہے جو تمہیں آخرت میں اجر و ثواب کی صورت میں ملے گا۔ اس کے علاوہ دنیا میں بھی اس انفاق سے ایک منصفانہ اور صالح معاشرہ قائم کرنے میں مدد ملتی ہے جس کے فائدہ تمہیں حاصل ہوں گے۔

پھر فرمایا تمہارا وہی انفاق مقبول ہوگا جو صرف اللہ کی رضا طلبی کے لیے ہوگا۔ مَا تُنْفِقُونَ (نہیں تم خرچ کرو گے) یہ خوبی انداز میں انشائیہ جملہ ہے۔ اس اسلوب کی کمی مثالیں قرآن میں موجود ہیں۔ مراد یہ ہے کہ تمہیں جو کچھ خرچ کرنا ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے۔

﴿وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُؤْفَ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ﴾ (272)

ارشاد ہوا کہ تم جو انفاق کرو گے اُس کا ثواب تمہیں کمی گناہ کردا کر دیا جائے گا۔ تمہارے ثواب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی نیکی کا قدر داں ہے اور وہ کسی کی نیکی ضائع نہیں کرتا۔

﴿لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَيِّئِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِعُونَ ضَرَبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَهُمْ لَا يَسْكُنُونَ النَّاسَ إِلَّا حَافَّاً﴾ (273)

اوپر صدقہ و خیرات کا ذکر تھا۔ اب اس کے سب سے زیادہ حق داروں کا ذکر ہے جن کے پانچ اوصاف یہ بیان

ہوئے ہیں۔

1۔ وہ اللہ کے کاموں میں گھرے ہوئے ہیں۔ جیسے دینی تعلیم کے حصول، درس و مدرسیں اور جہاد وغیرہ میں ہر وقت مصروف لوگ۔ اگر یہ لوگ بھی دوسروں کی طرح روزی کمانے میں لگ جائیں تو اس سے اسلامی معاشرے کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ اس کے علاوہ اسلامی حکومت کے کل وقتی ملازمین کی تخلویں بھی بیت المال سے ادا کی جائیں گی اور ان کو کوئی اور کاروبار کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

2۔ ایسے لوگ اپنی ہمسوئی صرف دنیا کی وجہ سے روزی کمانے کے لیے دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔

3۔ وہ بڑے خوددار ہوتے ہیں اور مال و دولت کے حریص نہیں ہوتے۔ ناقص آدمی ان کو خوش حال سمجھتا ہے حالانکہ وہ ضرورت مند ہوتے ہیں۔

4۔ لیکن سمجھدار شخص ایسے سفید پوش محتاجوں کو پیچاں لیتا ہے خواہ ان کی وضع قطع کیسی بھی ہو۔

5۔ وہ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ کسی سے سمجھ نہیں مانگتے۔ نہ لپٹ کر، نہ پیچا کر کے اور نہ کسی اور طریقے سے۔ ایک متفق علیہ حدیث جس کو سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرمائی تھی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَيْسَ الْمِسْكِينُ الَّذِي يَطْعُوفُ عَلَى النَّاسِ تَرْدَهُ الْلُّقْمَةُ وَاللُّقْمَةُ وَالْتَّمْرَةُ وَالْتَّمْرَاتُانِ، وَلَكِنَ الْمِسْكِينُ الَّذِي لَا يَجِدُ غَنِيًّا يُغْنِيهُ، وَلَا يُفَكِّرُ بِهِ فِيمَضَّدُ عَلَيْهِ، وَلَا يَقُولُ فَيَسَّأُلُ النَّاسَ))

(صحیح بخاری، رقم: 1479، صحيح مسلم، رقم: 2393، ابو داؤد، رقم: 1631، نسائی، رقم: 2571)

”وہ شخص مسکین نہیں جو ایک دلوں، یا ایک دو بھروسوں کے لیے لوگوں سے سوال کرتا پھرتا ہے۔ بلکہ اصل مسکین وہ ہے جو اتنا خوش حال نہیں ہوتا کہ اس کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ اور بظاہر اس کے محتاج ہونے کا بھی پتہ نہیں چلتا کہ کوئی اسے صدقہ دے دے، اور وہ خود بھی لوگوں سے نہیں مانگتا پھرتا۔“

بعض مفسرین کی رائے میں یہ آیت اصحاب صفة کے بارے میں نازل ہوئی تھی جو مسجد نبوی کے صحن میں ایک چبوترے کے نیچے تھے۔ ان کا اپنا کوئی گھر نہ تھا۔ یہ سب مهاجرین تھے۔ یہ حضرات قرآن مجید حفظ کرتے، احادیث یاد کرتے، ذکر و فکر کی مجلیں برپا کرتے اور جہاد و قول میں شرکت کرتے تھے۔

قرآن میں انہی اصحاب صفة کے بارے میں نبی ﷺ کو حکم ہوا تھا کہ آپ ﷺ ان حضرات میں تشریف لے جایا کریں اور ان کو خصوصی طور پر وقت دیا کریں۔

((وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَذْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدْوَةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعُدُ عَيْنَكَ عَنْهُمْ))
(الکھف: 18)

”اور (ایے نبی ﷺ) آپ ﷺ ائمہ ائمہ بیٹھنا اُن لوگوں کے ساتھ رکھیں جو صبح و شام اپنے رب کو یاد

کرتے ہیں اور اُس کی رضا کے طالب ہیں۔ آپ ﷺ کی نظرِ کرم ان سے بھنے نہ پائے۔

﴿وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ﴾ (273)

یہ آخر میں فرمایا کہ اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ تم جو انفاق بھی کرو گے۔ اُسے اللہ سبحانہ جانتا ہے اور وہ تمہیں اس کا اجر دے گا۔

اس فقرے میں انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب پائی جاتی ہے۔ خاص طور پر ان سفید پوش محتاجوں پر صدقة و خیرات کرنے کی، جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔

﴿الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِالْأَيْلِيلِ وَالنَّهَارِ سِرًا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرٌ هُمْ عَنْهُ رَيِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزُنُونَ﴾ (274)

اس سے پہلے صدقہ و خیرات اور انفاق فی سبیل اللہ کا حکم تھا۔ اب اس کے اجر و ثواب کا ذکر ہے۔

فرمایا: جو لوگ دن رات، ہر موقع اور ہر حال میں اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں، کبھی پوشیدہ طور پر اور کبھی علانیہ، تو ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ ایسا اجر و ثواب عطا فرمائے گا جس کے بعد ان کوئی خوف و خطر رہے گا اور نہ کوئی غم و اندوہ۔

اس سے پہلے واضح کیا جا چکا ہے کہ قرآن مجید کی اس تعبیر سے جنت مراد ہوتی ہے کیونکہ ہماری دنیا میں خوف و غم سے نجات ممکن نہیں۔

اس آیت میں رات کو دن پر اور پوشیدہ کو علانیہ پر مقدم رکھا گیا ہے جس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ چھپا کر دیا ہوا صدقہ دوسروں کے سامنے دیے ہوئے صدقے سے افضل ہے۔

اس کے علاوہ پھر پوشیدہ اور علانیہ صدقات کو ملادیا گیا ہے۔ کہ بعض حالات میں یہ دونوں صدقات یکسان فضیلت رکھتے ہیں۔ ایک اس اعتبار سے کہ اس میں ریا کاری اور دکھاو انہیں ہوتا، اور دوسرا اس لحاظ سے کہ اس سے اوروں کو بھی انفاق کی ترغیب ملتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ آیت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی جنہوں نے ایک موقع پر چالیس (40)

دینار (سونے کا سکہ۔ اشرفتی) صدقہ کیے تھے جن میں دس (10) دینار رات کے وقت، دس (10) دن کو، دس (10) پوشیدہ طور پر اور دس (10) علانیہ خیرات کیے تھے۔

أَلَّذِينَ يَا كُلُونَ الرِّبُوا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ
الشَّيْطَنُ مِنَ الْمَسْطَ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبُوا وَ
أَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَ حَرَمَ الرِّبُوا فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ
فَأَنْتَهُمْ فَلَئِمَا سَلَفَ وَ أَمْرَةٌ إِلَى اللَّهِ وَ مَنْ عَادَ فَأُولَئِكَ أَصْحَابُ
النَّارِ هُمْ فِيهَا خَلِدُونَ ﴿٢٤﴾ يَعْلَمُ اللَّهُ الرِّبُوا وَ يُرِي الصَّدَقَاتِ

وَ اللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كُفَّارٍ أَثِيمٍ ﴿٢٥﴾

”جو لوگ سود کھاتے ہیں، قیامت کے دن (قبوں سے) اس طرح اٹھیں گے جیسے کسی پر جن بھوت کا سایہ ہو۔ اُن کا یہ حال اس لیے ہو گا کہ وہ کہتے تھے تجارت بھی سود کی طرح ہے۔ حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ پھر جس کے پاس اُس کے رب کی طرف سے نصیحت پہنچی اور وہ سود کھانے سے باز آگیا تو جو پہلے لے چکا، سو لے چکا۔ اس کا معاملہ اللہ کے حوالے۔ مگر جو لوگ اس کے بعد بھی سود کھائیں گے، وہ دوزخی ہیں اور ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

اللہ سود کے مال سے برکت ختم کر دیتا ہے اور صدقے کے مال میں برکت دیتا ہے۔ یاد رکو، اللہ کسی ناشکرے اور گناہگار کو پسند نہیں کرتا۔“ (275-276)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

يَا كُلُونَ:..... اس کھانے سے مراد سود کا مال حاصل کرنا اور اسے اپنے تصرف میں لانا ہے۔

الرِّبُوا:..... یہ ربا یعنی سود ہے۔ اس کے اصل معنی بڑھنے یا اضافہ ہونے کے ہیں۔

رَبَا الشَّيْءَ كَمَعْنَى ہیں کوئی چیز بڑھ گئی، اُس میں اضافہ ہو گیا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَمَا آتَيْتُمْ مِنْ رِبَآ لِيَرْبُوَا فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوُا عِنْدَ اللَّهِ﴾ (الروم: 30:38)

”اور جو سودی قرض تم دیتے ہو تاکہ دوسرا لوگوں کے مال میں شامل ہو کروہ بڑھ جائے تو اللہ کے نزدیک وہ نہیں بڑھتا۔“

شرعی اصطلاح میں ربا یعنی سود سے مراد ہے: الْقَرْضُ الْبَشْرُوطُ فِيهِ الْأَجْلُ وَ زِيَادَةٌ عَلَى الْمُسْتَقْرِضِ

”یعنی قرض کا اپنا معاملہ جس میں میعاد مقرر کی گئی ہو اور قرض لینے والے پر قرض کی اصل رقم سے کچھ زیادہ دینے کی شرط

(احکام القرآن للحصاص 1/429)

لگائی گئی ہو۔“

يَتَبَخَّطُهُ..... یہ خبط ہے جس کے اصل معنی اندر ہیرے میں بھکنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے اس شخص کو شیطان نے مُھوت کے اثر سے یا آسیب کے نتیجے میں پاگل اور دیوانہ بنادیا ہو۔

الْمَسْ..... اس کے اصل معنی مُھونے کے ہیں مگر اس جگہ مراد ہے: جنون، دیوانگی، آسیب، جن کا سایہ۔

يَمْحُقُ..... مَحَقَ کے معنی ہیں: کسی چیز کو تھوڑا تھوڑا کر کے ختم کر دینا اور مٹا دینا۔ دوسرے لفظوں میں اسے گھٹانا اور مٹانا کہہ سکتے ہیں۔

يُرُبِّيُ..... یہ رہنا سے ہے۔ اس کے معنی ہیں: وہ بڑھاتا ہے اور کئی نمازیاہ کر دینا ہے۔

أَثْيَمُ..... یہ إِثْمٌ (گناہ) سے صفت مشہد ہے جس کے معنی عادی گناہ گار اور جرام پیشہ کے ہیں۔

﴿الَّذِينَ يَا كُوْنَ الرِّبُّوْلَا يَقُوْمُونَ إِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِي يَتَبَخَّطُهُ الشَّيْطَنُ مِنَ الْمَسِّ﴾

(275)

اتفاق فی سبیل اللہ کے بعد اب اس کے مقابل میں سود کی حرمت کا ذکر ہے۔ یا پھر اسے مالی معاملات میں علال و حرام چیزی دو متقابل (OPPOSITE) چیزوں کا بیان بھی کہہ سکتے ہیں۔ بہر حال یہ قرآن کا ایک اسلوب ہے جس میں وہ جنت کے ساتھ وزن کا اور اہل ایمان کے ساتھ اہل کفر کا ذکر کرتا ہے۔ بعض لوگ جن کے اعصاب پر ”نظم“ سوار ہے وہ اسے قرآن کے ”نظم“ کی ایک خصوصیت قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ قرآن حکیم کے مختلف اسالیب میں سے ایک اسلوب ہے جس کا نام نہاد ”نظم“ سے کوئی تعلق نہیں۔ اصطلاح میں اسے ”اسلوب مقابله“ کہتے ہیں۔

فرمایا: جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قیامت کے دن قبروں سے اس طرح اٹھیں گے جیسے کسی پر جن بھوت کا سایہ ہو۔ اسے مرگی (EPILEPSY) کے دورے پڑ رہے ہوں اور اس کی حالت پاگلوں جیسی ہو۔

یہ ایک سودخوار کی ڈھنی کیفیت کی تمثیل ہے کہ ویسے وہ معمول کا (NORMAL) انسان ہوتا ہے مگر جب اس کے پاس کوئی پریشان حال ضرورت مند قرض لینے آتا ہے تو اچانک اس کی طبیعت میں درندگی آجائی ہے۔ اور وہ خونخوار ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ایک تازہ شکار ہاتھ آ گیا ہے۔ وہ اس کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس کی کوئی قیمتی چیز اپنے پاس رہن (PLEDGE) رکھ کر اسے اپنی من مانی شرائط کے ساتھ سود پر کچھ رقم دیتا ہے۔ اس وقت وہ انسانی ہمدردی سے عاری، عقل و شعور سے بے بہرہ، ایک سنگ دل درندے کا روپ دھار لیتا ہے۔ دنیا میں اس کی یہی ڈھنی حالت قیامت کے دن اس صورت میں تبدیل ہو جائے گی جس کا ذکر اس آیت میں بیان ہوا ہے کہ وہاں جب اسے قبر سے اٹھایا جائے گا تو وہ پاگلوں کی سی حرکتیں کرے گا۔

﴿إِذْلِكَ إِنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبُّوْلَا وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبُّوْلَا﴾

(275)

مطلوب یہ ہے کہ آخرت میں سودخواروں کا انعام پاگلوں جیسا اس لیے ہو جائے گا کہ جب دنیا میں آن سے کہا جاتا تھا کہ تم سود کیوں کھاتے ہو تو وہ یہ نامعمول جواب دیتے تھے کہ تجارت کا نفع بھی تو سود ہے۔ اگر تجارت کا نفع لیتا جائز ہے تو سود لینا بھی جائز ہے۔ اللہ سبحانہ نے آن کے اس غلط دعوے کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ بے شک تجارت کے ذریعے نفع لینا تو حلال ہے مگر سود کی کمائی حرام ہے:

تجارت اور سود میں اتنا واضح فرق ہے کہ کوئی ہوش مند شخص اس کا انکار نہیں کر سکتا اور جوان کار کرتا ہے اور ان دونوں کو ایک جیسا سمجھتا ہے وہ قرآن کی نظر میں مخطوط الہواں اور بے عقل ہے۔

تجارت اور سود میں فرق:

1۔ تجارت میں زائد روپیہ کی کام یا مال کا معاوضہ ہوتا ہے لیکن سود میں جو زائد رقم سودخوار وصول کرتا ہے، وہ نہ کسی کام کا معاوضہ ہے اور نہ مال کا۔

2۔ تجارت سے دولت گردش میں آتی اور پھیلتی ہے لیکن سود میں یہ سست کر صرف چند ہاتھوں میں مرکوز (CONCENTRATE) ہو جاتی ہے۔

3۔ تجارت میں ہر شخص اپنے مال کے نفع و نقصان دونوں کا ذمہ دار ہوتا ہے لیکن سودخوار صرف نفع کا حق اپنے لیے محفوظ رکھتا ہے مگر نقصان کی ذمہ داری مقروض پر ڈالتا ہے۔

4۔ تجارت میں کوئی معاملہ ایک بار ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد سودخوار اکثر اپنے مقروض کی جان نہیں چھوڑتا۔ اس کے مطالبات پورے ہونے میں نہیں آتے۔ سود مرکب (COMPOUND USURY) کی صورت میں کئی خاندان بتاہ ہو جاتے ہیں۔

5۔ تجارت میں نفع کی جو بھی شرح طے ہو، وہ ایک بار وصول ہو جائے تو یعنی وائل کے مطالبات ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن سودخوار کے مطالبات وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتے جاتے ہیں۔

6۔ تجارت میں انسان کی محنت، ذہانت، صلاحیت اور وقت سب صرف ہوتے ہیں پھر کہیں جا کر کچھ نفع ہوتا ہے۔ لیکن سودخوار بغیر محنت کیے سود وصول کرتا رہتا ہے۔

فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهِ فَأَنْتَهِي فَلَهُ مَا سَلَفَ وَ أَمْرَهُ إِلَى اللَّهِ وَ مَنْ عَادَ فَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَلِدُونَ ﴿٢٧٥﴾

مراد یہ ہے کہ اب سود کی حرمت کا حکم آجائے کے بعد جو شخص سود لینا چھوڑ دے گا اسے اس پر گناہ نہیں ہو گا جو اس سے پہلے وہ سود لے چکا۔ کیونکہ اس وقت تک سود حرام نہ تھا۔ اس لیے پہلے کالیا ہوا سود واپس کرنا بھی ضروری نہیں۔

ایسے شخص کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے ہے۔ وہ چاہے گا تو اسے معاف کر دے گا۔ لیکن جو لوگ سود کی حرمت کا حکم آجائے کے بعد بھی سود لینا نہیں چھوڑیں گے تو ایسے لوگوں کا انعام دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

﴿هُمْ فِيهَا خَلِدُونَ﴾ (وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے) سے دعمنی مراد ہو سکتے ہیں:

1۔ اس جگہ خلوٰۃ فی الارضِ عَنْ دُوْزِخٍ میں ہمیشہ رہنے کا مطلب طویل مدت ہے نہ کہ ہمیشہ رہنا۔ اس مفہوم کی بعض مثالیں قرآن میں موجود ہیں جیسے قاتل کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔

﴿وَمَنْ يَقْتُلُ مُؤْمِنًا مُّتَعَيِّنًا فَجَزَّ أَوْهَ جَهَنَّمُ خَلِدًا فِيهَا وَغَضْبَ اللَّهِ عَلَيْهِ وَلَعْنَةُ اللَّهِ عَدَلَةٌ عَذَابًا عَظِيمًا﴾ (النساء: 4)

”اور جو شخص کسی مسلمان کو جان بوجھ کرتیں کر دے تو اس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لیے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔“ اسی طرح بعض احادیث سے بھی اس مضمون کی تائید ملتی ہے۔

(صحیح بخاری، رقم: 6571, 6560، صحیح مسلم، رقم: 461, 457)

2۔ جو شخص سود کی حرمت کا حکم آجائے کے بعد بھی اُسے حلال سمجھے گا، خواہ وہ زبان سے اس کا اظہار کرے یا نہ کرے، تو وہ قرآن کے ایک منصوص اور واضح حکم کا انکار کرنے کی وجہ سے کافر (یا مرتد) ہو جائے گا جس کا انعام بہر حال دوزخ میں ہمیشہ کے لیے رہنا ہے۔

﴿يَمْحُقُ اللَّهُ الرِّبُّوْا وَ يُرِيبُ الصَّدَقَتِ﴾ (276)

فرمایا: اللہ سبحانہ سود کو گھٹانا اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سود کے مال سے اور اس مال سے جس میں سود ملا ہوا ہو، برکت ختم کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس اس مال میں برکت دیتا ہے جس میں سے صدقات دیے جائیں۔ یہ برکت مادی طور پر (MATERIAL) اضافے کی شکل میں ہوتی ہے اور روحانی (SPIRITUAL) طور پر ثواب کی صورت میں ہوتی ہے۔ بعض لوگوں نے اسے صرف آخرت سے متعلق سمجھا ہے کہ وہاں سود کی کمائی نیکی کے پڑھے میں صفر (ZERO) ہو گی اور صدقات کے بدھے میں بہت سی نیکیاں حاصل ہوں گی۔

لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سود کو گھٹانے اور صدقات کو برھانے کا تعلق ہماری موجودہ زندگی سے بھی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ سودی نظام سے معيشت آہستہ آہستہ زوال پذیر ہو جاتی ہے اور صدقات کے نظام سے معاشی ترقی ہوتی ہے۔ اس معاملے کی تفصیل ان شا اللہ آیت 280 کی تفسیر کے آخر میں بیان کی جائے گی۔

﴿وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ﴾ (276)

آخر میں فرمایا: اللہ کسی ناشکرے اور گناہ گار کو پسند نہیں کرتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص جو اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے مال کی نعمت کی قدر نہیں کرتا، اس کا صحیح حق ادا نہیں کرتا اور اس کے حکم کے مطابق مال کو استعمال نہیں کرتا وہ ناشکرا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ سود کی حرمت کے حکم پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے پاپی اور گناہ گار ہو جاتا ہے۔ یہی دونوں صفات ایک سود خوار میں بیک وقت جمع ہو جاتی ہیں کیونکہ کفارِ اثیم (پاپی ناشکرا) کے درمیان واو (و) نہیں آیا ہے۔

اس لیے ان کو الگ الگ انسانوں کی صفات نہیں سمجھنا چاہیے۔ بلکہ یہ جزوی صفات ہر سودخوار کا خاصہ ہیں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو ناشکرا گناہ گار ہو تو اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اگر وہ آدمی توبہ کیے بغیر مر گیا تو اللہ تعالیٰ اسے آخرت میں ایسا عذاب دے گا جس کا ذکر اوپر آیت 275 میں آچکا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ أَمْنَوْا وَعَمِلُوا الصَّلِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَتُوا الزَّكُوْنَ لَهُمْ

أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خُوفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝

”جو لوگ سچے ایمان والے ہیں، نیک کام کرتے ہیں، نماز کی پابندی کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، (غرض ایمان کے تقاضے کے مطابق اللہ تعالیٰ کے تمام احکام پر عمل کرتے ہیں) تو ان کا اجر ان کے رب کے ہاں آخرت میں محفوظ ہے۔ وہاں ان کو عیش و آرام کی جنت ملے گی۔ ان کو نہ ماضی کا کوئی غم ہو گا اور نہ مستقبل کا کوئی خوف ہو گا۔“ (277)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

اعمال صالح کے بعد نماز اور زکوٰۃ کا ذکر الگ طور پر کیا گیا۔ حالانکہ وہ بھی اعمال صالح میں شامل تھے۔ اس کی وجہ دین میں ان دونوں کی خاص اہمیت ہے۔ نماز سب سے بڑی بدینی عبادت ہے اور زکوٰۃ سب سے بڑی مالی عبادت ہے۔ دونوں دینِ اسلام کے بنیادی اركان میں سے ہیں۔ قرآن نے اکثر مقامات پر ان کا ذکر ایک ساتھ کیا ہے۔ اس آیت میں سود کھانے والوں پر تعریض بھی ہے کہ اگر وہ سچے ایمان والے ہوتے اور نیک اعمال کرنے والے ہوتے تو کبھی سود کی کمائی نہ کھاتے اور اس سے بچنے کی پوری کوشش کرتے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أَمْنَوْا إِنْقُوا اللَّهَ وَذُرُّوا مَا بَقَى مِنَ الرِّبَآوا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ فَإِنْ لَمْ تَفْعِلُوا فَإِذْنُوا بِحَرْبِ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رِءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تُظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ۝ وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرْهُ إِلَى مَيْسَرَةٍ وَإِنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ وَإِنْقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوْفَى

جِعْلُ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿١٥﴾

”اے ایمان والو! اگر تم واقعی موت کے عذاب سے ڈرو اور تمہارا جو سو لوگوں کے ذمے باقی ہے، اسے چھوڑ دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے۔ اگر تم توبہ کرو تو اصل رقم کے حق دار ہو۔ نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی تم پر ظلم کرے۔ مقروظ جب تک بنت دست ہے، اسے خوش حالی تک مہلت دو۔ لیکن اگر قرض معاف کر دو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم سمجھو۔ اُس دن سے ڈرو جب تمہیں اللہ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ پھر ہر ایک کو اُس کے اچھے برے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا اور کسی کی حق تلفی نہ ہوگی۔“ (281-278)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

إِنْقُوا اللَّهُ:..... اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتا ہے۔

فَأَذْنُوا:..... اس کے معنی ہیں فَاعْلَمُوا (پس تم خوب جان لو)

حَرْبٌ مِّنَ اللَّهِ:..... (اللہ تعالیٰ کی طرف سے لڑائی) اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا غصہ اور غضب ہے۔

حَرْبٌ مِّنْ رَّسُولِهِ:..... اس سے مراد ہے کہ رسول اللہ ﷺ سو خواروں سے وہ سلوک کریں گے جو باغیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے اور وہ عملی طور پر جنگ کی صورت میں ہوگا۔ ویسے ہر زمانے کے سو خواروں کو رسول اللہ ﷺ کا دشمن سمجھا جائے گا۔

لَا تَظْلِمُونَ:..... اس سے مراد ہے اصل مال سے زیادہ لے کر دوسروں پر ظلم نہ کرو۔

لَا تُظْلَمُونَ:..... اس کا مطلب ہے اپنا اصل مال پورا لو اور کم نہ لو کہ اس طرح اپنے اور پر ظلم نہ کرو۔

ذُو عُسْرَةٍ:..... یہ إِعْسَارٌ سے ہے جس کے معنی مال نہ ہونے یا کاروبار میں مندا ہونے کے ہیں۔

نَظَرَةً:..... اس کے معنی انتظار کرنے کے ہیں۔

مَيْسِرَةً:..... اس کے معنی ہیں: آسانی، سہولت، گنجائش، خوش حالی۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَّوَا إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ﴾

(278)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو خطاب کر کے دو باتوں کا حکم دیا ہے۔ ایک تقویٰ اختیار کرنے یعنی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنے کا، اور دوسరے سو دیا سو دیکی بقا یار قم چھوڑ دینے کا۔

پہلے اہل ایمان سے فرمایا گیا کہ تقویٰ اختیار کرو اور ہر حال میں اللہ سماج نہ کے عذاب سے ڈرتے رہو۔ تقویٰ

در اصل تمام نیکیوں کی بنیاد ہے۔ قرآن مجید نے اسے اختیار کرنے کا حکم کئی مقامات پر دیا ہے۔ تقویٰ وہ ایمانی کیفیت ہے جس میں بندہ اپنے رب کے احکام کی پابندی کرتا ہے۔ اس کی نافرمانی کے برے انعام سے ڈرتا ہے۔ پھر مقتنی شخص کے لیے نیکی کرنا آسان اور برائی کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

پھر فرمایا کہ اگر کسی کا پچھوڑ کسی کی طرف بقايرہ گیا ہے تو وہ اسے چھوڑ دے اور اس کو نہ لے۔ تقویٰ اور ایمان کا ہبی تقاضا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ بندے کو کسی کام سے روک دے تو وہ رک جائے۔ اب جب کہ سود کو حرام قرار دے دیا گیا ہے تو اس کا ہر قسم کا لیٹن دین بندہ ہونا چاہیے اور کسی کا جو بقايرہ گیا ہو تو وہ اسے بھی چھوڑ دے۔

﴿فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَإِذْنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ (279)

ارشاد ہوا کہ اگر تم سود کی رقم یا اس کا بقايانہ نہیں چھوڑ دے گے تو پھر یاد کو تھہاری اللہ و رسول ﷺ سے جنگ ہے۔ یہ قرآن مجید میں سخت ترین وعید ہے جس میں سود کھانے کو اللہ و رسول ﷺ سے جنگ کرنے کے متراff قرار دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے جو اللہ و رسول ﷺ سے جنگ کرے گا، غلست و بر بادی اس کا مقدر بنے گا۔

﴿وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رِّعْوَسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تُظْلِمُونَ وَلَا تُنْظَلَمُونَ﴾ (279)

فرمایا، سود پر دیے ہوئے قرض کی اصل رقم لینے کے تم حق دار ہو وہ تم لے سکتے ہو، لیکن اس پر اضافہ جو سود کی شکل میں ہے وہ حرام ہے، اسے چھوڑ دو۔ اس طرح سود لے کر نہ تم کسی پر خلّم کرو اور نہ اصل رقم چھوڑ کر اپنا نقصان کرو۔ بلکہ اپنا حق لو اور دوسروں کو اُن کا حق دو، نہ صرف سود کے معاملے میں بلکہ ہر معاملے میں یہی اصول پیش نظر رکھو۔

﴿وَإِنْ كَانَ ذُؤْ عُسْرَةً فَنَظِرَةٌ إِلَى مَيْسَرَةٍ﴾ (280)

پھر ارشاد ہوا کہ اگر مقرض ننگ دست ہے اور فی الحال قرض ادا نہیں کر سکتا تو اسے خوشحال ہونے تک مہلت دو تاکہ وہ آسانی سے تمہارا قرض لوٹا سکے۔ اس طرح مقرض کو مہلت دینے کا تمہیں اجر ملے گا۔

﴿وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لِّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ (280)

پھر فرمایا اگر مقرض قرض ادا نہیں کر سکتا تو اس کا قرض معاف کر دو۔ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔ اس سے تمہیں صدقے کا ثواب ملے گا۔ اگر تم کو اس کا صحیح اجر معلوم ہو تو تم ضرور اپنا قرض معاف کر دو گے۔

حقیقت یہ ہے کہ سود ایک لعنت ہے جو اسلامی معاشرے میں اخوت، باہمی ہمدردی و تعاون اور برادرانہ محبت کے پاکیزہ جذبات ختم کر دیتی ہے۔ اس کے نتیجے میں دلوں میں مال کی ہوں پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔

سود کی حرمت:

سود کے مسئلے کی اہمیت کے پیش نظر اب ہم اس پر فضیلی گفتگو کریں گے۔

سود کے بارے میں یہ آخری آیات (278 تا 280) ہیں جو جنت الوداع سے ذرا پہلے نازل ہوئیں۔ ان کے

ذریعے سود کو بالکل یہ ختم کر دیا گیا اور اس کی وجہ لا ادا رقم کو بھی کا عدم قرار دیا گیا۔

پھر بھی ﷺ نے خطبہ ججہ الاداع میں اعلان فرمایا کہ سود کا ہر معاملہ کا عدم عمل کرتے ہوئے آپ ﷺ نے اپنے پیچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے تمام سودی معاملات کا عدم قرار دیے اور غیر مسلموں کے ذمے جو سودی رقم واجب الادا تھیں وہ بھی چھوڑ دی گئیں۔

اس مقام پر قرآن نے راس المال (رُءُ وَسْ أَمْوَالُ) کی اصطلاح استعمال کی ہے جس میں اس بات کا واضح اشارہ ہے کہ یہ حکم تجارتی، صرفی اور سرمایہ کاری کی ہر نوعیت پر یکساں طور پر لائگو ہوتا ہے۔

احادیث اور سود:

صحیح احادیث میں سود کھانے کو سات مہلکات (موبقات) میں سے ایک قرار دیا گیا ہے، جو اسلام میں اکبر الکبار یعنی سب سے بڑے گناہ ہیں۔ اس کے علاوہ سود لینے والے پر، سود دینے والے پر، اس کی تحریر لکھنے والے پر اور اس کے گواہوں پر لعنت کی گئی ہے۔

ایک متفق علیہ حدیث جس کو سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اجتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُؤْبِقَاتِ، قَالُوا: وَمَا هُنَّ يَأْرُسُولُ اللَّهِ؟ قَالَ: الشَّرْكُ بِاللَّهِ، وَالسِّحْرُ، وَقَلْبُ النَّفْسِ الَّتِي حَرَمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ، وَأَكْلُ الرِّبَا، وَأَكْلُ مَالِ الْيَتَمِّ، وَالْتَّوَلِيُّ يَوْمَ الزَّحْفِ، وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ))

(صحیح بخاری، رقم: 2766، صحیح مسلم، رقم: 262، ابو داؤد، رقم: 2874، نسائی، رقم: 2874)

”سات مہلک چیزوں سے بچو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! وہ سات مہلک چیزیں کون کون سی ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے ساتھ شرک کرنا، جادو کرنا، کسی جان کو قتل کرنا جس کے قتل کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، جنگ کے وقت میدانِ جہاد سے بھاگنا، اور بھولی بھالی پاک دامن مسلمان عورتوں پر تہمت لگانا۔“

صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

((لَعْنَ رَسُولِ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَكْلُ الرِّبَا، وَمُوْكَلَةُ، وَكَاتِبَةُ، وَشَاهِدَيْهُ، وَقَالَ: هُمْ سَوَاءُ))

(صحیح مسلم، رقم: 4093، ترمذی، رقم: 1206)

”رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے، اس کی تحریر لکھنے والے اور اس کے دونوں گواہوں پر لعنت فرمائی ہے۔ اور فرمایا ہے کہ ”یہ سب (گناہ میں) برابر ہیں۔“

توریت میں بھی سود کو حرام قرار دیا گیا تھا۔ اس کے دو حوالے درج ذیل ہیں:

- 1۔ ”اگر تو میرے لوگوں میں سے کسی محتاج کو جو تیرے پاس رہتا ہو، کچھ قرض دے تو اس سے بیا جیوں کی طرح سلوک نہ کرنا اور نہ اس سے سود لینا۔“ (خروج باب 25:22)
- 2۔ ”تو اس سے سود اور نفع مت لے، اپنے خدا سے ڈر، تاکہ تیرا بھائی تیرے ساتھ زندگانی بس کرے، تو اسے سود پر روپیہ قرض مت دے، نہ ایسے نفع کے لیے کھانا کھلا۔“ (احباد باب 25، ص 37)
- ”ربا“ (یا ربِو) کے لفظی معنی ”اضافے اور زیادتی“ کے ہیں۔ اردو اور فارسی زبان میں اس کا ترجمہ ”سود“ کیا جاتا ہے۔

سود کی دو قسمیں ہیں: **ربا النسیعہ** اور **ربا الفضل**.

ربا النسیعہ:

یہ قرض پر اضافے کا سود ہے۔ قرآن نے اسے حرام قرار دیا ہے اور اسے ”الله اور رسول ﷺ سے جنگ“ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ حرام لذات ہے۔ (البقرہ 2:279)

ربا الفضل:

یہ اس اضافے کو کہتے ہیں جو بعض اجناس کے ہم جنس بادلے پر لیا جائے۔ حدیث و سنت میں اسے بھی حرام قرار دیا گیا ہے۔ یہ حرام لغیبہ ہے۔

صحیح مسلم میں سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((الدَّهْبُ بِالدَّهْبِ، وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ، وَالْبُرْ بِالْبُرِّ، وَالشَّعِيرُ بِالشَّعِيرِ، وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ، وَالْمِلْحُ بِالْمِلْحِ، مِثْلًا بِمِثْلٍ، يَدًا بِيَدٍ، فَمَنْ زَادَ أَوْ اسْتَرَادَ فَقَدْ أَرْبَى، الْأَخْدُ وَالْمُعْطُونُ فِيهِ سَوَاءٌ)) (صحيح مسلم، رقم: 4046)

”سو نا سونے کے بدلتے، چاندی چاندی کے بدلتے، گندم گندم کے بدلتے، ہو ہو کے بدلتے، کھجور کھجور کے بدلتے اور نمک نمک کے بدلتے، برابر برابر اور نقد بنتد ہوں۔ جس شخص نے زیادہ دیا، یا جس نے زیادہ کا مطالبہ کیا تو اس نے سودی کام کیا۔ اور اس میں لینے والا اور دینے والا دونوں (گناہ میں) برابر ہیں۔“

ربا الفضل بنیادی طور پر ربا النسیعہ سے روکنے کا ذریعہ ہے اور یہ بھی حرام ہے۔ یہ ایک انسدادی (PREVENTIVE) حکم ہے جسے اصول فقہ کی اصطلاح میں سودہ ذریعہ کہا جاتا ہے۔

ربا کی تعریف (DEFINITION OF RIBA):

فقہ میں ربا یعنی سود کی تعریف کی گئی ہے

”هو القرض المشروط فيه الاجل و زيادة على المستقرض“

(امام جصاص، احکام القرآن، ج: 1، ص: 429)

”قرض کا ایسا معاملہ جس میں ایک خاص مدت ادا یگی کے لیے طے کی گئی ہو اور قرض لیجے والے پر کچھ اضافہ مقرر کیا گیا ہو،“

دوسرے الفاظ میں قرض پر ہر قسم کا اضافہ، جو معابرے میں طے کر لیا گیا ہو، سود کہلاتا ہے۔

یاد رہے ربا (سود) کی اس تعریف میں سود مفرد کے علاوہ سود مرکب بھی شامل ہے اور یہ دونوں حرام ہیں۔

موجودہ زمانے کے تجارتی بینک جو منافع (INTEREST) اپنے قرض داروں سے لیتے اور امانت داروں کو دیتے ہیں وہ بھی ربا (سود) ہے۔

ربا النسیمہ کے حرام ہونے کا حکم مدینے میں اجھرت کے بعد نازل ہوا۔ سورہ الروم (30) میں اگرچہ ربا کا ذکر آیا ہے کہ:

﴿وَمَا أَتَيْتُمْ مِّنْ رِبَّالٍ يَرْبُوَا فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوُا عِنْدَ اللَّهِ وَمَا أَتَيْتُمْ مِّنْ زَكْوَةٍ تُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُضْعَفُونَ﴾ (الروم 30:39)

”جو سود تم دیتے ہوتا کہ دوسرے لوگوں کے مال میں شامل ہو کروہ بڑھ جائے تو اللہ کے نزدیک وہ نہیں بڑھتا۔ لیکن جو زکوٰۃ تم اللہ کی رضا کے لیے دیتے ہو تو ایسے لوگ اللہ کے ہاں اپنا مال بڑھا رہے ہیں۔“

مگر مفسرین کے نزدیک اس کا مطلب سود نہیں ہے بلکہ ”نوتہ“ مراد ہے جسے اردو زبان میں ”نیوٹہ“ اور پنجابی میں ”نیوندرَا“ کہتے ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ کسی شخص کو اس نیت سے کوئی ہدیہ یا تخفیف دینا تاکہ بعد میں وہ اس سے بہتر ہدیہ یا تخفیف پیش کرے۔

قرآن و حدیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ربا یعنی سود کے بارے میں اس بات کو کوئی دخل نہیں کہ قرض کس غرض کے لیے لیا گیا ہے۔ نبی ﷺ اور صحابہ کرام کے دور میں ہر قسم کے قرض پر اضافہ لینا ربا (سود) کہلاتا تھا۔ خواہ وہ قرض کسی عام صرفی ضرورت کے لیے تھا، یا کسی تجارتی یا پیداواری ضرورت کے لیے۔ اس لیے یہ خیال بالکل غلط، لغو اور غیر اسلامی ہے کہ تجارتی مقصد کے لئے لیے گئے قرضے پر سود لینا ربا (سود) نہیں ہے، اور یہ کہ دور اوقل میں صرف صرفی اور ذاتی ضرورت کے لیے سود کا رواج تھا اور تجارتی قرضوں اور ان پر سود کا رواج نہ تھا۔

اسلام میں ربا یعنی سود کی حرمت کا ایک بڑا مقصد میں دعویٰ ہے کہ اس سے دولت چند ہاتھوں میں جمع ہونے اور اس کے ارکان (CONCENTRATION OF WEALTH) کو روکنا ہے، جو سرمایہ دارانہ نظام (CAPITALISM) کی سب سے بڑی خرابی ہے کہ اس سے دولت چند ہاتھوں میں سست جاتی ہے اور وہ گردش دولت (CIRCULATION OF WEALTH) نہیں ہو پاتی جس سے سب لوگ فائدہ اٹھا سکیں۔

یاد رہے کہ کرنی کی قیمت (VALUE) میں کمی بیشی کا اثر قرض پر نہیں پڑتا۔

بعض لوگ سرمائے (CAPITAL) کو پیداوار کا ذریعہ تصور کر کے اس کے استعمال کا معاوضہ (کرایہ) لیتے ہیں

تو یہ بھی حقیقت میں سود ہے جو کہ حرام ہے لیکن مکان، سواری، زمین اور دوسری چیزوں کے استعمال کا کرایہ اور معافہ جائز ہے۔ مگر نقد رقم یا کرنٹ کے استعمال کا کرایہ اور معافہ حرام ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ دارالحرب میں سود کالین دین جائز ہے لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ قرآن میں سود کو حرام قرار دینے والی آیتوں کا حکم عام ہے اور اس میں کسی قسم کا استثنی (EXCEPTION) نہیں ہے۔ کسی صحیح حدیث سے بھی اس استثنی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ ہر مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ ہر مقام پر اسلام کے احکام کی پابندی کرے۔ جس طرح ایک مسلمان کے لیے شراب، جوا، زنا، چوری ڈاکہ دنیا میں ہر جگہ حرام ہے اسی طرح سود بھی ہر جگہ حرام ہے۔ سود سے جو اخلاقی اور معاشی خرابیاں ایک مقام پر پیدا ہوتی ہیں وہی دوسری جگہ بھی پیدا ہوتی ہیں۔ خود غرضی، مادہ پرستی، سنگ دلی اور بے رحمی جیسی اخلاقی قضاحتیں اور معاشی عدم توازن اور دولت کا ارتکاز یعنی چند ہاتھوں میں جمع ہونا جیسی معاشی خرابیاں سودی معيشت کے وہ برعے اثرات ہیں جو ہر جگہ اور ہر مقام پر کیساں طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے دارالاسلام ہو، یا دارالحرب ہو، دارالکفر ہو یا دارالصلح ہو، کوئی ”دار“ ہو، اسلام نے ہر فرد، ادارے اور حکومت کے لیے سود کو حرام قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ اسلامی حکومت اور اداروں کے سودی معابدات اور سودی ادائیگیاں بھی حرام ہیں۔

مشہور حنفی دیوبندی مولانا رشید احمد گنگوہی رضی اللہ کا فتویٰ ہے کہ: ”کفار سے بھی سود لینا درست نہیں ہے۔“

اس کے علاوہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رضی اللہ نے اپنی کتاب ”سود“ میں دارالحرب میں سودی لین دین کو ناجائز لکھا ہے۔

سود کی خرابیاں:

سود اپنے اندر بے شمار اخلاقی، معاشرتی اور معاشی خرابیاں اور قضاحتیں رکھتا ہے۔ ذیل میں ان میں سے چند ایک خرابیوں کا ذکر کریں گے۔

تمہید کے طور پر سمجھ بیجھتے کہ اسلام چاہتا ہے کہ وہ معاشرے میں ایسا عادل اشہ اور منصفانہ نظام قائم کرے جس میں کوئی کسی پر ظلم و زیادتی نہ کرے اور نہ کسی کی حق تلفی کرے۔ لوگوں میں باہمی اخوت، الفت، خیر خواہی، ہمدردی اور تعاون و تکافل کا جذبہ کار فرمائے۔

اس کے بر عکس سود سے جو ذہنیت پیدا ہوتی ہے وہ اسلامی اقدار و اخلاق کے سراسر خلاف ہے۔ ایک سود خوار دوسرے کے نقصان پر خود فائدہ اٹھاتا ہے۔ سود خواری سے خود غرضی، ظلم و زیادتی اور سنگ دلی جنم لیتی ہے۔ اس سے تین بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

(۱) اخلاقی خرابیاں:

1۔ سود ایک ظالمانہ سلسلہ پیدا کرتا اور دن اسے پھیلاتا رہتا ہے۔ بہت سے لوگ اس ظلم کا شکار ہو کر دیوالیہ (BANKRUPT) ہو جاتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں کسی کا گھر لٹتا ہے تو کسی کی رہی سہی پوچھی بھی ڈوب

جاتی ہے۔

- 2. سود خواری سے انسان میں ایسی خود غرضی، سنگدی اور شائیلا کی پیدا ہوتی ہے جو دوسروں کے نقصان پر اپنا فائدہ حاصل کرنا چاہتی ہے۔ سود خوار کو اپنے سود کی رقم وصول کرنے سے غرض ہوتی ہے چاہے غریب اپنے گھر کے بڑن اور تن کے کپڑے نیچے۔
- 3. سودی نظام سے لوگوں میں مال و دولت کی ہوس پیدا ہو جاتی ہے جس کے بعد انسان کی اہمیت کم اور مال و دولت کی وقعت زیادہ ہوتی ہے۔ ایک انسان کی محنت و کوشش کے شائع ہونے پر کسی کو افسوس نہیں ہوتا مگر سود کے چار پیسے کم ہونے کا سب روناروئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ روپے کو انسان پر برتری دینے کا نام سود ہے۔
- 4. ایک سود خوار محنت کر کے اور خون پسند بہا کر حلال اور پاکیزہ روزی کا تصور نہیں کر سکتا۔ وہ گھر بیٹھے مفت کی کھانے کا عادی ہو جاتا ہے۔

(ب) معاشرتی خرابیاں:

سودی نظام سے درج ذیل معاشرتی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں:

- 1. سود کے نتیجے میں دولت کی گردش (CIRCULATION OF WEALTH) رُک جاتی ہے اور ارتکاز دولت (CONCENTRATION OF WEALTH) پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے دولت چند ہاتھوں میں جمع ہو جاتی ہے اور معاشرہ و مختلف طبقوں میں بٹ جاتا ہے۔ ایک قلیل طبقہ سود خوار سرمایہ داروں پر مشتمل ہوتا ہے جو ساری دولت اور وسائلی رزق پر قابض ہو کر من مانیاں کرتا ہے۔ دوسرا کثیر طبقہ نان جویں اور اپنی بنیادی ضروریات کو ترستا ہے۔ پھر یہ دونوں طبقے باہمی نفرت، حسد و غصہ اور جنگ و جدال کی کشکاش کا شکار ہو جاتے ہیں۔
- 2. عام مشاہدہ ہے کہ بغیر محنت و مشقت کے جو دولت مل جائے اس کی قدر نہیں ہوتی۔ جس طبقے میں گھر بیٹھے دولت کی ریل پیل ہو جائے وہ فضول خرچی اور عیاشی میں بیتلہ ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں معاشرے میں ہر طرح کی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔
- 3. چونکہ سودی نظام کوئی اخلاقی بنیاد نہیں رکھتا اس لیے اس سے معاشرے میں وہ مغبوط باہمی تعاون و تکافل پیدا نہیں ہو سکتا جو کسی قوم کی حقیقی ترقی کا ضامن ہوتا ہے۔

(ج) معاشی خرابیاں:

- 1. سود کے سب سے امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہو جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں غریب لوگوں کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ وہ بے روزگاری اور مہنگائی کے ہاتھوں سخت پریشان رہتے ہیں۔
- 2. سود کے باعث سرمائے کی کارکردگی (EFFICIENCY) کم ہو کر رہ جاتی ہے۔ شرح سود اور سرمائے کی

صلاحیت کار میں ایک منفی تعلق قائم ہو جاتا ہے جس سے کئی قدرتی وسائل کا حصول ممکن نہیں رہتا۔ خاص طور پر کوئی چھوٹا کار و بار جو سود کا بوجھ نہیں آٹھا سکتا، وہ شروع ہی نہیں کیا جاسکتا، یا شروع کرنے کے بعد قسان آٹھا کر چھوڑنا پڑتا ہے۔ جس سے بے روزگاری میں اضافہ ہوتا ہے۔

3۔ سودی رقم سے جو کار و بار شروع کیا جاتا ہے اس میں منافع کی شرح زیادہ رکھنی پڑتی ہے تاکہ سود کی اقسام بھی ادا کی جاسکیں اور نفع بھی کمایا جاسکے۔ اس کے نتیجے میں ناجائز منافع خوری کا رحجان پیدا ہوتا ہے۔ پھر مکانوں اور دکانوں کی تعمیری لaggت زیادہ ہونے سے ان کے کرائے بہت زیادہ ہو جاتے ہیں۔ پھر مہنگائی بھی بڑھتی ہے۔

4۔ سودی نظام میں منافع خوری کے لیے ضروری ہے کہ مزدوروں کو ان کی محنت کا پورا معاوضہ نہ دیا جائے۔ اس کے نتیجے میں طبقاتی کشمکش پیدا ہوتی ہے جو معاشرے کا امن و سکون برپا کر دیتی ہے۔

5۔ سود کی وجہ سے چیزیں مہنگی ہو جاتی ہیں اور غریب لوگوں کو اپنی ضروریات زندگی حاصل کرنے میں سخت دشواری پیش آتی ہے۔

6۔ سودی کار و بار میں ایک بنیادی خرابی یہ ہے کہ اس میں منافع کی بلند سطح قائم رکھنے کے لیے پیداوار نہ صرف کم کر دی جاتی ہے بلکہ بعض اوقات زیادہ پیداوار کو تلف (DESTROY) کر دیا جاتا ہے جو انسان کی محرومی اور سرمائے کی طاقت کا نہایت عبرت ناک منظر ہوتا ہے۔

﴿وَ اتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾ (281)

فرمایا: اُس دن سے ڈرو جب تمہیں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ وہاں سود کھانے والوں کے جھوٹے عذر بہانے نہیں چلیں گے اور وہ اپنے کیے کی سزا پائیں گے۔ البتہ جنہوں نے سود کھانا چھوڑ دیا، توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لی اور نیک اعمال بھی کیے تو ان کو پورا اجر و ثواب ملے گا۔

آخر میں فرمایا: **﴿وَ هُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾** (اور ان کی حق تلفی نہ ہوگی) اس کا مطلب ہے کہ لوگوں کے ساتھ نا انصافی نہیں ہوگی۔ نہ کسی کے ثواب میں کسی ہوگی اور نہ کسی کی سزا میں اضافہ ہوگا۔

اس آیت کے بارے میں عبداللہ بن عباس رض کا قول ہے کہ یہ قرآن مجید کی سب سے آخری آیت ہے جو نازل ہوئی۔ اس کے بعد نبی ﷺ دنیا میں اکیس (21) دن رہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اکیاسی (81) دن رہے تھے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَاءَنُتُم بِدَيْنِ إِلَى أَجَلٍ مُسَتَّعٍ فَاتَّبُوهُ وَلَا يُكْتَبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يُكْتَبَ كَمَا عَلِمَ اللَّهُ فَلَيُكْتَبْ وَلَمْ يُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلَيُبَتِّقَ اللَّهُ رَبُّهُ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًَا أَوْ ضَعِيفًَا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُمْلِلَ هُوَ فَلَيُمْلِلْ وَلِيُبَتِّقَ بِالْعَدْلِ وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَيْنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ إِنْ تَضَلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَى وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا مَوْلَى وَلَا تَسْمُوا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَى أَجَلِهِ ذَلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَى إِلَّا تَرْتَابُوا إِلَّا أَنْ تَكُونَ تَجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيُسَّرَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ إِلَّا تَكْتُبُوهَا وَآشِهْدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ وَلَا يُضَارَ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ وَإِنْ تَفْعَلُوا فَإِنَّهُ فُسُوقٌ بِكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَيَعْلَمُكُمُ اللَّهُ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلَيْهِمْ^(٤٧) وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَى سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهْنٌ مَقْبُوضَةٌ فَإِنْ أَصْنَعْتُمْ بَعْضًا فَلَيُؤَدَّ الَّذِي أَوْتُمْ أَمَانَتَهُ وَلَيُبَتِّقَ اللَّهُ رَبُّهُ وَلَا تَكْتُبُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُبُهَا فَإِنَّهُ أَثْمٌ قَلْبُهُ وَاللَّهُ بِمَا

تَعْمَلُونَ عَلَيْمٌ ﴿١﴾

”اے ایمان والو! جب تم کسی مقررہ مدت کے لیے آپس میں ادھار کالین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔ خود نہ لکھ سکو تو تمہارے درمیان کوئی اور لکھنے والا انصاف سے لکھ دے۔ لکھنے والے کو چاہیے کہ وہ لکھنے سے انکار نہ کرے۔ جیسے اللہ نے اسے سکھایا ہے لکھ دے۔ وہ شخص لکھواتا جائے جس کے ذمے قرض ہے اور وہ اللہ سے ڈرتا رہے جو اُس کا رب ہے۔ ایسا نہ ہو قرض کی رقم میں سے کچھ کم کر کے لکھوادے۔ مقروض اگر بے سمجھ یا کمزور ہو، یا خود نہ لکھوا سکتا ہو تو اس کا کوئی سر پرست انصاف کے ساتھ لکھوادے۔ اپنے مسلمان مردوں میں سے دوآدمیوں کو گواہ بنالو۔ اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی ہو۔ سارے گواہ تمہارے نزدیک معتبر ہونے چاہئیں۔ دعورتوں کی گواہی اس لیے کہ ایک سے کچھ بھول چڑک ہوتا دوسرا اسے یاد دلا دے۔ گواہوں کو جب بلا یا جائے تو وہ انکار نہ کریں۔ قرض تھوڑا ہو یا زیادہ میعاد کے مطابق اسے لکھنے میں سنتی نہ کرو۔ یہی طریقہ اللہ کے نزدیک انصاف کا ہے۔ اس سے گواہی ٹھیک ہوتی ہے اور کوئی شک باقی نہیں رہتا۔ لیکن اگر فتنہ یا تھوڑی دیر کے لیے آپس میں لین دین کرو، پھر نہ لکھنے میں حرج نہیں۔ آپس میں سودا طے کر و تو اس پر گواہ بنالو۔ یاد رکھو، کسی لکھنے والے کو، یا گواہ بننے والے کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے۔ اگر ایسا کرو گے تو تمہیں گناہ ہوگا۔ ہر حال میں اللہ سے ڈرو۔ اللہ تمہیں ابھی بات سکھاتا ہے اور وہ ہر چیز کے بارے میں خوب جانتا ہے۔

اگر تم سفر میں ہو اور کوئی لکھنے والا نہ ہو، تو کوئی چیز رہن رکھ کر قرض لے لو۔ اگر کوئی شخص دوسرے پر اعتبار کرے اور اسے بغیر رہن کے قرض دے دے تو قرض لینے والے پر اعتبار کیا گیا ہے اسے چاہیے قرض دینے والے کا قرض جو کہ امانت ہے، اسے پوری طرح واپس ادا کرے اور اللہ سے ڈرے جو اُس کا رب ہے۔ دیکھو، گواہی کو ہرگز نہ چھپاؤ، جو گواہی چھپائے گا اُس کا دل گناہ گار ہوگا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اسے جانتا ہے۔“ (282-283)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

تَدَاءِيْتُمْ:..... یہ تَدَاءِيْنَ سے ہے جس کے معنی ہیں: ایک دوسرے سے قرض کا معاملہ کرنا۔

وَلِيْسِيلُ:..... (اور چاہیے کہ وہ لکھوائے) اَمَلَ يُبْلِي إِمْلَالًا کے معنی ہیں: لکھوانا (TO DICTATE) یعنی

معنی اَمْلَى يُبْلِي إِمْلَاءً کے بھی ہوتے ہیں:

سَيْفِيْهَا:..... اس سے مراد وہ بے وقوف شخص ہے جو لین دین کے معاملے میں کم عقل ہو۔

ضَعِيفِيْا:..... اس سے بچے یا زیادہ بوڑھا شخص مراد ہے۔

أَنْ تَضِلُّ:..... اس کے معنی بھول چڑک ہونے کے ہیں۔

تُدِيرُونَ:..... ایک دوسرے سے نفدا و دست بدست سودا کرتے ہو۔

فَرِهَانُ:..... رِهَانٌ جمع ہے رَهْنُ (PLEDGE) کی اور اس جگہ اس سے مراد وہ شے ہے جو، ہم رکھی جائے (مرہون شے)۔ ہم یا گروپ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ قرض لینے والا اپنی کوئی شے قرض دینے والے کے قرض کی ضمانت کے طور پر اس کے قبضے میں دے۔

آمَانَتَهُ:..... اس سے مراد قرض کی رقم یا قرض کا مال ہے۔ کیونکہ اس صورت میں قرض لینے والے پر اعتماد کیا جاتا ہے اور اس کی کوئی چیز ہم یا گروپ نہیں رکھی جاتی۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَاءَنْتُمْ بِدِينِ إِلَى أَجَلٍ مُّسَسَّى فَإِنْ تَبُوءُوهُ ﴾ (282)

سودجو کہ قرض کی ایک شکل ہے، کے بعد اب قرض کا ذکر ہے۔

اسلام میں مال کی بڑی اہمیت ہے قرآن نے روزی کو اللہ کا فضل قرار دیا ہے۔ سورہ الجمعدہ میں ہے کہ جمعے کی نماز کے بعد زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل یعنی روزی تلاش کرو:

﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَأَنْتُشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ﴾ (الجمعہ 10:62)

”پھر جب نماز (جمع) پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل یعنی روزی تلاش کرو۔“

پھر لوگوں کو اپنی زندگی کی ضروریات کے لیے ایک دوسرے سے قرض لینا پڑتا ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے بھی دوسروں سے قرض کا معاملہ کیا ہے اور قرض لیا ہے۔ اسی قرض کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں تفصیلی طور پر احکام وہدایات کی تاکید فرمائی ہے۔ ان میں سے پہلا حکم یہ ہے کہ قرض کا معاملہ لکھ لینا چاہیے تاکہ بھول چوک کا امکان نہ رہے اور کسی کی وفات کے بعد بھی اس معاملے کا لین دین ہو سکے۔

﴿وَ لَيَكُتُبَ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعُدْلِ وَ لَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكُتُبَ كَمَا عَلِمَهُ اللَّهُ فَلَيَكُتُبَ ﴾ (282)

فرمایا: لکھنے والا انصاف کے ساتھ تحریر یا دستاویز (DOCUMENT) لکھے۔ کسی فریق کی طرف داری نہ کرے اور نہ قرض کی رقم میں کوئی کمی بیشی کرے۔ لکھنے والا ایسا شخص ہونا چاہیے جو اس طرح کی تحریر لکھنی جانتا ہو اور جب اسے لکھنے کے کام کے لیے بلا یا جائے تو وہ لکھنے سے انکار نہ کرے بلکہ اللہ تعالیٰ کے سکھائے ہوئے طریقے پر لکھ دے۔

﴿وَ لَيُمْلِلَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحُقُوقُ وَ لَيُبَيِّنَقَ اللَّهُ رَبُّكُمْ وَ لَا يَبْخَسُ مِنْهُ شَيْئًا ﴾

(282)

اور چاہیے کہ اس تحریر کی عبارت وہ شخص لکھوائے جس نے قرض دیا ہے تاکہ اس میں اس کا اقرار اور اعتراف بھی شامل ہو جائے اور وہ بعد میں انکار نہ کر سکے۔ لکھوائے والا قرض لی ہوئی پوری رقم لکھوائے اس میں کمی کر کے نہ لکھوائے بلکہ اس اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے پوری رقم لکھوائے جو اس کا رب اور آقا و مالک ہے۔

﴿فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحُقْقُ سَفِيهًّا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِعُ إِنْ يُؤْمِنَ هُوَ فَلِيُمْلِلْ وَلَيُئْلِلْ بِالْعَدْلِ﴾ (282)

پھر اگر قرض لینے والا کسی وجہ سے خود نہ لکھ سکتا ہو تو اس کی طرف سے اس کا کوئی ولی یا سرپرست انصاف کے ساتھ یہ تحریر لکھائے اور اس میں کوئی کمی ویشی یا زیادتی نہ کرے۔

﴿وَاسْتَشِهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ﴾ (282)

اور قرض کی اس دستاویز (DOCUMENT) پر دو معتبر مردوں کی گواہی بھی ثبت ہونی چاہیے تاکہ بعد میں کسی اختلاف اور جھگڑے کی صورت میں وہ صحیح گواہی دے کر معاملے کا فیصلہ کرنے میں مدد دے سکیں۔ مالی معاملات میں گواہی کا بھی نصاب ہے جس میں دو مردوں کی گواہی لی جاتی ہے۔

﴿فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَيْنِ مِمَّنْ تَرْضُونَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ تَضَلَّ إِحْدَاهُمَا فَتَذَكَّرَ إِحْدَاهُمَا إِلَّا خَرَى﴾ (282)

پھر اگر دو معتبر مرد گواہ میرسنہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ ہونی چاہیں۔ یہ سب گواہ بھی معتبر اور قبل اعتبار ہونے چاہیں۔

ایک مرد کے مقابل میں دو عورتوں کو اس لیے گواہ بنا�ا جائے کہ اگر ان میں کسی ایک کو بھول چوک ہو جائے تو دوسری اُسے یاد دلا دے اور اصلاح کر دے۔ گویا ایک کی گواہی میں جو کمی رہ گئی ہو دوسری اُسے پوری کر دے۔ یوں ظاہراً ایک گواہی دینے والی اور دوسری اُسے یاد کرانے والی (REMINDER) ہوگی۔ مگر حقیقت میں دونوں ہی گواہ اور دونوں ہی یاد کرانے والیاں ہو جائیں گی۔

﴿وَ لَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا مُهِاجِرِيْنَ﴾ (282)

فرمایا: جب قرض کے معاملے کے لیے گواہوں کو طلب کیا جائے تو وہ حاضر ہونے سے انکار نہ کریں۔ بلکہ ٹھیک ٹھیک گواہی دیں۔ ایسا کرنا ان پر واجب ہے۔

﴿وَ لَا تَسْكُنُوا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَى آجَلِهِ﴾ (282)

پھر اللہ تعالیٰ نے یہ تاکید فرمائی ہے کہ قرض کی رقم کو تھوڑی ہو یا زیادہ ہو، کم مدت کے لیے ہو یا زیادہ مدت کے لیے، بہر حال اسے لکھنے میں کوتاہی اور سستی نہ کی جائے تاکہ بعد میں کوئی جھگڑا پیدا نہ ہو۔

﴿ذَلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَى إِلَّا تَرْتَأُوا إِلَّا أَنْ تَكُونَ

تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيُسَعِّ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ إِلَّا تَكْتُبُوهَا﴾ (282)

فرمایا: اس طرح قرض کی رقم کو تحریر کر لینا اور ان پر گواہیاں ثبت کر دینا ایسا طریقہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک عدل و انصاف کا ہے۔ اس سے گواہی بھی ٹھیک ہوتی ہے اور کسی قسم کا کوئی شک بھی باقی نہیں رہتا۔

لیکن اگر قرض کا معاملہ تھوڑی دیر کے لیے ہو یا چند گھنٹوں کے لیے ہو تو پھر اسے نہ لکھنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

﴿وَأَشْهُدُ وَآذَا تَبَأْيَعْتُمْ﴾ (282)

اور اگر خرید و فروخت کا کوئی بڑا معاملہ ہو جیسے کوئی شخص اپنا مکان، گاڑی یا باغ بیچ رہا ہو تو اس سودے پر بھی گواہی ہونی چاہیے۔ لیکن یہ گواہی مستحب اور پسندیدہ ہے، ضروری اور واجب نہیں ہے۔

﴿وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ وَإِنْ تَفْعَلُوا فَإِنَّهُ فُسُوقٌ إِلَّكُمْ﴾ (282)

فرمایا: قرض کی تحریر اور دستاویز لکھنے والے کو، یا گواہوں کو کسی قسم کا جانی یا مالی نقصان نہ پہنچایا جائے۔ اُن پر کوئی دباؤ نہ ڈالا جائے اور نہ ان کو ہر اساح کیا جائے۔ ایسی کوئی حرکت کرنا سخت گناہ ہے۔

﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ تَعَالَى﴾ (282)

آخر میں تقویٰ اختیار کرنے اور اللہ سے ڈرنے کی تاکید فرمائی گئی کہ ہر حال میں گناہ اور زیادتی سے بچو۔ اللہ سبحانہ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ کرو بلکہ اُس کے ہر حکم کی پابندی کرو ورنہ تمہیں آخرت میں اس کی سزا بھلٹتی پڑے گی۔ ممکن ہے تم دنیا کے قانون اور اُس کی عدالت سے بچ جاؤ مگر اللہ کی عدالت سے بچ نہیں سکتے۔

﴿وَيَعْلَمُ اللَّهُ أَعْلَمُ﴾ (282)

فرمایا: اللہ سبحانہ تمہیں ایسے احکام سکھاتا ہے جن پر عمل کر کے تم دنیا اور آخرت کی فلاج و کامیابی حاصل کر سکتے ہو۔

﴿وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ (282)

آخر میں فرمایا کہ اللہ سے کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ پھر جیسے تمہارے اعمال ہوں گے وہی جزا اوزرا ہو گی۔

اسلام میں عورت کی گواہی:

اوپر اس آیت میں قرض کے لین دین میں دعورتوں کی گواہی کو ایک مرد کی گواہی کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ بالکل یہی بات صحیح احادیث سے بھی ثابت ہے کہ مالی معاملات میں عورت کی گواہی مرد کی گواہی کا نصف ہے۔

1۔ صحیح مسلم میں سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((فَشَهَادَةُ امْرَاتَيْنِ تَعَدِّلُ شَهَادَةَ رَجُلٍ)) (صحیح مسلم، رقم: 241)

”پس دعورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے۔“

2۔ صحیح بخاری میں سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دعورتوں سے پوچھا کہ:

((الَّذِيْسَ شَهَادَةُ الْمَرْءَةِ وَمِثْلُ نَصْفِ شَهَادَةِ الرَّجُلِ)) (صحیح بخاری، رقم: 304)

”کیا ایک عورت کی گواہی مرد کی گواہی سے آدمی نہیں ہے۔“

تو دعورتوں نے جواب دیا: بُلی (جی ہاں، کیوں نہیں)۔

اسی مضمون کی احادیث ابو داؤد اور ترمذی میں بھی موجود ہیں۔

اس سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ قرآن و سنت میں کامل مطابقت پائی جاتی ہے۔ پھر اسی پر اجماع امت بھی ہے کہ مالی معاملات میں دونوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے۔

اسلامی شریعت میں عورت کی گواہی کی درج ذیل چار صورتیں ہیں:

1۔ ایسے معاملات جو عام طور پر مردوں سے مخفی رہتے ہیں اور عورتیں ان سے زیادہ باخبر ہوتی ہیں۔ جیسے حمل، ولادت، رضاعت وغیرہ۔ ایسے تمام معاملات میں ایک عورت کی گواہی دونوں کی گواہی کے برابر ہے۔

2۔ بعض معاملات میں عورت اور مرد کی گواہی برابر ہے اور ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جیسے روایت ہلال (چاند دیکھنے) کی خبر دینا۔

3۔ ہر قسم کے مالی معاملات میں عورت کی گواہی مرد کی گواہی کا نصف ہے۔ گویا دونوں کی شہادت ایک مرد کی شہادت کے برابر ہے۔

4۔ حدود و تحریرات میں عورت کی گواہی قابل قبول نہیں ہے۔

بعض لوگ جو اسلامی شریعت اور اس کے مزاج سے نادافع ہیں یہ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ عورت کی گواہی مرد کی گواہی کے برابر کیوں نہیں۔ حالانکہ اور پرہم بیان کر آئے ہیں کہ بعض معاملات میں عورت کی گواہی نہ صرف مرد کے برابر ہے بلکہ کئی معاملات میں ایک عورت کی گواہی دونوں کی گواہی کے برابر ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی مرد فاسق و فاجر ہے تو اس کی گواہی معترض نہیں ہے۔ بہر حال اس حوالے سے چند قابل غور امور یہ ہیں:

(1) اگرچہ مرد اور عورت دونوں انسان ہیں مگر ان کی جسمانی و ذہنی صلاحیتیں، مزاجی خصوصیات اور معاشرتی مشاغل الگ الگ ہیں جن کے باعث فطری طور پر دونوں کا دائرہ کار اور حقوق و فرائض جدا جدا ہیں۔ چونکہ مالی معاملات کے سلسلے میں عدالت میں گواہی دینے کی ذمہ داری عورت کے مزاج اور احوال کے لحاظ سے ایک بھاری ذمہ داری تھی اس لیے ایک مرد کی جگہ دونوں کو گواہ بنایا گیا ہے۔ اس میں عورت کے لیے کوئی تحفیز کا پہلو نہیں ہے۔

(2) بعض لوگ کہتے ہیں کہ عورت کو گواہی میں کم حیثیت دینا اُس کی حق تلفی ہے۔ لیکن یہ بات اس لیے درست نہیں ہے کہ گواہی دینا سرے سے کوئی قانونی یا شرعی حق (RIGHT) نہیں ہے بلکہ یہ ایک فرض (DUTY) ہے۔ دنیا میں کہیں بھی گواہی دینے کو حق (RIGHT) تسلیم نہیں کیا جاتا۔

(3) کچھ لوگ ”لِعَان“ کے معاملے کو دلیل بنا کر کہتے ہیں کہ جب اُس میں عورت اور مرد کی گواہی برابر ہے تو ہر معاملے میں کیوں برابر نہیں۔ ایسے لوگ ایک تو قرآن کے ایک صریح حکم کا انکار کرتے ہیں جس میں دونوں کی گواہی کو ایک مرد کی گواہی کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ (البقرہ (2) آیت 282)۔ دوسرے ”لِعَان“ کی گواہی جیسا کہ فقہاءِ اسلام نے تصریح کی ہے، شہادت نہیں ہے بلکہ ”بیہین“ (اپنے بارے میں حل斐ہ بیان) ہے اور یہ گواہی سے بالکل مختلف

چیز ہے۔ اسے گواہی پر ہرگز قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

(4) بعض لوگ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ جب حدیث کی روایت کرنے میں مرد اور عورت برابر ہیں تو گواہی میں بھی برابر ہونے چاہئیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اداۓ شہادت (گواہی دینا) اور روایت حدیث (حدیث کی روایت کرنا) دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ان کو ایک دوسرے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا قیاس، قیاس معنی الفارق ہے جو تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

مثال کے طور پر کوئی حدیث ایک معتبر راوی (خبر واحد) سے بھی صحیح ثابت ہو جاتی ہے اور وہ قابل قبول اور جست ہوتی ہے مگر جس معاملے میں شریعت نے دو گواہوں کا نصاب مقرر کیا ہے وہاں کسی ایک معتبر گواہ (خواہ وہ صحابی ہی کیوں نہ ہو) کی گواہی قابل قبول نہیں اور نہ اس کی بیاناد پر کوئی فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

دوسرے روایت حدیث میں سنی ہوئی بات (سامع) بھی معتبر ہوتی ہے جب کہ شہادت یا گواہی میں سنی سنائی بات کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔

(5) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر عورت کی گواہی نہ ہوگی تو معاشرے میں جرام بڑھیں گے۔ مگر ایسے لوگ اس سوال کا کیا جواب دیں گے کہ جن ملکوں میں عورت اور مرد کی گواہی برابر ہے وہاں جرام کی شرح ان ملکوں سے زیادہ کیوں ہے جہاں عورت کی گواہی مردوں سے کم ہے۔ اس سلسلے میں امریکہ اور سعودی عرب کی مثال سامنے رکھ کر دیکھا جاسکتا ہے۔ امریکہ میں جرام کی شرح خوفناک حد تک زیادہ ہے جب کہ سعودی عرب میں جرام انتہائی کم ہے۔

﴿وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَى سَفَرٍ وَّ لَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَإِنَّهُ مَقْبُوضَةٌ﴾ (283)

قرض کے بعد اب رہن یا گروپ (PLEDGE) رکھنے کا ذکر ہے۔ اگر قرض کا لین دین کرنے والے افراد سفر پر ہوں اور قرض کی تحریر یا دستاویز لکھنے والا کوئی کاتب وہاں موجود نہ ہو تو قرض دینے والے کے لیے جائز ہے کہ وہ قرض لینے والے سے کوئی چیز ضمانت کے طور پر اپنے پاس رہن رکھ کر اسے قرض دے دے۔ پھر جب مقرض اپنا قرض ادا کرے تو اس کی رہن شدہ چیز اسے واپس لوٹا دی جائے۔

اس رہن کے لیے جمہور فقہا کے نزدیک شرط یہ ہے کہ وہ باقسط ہو جیسا کہ قرآن کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ لیکن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں رہن کے باقسط ہونے کی شرط نہیں ہے اور بغیر قسطہ کرائے بھی رہن ہو سکتا ہے۔

﴿فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلَا يُؤْكِدُ الَّذِي أُؤْثِمَ أَمَانَتَهُ وَ لَيْقَنِ اللَّهُ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾

(283)

پھر اگر فریقین کو باہمی اعتماد ہو، یا حسن نظر سے کام لیا جائے تو کوئی چیز رہن رکھنے کی ضرورت نہیں ہے اور بغیر رہن رکھنے قرض دیا جاسکتا ہے۔ لیکن قرض لینے والے کو وہ قرض بعد میں وقت پر واپس کر دینا چاہیے کیونکہ قرض بھی ایک طرح کی امانت ہے جو اس کے حق دار کو لوٹانی ضروری ہے۔ اس امانت میں کسی طرح کی خیانت یا کمی کو تباہی نہیں ہونی

چاہیے۔ اپنے رب اللہ سے ذرتے ہوئے پورا قرض ادا کرنا چاہیے کیونکہ جس طرح اُس پر اعتماد کیا گیا اور اُسے بغیر تحریر اور گواہوں کی ضمانت کے قرض دیا گیا تھا، تو اب اُسے بھی دوسرا کے اعتماد پر پورا اُترنا چاہیے۔ شیطان کے وسوں میں آ کر بے ایمانی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اللہ سب سے بڑا گواہ ہے اور اُس سے ہر حال میں ڈرنا چاہیے۔

اس مقام پر قرض کو امانت اس لیے کہا گیا کہ بغیر کوئی چیز، ہم رکھے جو قرض دیا جاتا ہے اُس کی حیثیت بالکل ایک امانت کی ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں کے عرف میں بھی قرض کو امانت ہی سمجھا جاتا ہے۔

اس پر تمام فقہاء اور مفسرین کا اتفاق ہے کہ جس طرح سفر کی حالت میں رہن رکھنے کی اجازت ہے اسی طرح حضر اور مقیم ہونے کی حالت میں بھی اس کی اجازت ہے اور یہ تحریر اور گواہیوں کے قائم مقام اور ایک تبادل (ALTERNATE) چیز ہے کیونکہ اس کی دلیل وہ متفق علیہ حدیث ہے جس کو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مقیم ہوتے ہوئے بھی ایک یہودی سے کچھ عرصے کے لیے غلام ادھار لیا تو اپنی لو ہے کی ایک زرہ اُس کے پاس گروی (رہن) رکھی۔

(صحیح بخاری، رقم: 2068، 4467، صحيح مسلم، رقم: 4115، نسائی، رقم: 4609، ترمذی، رقم: 1214، ابن ماجہ، رقم: 2436)

البتہ مجاہد رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے کہ وہ رہن کو صرف سفر کی حالت میں جائز سمجھتے تھے گر اُن کا یہ قول شاذ ہے اس لیے قبل قبول نہیں ہو سکتا۔

اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ غیر مسلموں سے تجارت، خرید و فروخت اور لین دین جائز ہے۔ غالباً اس کی دلیل بھی مذکورہ حدیث ہی ہے۔

﴿وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۖ وَ مَنْ يَكْتُمُهَا فَإِنَّهُ أَثِمٌ قَلْبُهُ﴾ (283)

پھر فرمایا: وَ لَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ کہ گواہی نہ چھپاؤ۔ اس مکملے کا تعلق اوپر کے فقرے وَ لَا يَأْبَ الشَّهَادَاءِ إِذَا مَا دُعُوا (اور جب گواہوں کو بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں) سے ہے۔ مراد یہ ہے کہ نہ تو گواہوں کو گواہی دینے سے انکار کرنا چاہیے اور نہ گواہی سے متعلق کوئی بات چھپائی چاہیے، بلکہ ثیک ثیک گواہی دینی چاہیے۔ ایسا کرنا اُن پر واجب اور ضروری ہے۔

آگے فرمایا: لیکن اگر وہ گواہی نہیں دیں گے، یا گواہی میں سے کوئی بات چھپائیں گے تو جس طرح ہاتھ اور زبان کے افعال کے ذریعے گناہ ہوتے ہیں، اسی طرح اُن کے دل بھی بد نیتی، حسد، یا بغض جیسی خرابیوں کی وجہ سے سخت گناہ کا رہ جائیں گے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ نے کان، آنکھ، زبان اور دل سب کا حساب لینا ہے۔

﴿إِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُوَادَ كُلُّ أُولَئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْؤُلًا﴾ (بنی اسرائیل 17:36)

”بے شک کان، آنکھ اور دل سب کے بارے میں باز پُرس ہو گی۔“

یاد رہے کہ اسلامی شریعت میں لوگوں کے باہمی معاملات کے فیصلوں کا زیادہ تر دار و مدار گواہوں کی شہادت پر ہوتا ہے کہ وہ صحیح ہو ورنہ لوگوں کے حقوق شائع ہونے کا اندازہ ہے۔

﴿وَاللَّهُ يِمَا تَعْمَلُونَ عَلَيْمٌ﴾ (283)

آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو جانتا ہے۔ تم اگر ایک دوسرے کی حق تلفی کرو گے، صحیح گواہی نہ دو گے، اور اللہ تعالیٰ کے دوسرے احکام کی پابندی نہیں کرو گے تو پھر تمہارے یہ گناہ اور نافرمانیاں اللہ تعالیٰ کی نظر وہ سچے نہیں سکتیں اور وہ اس پر تمہیں سزا دے گا۔

ہمارے زمانے کے بعض لوگ جن کو قرآن کی تفسیر میں حدیث و سنت کی تشریح لینے سے چڑھے ہیں، اس آیت کی درج ذیل تاویل کرتے ہیں:

- 1۔ صرف سفر کے دوران ہی قرض کی ضمانت کے طور پر کوئی چیز رہن رکھنی چاہیے اور حضرو قیام میں رہن جائز نہیں۔
- 2۔ صحیح حدیث میں نبی ﷺ نے غله ادھار لینے کے لیے جو اپنی زرہ ایک یہودی کے پاس رہن رکھی تھی وہ آپ ﷺ کی شدید مجبوری اور اضطرار تھا کیونکہ وہ یہودی رہن لیے بغیر غله ادھار دینے پر تیار نہ تھا۔
- 3۔ قرض دینے والا سفر ختم ہوتے ہی رہن شدہ چیز واپس اُس شخص کو لوٹانے گا جس سے لی گئی تھی اور آیت میں اسی رہن کی چیز کو امانت کہا گیا ہے کیونکہ ”اسلامی اخوت و مردوں“ کا یہی تقاضا ہے۔

اب ہم ان تینوں دعوؤں کا شریش وار جائزہ لیتے ہیں:

1۔ جہاں تک قرض کی ضمانت کے طور پر رہن رکھنے کا تعلق ہے، تمام فقهاء اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ جس طرح سفر میں یہ جائز ہے اسی طرح حضرو قیام میں بھی جائز ہے اور یہ ضرورت کے وقت قرض کی تحریر اور گواہوں کی عدم موجودگی میں ایک متبادل (ALTERNATE) صورت ہے۔ کیونکہ اس کا ثبوت اُس متفق علیہ حدیث سے ہو جاتا ہے جس کا ہم نے ابھی اوپر حوالہ دیا ہے اور جس میں نبی ﷺ نے ایک یہودی سے کچھ غله ادھار لینے کے بدله میں اپنی زرہ رہن رکھی تھی۔ کیونکہ سنت نے قرآن کے اس حکم کی تشریح کر دی ہے، بالکل اُسی طرح جس طرح سنت نے ہر قسم کے پر امن سفر میں بھی نماز قصر کرنے کی اجازت دی ہے جب کہ قرآن میں یہ اجازت صرف ایسے سفر کے لیے تھی جس میں دشمن کا خوف ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَقْتِنُكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا أَطْ إِنَّ الْكُفَّارِ إِنَّهُمْ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِينًا﴾ (النساء: 4: 101)
”اور جب تم زمین میں سفر کردا اور تمہیں خوف ہو کہ کافر تھیں ستائیں گے تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم نماز میں قصر کر لیا کرو۔ بے شک کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں۔“

قرآنی آیت کی غلط تاویل کرنے کے بعد ان لوگوں نے اس متفق علیہ حدیث کی بھی بھوئی تاویل کر دی کہ معاملہ

چونکہ ایک یہودی سے تھا اس لیے نبی ﷺ کو غلہ ادھالینے کے لیے "شدید مجبوری اور احتصار" کی حالت میں اپنی زرہ اُس کے پاس گردی کھنی پڑی۔ حالانکہ یہ ایک عام ضرورت تھی جسے اپنی طرف سے "شدید مجبوری اور احتصار" بنا دیا گیا ہے جس کا کوئی ثبوت مذکورہ حدیث میں نہیں ملتا۔

یہودی سے ادھار کا معاملہ کرنے میں کمی حکمتیں تھیں، جیسے:

(1) اگر حضور ﷺ اپنے کسی صحابی سے قرض لیتے تو وہ عقیدت کی بنا پر غلے کی صحیح قیمت نہ لگاتا اور اسے بظاہر مالی نقصان پہنچ جاتا جو حضور ﷺ کو گوارانہ تھا۔

(2) کسی مسلمان کی طرف سے دیا گیا قرض آپ ﷺ کو معاف بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کیونکہ اس طرح اس کی حیثیت ایک صدقے کی ہو جاتی اور صدقہ حضور ﷺ کے لیے جائز نہ تھا۔

(3) اپنے اس عمل کے ذریعے نبی ﷺ اس بات کا جواز فراہم کرنا چاہتے تھے کہ غیر مسلموں سے بھی تجارت، خرید و فروخت اور مالی لین دین ہو سکتا ہے جب کہ صرف قرآن سے اس چیز کا جواز ثابت نہیں ہو سکتا۔

2۔ اگر یہی بات ہوتی کہ قرض دینے والا شخص سفر ختم ہو جانے کے بعد رہن شدہ چیز اُس آدمی کو واپس کر دے جس سے اُس نے لی ہے تو اس کے لیے آیت کی عبارت میں فَإِذَا (پھر جب) آتا اور فَإِنْ (پھر اگر) نہ آتا۔

3۔ دوسرے رہن کی چیز کو "امانت" کہنے کی سرے سے کوئی ضرورت نہ تھی۔ رہن تو ہوتا ہی امانت ہے اسے امانت کہنا تو تحصیل حاصل ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ قرض کا جو معاملہ بغیر کسی تحریر اور گواہوں کے کیا جائے گا اُس کی نوعیت بالکل ایک امانت کی ہو جائے گی۔ اس لیے آیت میں اسے امانت کہا گیا ہے اور اسے ادا کرنے کی غیر معمولی تاکید آتی ہے کہ:

﴿فَيَتَّقِيَ اللَّهُ رَبَّهُ﴾ (پس وہ اللہ سے ڈرے جو اُس کا رب ہے۔) ورنہ صرف رہن کی "امانت" ادا کرنے کے لیے اتنی سخت تاکید کی ضرورت نہ تھی۔ رہا قرض تو یہ بھی امانت ہوتی ہے اور اس جگہ یہی مراد ہے ہمارے ہاں کے عرف میں بھی اسے امانت تصور کیا جاتا ہے لیکن کیا کیا جائے مذکورین حدیث کی منطق اس کو گوار نہیں کرتی کہ قرض کو امانت کہا جائے۔

4۔ پھر اگر قرض دینے والے شخص کو سفر ختم ہونے کے بعد بغیر قرض وصول کیے رہن کی چیز بھی واپس کر دینے کا پابند بنایا جائے تو اس بیچارے کے پاس اپنے قرض دینے کا کیا ثبوت باقی رہ جائے گا اور اگر قرض لینے والا اس معاملے سے انکار کر دے تو دنیا کی کوئی عدالت قرض دینے والے کو اُس کے قرض کی رقم دلا سکے گی۔

باقی رہی قرض کے لین دین میں "اسلامی اخوت و مروءۃ" کی دہائی، تو خود قرآن نے اسے تحریر میں لا کر اور اس پر دو گواہوں کی شہادت ہونے کا حکم دے کر اسے غیر موثر (INEFFECTIVE) کر دیا ہے۔ اور خود ہمارے موجودہ معاشرے میں بھی لکھ جیزہ کا میزہ غرق ہو چکا ہے۔

تُخْفُوهُ يُحَاسِبُكُمْ بِهِ اللّٰهُ فَيَعْفُرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ

يَشَاءُ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٨٣﴾

”جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے سب اللہ کا ہے۔ تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے اسے تم ظاہر کرو، یا چھپاؤ، اللہ تم سے اس کا حساب لے گا۔ پھر جسے وہ چاہے گا بخشنے گا اور جسے چاہے گا سزا دے گا۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“ (284)

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی تفسیر:

﴿اللّٰهُ مَا فِي السَّمَاوٰتِ وَ مَا فِي الْأَرْضِ﴾ (284)

فرمایا: اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین، پوری کائنات کا خالق، مالک اور اس میں تصرف کا اختیار رکھنے والا ہے۔ یہ کویا اس سے پہلی آیت کے فقرے ﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَعْمَلُونَ عَلَيْهِمْ﴾ (اور اللہ تمہارے اعمال کو جانتا ہے) کی وضاحت ہو گئی کہ جو خالق ہے وہی مالک ہے اور وہ اپنی ہر چیز پر پورا تصرف رکھتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿الَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ طَ﴾

”کیا وہ نہ جانے لگا جس نے پیدا کیا ہے۔“

﴿وَإِنْ تُبَدِّدُوا مَا فِي أَنفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبُكُمْ بِهِ اللّٰهُ فَيَعْفُرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ مِنْ يَشَاءُ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ (284)

اوپر اللہ سبحانہ کی جن صفات کا ذکر ہوا اُن کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ تم لوگ اپنے دل کی بات کو ظاہر کرو یا اسے چھپاؤ، دونوں صورتوں میں اللہ تم سے حساب لے گا اور تمہارے کاموں کا بدل دے گا۔ پھر جسے چاہے گا اپنے نصل و رحمت سے بخش دے گا اور جسے چاہے گا عدل و انصاف کے ساتھ سزا دے گا۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

لیکن یاد رہے برائی کر لینے پر تو پکڑ ہو گی مگر محض اس کی نیت یا ارادہ کرنے پر کوئی پکڑنا ہو گی۔ اس لیے جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہر بے کام کے ارادے پر بھی پکڑ ہو گی تو ان کی یہ رائے ایک متفق علیہ حدیث کے خلاف ہے جس میں یہ واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ نہ صرف یہ کہ برائی کا ارادہ کرنے پر پکڑنا ہو گی بلکہ اُس برائی کو نہ کرنے پر ایک نیکی بھی ملے گی:

((عَنْ أَبْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيمَا يَرُوُنْ عَنْ رَبِّهِ

عَزَّ وَجَلَّ، قَالَ، قَالَ إِنَّ اللَّهَ كَتَبَ الْحَسَنَاتِ وَالسَّيَّئَاتِ ثُمَّ بَيْنَ ذَلِكَ فَمَنْ هُمْ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللَّهُ لَهُ عِنْدَهُ حَسَنَةٌ كَامِلَةٌ، فَإِنْ هُوَ هُمْ بِهَا فَعَمِلُهَا كَتَبَهَا اللَّهُ لَهُ عِنْدَهُ عَشْرَ حَسَنَاتٍ إِلَى سَبْعِ مائَةٍ ضَعْفٍ إِلَى أَضْعَافٍ كَثِيرَةٍ، وَمَنْ هُمْ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللَّهُ لَهُ عِنْدَهُ حَسَنَةٌ كَامِلَةٌ فَإِنْ هُوَ هُمْ بِهَا فَعَمِلُهَا كَتَبَهَا اللَّهُ لَهُ سَيِّئَةً وَاحِدَةً))

(صحیح بخاری، رقم: 6491، صحیح مسلم، حدیث: 338)

”سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ عز و جل فرماتا ہے: اللہ تعالیٰ نے نیکیاں اور برائیاں لکھنے کا حکم دیا۔ پھر ان کو واضح فرمادیا۔ اب جو شخص کسی نیکی کا ارادہ کرتا ہے اسے کرنہیں پاتا تو اللہ اس کے لیے پوری نیکی کا ثواب لکھ دیتا ہے۔ اگر وہ اس نیکی کا ارادہ کرنے کے بعد اسے کر لیتا ہے تو اللہ اس کے لیے دس (10) نیکیوں سے لے کرسات سو (700) نیکیوں تک ثواب لکھ دیتا ہے۔ اور جو شخص کسی برائی کا ارادہ کرتا ہے اور اسے کرتا نہیں تو اللہ اس کے اعمال نامے میں ایک نیکی لکھ دیتا ہے۔ اور اگر وہ ارادہ کر کے برائی کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے نامہ اعمال میں صرف ایک ہی برائی لکھتا ہے۔“

ابتدئ بعض امور ایسے ہیں جن کا تعلق صرف دل کے ساتھ ہے اس لیے اُن پر گرفت ہو گی جیسے اللہ تعالیٰ یادینِ اسلام کے بارے میں شکر میں بتلا ہونا، منافقت، ریا کاری، حسد، دین کے کسی حکم کو جھلانا اور گواہی کو چھپانا وغیرہ۔ بعض روایات میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام بہت غمگین ہوئے کہ اگر ہمارے دل میں گناہ کا خیال آنے پر بھی پکڑ ہو گی تو پھر معلوم نہیں ہماری بخشش ہو گی یا نہیں۔ کیونکہ دل میں خیالات اور سو سے آنے پر ہمارا اختیار نہیں۔ پھر انہیوں نے اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی تو حضور ﷺ نے فرمایا:

کیا تم اہل کتاب کی طرح یہ کہنا چاہتے ہو کہ ”سَيَغْنَا وَعَصَيْنَا“ (ہم نے سنا اور ہم نے نہ مانا) بلکہ تمہیں کہنا چاہیے ”سَيَغْنَا وَأَطْعَنَا“ (ہم نے سنا اور ہم نے مانا)۔

پھر صحابہ کرام نے جب یہی بات کہی تو آگے کی دونوں آیات نازل ہوئیں اور ان کے الفاظ ”لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا“ (اللہ کسی جان پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ذاتا) نے مذکورہ آیت 284 کے حکم کو منسوخ کر دیا۔ گویا دل میں آنے والے خیالات اور سو سوں کا حساب نہیں ہوگا۔ وہ سب معاف ہیں۔ اس پر صحابہ کرام کے دلوں کو طمینان حاصل ہو گیا۔

(صحیح بخاری، رقم: 2528، صحیح مسلم، رقم: 332، ترمذی، رقم: 2992,1183)

أَمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلُّ أَمَنَ بِإِلَهِهِ
وَمَلِكِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ وَقَالُوا
سَمِعْنَا وَأَطْعَنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ ﴿٢٨٠﴾ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ
نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا
تُؤْخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا
حَمَلْنَا عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحْمِلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا
بِهِ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَرَحْمَةً أَنْتَ مَوْلَنَا فَانْصُرْنَا

عَلَى الْقُوْمِ الْكُفَّارِ ﴿٢٨١﴾

بِعَ

”اللَّهُ كَارِسُ الْأَرضَ“ اس کلام پر ایمان رکھتا ہے جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل ہوا۔ مسلمان بھی اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ سب ایمان رکھتے ہیں اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اور اس کے رسولوں پر اور رکھتے ہیں: ہم کسی رسول کا انکار نہیں کرتے۔ ہم نے تیرا حکم سننا اور مانا۔ اے ہمارے رب! ہم تجھ سے بخشش چاہتے ہیں! آخر تیرے پاس جانا ہے۔ اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ جو نیکی کرے گا اجر پائے گا، جو برائی کرے گا اسے بھلگتے گا۔

ایمان والے دعا کرتے ہیں: اے ہمارے رب ہم سے بھول ہو جائے، یا ہم غلطی کر بیٹھیں تو ہمیں نہ پکڑ! اے ہمارے رب! جو لوگ ہم سے پہلے ہو گزرے، ان کے گناہوں کی وجہ سے جس طرح تو نے ان پر سخت احکام کا بوجھ ڈالا، وہ بوجھ ہم پر نہ ڈال۔ اے ہمارے رب! جو بوجھ ہم اٹھانہیں سکتے، وہ ہم سے نہ آٹھوا! ہماری کوتا ہیوں سے درگز رفرما! ہمارے گناہ بخش دے! ہمارے حال پر رحم فرماء! تو ہی ہمارا کار ساز ہے۔ کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرماء!“ (285-286)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

لَا نُفَرِّقُ:..... اس کی وضاحت البقرہ آیت 136 میں کی جا چکی ہے۔

سَمِعْنَا:..... اس سے صرف سننا مراد نہیں ہے بلکہ غور سے سننا، سمجھنا اور ماننا مراد ہے۔

لَا يُكَلِّفُ:..... ”تکلیف“ کے معنی کسی پر ایسی ذمہ داری ڈالنے کے ہیں جس میں کچھ محنت درکار ہو۔

وُسْعَ:..... ایسی قوت جس سے کوئی کام آسانی سے کیا جاسکے اور اس میں کوئی پیشگوی یا خخت مشقت نہ اٹھانی پڑے۔

إِنْكَسْبَتْ:..... یہ اگتساب سے ہے جس کے معنی ہیں زیادہ محنت اور تنگ و دو سے کوئی کام کرنا۔ اس کے

برخلاف کسب کے معنی ہیں معمولی محنت سے کوئی کام کر لینا۔ البتہ اس مقام پر کسب سے نیکی کرنا اور إِنْكَسْبَتْ سے برائی کرنا مراد ہے۔

لَا تُواخِذُنَا:..... یہ مواخذہ سے ہے جس کے معنی ہیں مُعَاقَبَةٌ یعنی خختی سے احتساب کرنا اور سزا دینا۔

لَا طَاقَةَ:..... ”طاقة“ کے معنی ایسی کم قوت کے ہیں جس سے کوئی کام سخت وقت اور مشقت کے بعد کیا جاسکے۔

إِصْرًا:..... اس کے اصل معنی عہد اور ذمہ داری کے ہیں لیکن اس جگہ اس سے مراد بھاری بوجھ ہے۔

إِصْرٌ عَهْدٌ اَوْ ذَمَّةٌ دَارِيٌّ کے معنوں میں اس مقام پر آیا ہے:

(آل عمران ۳: ۸۱) ﴿فَالَّذِي أَقْرَرْتُمْ وَأَخْذَتُمْ عَلَى ذِلِّكُمْ إِصْرٌ﴾

”فرمایا: کیا تم نے اس کا اقرار کیا اور تم نے اس عہد کی ذمہ داری قبول کی۔“

اس کے علاوہ إِصْرًا کا الفاظ بھاری بوجھ کے معنوں میں درج ذیل آیت میں استعمال ہوا ہے:

(الاعراف ۷: ۱۵۷) ﴿وَيَضْعُ عَنْهُمْ إِصْرُهُمْ وَالْأَعْلَلُ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾

”اور وہ (رسول) ان پر سے (جاہلیت کے) بھاری بوجھ اور طوق ہٹاتا ہے۔“

مَوْلَنَا:..... اس کے معنی ہیں: ہمارے آقا، مالک اور منتظم۔

﴿أَمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ لُكْلُ أَمَنَ بِاللَّهِ وَمَلِكَتْهُ

وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ رُسُلِهِ﴾ (285)

فرمایا: رب کی طرف سے نازل شدہ اس قرآن پر رسول اللہ ﷺ اور سارے مسلمان ایمان رکھتے اور اسے مانتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح اللہ تعالیٰ کے قانون اور احکام کے مکلف

اور پابند تھے۔ آپ ﷺ دنیا کے دوسرے باشہوں کی طرح نہ تھے جو رعایا کو قانون دیتے ہیں مگر خود قانون سے بالاتر

ہوتے ہیں۔

پھر فرمایا: تمام مسلمان اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے تمام رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں اور

کہتے ہیں کہ: ہم کسی ایک رسول کا بھی انکار نہیں کرتے، بلکہ سب کو مانتے ہیں۔

اس میں ان اہل کتاب پر مسلمانوں کی فضیلت کی طرف اشارہ ہے جو اللہ کے بعض رسولوں کو مانتے اور بعض کا

انکار کرتے تھے اور کہتے تھے:

﴿نُؤْمِنُ بِعَيْنِنَا وَنَكُفَّرُ بِبَعْضِهِ﴾ (الستاء: ۴) (250)

”ہم بعض (رساولوں) کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے۔“

﴿وَقَاتُلُوا سَيِّدَنَا وَأَطْعُنَا أَعْفُرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمُصَبِّرُ﴾ (285)

مطلوب یہ ہے کہ اہل ایمان کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم نے تیرا حکم سننا اور اسے مانا۔ پھر اس سمع و طاعت میں ہم سے جو کسی کوتا ہی ہو جائے، اس پر ہم تجھ سے معافی مانگتے اور بخشش چاہتے ہیں۔ آخر ہمیں تیرے پاس ہی جانا ہے اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔

﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ (286)

فرمایا: اللہ تعالیٰ کسی جان پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ اُس پر اتنی ہی ذمہ داری کا بوجھ ہے جتنا وہ اٹھا سکتا ہے۔ کیونکہ دین میں کوئی شکنی نہیں ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (الحج: 22) (78:22)

”اور اُس (اللہ) نے دین کے معاملے میں تم پر کوئی شکنی نہیں رکھی۔“

پھر یہی مضمون، کہ اللہ سبحانہ کسی جان پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا، قرآن نے کئی اور مقامات پر بھی بیان کیا ہے جیسے:

﴿لَا تُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾

”کسی جان پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا جاتا۔“

﴿لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾

”ہم کسی جان پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے۔“

﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا أَكْتَسَبَتْ﴾ (286)

جو شخص کوئی نیکی کرے گا اُس کا اجر پائے گا اور جو برائی کرے گا اُسے بھلکتے گا۔

اس جگہ نیکی کے لیے کسبت اور برائی کے لیے اکتسابت کے الفاظ آئے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ نیکی انسان کی فطرت میں ہے اور اسے وہ آسانی سے کر سکتا ہے۔ گویا نیکی اور انسانی فطرت میں موافقت اور مطابقت ہے جیسے بولنا۔ اس لیے اس کے لیے کسبت کا لفظ آیا۔ جب کہ برائی ایک غیر فطری چیز ہے جس کے ساتھ انسانی فطرت کو مناسبت نہیں ہے۔ اس لیے اس کے کرنے میں تکلف، تصنیع اور مشقت ہے جیسے جھوٹ بولنا۔ لہذا اس کے لیے اکتسابت کا لفظ استعمال ہوا۔

یاد رہے قرآن کے اس اسلوب میں نیکی کی ترغیب اور برائی سے بچنے کا اشارہ بھی ملتا ہے۔

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِيْنَا أَوْ أَخْطَأْنَا﴾ (286)

یہ اہل ایمان کی دعا ہے جو اور پر آیت 285 سے شروع ہوئی تھی۔ درمیان میں جملہ مفترضہ لا یکفُ اللہ نَفْسًا إِلَّا وَسُعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكتَسَبَتْ (اللہ کسی پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ جو نیکی کرے گا اجر پائے گا، جو برائی کرے گا اُسے بھگتے گا)۔ آگیا اور اب وہی دعا پھر سے شروع ہو رہی ہے کہ اے ہمارے رب! تیرے کسی حکم کی سمع و طاعت میں احتیاط کے باوجود اگر ہم سے کوئی بھول چوک ہو جائے تو اُسے معاف کر دینا اور اس پر گرفت نہ کرنا۔ ہماری کسی ایسی خطہ اور غلطی سے بھی درگز فرماجس میں ہمارا کوئی ارادہ، ہماری کوئی بے احتیاطی اور لا پرواہی شامل ہو۔

ایک صحیح حدیث میں ہے جسے سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ اللَّهَ تَجَاؤزَ عَنْ أَمْتَنِ الْخَطَا وَالْتَّسْيَانِ وَمَا اسْتُكْرِهُوا عَلَيْهِ))

(ابن ماجہ، رقم: 2043، مشکوہ، رقم: 6293)

”بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت کی خطہ (بے ارادہ غلطی)، نیسان (بھول چوک) اور اکراہ (جان کے خطرے کی مجبوری) سے کیے گئے کاموں کو معاف کر دیا۔“

لیکن یاد رہے اس خطہ، غلطی اور بھول چوک کے معاف ہونے کا تعلق آخرت سے ہے لیکن دنیا میں اگر ہماری بھول چوک یا خطہ اور غلطی سے کسی کا حق تلف ہو جائے تو اس پر ضمان (PENALTY) یا جرمانہ یا سزا ہوگی۔ جیسے کسی نے خکار کے جانور پر گولی چلائی اور وہ گولی کسی انسان کو جاگی تو قتل خطہ ہے اور یہ جرم ہے جس پر دیت کی سزا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِيُؤْمِنُ أَنْ يَئْتُلُ مُؤْمِنًا إِلَّا حَطَّةً وَ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا حَطَّةً فَتَحْرِيرُ رَقْبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَ دِيَةٌ مُسْلِمَةٌ إِلَى أَهْلِهِ إِلَّا أَنْ يَصْدَقُوا طَاطِهِ﴾ (النساء: 4:92)

”اور کسی مسلمان کا کام نہیں کہ وہ دوسرا مسلمان کو قتل کرے مگر یہ غلطی اور خطہ سے ایسا ہو جائے۔ جو کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کر دے، اُسے چاہیے ایک مسلمان غلام آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو خون بہا ادا کرے۔ البتہ مقتول کے وارث خون بہا معاف بھی کر سکتے ہیں۔“

﴿رَبَّنَا وَ لَا تَحْمِلْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْنَا عَلَى النَّذِينَ مَنْ قَبْلِنَا﴾ (286)

اہل ایمان دعا کرتے ہیں اے ہمارے رب! ہم پر سخت احکام کا وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے پہلی قوموں پر ان کی سرکشی کی وجہ سے ڈالا تھا۔ جیسے بنی اسرائیل کے لیے حکم تھا کہ جس کپڑے پر گندگی یا نجاست لگ جائے تو اُس کا اتنا ٹکڑا اپھاڑ کر الگ کر دیا جائے ورنہ وہ کپڑا پاک نہ ہوگا۔ یا جیسے ان کے لیے زکوہ کی شرح 25% تھی۔ یا جیسے ان کے لیے حلال جانوروں کی چربی کا استعمال حرام تھا، وغیرہ۔

﴿رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ﴾ (286)

اے ہمارے رب! ہم سے وہ بوجہ نہ اٹھوا جس کے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں۔ ہمیں ایسے احکام کا مکلف اور پابند نہ بنا جن کی پابندی کرنا ہمارے بس میں نہیں۔ ہمیں ایسی آزمائشوں، امتحانوں، حدائق اور مصائب سے چا جو ہمارے لیے ناقابل برداشت ہوں۔

گویا ہم تیری اس عذایت اور بشارت پر تیری نعمت کا شکر ادا کرتے ہیں جو تو نے یہ فرمایا ہے کہ:

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (الحج 78:22)

”اور اس (اللہ) نے دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔“

﴿وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلَنَا فَإِنَّا نَعْلَمُ الْقَوْمَ الْكُفَّارِ﴾ (286)

اے ہمارے رب! ہمیں معاف کر دے، ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرم۔ تو ہی ہمارا مالک اور کارساز ہے جس نے ہمیں ایمان اور ہدایت کی توفیق دی۔ کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرمادی! دعوت و تبلیغ کے میدان میں دلائل کے ذریعے اور جہاد و قول کے معمر کے میں فتح و کامیابی کے ساتھ!

ایک اثر میں ہے کہ:

((إِنَّ هَذِهِ الْأُمَّةَ لَا تُغْلِبُ مِنْ قِلَّةٍ .))

”یہ امت مسلم تھوڑی تعداد میں ہونے کے باوجود کبھی مغلوب نہ ہوگی۔“

اوپر کی اس دعا میں تین باتیں تین باتوں کے مقابل میں ایک خاص ترتیب سے آئی ہیں:

(1) لَا تُؤَاخِذْنَا (تو ہمیں نہ پکڑنا) کے مقابل میں وَأَغْفُ عَنَّا (ہمیں معاف کر دے) ہے۔

(2) وَلَا تَعْهِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا (اور ہم پر بوجہ نہ ڈالنا) کے مقابل میں وَأَغْفِرْ لَنَا (اور تو ہمیں بخش دے)

آیا ہے۔

(3) وَلَا تُحِيلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ (اور ہم سے وہ بوجہ نہ اٹھوا جو ہم اٹھانہیں سکتے) کے مقابل میں وَأَرْحَمْنَا (اور ہم پر رحم فرم) ہے۔

ضروری ہے کہ یہ دعائیں زبان ہلانے تک محدود نہ رہے بلکہ دل سے نکلے اور اس میں اخلاص ہو، خشوع و خضوع ہو، گریہ زاری ہو اور اس کی قبولیت کا یقین ہو۔

صحیح مسلم میں حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِذَا دَعَ أَحَدُكُمْ فَلْيَعْزِمْ فِي الدُّعَاءِ، وَلَا يَقُلْ: اللَّهُمَّ إِنِ شِئْتَ فَأَعْطِنِيْ، فَإِنَّ اللَّهَ لَا مُسْتَكْرِهَ لَهُ))

(صحیح مسلم، رقم: 6812)

”تم میں سے جب کوئی دعا مالک تو پورے یقین کے ساتھ مانگے، اور یوں نہ کہے کہ اے اللہ! اگر تو چاہے تو

مجھے دے..... کیونکہ اللہ تعالیٰ کو کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔“

ایک تفہیق علیہ حدیث میں ہے کہ:

((لَا يَقُلُّ أَحَدُكُمْ: إِلَهُمَ اغْفِرْلِي إِنْ شِئْتَ، إِرْحَمْنِي إِنْ شِئْتَ، ارْزُقْنِي إِنْ شِئْتَ، وَالْعَزِيزُ مَسْئَلَتَهُ، إِنَّهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ، وَلَا مُنْكِرَهُ لَهُ))

(صحیح بخاری، رقم: 7464,7477، صحیح مسلم، رقم: 6811,6813)

”تم میں سے کوئی یوں دعا نہ کرے کہ ”اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے بخش دے۔ یا اگر تو چاہے تو مجھ پر رحم کر۔ یا اگر تو چاہے تو مجھے روزی دے۔ بلکہ اسے چاہیے کہ پورے عزم اور یقین کے ساتھ دعا مانگ۔
بے شک اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، اسے کوئی مجبور کرنے والا نہیں۔“

صحیح حدیث میں سورہ البقرہ کی ان آخری دو آیتوں کی یہ فضیلت بیان ہوئی ہے کہ جو شخص رات کو سوتے وقت ان کو پڑھ لے تو یہ اس کے لیے کافی ہیں اور اسے اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد حاصل ہوگی۔ (صحیح بخاری، رقم: 5009)
سورہ البقرہ کا اختتام ایک جامع دعا پر ہوا ہے۔ ضروری ہے کہ اس کے مضمایں پر ایک تفصیلی نظر ڈال لی جائے۔
تمہیدی طور پر یہ سمجھ لیجیے کہ دعا اصل میں ایک پکار ہے جو کسی عاجز اور بے بس بندے کے دل و زبان سے نکلتی، اس کے رب تک پہنچتی اور اس کی رحمت کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔

دعا عبادات ہے:

جیسا کہ سورہ الفاتحہ کی تفسیر میں ہم لکھے ہیں کہ دعا ایک عبادت ہے بلکہ عبادت کا مغز ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دعا صرف اللہ تعالیٰ سے مانگی جاسکتی ہے کسی اور سے دعا کرنا شرک ہے۔

دعا بنیادی ضرورت ہے:

دعا انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ اگرچہ انسان اپنی عقل کے ذریعے بہت سے اسباب و وسائل سے کام لیتا اور اپنی ضرورتیں اور حاجتیں پوری کر لیتا ہے لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اسباب و وسائل یا توسرے سے ملتے ہی نہیں ہیں یا اگر مل جائیں تو ان سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوتے۔ ایسے حالات میں بندے کو اپنے خالق سے دعا کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے کیونکہ اس وقت وہ اپنے آپ کو بالکل بے بس اور لا چار پاتا ہے۔

دعا کے فائدے:

دعا سے ہمیں بہت سے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ دعا ہی ہے جو ہمیں سکون مہیا کرتی ہے۔ ہمیں بیماریوں اور خودکشی (Suicide) کرنے سے بچاتی ہے۔ ہمیں مشکل حالات میں حوصلہ دیتی اور ثابت قدمی عطا کرتی ہے۔ یہ بندے اور اس کے رب کے درمیان تعلق کو مغضوب کرتی اور قائم رکھتی ہے جس کے نتیجے میں انسان کے دل میں نیا جذبہ، تازہ حوصلہ اور جوش و ولولہ پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد کوئی مصیبت اس کے لیے مصیبت نہیں رہتی اور کوئی پریشانی

اُسے پریشان نہیں کر سکتی کیونکہ وہ بندہ اپنے رب کی رحمت کے سامنے میں آ جاتا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں دعا مانگنے کا حکم دیا ہے۔ (الاعراف ۵۵:۷) جو شخص اللہ تعالیٰ سے دعا نہیں کرتا اور اپنی حاجت اُس کے سامنے پیش نہیں کرتا، تو اللہ تعالیٰ اُس سے ناراض ہوتا ہے۔ یہ بات ایک صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ (ترمذی، رقم: 3373)

دعا کے آداب:

لیکن یاد رکھیے کہ ہر کام کی طرح دعا کے بھی کچھ خاص آداب ہیں جن کے ساتھ اگر دعا کی جائے تو وہ دعا قبول ہو جاتی ہے:

1. اپنے گناہوں سے توبہ و استغفار کرنا۔
2. صرف اللہ تعالیٰ سے مانگنا۔
3. دعا کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی حمد و شاکرنا اور پھر اپنی حاجت بیان کرنا۔
4. دعا سے پہلے اور بعد میں درود شریف پڑھنا۔
5. حلال روزی کھانا اور حرام روزی سے بچنا۔
6. پوری توجہ، وضیان اور اخلاص کے ساتھ دعا کرنا۔
7. اس عزم و یقین کے ساتھ دعا کرنا کہ میری دعا ضرور قبول ہو گی۔
8. عاجزی، انکساری اور گریز ایسی سے دعا کرنا۔
9. دعا کے وقت ہاتھ اٹھانا اور اللہ تعالیٰ کے آگے ہاتھ پھیلا کر سوالیوں کی طرح دعا مانگنا۔
10. آہستہ آواز سے چکے چکے دعا کرنا۔
11. قرآن و حدیث سے ثابت شدہ دعائیں مانگنا۔
12. خاص قبولیت کے اوقات میں دعا کرنا جیسے تہجد کے وقت، اذان کے وقت، مجمع کے ذلن، سفر کی حالت میں اور بارش کے وقت وغیرہ۔

اس دعا کی ترتیب:

سورہ البقرہ کی اس دعا میں سب سے پہلے ایمان لانے کا ذکر ہے۔ اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ دعا سے پہلے ایمان ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے اہل ایمان بندوں کی دعائیں قبول کرتا ہے۔

پھر ایمان کو ذرا وضاحت سے بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر، اُس کے فرشتوں پر، اُس کی کتابیوں پر، اُس کے تمام نبیوں اور رسولوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ان سب پر ایمان لانے سے ایمان کامل ہوتا ہے ورنہ ناقص اور نامکمل رہتا ہے۔ ایمان کے بعد سمع و طاعت کا ذکر ہے کہ بندہ اپنی دعا سے پہلے اللہ تعالیٰ اور اُس کے

رسول ﷺ کے ہر حکم کو مانتے اور اُس پر عمل کرنے کا اقرار کرتا ہے۔ اس طرح وہ اللہ کا ایک فرمان بردار اور اطاعت گزار بندہ بن کر اپنے رب سے دعا کرتا ہے۔

اس کے بعد غُفرانِکَ (هم تھے سے بخشش چاہتے ہیں) آیا ہے۔ کیونکہ انسان خطا کار ہے (To err is human) اس لیے وہ اللہ تعالیٰ سے اپنی خطاوں اور اپنے گناہوں کی بخشش چاہتا ہے۔ کیونکہ اُس کے سوا کوئی اور نہیں ہے جو گناہوں کو بخشتا ہو۔ پھر اس کے بعد آخرت کے عقیدے پر زور دیا گیا ہے کہ ایک دن ہم سب کو اپنے اعمال کے حساب کے لیے اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہونا ہے۔ اسی لکھرِ آخرت اور خوفِ آخرت کے جذبے سے یہ دعا کی جا رہی ہے۔ پھر اس دعا میں اللہ تعالیٰ کے ایک قانون کا ذکر ہے کہ وہ اپنے بندوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ اُن کو مشکل احکام کا پابند نہیں بناتا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہے۔

پھر اس کے بعد بندہ اپنے رب سے اپنے گناہوں سے جو غلطی اور بھول پھوک سے ہو گئے، اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتا ہے۔ پھر بندہ اپنے رب سے یہ دعا کرتا ہے کہ وہ اسے سخت احکام کا پابند بنانے کی بجائے آسان احکام اور سہل شریعت دے جس پر آسانی سے عمل ہو سکے۔

پہلی قوموں پر ان کی سرکشی اور نافرمانی کی وجہ سے اُن کے لیے جو سخت احکام دیے گئے تھے۔ اے اللہ! ہمیں اس طرح کے سخت حکموں کا پابند نہ بنانا۔

اس کے بعد اس دعا میں اللہ تعالیٰ سے گناہوں کی تفصیلی بخشش مانگی گئی ہے کہ وہ ہمارے ہر قسم کے چھوٹے اور صغیرہ گناہ معاف فرمادے۔ ہم اپنے بڑے اور کبیرہ گناہوں سے توبہ اور استغفار کرتے ہیں۔ ہمارا رب ان کو بھی بخش دے۔ ہر حال میں ہم پر رحم فرمائے۔ ہم پر اپنی برکتیں اور حمتیں نازل فرمائے۔ ہمیں ہر آفت اور مصیبت سے نجات دے۔ ہمیں دنیا اور آخرت کی ہر بھلاکی، سخت اور سعادت عطا فرمائے۔

سب سے آخر میں کافروں کے مقابلے میں فتح و نصرت کی دعا کی گئی ہے کیونکہ جس زمانے میں یہ سورت نازل ہوئی ہے اُس وقت اہل اسلام چاروں سے ایسے کفار و مشرکین میں گھرے ہوئے تھے جو اسلام کو مٹانے پر شے ہوئے تھے۔ جو آگے چل کر مسلمانوں پر جنگ بدر، جنگ احمد اور جنگ احزاب مسلط کرنے والے تھے۔ ان حالات میں مسلمانوں کو اس دعا کی شدید ضرورت تھی۔ آج بھی امت مسلمہ کفار کے نرغے میں ہے۔ غیر مسلم قومیں ہمیشہ کی طرح آج بھی مسلمانوں کا نام و نشان مٹانے پر کمر بستہ ہو بھی ہیں اور ہمیں جہاد کی تیاری کے ساتھ ساتھ اس دعا کی بھی سخت ضرورت ہے۔

((الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي بِنِعْمَتِهِ وَبِتَوْفِيقِهِ تَبَعَّمُ الصَّالِحَاتُ))

”شکر ہے اللہ کا جس کے فضل و احسان اور توفیق سے نیک کاموں کی تکمیل ہوتی ہے۔“

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى إِلٰهٖ وَ صَحِّبِهِ أَجْمَعِينَ.



فہرست مضمایں تفسیر البلاع (سورہ الفاتحہ تا سورہ البقرہ)

3	اصول ترجمہ و تفسیر	✿
10	تفسیر بالرائے سے کیا مراد ہے؟	✿
11	تفسیر بالرائے محمود	✿
11	تفسیر بالرائے نذموم	✿
11	تفسیر بالرائے نذموم کی بعض صورتیں	✿
15	کچھ اس کتاب کے بارے میں	✿

تفسیر بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

17	الفاظ کی تحقیق	✿
18	نظائر و شواہد (PRECEDENTS)	✿
19	تسمیہ اور قرآن	✿
19	تفسیر سے کام کے آغاز میں حکمتیں	✿

تفسیر سورہ الفاتحہ

21	اس کے مختلف نام	✿
21	زمانہ نزول	✿
22	مرکزی مضمون	✿
23	الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر	✿
23	حمد کے ایک معنی	✿
23	حمد کے دوسرے معنی	✿
24	رب کے معنی	✿
24	عالمین کے معنی	✿
25	خلاصہ مضمون	✿

25-----	آیات کی تفسیر
31-----	صراط مستقیم سے کیا مراد ہے؟
33-----	سورہ الفاتحہ کے فضائل
35-----	سورہ الفاتحہ کے مسائل و احکام
تفسیر سورہ البقرہ	
36-----	اس کا نام
36-----	زمانہ نزول
36-----	سورہ البقرہ کے فضائل
37-----	الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر
38-----	”حروف مقطعات“ کے معنی
38-----	ذلیک (وہ) کے معنی ہذا (یہ) کے بھی ہیں
38-----	الکتاب کا مطلب
39-----	لاریب فیہ کا معاملہ
39-----	لاریب فیہ کی وضاحت
39-----	ہڈی کے معنی
40-----	متقین سے کون لوگ مراد ہیں؟
40-----	کیا قرآن صرف متقین کے لیے ہدایت ہے؟
40-----	تقویٰ کے معنی
41-----	متقین کی پہلی صفت ایمان بالغیب
41-----	ایمان بالغیب اندھا ایمان نہیں ہوتا
42-----	متقین کی دوسری صفت نماز قائم کرنا
42-----	اقامت صلوٰۃ سے کیا مراد ہے؟
43-----	متقین کی تیسرا صفت اتفاق فی سبیل اللہ
43-----	اتفاق سے کیا مراد ہے؟
43-----	متقین کی یہ تینوں صفات اجمالی ہیں
44-----	آیت 3 کے مارے میں ایک عمدہ تفسیری قول

- یقین کے معنی 44
- آیت 4 میں حق پسند اہل کتاب کا ذکر ہے 44
- کفر کے لغوی اور اصطلاحی معنی 47
- آیت 6 میں قریش کے پکے کافروں کا ذکر ہے 49
- دل پر نہ رکنے سے کیا مراد ہے؟ 49
- اس بارے میں ایک حدیث 50
- آیت 8 میں جن منافقین کا ذکر ہے اُس سے عام اہل کتاب کے منافق لوگ مراد ہیں 52
- ایمان بالله اور ایمان بالآخرت سے کیا مراد ہے؟ 54
- فِيْ قُلُوبِهِمْ تَرَصُّدٌ كَامِلٌ 55
- فوادی الارض سے کیا مراد ہے؟ 56
- آیت 14 میں شیاطین سے مراد کفار و یہود کے سردار ہیں 57
- آیت 15 میں قرآن کا ایک اسلوب "مشکلہ" 58
- طغیان کے معنی 58
- یَعْنِهُونَ کے معنی 58
- عرب یہودیوں کی اکثریت نے اسلام قبول نہیں کیا تھا 59
- آیت 18 میں بلاغت کا ایک گونہ 59
- 'صَيْبَبٌ' کے معنی 60
- 'صَوَاعِقٌ' کے معنی 60
- آیت 19 میں بارش سے مراد اسلام کی دعوت ہے 60
- سب کا خالق ایک ہے تو معبود بھی ایک ہی ہے 62
- مشرکین عرب بھی اللہ کو خالق مانتے تھے 62
- 'بَعَاءُ' کے معنی 62
- 'أَنْدَادًا' کے معنی 62
- قرآن مجید کا چیخ 63
- اعجاز القرآن اور اُس کے مختلف پہلو 65
- 'آزَوَاجٌ مَطَهَّرٌ' کے معنی 69

69	جنت کی نعمتوں اور جنتیوں کے بارے میں احادیث
69	”منْ تَحْيِهَا الْأَنْهَرُ“ کا مطلب
72	ضرب اشل (مثال دینے) سے کیا مراد ہے؟
72	”فَاسْتَقِيمْ“ کے لغوی اور اصطلاحی معنی
73	فاسقین کی چند نشانیاں
74	خالق کا انکار ممکن نہیں ہے
75	شرک کرنا انسانیت کی توہین ہے
78	فرشتے محض و قسم نہیں ہیں بلکہ انسانوں کی طرح ایک مستقل خلوق ہے
78	خلیفہ کے معنی
80	”علم اماء“ سے کیا مراد ہے؟
80	علم کو عبادت پر فضیلت حاصل ہے
81	تعظیمی سجدہ
82	ابليس جن تھا فرشتہ نہ تھا
83	آدم سے حضرت آدم ﷺ مراد ہیں نہ کہ نوع انسانی
84	آدم ﷺ کی غلطی اُن کونبوٹ ملنے سے پہلے ہوئی تھی
85	آدم ﷺ کی توبہ
86	”لَا خُوفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ“ کے الفاظ سے جنت مراد ہوتی ہے
86	قصہ آدم ﷺ اولیس میں حکمتیں
88	بنی اسرائیل سے خطاب
88	”يَعْمَلُونَ“ (میری نعمت) کا مطلب ہے ”میری نعمتیں“
89	یہودی قوم بد عہد اور عہد شکن ہے
90	قصہ بنی اسرائیل بیان کرنے کے مقاصد
90	”مُصْدِّقاً“ کے معنی
92	یہودی علماء حق بات کو چھپاتے تھے
92	دین میں نماز کی اہمیت
93	قول فعل میں تضاد

مشکل حالات میں نماز اور صبر سے کام لو	94
صبر کے معنی	94
”یَظْنُونَ“ کے معنی	95
بنی اسرائیل کو آخرت کے حساب سے ڈرایا گیا	100
بنی اسرائیل پر فرعونیوں کے مظلوم	101
بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور احسانات	102
موئی علیہ السلام کا مجرہ..... عصا مارنے سے سمندر میں راستہ بن گیا	102
بنی اسرائیل نے پھرترے کی پوجا کی	103
بنی اسرائیل کی شریعت میں بھی مرتد کی سزا قلتی	105
بنی اسرائیل کے لیے من و ملوی	106
موئی علیہ السلام کا ایک اور مجرہ..... عصا مارنے سے پانی کے بارہ چشمے پھوٹ نکل	109
بنی اسرائیل کی ناشکری	110
آخرت کی نجات کا دار و مدار صرف اور صرف ایمان اور عمل صالح پر ہے	112
حضرت محمد ﷺ کی نبوت پر ایمان لائے بغیر اہل کتاب کے لیے نجات نہیں	113
بنی اسرائیل سے توریت کی پابندی کا عہد زبردستی نہیں لیا گیا تھا	115
بنی اسرائیل نے ہفتے کے دن (سبت) کی بے حرمتی کی تو ان کو بندر بنادیا گیا	117
بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا	120
گائے ذبح کرنے کے حکم کی حکمت	123
دین میں فضول سوالات کرنے کی ممانعت	123
بنی اسرائیل کے دل پتھروں سے زیادہ خست ہو گئے	126
یہود کے آن پڑھ لوگوں کی مذہبی غلط فہمیاں	129
یہودی علماء کی دین فروشی	130
اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے چند باتوں کا عہد لیا	132
بنی اسرائیل کی عہد شکنی	134
بنی اسرائیل نے نبیوں اور رسولوں کو قتل کیا	140
عیسیٰ علیہ السلام کو جبرائیل علیہ السلام کی تائید حاصل ہونے کا مطلب	140

142	بعض لوگوں کا یہ غلط دعویٰ کہ کوئی رسول کبھی قتل نہیں ہوا	✿
143	یہود کا حسد اور تعصّب	✿
145	یہود کو قرآن نے ایک چیلنج دیا جس کا وہ جواب نہ دے سکے	✿
146	ہزار برس چینی کا محاورہ اور استغوارہ	✿
148	جریئل علیہ السلام سے یہود کی دشمنی اور اس کا انجام	✿
151	ہاروت ماروت کا قصہ	✿
151	حضرت سیمان علیہ السلام کو یہود نے جادو گر کہا	✿
151	جادو گر کی کے بارے میں چند قابل غور باتیں	✿
151	جادو گر کنا کفر ہے اور اسلام میں جادو گر کی سزا قتل ہے	✿
155	نبی ﷺ کی شان میں یہودیوں کی ایک گتائی	✿
156	تائیخ و منسوخ احکام کی حقیقت	✿
158	دین کے بارے میں فضول سوالات کرنا منع ہے	✿
159	مدینے کے یہودی قبائل سے مسلمانوں کا سلوک	✿
160	دین میں نماز اور زکوٰۃ کی اہمیت	✿
160	آخرت میں نجات پانے کا صحیح معیار	✿
161	یہودیوں اور عیسائیوں کے باہمی اختلاف	✿
163	عبادت گاہوں کو گرانا ظلم ہے	✿
165	الله تعالیٰ کی اولاد نہیں ہے	✿
166	شرکریں عرب کی ایک غلط فرمائش	✿
168	یہود و نصاری مسلمانوں سے کبھی راضی نہیں ہوں گے	✿
168	اہل کتاب کے حق پرست لوگوں کا ذکر	✿
173	ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ اور اس کی حکمت	✿
174	خانہ کعبہ کی تعمیر نو	✿
174	ابراہیم علیہ السلام کی دعا	✿
176	نبی ﷺ کی بعثت کی اہم ذمہ داریاں	✿
184	تفہیق میں الرسل غلط ہے کہ بعض رسولوں اور نبیوں کو مانا جائے اور بعض کا انکار کیا جائے	✿

ملت ابراہیمی کے پچے اور جھوٹے دعوے دار کون ہیں؟	184
آیت 137 سے تعاملی صحابہ اور اجتماعی امت کا جھٹ ہونا ثابت ہوتا ہے۔	185
”صَبْغَةُ اللَّهِ“ (الذکارنگ) سے کیا مراد ہے؟	185
اہل کتاب کا ستمان حق یعنی حق کو چھپانا	186
تحویل قبلہ کا حکم	188
اُمَّةٌ وَسَطًا سے کیا مراد ہے؟	189
شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (لوگوں پر گواہ) کا مطلب	189
آیت 143 میں نماز کو ایمان قرار دیا گیا ہے	190
خواہشات کے پیچھے چنان دین واری نہیں ہے	193
رسول اللہ ﷺ کی بعثت عظیم نعمت ہے	197
ایک متفق علیہ حدیث قدسی	197
شکر کرنے اور ناشکری نہ کرنے کا حکم	198
شہیدوں کو مردہ نہ کہا جائے	200
اہل ایمان کے لیے آزمائشوں کا ذکر	201
انبیائے کرام کے لیے آزمائش	201
حدیث خباب رضی اللہ عنہ	202
مصیبت کے وقت إِنَّا إِلَلَهُ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ پڑھنا چاہیے	203
رسول اللہ ﷺ اپنے صاحجزادے ابراہیم کی وفات پر رونے تھے	203
صفا اور مروہ اللہ تعالیٰ کے شعائر (نشانیوں) میں سے ہیں	205
صفا اور مروہ کے درمیان سمجھی کا واجب ہونا سنت سے ثابت ہے	206
حق بات یا علم وحی کو چھپانا بہت بڑا گناہ ہے	208
توبہ کی ترغیب	209
اصل معہود صرف ایک ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہے	212
توحید کے عقلی دلائل	212
اہل ایمان سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرتے ہیں	213
مشرک لوگ دوزخ میں جائیں گے	214

216	حلال روزی کھانے کا حکم
216	اسلام میں حلال و حرام کا ضابطہ
218	بآپ دادا کی انڈھی تقیید کی نہ ملت
218	جاڑی تقیید کوں سی ہے؟
218	مجتہد کے لیے کسی کی تقیید جائز نہیں
218	عام آدمی کسی صاحب علم سے مسئلہ پوچھ کر اُس کے مطابق عمل کر سکتا ہے
221	حلال اور پاکیزہ چیزیں کھانے اور اس پر شکر کرنے کا حکم
222	وہی چیزیں حرام ہیں جو جسمانی یا روحانی طور پر مضر ہیں
222	چار حرام چیزوں کا ذکر
223	شریعت میں صرف چار چیزیں حرام نہیں ہیں
223	”فطرت“ یا ”بیان فطرت“ سے کوئی چیز حلال یا حرام نہیں ہوتی
224	یہ رخصت کہ مجبوری اور جان کے خطرے کی صورت میں حرام بھی بقدر ضرورت حلال ہو جاتا ہے
224	علمائے سوہ کا کردار
224	حق چھپانے کی آخرت میں سزا
225	فتیحی اور نہیں اختلاف کو دور کرنے کا طریقہ
228	آیت برآ اور نیکی کا جامع تصور
232	قصاص اور دیت کے بارے میں حکم
233	قصاص میں زندگی ہے
235	وصیت کا عارضی حکم
235	ہرنا جائز وصیت کی اصلاح کر لینا درست ہے
238	”بُطِيقُونَة“ کا مطلب
240	روزے کی فرضیت کا حکم
240	بیمار اور مسافر روزہ قضا کر کے بعد میں ادا کر سکتا ہے
241	قرآن مجید رمضان المبارک میں نازل ہونا شروع ہوا
242	دین میں آسانی رکھی گئی ہے
243	اللہ تعالیٰ اتنا قریب ہے کہ ہر دعا مستنا ہے

244	دعا کی قبولیت کے لیے اللہ تعالیٰ کی فرمان برداری ضروری ہے
244	میاں یوہی ایک دوسرے کے لیے بابس کی طرح ہیں
244	رمضان المبارک کی راتوں میں ازدواجی تعلق جائز ہے
245	اللَّيْلُ (راتِ تک) کا کیا مطلب ہے؟
246	عورت کے لیے مسجد میں اعتکاف ضروری نہیں
248	رشوت اور باطل طریقوں کی کمائی حرام ہے
251	اہلۃ (نئے چاندلوں) سے مراد حرمت والے مہینے نہیں ہیں
251	لفظ "قنز" کے ایک معنی "کسی کو مذہب بدلتے کے لیے مجبور کرنے" کے ہیں
252	رویت ہلال
253	قری کیلنڈر ہی قدرتی کیلنڈر ہے
253	نمازوں کا تعلق سورج کے طلوع و غروب سے ہے
254	حج سے متعلق دور جاہلیت کی ایک بری رسم اور بدعت
255	دفائی جنگ کی اجازت
256	جنگ کا ضابطہ اخلاق
256	چہاروں کا اصل مقصد اعلاء کلمۃ اللہ ہے
256	"عُذْوَانَ" کے معنی تادبی (جوabi) کاروائی کے بھی ہیں
258	اتفاق فی سیل اللہ نہ کرنے میں ہلاکت ہے
259	حج اور عمرہ پورا کرنے کا حکم
259	حج اور عمرے سے متعلق بعض احکامات
264	"تَزَوَّدُوا" کا صحیح مفہوم
268	ایک جامع دعا
271	منافق شخص کا کردار
271	مخلص مسلمان کا کردار
272	بعض حالات میں ندائی حملہ جائز ہے
274	اسلام میں پورے طور پر داخل ہو جاؤ
275	مسلمانوں کے زوال کا بڑا سبب جزوی اسلام پر عمل کرنا ہے

275	بندے کو اپنے گناہوں سے جلد توبہ کرنی چاہیے
277	ناشکری کی سزا
277	مسلمانوں کے لیے ایک بڑا سبق
277	مال و دولت کا میابی کا معیار نہیں ہے
278	انسانیت کی ابتدا شرک سے نہیں توحید سے ہوئی ہے
280	راوحٰن کی مشکلات
280	آیت 214 میں لاف و نشر غیر مرتب ہے
283	جہاد کی فرضیت اور اس کے فائدے
284	حرمت والے مہینوں میں لڑائی کے بارے میں حکم
286	اسلامی شریعت میں مرتد کی سزا قتل ہے
289	اس سزا کے عقلي دلائل
294	شراب اور جوئے کے بارے میں ابتدائی حکم
295	اللہ کی راہ میں کتنا مال خرچ کیا جائے؟
296	تیبیوں سے حسن سلوک
297	شرک مردیا عورت سے نکاح حرام ہے
298	قرآن میں ہر جگہ "مشرکین" سے عرب کے مشرکین مراد نہیں ہیں
299	غیر مسلموں سے مسلمانوں کا نکاح جائز نہیں
302	حیض کے بارے میں احکام
303	نکاح کا اصل مقصد
303	خاندانی منصوبہ بندی یا بہبود آبادی قرآن کے خلاف ہے
304	غلط فتنمیں نہ کھاؤ
305	ایماء کے بارے میں اسلامی حکم
306	طلاق یافتہ عورت کی عدت
307	مردوں کو عورتوں کی سر برائی کا درجہ حاصل ہے
310	طلاق دینے کا صحیح طریقہ
310	طلاق سے متعلق بعض احکام

311	ایک مجلس میں تین طلاقوں کا مسئلہ اجتماعی نہیں ہے
312	خلع کے بارے میں حکم
314	'حلالہ حرام ہے'
317	طلاق یا فتح عورت نکاح ٹانی کر سکتی ہے
318	نکاح میں ولی کا ہونا
319	رضاعت کی مدت
319	رضاعت کے بارے میں چند احکام
320	بیوہ کی عدت
320	عدت کی حالت میں عورت پر پابندیاں
321	ایک غلط فہمی کا ازالہ
321	بیوہ کا نکاح ٹانی
323	حق مرکے بارے میں احکام
325	"الصَّلُوةُ الْوُسْطَىٰ" (دریانی نماز) سے نمازِ عصر مراد ہے
326	قرآن کا ایک اسلوب
326	"قُومُوا لِلَّهِ قَيْتِيْنَ" کا شانِ نزول
326	نمازِ خوف کا ذکر
327	بیواؤں کے نان و نفقة کے لیے ابتدائی عارضی حکم
328	مظاہر عورت کو کچھ دے دلا کر خصت کرنے کا حکم دیا گیا ہے
329	"الْحَمْدُ لَهُ" کا قرآنی اسلوب اور اس کا مطلب
330	آیت 243 کی صحیح تاویل
331	جہاد کا حکم
332	اسلام اور جہاد و قیال پر تفصیلی بحث
333	جہاد کا مقصد
334	کیا جہاد کے لیے مسلمانوں کی حکومت کا اعلان شرط ہے؟
334	قرآن اور جہاد
339	احادیث اور جہاد

346	شہید کے فضائل
351	سموئیل علیہ السلام کا واقعہ
352	قیادت کا اسلامی معیار
352	طاولوت کی سرگردگی میں بنی اسرائیل کا جہاد کرنا
353	چھوٹے شکر بھی بڑے شکروں پر فتح پاسکتے ہیں
353	محابین کی دعا
354	داود علیہ السلام نے جالوت (کافر بادشاہ) کو قتل کیا
354	داود علیہ السلام کا ایک تعارف
354	قوموں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ایک قانون
355	حضرت محمد ﷺ کی نبوت کی ایک دلیل
357	بعض پیغمبروں کو بعض پر فضیلت حاصل ہے
357	نہماں نبیوں پر ایمان لانا ضروری ہے
360	ایمان اور کفر کا ہونا اللہ کی مشیت سے ہے
362	صدقة کرنے کی ترغیب اور حکم
363	آیت الکرسی اور اس کی فضیلت
366	کسی شخص کو زبردستی مسلمان بنانا جائز نہیں
366	مجرم کو اس کے جرم پر سزا ہوگی
366	اللہ پر ایمان لانے سے پہلے شیطان اور طاغوت سے سرکشی اور بغاوت ضروری ہے
367	اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا دوست، مدحگار اور کارساز ہے
367	”نور“ واحد کے مقابل میں ظلمبات جمع کیوں ہے؟
367	ایک حدیث کے ذریعے صراط مستقیم کی وضاحت
368	آیت 258 میں اللہ تر کا (ا) استفہام انکاری ہے
369	ہدایت اور اور گمراہی کا ایک خونہ..... ابراہیم علیہ السلام اور نمرود
370	انبیاء کرام کا طریقہ دعوت و تبلیغ مجادلہ ہے نہ کہ مناظرہ
372	حضرت عزیز علیہ السلام اور اُجڑی بستی کا واقعہ
373	علم ایقین اور عین ایقین

374	• ابراہیم علیہ السلام اور چار پرندوں کا واقعہ
374	• انیماے کرام اور فلسفیوں کے علم میں بنیادی فرق
376	• صدقے کا ثواب
376	• ایک نیکی کا بدلہ سات سو (700) نیکیاں
377	• صدقہ دینے کے آداب
379	• احسان کرنے اور ستانے سے صدقے کا ثواب ضائع ہو جاتا ہے
380	• ریا کاری اور دکھاوے سے کیے ہوئے صدقے کی پہلی مثال
382	• اخلاص اور نیک نیقی سے کیے ہوئے صدقے کی مثال
383	• ریا کاری اور دکھاوے سے کیے ہوئے صدقے کی دوسری مثال
384	• حلال کمائی سے صدقہ کیا جائے
385	• عشر کے بارے میں حکم
385	• آیت 268 میں یَعْدُ كُمْ کے معنی وعید اور ذرا نے کے ہیں
386	• آیت 268 میں "الْفَحْشَاءُ" کے معنی "بخل" ہیں
387	• لفظ "حکمت" کی وضاحت
387	• انفاق کے بارے میں ایک حدیث
387	• قرآن کا ایک اسلوب " مقابلہ"
387	• حکمت کے معنی فلسفہ مراد یہا درست نہیں
388	• "نذر" کیا ہوتی ہے
389	• "نذر" کی شرعی حیثیت
389	• فرض صدقے اور عبادت میں اظہار افضل ہے اور نفی صدقے اور عبادت میں اخفا بہتر ہے
392	• لفظ "سیئہ" کے معنی علامت اور نشانی کے ہیں۔ اس سے چہرہ مراد یہا درست نہیں ہے۔
392	• "لَا يَسْتَعْلُونَ" سے سوال کی نفی مراد ہے، یہ شرط نہیں ہے
393	• نبی ﷺ کا کام دعوت و تبلیغ ہے، آگے ایمان کی توفیق اللہ تعالیٰ دیتا ہے
394	• صدقے کے خصوصی حق دار لوگ کون ہیں؟
395	• اصل مسکین کون ہے؟
396	• انفاق فی سبیل اللہ کرنے سے جنت ملے گی

396	حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مثالی صدقہ
397	”ربا“ (سود) کے لفظی اور اصطلاحی معنی
398	قرآن کا ایک اور اسلوب
398	سود خوار کی چنی کیفیت کی تتمیل
399	سود حرام ہے اور تجارت حلال ہے
399	تجارت اور سود میں فرق
400	خلود فی النار (دوخ میں ہمیشہ رہنے) کا ایک مطلب طویل مدت بھی ہے
400	سود کے مال میں برکت نہیں ہوتی
401	قرآن کا ایک اسلوب عام کے بعد خاص کا ذکر
402	تفویٰ اختیار کرنے کا حکم
403	سود کھانا اللہ اور رسول ﷺ سے اعلان جنگ کرنا ہے
403	سود کا بقایا چھوڑ دینے کا حکم
403	تنگ دست مقروض کو مہلت دی جائے
403	قرض معاف کر دینا بہتر ہے
403	سود کی حرمت
404	سود کبیرہ گناہ ہے بلکہ سات مہلک ترین گناہوں میں سے ہے
405	توریت میں سود کی حرمت
405	ربا النسیبہ اور ربا افضل
405	ربا کی تعریف (DEFINITION)
406	ہر قسم کا سود حرام ہے خواہ صرفی اور ذاتی ضرورت کے لیے ہو یا تجارتی غرض کے لیے
407	دار الحرب میں بھی سود لینا جائز نہیں
407	سود کی خرابیاں
407	سود کی اخلاقی خرابیاں
408	سود کی معاشرتی خرابیاں
408	سود کی معاشی خرابیاں
412	قرض کے لین دین کے بارے میں تفصیلی احکام

● مالی معاملات میں دو مردوں کی گواہی یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی کا نصاب شہادت ہے 413
● خرید و فروخت کے کسی بڑے معاملے پر گواہ بنالینا پسندیدہ اور مستحب ہے 414
● اسلام میں عورت کی گواہی پر تفصیلی بحث 414
● آیت 283 میں امانت کا لفظ قرض کے معنوں میں ہے نہ کہ رہن کی چیز کے بارے میں 416
● سفر میں رہن کا حکم 417
● حضراً اور مقیم ہونے کی حالت میں بھی رہن رکھنے کی اجازت ہے 417
● گواہی کو چھپانا گناہ ہے 417
● برائی کا ارادہ کرنے پر کپڑا نہ ہوگی 420
● نکل کے ثواب اور برائی کے گناہ کے بارے میں ایک جامع صحیح حدیث 420
● رسول اللہ ﷺ بھی اللہ تعالیٰ کے احکام کے پابند اور مکلف تھے 423
● اللہ تعالیٰ کسی شخص پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا 424
● گَسْبَتُ اور إِنْتَسَبَتُ کا معنوی فرق 424
● خطا اور بھول چوک کے معاف ہونے کا تعلق آخرت سے ہے، دنیا سے نہیں ہے 425
● بنی اسرائیل کو ان کی سرکشی کی وجہ سے سخت شریعت دی گئی 425
● قرآن کی ایک جامع دعا 425
● اس دعا میں تین باتیں تین چیزوں کے مقابل آئی ہیں 426
● دعا کے آداب 426
● قبولیت دعا کے بارے میں ایک صحیح حدیث 426
● سورہ البقرہ کی آخری دو آیتوں کی فضیلت 427



اشاریہ مضمائیں قرآن مجید

(سورۃ الفاتحہ تا سورۃ البقرہ) مع سورت نمبر اور آیت نمبر

(ج)

آزمائش (البقرہ: 2: 157)	آدم علیہم (البقرہ: 2: 31)
احسان (البقرہ: 2: 195)	بلیس (ویکھیے "شیطان")
اسلام (البقرہ: 2: 208)	احسان جلتانا (البقرہ: 2: 246, 262)
ادھار (ویکھیے "قرض")	ابراہیم علیہم (البقرہ: 2: 124)
اسعیل علیہم (البقرہ: 2: 136)	ارتداد (ویکھیے "مرتد")
اللہ تعالیٰ (الفاتحہ: 1: 1، البقرہ: 2: 255)	اعتكاف (البقرہ: 2: 187, 125)
امتحان (ویکھیے "آزمائش")	اللہ کی عبادت (البقرہ: 2: 21)
اولاد (البقرہ: 2: 233)	امت مسلم (البقرہ: 2: 143, 128)
ایلاء (البقرہ: 2: 226)	اہل کتاب (البقرہ: 2: 109)

(ب)

بارش (البقرہ: 2: 146)	بادل (البقرہ: 2: 164)
بیت اللہ (البقرہ: 2: 125)	بن اسرائیل (40: 2)
توحید (البقرہ: 2: 163)	تفوی (البقرہ: 2: 197)

(ج)

جالوت (البقرہ: 2: 249)	جادو (البقرہ: 2: 102)
جلادُنی (البقرہ: 2: 85)	جبرائیل علیہم (البقرہ: 2: 98, 97, 87)
چہار (البقرہ: 2: 216)	جو (البقرہ: 2: 219)

(خ)

خلع (البقرہ: 2: 229)	خلافت (البقرہ: 2: 30)
	خیرات (ویکھیے "صدقة")

(د)

درگز (ویکھیے "عفو")	دانائی (البقرہ: 2: 269)
---------------------	-------------------------

(ز)

ذکر الہی (البقرہ: 2: 152)

(ر)

ربا (دیکھیے "سُودٌ")

رشوت (البقرہ: 2: 188)

رمضان المبارک (البقرہ: 2: 185)

رضاعت (البقرہ: 2: 233)

روزہ (البقرہ: 2: 183)

روح القدس (البقرہ: 2: 87)

ریا کاری (البقرہ: 2: 264)

رہن (البقرہ: 2: 283)

(س)

سبت (البقرہ: 2: 65)

سوال (دیکھیے "فضول سوالات")

(ش)

شراب (البقرہ: 2: 219)

شکر (البقرہ: 2: 152)

شیطان (البقرہ: 2: 268, 3: 203, 34)

شہید (البقرہ: 2: 154)

(ص)

صابی (البقرہ: 2: 62)

صریر (البقرہ: 2: 153)

صدقة و خیرات (البقرہ: 2: 265, 3: 261)

صراط مستقیم (الفاتحہ: 1)

صفا و مردہ (البقرہ: 2: 153)

صلوٰۃ (البقرہ: 2: 153, 3: 2)

صوم (دیکھیے "روزہ")

(ط)

طاغوت (البقرہ: 2: 256)

طاولوت (البقرہ: 2: 247)

طلاق (البقرہ: 2: 226)

طور (البقرہ: 2: 93, 63)

(ع)

عدت (البقرہ: 2: 234, 231)

عرفات (البقرہ: 2: 198)

عنود و گزر (البقرہ: 2: 234)

عمرہ (البقرہ: 2: 196)

(ف)

فاسد (البقرہ: 2: 99)

فتحہ (البقرہ: 2: 103, 191, 193)

فرشته (البقرہ 2:102, 177) (50, 49: 2)

فضل سوالات (البقرہ 2: 108)

(ق)

قرآن (البقرہ 2: 185)

قبلہ (البقرہ 2: 143, 145)

قسم اٹھانا (البقرہ 2: 225)

قرض (البقرہ 2: 282)

قصاص (البقرہ 2: 178, 179)

(گ)

گردی (دیکھی ”رہن“)

(ل)

لعت (البقرہ 2: 88)

(م)

مرتد (البقرہ 2: 217)

مقرض (البقرہ 2: 280, 282, 283)

مسجد حرام (البقرہ 2: 150)

من وسلوئی (البقرہ 2: 57)

مناق (البقرہ 2: 20, 8)

موکی علیہ السلام (البقرہ 2: 54)

(ن)

ناشری (البقرہ 2: 152)

نعمت (البقرہ 2: 150, 151)

نصاری (البقرہ 2: 62, 113)

نماز (البقرہ 2: 3, 153, 238)

نکاح (البقرہ 2: 221)

نیکی (البقرہ 2: 177)

(و)

وصیت (البقرہ 2: 180, 181)

(ہ)

ہجرت (البقرہ 2: 218)

ہدایت (الفاتحہ 1)

(ی)

یہود (البقرہ 2: 131, 120)

یعقوب علیہ السلام (البقرہ 2: 132)



تفسیر البلاع کی چند نمایاں خصوصیات

مفسر: مولانا محمد فیق حنفی

- تفسیر آسان اور عام فہم اردو زبان میں لکھی گئی ہے۔
- اس میں قرآنی / مشکل الفاظ کے معانی اور آن کی تشریح الگ سے کی گئی ہے۔
- اس میں تفسیر کے علاوہ آیات کے نظائر و شواہد (precedents) دیے گئے ہیں کیونکہ قرآن اپنی تفسیر آپ کرتا ہے۔
- اس میں صحیح احادیث کے کامل حوالے جا بجائے ہیں۔
- تفسیر اجماع امت اور دینی مستمات کے بالکل مطابق ہے۔
- اس میں قرآنی احکام کی تفسیر کرتے ہوئے تمام مسائل کا لاحاظہ رکھا گیا ہے۔
- اس میں مجید دین، منکرین حدیث اور دوسرے گمراہ طبقوں کی غلط تاویلوں کا محاسبہ کیا گیا ہے۔
- اس میں دو رجیدیہ کی ضروریات اور نئے مسائل کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔
- تفسیر قدیم و جدید دونوں طرح کے اسلوبوں کا حسین امتحان ہے۔
- اس کے مخاطبین میں جدید تعلیم یافتہ اور دینی طبقہ دونوں شامل ہیں۔

مکتبہ قرآنیۃ الامور

A-3 یوسف مارکیٹ، غزنی سڑک، اردو بازار لاہور
0321-7724032, 0333-4399812